سلسلہ ندوۃ المصنفین
(۵۲)
سلسلہ مشایخ ہند

تاریخ مشایخ چشت

از

خلیق احمد صاحب نظامی
استاد شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
رفیق ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی

انتساب

اپنے دادا مرحوم

مولوی فرید احمد نظامیؒ

کے نام

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زارِ تو ام
دگر کشادہ جبینم، گلِ بہارِ تو ام

قیمت غیر مجلد — بارہ روپے

قیمت مجلد — تیرہ روپے

طبع اول

رمضان المبارک ۱۳۷۲ھ مطابق مئی ۱۹۵۳

مطبوعہ اشوکا پریس دہلی

کل صفحات معہ پیش لفظ و تعارف وغیرہ

"۸۱۸"

فہرست مضامین

باب چہارم

پیش لفظ

از جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

سیرت کی تربیت اور شخصیت کی تعمیر، یہ شاید آدمی کے کاموں میں سب سے کٹھن اور سب سے اہم کام ہیں۔ انفرادی زندگی میں بھی جماعتی زندگی میں بھی۔ انفرادی زندگی کی تکمیل اور یہ کام تو ہم معنی چیزیں ہیں، جماعتی زندگی کا سدھار بھی ان کا طالب ہے اس لئے کہ جماعتی تمدن کی تعمیر کا لازمی تقاضا ہے کہ معمار خود بھی اپنی تعمیر کرے۔ اس تعمیر کا راستہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے صلاحیتوں اور استعدادوں کی جو گوناگوں اور کبھی کبھی متضاد بخششیں کی ہیں ان میں یکسوئی اور یک جہتی پیدا کی جائے، بے ترتیب انفرادیت کو مرتب سیرت بنایا جائے اور اس سیرت کو جانے بوجھے بالارادہ اقدارِ مطلقہ کی چاکری میں لگا کر اخلاقی شخصیت کے مرتبۂ بلند پر پہنچایا جائے۔ خزانۂ کائنات میں اخلاقی شخصیت غالباً سب سے گراں بہا گوہر ہے، فرشتے اس پر رشک کر سکتے ہیں، کرتے ہیں، خالقِ کائنات اپنے اس شاہکار پر ناز کر سکتا ہے، کرتا ہے۔

شخصیت کی تعمیر کے اس کام کو جس اہتمام، جس انہماک، جس خلوص اور جس شیفتگی سے اکابر صوفیہ نے انجام دیا اور جس وسیع پیمانہ پر اس کام کے انجام دینے میں لوگوں کی مدد اور رہنمائی کی اس کی دوسری مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ ان کے کارناموں سے، ان کے مجاہدوں، ان کی خدمتوں، ان کی تعلیمی تربیتی کوششوں سے واقفیت آج بھی تعمیر

شخصیتوں کے دشوار کام میں موثر معاونت کر سکتی ہے۔ دورِ انحطاط میں قوم اپنے اکابر کے کارناموں اور ان کی شخصیتوں کو بھی اپنی ہی پست سطح پر لے آتی ہے چنانچہ ان مَردانِ خدا کے یاد کرنے والے بھی ان کی طرف طرح طرح کے من گھڑت افسانے منسوب کر کے سمجھتے ہیں کہ ان کا رتبہ بڑھا رہے ہیں اور افکار و کردار کے اس انمول خزانہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جن سے انھوں نے انسانی زندگی کو مالا مال کیا ہے نا قدرے ہیروں میں کنکر کی خوبیاں نکالتے ہیں مگر زمانہ کا رخ بدل رہا ہے نظریں پھر حقیقت کی متلاشی نظر آتی ہیں

مجھے بڑی خوشی ہے کہ میرے ایک ہونہار نوجوان ساتھی خلیق احمد صاحب نظامی نے ان خاصانِ خدا کے ایک گروہ یعنی چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے حالات اس انداز سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے جن سے ان کی زندگی اور ان کے کام کی صحیح روح آشکارا ہو جائے اور ہم ان بزرگوں کے ارادوں کی قوت، افکار کی صحت، جمالی حس کی ذکاوت اور طبیعت کی ہیجان پذیری کی وسعت، گیرائی اور پائداری یعنی سیرت کی تربیت کے ان لوازم کی جھلک دیکھ لیں، ایک نقشہ، دھندلا سا ہی سہی، ان کے ثباتِ قدم کا، ان کی خود اعتمادی، ان کے ضبطِ نفس، ان کی بے لوث خدمت، ان کی اخلاقی جرات کا، یعنی شخصیت کی تعمیر کے گھمبیر کام کا نقشہ سامنے آجائے۔

یہ کام ہمیشہ ہی ضروری تھا آج اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ صوفیہ کے حالاتِ زندگی کو کشف و کرامات کے کہرے سے نکال کر صحیح تاریخی پس منظر کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت اتنی کبھی نہ تھی جتنی آج ہے۔ خلیق احمد صاحب نظامی نے جو مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے رکن ہیں اور جن کی تحریروں سے اہلِ علم نا آشنا نہیں، سلسلۂ چشتیہ کی تاریخ کو پانچ جلدوں میں مرتب کرنے کا قصد کیا ہے۔ یہ کام مکمل ہو جائے تو ہندی قرونِ وسطیٰ کی تمدنی تاریخ کا ایک اہم پہلو روشنی میں آجائے گا۔ پیشِ نظر جلد میں جو اس مجوزہ سلسلہ کی ایک کڑی ہے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مشائخِ چشت

کے حالات بڑی تحقیق سے جمع کئے گئے ہیں۔ مصنف نے ان بزرگوں کے کارناموں کو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے سیاسی، تمدنی اور معاشی حالات کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ان کے اصلی خط وخال نمایاں کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کتاب کے ابتدائی ابواب میں تصوف اسلام کی نوعیت، تصوف کی تاریخ مشایخ کے مقصدِ حیات، ان کے نظامِ اصلاح وتربیت اور اندازِ تبلیغ واشاعت سے بحث کی گئی ہے۔ مشایخ کے حالات سے متعلق جو لٹریچر میری نظر سے گذرا ہے اس میں کہیں ان بزرگوں کے حالات اور ان کی اصلاحی اور اخلاقی تعلیم کو اس طرح پیش کرنے کی کوششیں نہیں کی گئی ہے۔

خلیق احمد صاحب نظامی ہونہار مورخ اور معلم ہیں اور مجھے امید ہے کہ جس کام کو انھوں نے ہاتھ میں لیا ہے وہ حسن وخوبی سے تکمیل کو پہنچے گا اور مورخ ہی ان کے مرہونِ منت نہ ہوں گے بلکہ معلم بھی، کتابیں پڑھنے پڑھانے والے بھی اور شخصیت سازی کا کام کرنے والے، اور اس میں اوروں کو سہارا دینے والے بھی۔ یہ بات ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔

علی گڑھ : ۲۰ مئی ۵۳ء

ذاکر حسین

ازجناب پروفیسر محمد حبیب صاحب ۔ صدر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خلیق احمد صاحب نظامی کی تصنیف "تاریخ مشایخ چشت" کو جو ہندوستان کے سب سے اہم مذہبی سلسلے سے متعلق ہے، دنیا سے روشناس کراتے وقت میں فخر و مسرت کی ایک عجیب کیفیت محسوس کرتا ہوں۔

عرصہ ہوا ایک سلسلہ میں مجھے میرٹھ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں مصنف سے جو میرے ایک پرانے شاگرد مسٹر عزیز احمد ایڈوکیٹ کے صاحبزادہ ہیں پہلی بار ملاقات ہوئی اس وقت وہ ایم۔اے کے طالب علم تھے لیکن ہندی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں انکا غیر معمولی انہماک بالخصوص تصوف کے وسیع مطالعہ کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی میں نے یہ طے کرلیا کہ اس ہونہار نوجوان کو علی گڑھ بلالینا چاہیے، کچھ ہی دنوں بعد خوش قسمتی سے حالات نے ساتھ دیا تو میں نے فوراً خلیق صاحب کو علی گڑھ بلالیا۔

انسان کے مستقبل کی تشکیل و تعمیر میں بعض اوقات اتفاقات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ خلیق صاحب کی زندگی کے مقاصد اور کام کا تعین ان فارسی مخطوطات نے کیا جن کا ایک بیش بہا ذخیرہ ان کے دادا چھوڑ گئے تھے۔

میرٹھ اور علی گڑھ دونوں مقامات پر خلیق نظامی صاحب نے مشایخ کی تاریخ کا مواد بڑی محنت سے فراہم کیا ہے۔ انھوں نے چشتیہ سلسلے کی تاریخ کو پانچ جلدوں میں مرتب

کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ پیش نظر جلد اس مجوزہ سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں شاہ کلیم اللہ دھلویؒ سے خواجہ اللہ بخش تونسویؒ تک کے تمام صوفیائے چشت کے مفصل حالات درج ہیں۔ اس نوع کے سلسلے کو ایک درمیانی کڑی سے شروع کرنے میں دقتیں ضرور ہیں، لیکن ایک محقق اس معاملہ میں بالکل مجبور ہوتا ہے جس طرح اور جس وقت اس کا مواد جمع ہو جاتا ہے اسی طرح اور اسی وقت وہ اپنی تحقیق کے نتائج پیش کر سکتا ہے، اس ہی وقت کے پیش نظر خلیق صاحب نے کتاب کے ابتدائی حصہ میں تصوفِ اسلام کی نوعیت سے بحث کی ہے اور تصوف کے ان ارتقائی مدارج کا جایزہ لینے کے بعد جن سے وہ دوسرے ممالک میں گذرا ہے چشتیہ سلسلے کی تاریخ بھی دیدی ہے یہ تمام تفصیلات شروع کے ۳۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ مصنف سے گفتگو کے دوران میں مجھے اس بات کا پتہ چلا کہ یہ صفحات محض تمہیدی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ پہلی جلد میں فلسفۂ تصوف کی اس طرح تشریح کریں کہ تصوف کی اہمیت ایک ہمہ گیر نظام کی حیثیت سے واضح ہو جائے —— ایک ایسا نظام جو فلسفۂ حیات سے لے کر خدمتِ خلق تک انسانی زندگی کے ہر گوشہ پر حاوی ہے۔

خلیق صاحب نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے اس کے لئے ان کی اہلیت اور موزونیت مسلم ہے۔ یہاں میں ان کی تین خصوصیات کی طرف اشارہ کروں گا۔ اولاً یہ کہ انھوں نے تصوف کے ان تمام ماخذ کا وسیع اور غایر مطالعہ کیا ہے جن تک انسانی دسترس ممکن ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں ان سے بہتر اس کام کو اب تک کوئی انجام نہیں دے سکا ہے۔ دورِ حاضر کے مصنفین میں اگر کوئی شخص اس وسعتِ مطالعہ میں ان کے لگ بھگ آتا ہے تو وہ صرف شیخ غلام سرور لاہوری ہیں، کوئی اسی نوے برس ہوئے ان کی کتاب "خزینۃ الاصفیا" دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن اس کتاب کا بڑا نقص یہ تھا کہ مصنف نے عقاید کا سہارا لے کر ان تمام اصولِ اسناد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا جو علمائے

اسلام کی نظر میں صدیوں تک علم وحکمت کی روح سمجھے جاتے رہے ہیں. تنقیدی اصولوں سے
چشم پوشی کرکے محض عقاید پر علم کی عمارت تعمیر کرنا نا سمجھی نہیں تو کیا ہے. اس قسم کی تحریریں متضاد
افکار کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہیں اور بالآخران کا نتیجہ بدعقیدگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے صاحب
خزینۃ الاصفیا نے اپنی کتاب میں ہیبت ناک قسم کی ایسی کرامات کی تفصیل دی ہے جن کو پڑھکر
انسانی عقل وخرد کو شرم آجاتی ہے موجودہ نسلیں ان پر بحث ومباحثہ کرنے کی بجائے بے توجہی
سے ان کو نظر انداز کرنا بہتر سمجھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کشف وکرامات کے بے معنی قصوں کا تصوف
سے دور کا بھی تعلق نہیں. شیخ نظام الدین اولیاؒ کا کہنا ہے کہ کرامات تصوف کے سلسلے میں
کوئی اہمیت نہیں رکھتیں. حقیقتاً تصوف اخلاقی زندگی کا ایک نظام اور نظامِ کائنات کی ایک
مکمل توجیہہ پیش کرتا ہے ـــــ اس کو کشف وکرامات سے کیا تعلق! خلیق صاحب نے
شیخ نظام الدین اولیاؒ کے اس قول کو مستقلاً مدِ نظر رکھا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ان کی
تصنیف کو ایک امتیازی حیثیت دیتی ہے۔

دوم یہ کہ گو تصوف کی تعریف وتوجیہہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن جہاں
تک میری معلومات کا تعلق ہے خلیق صاحب کی یہ تصنیف ہی ایک ایسی واحد کتاب ہے جس
میں تصوف کو تاریخی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے مصنف نے ہر دور کے فکر کو اس عصر کے
مخصوص مسائل سے متعلق کرکے واضح کیا ہے یہ بڑی مستحسن کوشش ہے تاریخ کے کسی
دور میں بھی تصوف کی ایک جامد حیثیت نہیں رہی. انسان کے افکار کا اس کے مادی ماحول
سے متعلق ہونا ایک لازمی چیز ہے. اس کے افکار خلا میں زندہ نہیں رہ سکتے. تصوف کو ایک
جامد طریقۂ فکر خیال کر لینا ہماری مستقل عادت بن چکی ہے. خلیق صاحب نے اس غلط اور
فرسودہ راہ سے ہٹ کر تصوف کے انقلابات کو سماجی اور سیاسی نظام سے جس طرح
منسلک کرکے مسائل کی وضاحت کی ہے اس کے لئے وہ قابلِ ستائش ومبارک باد ہیں. ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ اس نکتہ کی یہاں مزید تشریح کردی جائے۔

ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کے صوفیہ کی جو تصانیف دستیاب ہوتی ہیں ان میں اس دور کے فرماں رواؤں کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ امیر حسن سنجری نے "فوائد الفواد" میں شیخ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات کو جمع کیا ہے لیکن کتاب میں معاصر فرمانروا سلطان علاء الدین خلجی کا یکسر کوئی حوالہ ہی نہیں ملتا۔ حالانکہ جن تاریخوں میں یہ ملفوظات جمع کئے گئے ہیں اس وقت علاء الدین سربرآرائے سلطنت تھا۔ بالکل یہی حال "خیر المجالس" کا ہے اس میں حمید قلندر نے شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے ملفوظات جمع کئے ہیں لیکن فیروز شاہ کا ذکر بالکل مفقود ہے۔ اس کے کئی سبب ہیں خلیق صاحب نے بالکل قطعی طور پر ثابت کیا ہے کہ نہ صرف ابتدائی دور کے صوفیا بلکہ دورِ متوسط کے تمام مشایخ واکابرِ دین حکومتِ وقت اور حکام سے تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی یہ بے نیازی اور استغنیٰ ان کے مذہبی تقدس اور برتری کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ بعد کو جو غیر مستند قسم کی حکایات ان بزرگوں کے متعلق مشہور ہوئیں ان کا انداز کچھ ایسا ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے گویا دورِ سلطنت میں چشتیہ سلسلے کے اکابر مشایخ فرماں روایانِ وقت پر بڑا گہرا اثر رکھتے تھے اور حکمراں طبقے سے ان کی بڑی رسم وراہ تھی۔ بعض حکایتوں میں تو یہ صوفیہ درباریوں کے پیرایہ میں نظر آتے ہیں۔

اس تبدیلی کا سبب یہ ہے کہ بعد میں خود صوفیہ کے نقطۂ نظر میں ایک بہت بڑا فرق ہو گیا تھا۔ بابا فریدؒ کی سالکوں کو یہ قطعی ہدایت تھی کہ وہ امراء اور سلاطین سے کوئی رسم و راہ نہ رکھیں۔ دورِ سلطنت میں اس تنبیہ کی برابر تکرار بھی ہوتی رہی اور اس پر عمل درآمد بھی بڑی سختی سے ہوا لیکن ۱۳۵۶ء میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے انتقال کے بعد ایک زبردست تغیر رونما ہوا۔ سہولت و آسائش کی خاطر یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ صوفیہ فرماں رواؤں اور حکام بالا سے راہ و رسم ضرور پیدا کریں تاکہ ان پر خیر و نیکی کا اثر ڈالا جا سکے۔ اس نظریہ کی ترویج کے وقت یہ حقیقت بالکل فراموش کر دی گئی کہ حکومت سے مفاہمت اپنے اصولوں [illegible] صدی دستبردار ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ اس ہی کے ساتھ ساتھ ایک اور تبد[illegible]یہ ہوئی کہ بیشتر صوفیہ

نے خلافت اور سجادہ نشینی اپنے لڑکوں کے سپرد کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پندرھویں صدی کے بہت سے حکمراں صوبائی خاندانوں سے صوفیہ کا ایک ایسا سلسلہ منسلک ہوگیا جن کے یہاں خلافت کا تعلق وراثت سے تھا۔ سلاطین نے صوفیہ اور ان کے مریدین کی... خوشنودیِ مزاج کی خاطر بڑے بڑے اوقاف دئے اور نذریں پیش کیں اور اس کے بدلے ان کے اثر سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان تمام تبدیلیوں کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو انسانیت کی فلاح اور بہبود کے لئے ایک آفاقی جدوجہد کے طور پر پیش کیا تھا۔ دنیا میں اسلام کا ظہور ایک ایسے ضابطے کے طور پر ہوا جو مظلوموں کا حامی تھا۔ حکمراں طبقہ کی نفسیات اُسے چھو کر بھی نہ گذری تھیں۔ حقیقتاً اسلام خدمتِ خلق کا ایک عالمگیر اصول لے کر آیا تھا۔ لیکن سولہویں صدی میں صوفیہ بھی مسلمانوں کے اس تعلیم یافتہ طبقہ سے جا ملے جو اسلام کے عالمگیر اصولوں کی توجیہ حکمراں طبقہ کے معتقدات کے زیر اثر کرتا تھا۔

بعد کے صوفیہ نے ان توجیہات کو ایک نئے ضابطہ کی شکل دے دی اس کے اولین آثار تو خیر ابتدا ہی سے موجود تھے لیکن ہندوستانی ماحول کے پس منظر میں اس کی مکمل ترین تشریح ضیاء الدین برنی کی "فتاویٰ جہانداری" میں ملتی ہے۔ برنی نے فیروز شاہ تغلق کی حکومت کے پہلے چھ برس میں اسے تصنیف کیا تھا۔ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے اس بیش بہا تصنیف میں (جو ہماری یونیورسٹی کی افسر افضال الدین ایم اے لندن اسکول آف اورینٹل اسٹیڈیز میں ایڈٹ کر رہی ہیں) برنی نے رسول خدا اور خلفاء کی روایات اور معمولات کو یہ کہہ کر برطرف کر دیا ہے کہ یہ اصول ایک ایسے دور کی یادگار ہیں جو محض وقتی تھا اور جس کا دوبارہ ظہور میں لانا اس لئے ناممکن ہے کیونکہ وہ ایک مثالی چیز تھی اور تبدیل شدہ حالات میں اس کے حصول کی کوشش بے سود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی طرف سے وحی آتی تھی اور خلفائے راشدین کو انھوں نے تربیت دی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے

اس کے معنی یہ ہیں کہ جو واقعات گذر گئے ہیں ان کی تکرار ناممکن ہے۔ جہاں داری چونکہ حکمراں طبقہ کا حق ہے اس لئے سماجی نظام کو وراثت کے ذریعہ برقرار رکھنا ضروری ہے جہاں تک مسلمان عوام کا تعلق ہے ان کی جگہ معین ہے۔ علمائے کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ عوام کو دینی رسوم مثلاً نماز روزہ حج اور زکوٰۃ کی ادائگی سے ماورا کوئی تعلیم نہ دیں۔ رہے وہ لوگ جو محکوم ہیں اور اسلام قبول کر چکے ہیں مثلاً ہندو اور منگول ان کی طرف توجہ کی چنداں ضرورت اس لئے نہیں ہے کیونکہ توحید کا تصور جسمانی طور پر انھیں ورثہ میں نہیں ملا ہے اور نہ اس قسم کا کوئی عقیدہ ان کے خون میں جاری وساری ہے آگے چل کر برنی کہتا ہے نہ تو ہم میں وہ مسلمانی باقی ہے اور نہ ہمیں وہ مسلمان میسر ہیں جن پر ہم ابوبکرؓ وعمرؓ کی طرح حکومت کر سکیں۔ اپنی دلیل کو مستحکم کرنے کے لئے برنی کہتا ہے کہ ہم اس واقعہ کو نظرانداز نہ کریں کہ چار خلفائے میں سے جنھوں نے رسول کے بتائے ہوئے رستہ پر چلنے کی کوشش کی تین کو صرف اس لئے شہید کر دیا گیا کیونکہ وہ حکمرانوں کی طرح اپنا ذاتی تحفظ غیر ضروری سمجھتے تھے۔

برنی کی اس تصنیف کا لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا عہدِ سلطنت میں جب کہ حکمراں خاندانوں میں پے بہ پے تبدیلی ہو رہی تھی حکومت کے ضوابط کے متعلق اس کی سفارشات کے کچھ کارگر ہونے کا امکان تھا اور نہ بعد میں تو ان کی طرف کسی نے توجہ بھی نہ کی۔ حالانکہ برنی کے بتائے ہوئے ضابطے حکمراں طبقہ کو عوام سے نفع اندوزی کی بڑی سہولتیں بہم پہنچاتے تھے لیکن پھر بھی حکمراں طبقے نے ان ضوابط کو ایک نظریاتی حیثیت دے کر بھی تو نہ نوازا۔ برنی نے مذہب کے حریری پردہ میں نظریۂ وراثت اور نفع اندوزی کا جواز بھی تلاش کر لیا لیکن فرمانرواؤں کے نزدیک اس کتاب کے نظریات نے بار نہ پایا۔ برنی کی تصنیف نے عوام کے ضمیر میں اس تضاد کو حق بجانب اور جائز رکھا جس کی رو سے جہانبانی اور نفع اندوزی کو مخلوط کر دیا گیا تھا اور جس نے عوام کو دوطرفہ حیثیت دے کر

انسان کا ایک رخ خدا کی طرف پھیر دیا تھا اور دوسرا بندوں کی طرف۔ بہرکیف برنی نے حکمراں طبقہ کا جو تجزیہ کیا ہے اس سے ہمارا یہاں کوئی تعلق نہیں ہے میں تو صرف اس تغیر کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے امتدادِ وقت کے ساتھ ساتھ صوفیہ حکمراں طبقہ سے منسلک ہو گئے۔ علمائے ظاہری اور علمائے دنیوی کا جو فرق شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور شیخ نظام الدین اولیاؒ کو اس قدر عزیز تھا آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور صوفیا کی وہ بات نہ رہی جو پچھلے زمانہ میں تھی۔ دورِ مغلیہ اور اس کے بعد صوفیہ کے مراکز کا طرۂ امتیاز فقر کے بجائے اوقاف ہو گئے۔ ان اوقاف کی ضامن حکومتِ وقت تھی نتیجتاً انگریزی اقتدار ہندوستان میں رونما ہوا اور رفتہ رفتہ پوری طرح مستحکم ہو گیا۔ چیرمین ماؤسی تنگ کا قول ہے کہ پوری شہنشاہیت کا مقابلہ صرف عوام کے ذریعہ تو ممکن ہے، لیکن مشرقی حکمراں طبقہ کے طریقہ کار کے مطابق اسکا انسداد ناممکن ہے کیونکہ اس طبقہ کی جڑیں اب بہت کمزور ہو چکی ہیں۔ عوام کے طریقہ کار کا ہی سہارا لے کر اس نسل نے ہندوستان اور چین کو آزاد کرایا ہے۔ خلیق صاحب نے اٹھارھویں صدی کے پیچیدہ عقائد، پیچیدہ سیاست، افکار اور متضاد افعال (جنکی وجہ سے ہندوستان میں غیر ملکی حکومت قائم ہوئی تھی) کے سلسلہ میں بڑی کاوش کی ہے۔ عوام کا طریقہ کار ہمیں انگریزی اقتدار کی توسیع کے وقت بھی اس ہی طرح محفوظ کر سکتا تھا جسطرح اس نے ہماری آج مدد کی ہے۔ لیکن اس طریقہ کار کیلئے تین چیزیں درکار ہیں۔

(۱) غیر مذہبیت (۲) ترقی پسند مقاصد (۳) حکمراں طبقہ کی مکمل تحلیل۔ منگولوں کے حملوں کے زمانہ میں ان تینوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی کوئی تیار نہ ہوتا تھا صرف صوفیہ یہ جانتے تھے کہ جان کس طرح سے دی جاتی ہے۔ اٹھارھویں صدی میں یہ کام بھی ان کے بس کا نہ رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے تلوار اٹھائی اور تلوار ہی کے ذریعہ ختم ہو گئے۔ کچھ صوفیہ نے تحریر و تقریر کے ذریعہ آنے والے طوفان سے آگاہ کیا اور لوگوں کو تنبیہ بھی کی، لیکن ان کی اکثریت خاموش رہی۔ صوفیہ اور علماء نے

تو نہیں البتہ وہابیوں نے اس مایوسی کے دور میں انگریزی حکومت کے قیام کے خلاف ہندی مسلمانوں کے ردِ عمل اور اضطراب کو ظاہر کیا۔ اس دور میں بیشتر صوفیہ کی حالت زبوں تھی۔ وہ مغل منصب داروں اور اودھ کے بدکار امراء سے بھی کہیں زیادہ پست ہو چکے تھے مزاروں سے عقیدت اور دیگر خارجی شواہد سے اگر اندازہ لگایا جائے تو ہندوستان اور بیرون ہند کے مسلمان تصوف سے تو اب بھی وابستہ نظر آئیں گے لیکن وابستگی کے اس انداز میں فرار کا پہلو ملے گا اس میں کسی اعلیٰ کام کو انجام دینے کے جذبہ کو ابھارنے کی صلاحیت نام کو نہیں۔ اس وابستگی پر تو خود ایک مردنی کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

تاریخِ عالم کے طالب علم کے لیے جو کائنات کی جد و جہد کو ایک بہتر دور کا پیش خیمہ سمجھنے کا عادی ہو چکا ہے یہ انقلاب تعجب کی چیز نہیں ہے۔ عہدِ حاضر تصوف کیلئے ابتلا اور آزمایش کا دور ہے تصوف کو اس منزل سے اس لئے گذرنا پڑ رہا ہے تاکہ اس کی خرابیاں دُھل جائیں اور اس کی بلوریں شکل پھر اسی آب و تاب کے ساتھ نکھر آئے مجھے پورا پورا یقین ہے کہ تصوف اس آزمائش میں پورا اترے گا اور زیادہ توانا اور صحت مند ہو کر پھر آدمی کے خطاکار قدموں کو ظلمت اور گمراہی سے بچائے گا۔

تاریخِ عالم میں تصوف کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دورِ حاضر کے مسائل اور تصوف کے اساسی اصولوں کو ذہن میں رکھیں۔

پچھلے چار سو برس سے دنیا ایک ایسی شدید کشا کش سے گذر رہی ہے جس کی مثال ہمیں پتھر کے زمانہ سے اب تک تاریخ میں نہیں ملتی۔ آہستہ آہستہ ایجادات (مثلاً کاغذ کی ایجاد) کے دور نے جنم لیا۔ انسان بتدریج اپنے فکر و عمل میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہا یہاں تک کہ نئی تبدیلیاں اس کا مزاج بن گئیں۔ لیکن سولھویں صدی سے ایک طرف تو پیداوار اور رسل و رسایل کے ذرائع نے زبردست ترقی کی اور دوسری

طرف جاگیردارانہ نظام اور پرانے طبقہ امرا کو ختم کر دینے کے بعد امرا کا ایک ایسا نیا طبقہ وجود میں آیا جس کی سب سے بڑی خصوصیت نئے حالات میں بہترین طور پہ کام انجام دینا ہے اس کے ساتھ ساتھ طبقاتی اختلافات بھی شدید تر ہو گئے اور بالآخر مزدور طبقہ کی فتح ہوئی صدیوں سے یہی انقلاب عظیم کار فرما ہے۔ اس کی رفتار کبھی شدید ہو جاتی ہے اور کبھی سست لیکن جو ہے ناگزیر اور یقینی۔ آج کل کی سیاسی دنیا دو جماعتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کمیونسٹ دنیا جس کے رہبر پرولتاریت اور عوام کے اکابر ہیں اور دوسری وہ دنیا جس کی قیادت صنعت وحرفت کے امرا کے ہاتھ میں ہے۔ دونوں جماعتوں کے قائد اس اعتبار سے جمہوری کہے جا سکتے ہیں کہ انھیں ووٹ کے حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی دونوں جماعتوں کے اساسی فرق سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارا واسطہ تو دونوں کی اس بصیرت ونگاہ اور فکر واعتقاد سے ہے جس کا علوم مجرد ومنطق کی ترقی کے دوران میں تقسیم اور پیداوار کی ترقی کے زمانہ میں اور انسان کے مصائب مثلاً بھوک، وبا اور جاہلیت (جسے ہمارے آباد واجداد سماجی نظام کا خاصہ سمجھتے تھے) کے دوران میں یکسر ختم ہو جانے کا قوی امکان ہے اس میں تو خیر اب شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کہ آئندہ چند صدیوں میں یہ کشاکش تیز تر ہو جائے گی۔ بہر حال کامیابی یقینی اور قطعی ہے۔

سائنس داں کو بحیثیت سائنس داں کے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسے لائحہ عمل کو تسلیم کرے جو مذہبی معتقدات سے قطعاً غیر متعلق ہو، چاہے اس کے ذاتی مذہبی تصورات کچھ بھی رہیں۔ اب روز بڑھتے اور ترقی کرتے ہوئے علوم کی بنیاد دلیل وحکمت پر ہے، تجربہ پر ہے مشاہدہ پر ہے ان حالات میں ایک سائنس داں بحیثیت سائنس داں کسی مذہبی روایت یا کسی مذہبی عقیدہ کی بنیاد پر اپنے کام کو نہیں چلا سکتا۔

رسمی مذاہب اور جامد دنیاوی نظام کے اکابر جب اس ہمہ گیر انقلاب سے دوچار ہوئے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو انھوں نے ہر جگہ ایک رجعت پسندانہ انداز اختیار کر لیا۔

(رجعت پسندانہ انداز سے میری مراد ایک ایسے رویہ سے ہے جو انسان کے فکر و عمل کو حالات گرد و پیش کے مطابق تبدیلی پیدا کرنے سے روکتا ہے) رجعت پسندی اور معاندانہ افتادِ طبع کی بنا پر کشاکش کا پیدا ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ پہلی آویزش کی ابتدا ۱۷۸۹ء کے اس فرانسیسی انقلاب سے ہوئی جو کلیسائیت کے یقیناً اسی قدر خلاف تھا جتنا ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب۔ امریکہ کے انقلابیوں نے ۱۷۸۷ء میں جب ملک کے آئین کو ترتیب دیا تو ریاستی کلیسائی تنظیم کو ممنوع قرار دے کر انھوں نے اپنے مسائل کو حل کر لیا۔ انگریزی حکمراں طبقہ جس کی فراست کی نظیر دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے اس مسئلہ کو بہت شروع ہی میں حل کر چکا تھا۔ ایلزبیتھ کے مشہور Statute of Supremacy کے ذریعہ ۱۵۵۹ء میں انگلستان میں تمام مذہبی امور کے لئے کلیسا کو پارلیمنٹ کا پابند بنا دیا گیا اور مذہب کے انتظامی معاملات میں بادشاہ وقت کی اس حکومت کو اختیار دے دیا گیا جس کی بنیادیں مذہب پر مطلقاً استوار نہ تھیں۔ بہر کیف مذہب کی رسمیات اور غیر مذہبی رجحانات کے درمیان تقریباً تمام ممالک میں ایک کشمکش جاری ہے۔ تیس برس ہوئے چیرمین ماؤسی تنگ نے اپنی جد و جہد کا آغاز کنفوشیس کے پرستاروں کے خلاف جنگ سے کیا تھا اسکی جد و جہد کامیاب ہو چکی ہے۔ تبت کے لاماس اب نام کو ہی باقی رہ گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی مذاہب و افکار کا زبردست تنوع موجود ہے، لیکن حکومت کے غیر مذہبی ہونے کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ ریاست کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی گئی ہیں وہ غیر مذہبی ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے یہاں چونکہ کوئی منظم کلیسائی نظام نہیں ہے اس لئے ان کی حیثیت ذرا مختلف ہے۔ علمائے دین کی بڑی تعداد نئے رجحانات کے خلاف جنگ میں مصروف ہے اور مصر ہے کہ پرانے طریقہ ہائے زندگی کو پھر تازہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے عقائد کی کمزوری کا گلہ ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے آج پھر پرانے انداز میں شروع کر دیا گیا ہے گو یہ اب بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ اسلامی دنیا میں مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ سے ایک گونہ دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے اور امکان اس بات کا ہے کہ ہم شاید اسلامی ثقافت کو پھر اس انداز سے ترتیب دینے

میں کامیاب ہوں گے جس کی مثال تاریخ میں نہ مل سکے گی۔ یہ بہرکیف یقینی ہے کہ مسلمان روشن خیال اور تعلیم یافتہ طبقہ کا عقیدہ ان مذہبی رہنماؤں کی طرف سے بالکل متزلزل ہو چکا ہے جو تقلید جامد کے ذریعہ زندہ رہنا چاہتے ہیں اور جو مسلسل ان غیر ترقی پسندانہ اصولوں کی تبلیغ کر رہے ہیں جو مسائل حاضرہ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ رجحان کے اس تغیر کے ساتھ ساتھ عوام تو نہیں لیکن تعلیم یافتہ طبقہ مذہبی رسوم سے بھی بری طرح بدظن ہوتا جا رہا ہے ان تمام چیزوں کے باوجود اس بات کا امکان ضرور ہے کہ بہتر سماجی حالات میں ماضی کی صحت مند چیزیں پھر واپس آجائیں گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بدحالی اور افراط و تفریط کے دور میں تصوف کی جگہ کیا ہے؟

ہمیں یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ تصوف اسلام سے کئی سو برس پہلے انسانی فکر میں آچکا تھا۔ دارا شکوہ کا خیال صحیح ہے کہ تصوف کی اولین مستند تشریح اپنشدوں میں ملتی ہے، غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ ترکوں اور منگولوں کا نظریہ "ال تنگری" چینیوں کی تصور "تیان" اور صوفیائے اسلام کا نظریۂ حق اساسی طور پر ایک ہی چیز ہیں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے صوفیہ اپنے معتقدات کی بنیاد صرف قرآن کو ٹھیراتے ہیں۔ قرآن کی تصوفانہ تفسیر ہمیں اس قدر بالغ نظر ضرور کر سکتی ہے کہ ہم وضعیت اور سخن سازی کی ان گتھیوں سے ملند ہو سکیں جن میں ملاؤں کے ایک طبقہ نے اس کو الجھا رکھا ہے۔ قرآن کی جو تشریح تصوف پیش کرتا ہے وہ عقلیت پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی نقطۂ نگاہ لئے ہوئے ہے۔ اس میں ایک وسعت ہے، اس کا رخ کائنات کی طرف ہے۔ اس کا لہجہ آفاقی ہے، شاید قرآن کی صحیح ترین تفسیر یہی ہے۔

خلیق صاحب نے ٹھیک کہا ہے کہ تصوف کے عقاید کی بنیاد وحدت الوجود پر ہے قرونِ وسطیٰ کے مشایخ کی طرح ہمیں اس کے بیان کرنے اور سمجھانے میں تامل نہ کرنا چاہیئے

بلکہ بلا مذہب وملت کی کسی تفریق کے ضرورت اس کی ہے کہ اس کے بنیادی تصورات کو اسکولوں کی کتابوں میں بیان کیا جائے۔ مسلمانوں کے لئے اس نظریہ کی مذہبی اساس قرآن کا یہ ارشاد ہے۔ هوالاول والاخر والظاهر والباطن وهو بكل شئ عليم

لیکن یہاں ہم وحدت الوجود کو صرف اسلامی تصوف کے ایک نظریہ کی حیثیت ہی سے دیکھنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی عالمگیر حیثیت کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں — وہ حیثیت جس نے اس کو پوری انسانیت کے لئے ایک اہم نظریۂ حیات بنا دیا ہے۔

کسی ضابطہ یا اصول کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کا مقابلہ اس کے متضاد نظریے کیا جائے۔ اس ضمن میں میں برکلے کے نظریۂ مطحیت (IDEALISM) کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس نظریہ نے برکلے کو کلیسائی اعزاز تو بخش دیا لیکن مطحیت کو میں یورپ کی ایک مقامی غلطی تصور کرتا ہوں۔ موضوعِ بحث کے اعتبار سے میں لینن کا ذکر کرنا زیادہ موزوں خیال کرتا ہوں۔ لینن یورپ کے فلسفہ اور سائنس کی دنیا کا پورا جائزہ لینے کے بعد بالآخر مارکس کی جدلیاتی مادیت سے متفق ہوگیا۔ مادہ کا ذکر کرنا اب لاحاصل ہے۔ مادہ تو ختم ہو چکا۔ بالفاظ دیگر سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مادہ محض ایک ہیئت ہے جسے کوئی بھی شے (سہولت کے لئے ہم اسے قوت کہہ سکتے ہیں) اپنے اظہار کے لئے اختیار کر سکتی ہے۔ بہرکیف انسان اور خارجی مظاہر کی دوگونہ حیثیت تو برقرار رہتی ہے۔ برکلے کی غلطی کو نظر میں رکھ کر لینن انسان کو روزانہ کے حقایق کی طرف واپس بلاتا ہے۔ وجود میرا بھی ہے اور اس کائنات کا بھی جو میرے گرد و پیش ہے۔ لیکن اولیت اور برتری مجھے حاصل نہیں میرے گرد و پیش کو ہوئے اشیاء کی حقیقت ان کے مظاہر سے بالکل مختلف ہے لیکن میرے مشاہدہ اور خارجی دنیا میں مطابقت کا ہونا اس ہی قدر ناگزیر ہے۔ میرا تجربہ اور عمل بھی مجھے اس ہم آہنگی کا پتہ دیتے ہیں کیونکہ خارجی دنیا کو تبدیل کرنے پر مجھے قدرت حاصل ہے۔

وحدت الوجود کے مسئلہ میں اس غلطی کی تکرار ہرگز نہیں ہے جو برکلے سے سرزد ہوئی

وحدت الوجود خارجی دنیا کا منکر نہیں ہے اس کا اعتراف کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کے بغیر تو یہ نظریہ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ وحدت الوجود تو ایک حد تک جدلیاتی مادیت سے بھی فوق لئے ہوئے ہے۔ اس کا کہنا ہی کہ موجودات کی اصل ایک ہے۔ سائنس یا تجربات کی رو سے قوت (ENERGY) کو شعور میں اور شعور کو قوت میں اس طرح تبدیل کر دینا جیسے حرارت کو بجلی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ممکن نہیں ہے۔ بایں ہمہ جدلیات کی اصطلاح ہی میں انسان اور خارجی شواہد میں وحدت کا موجود ہونا مضمر ہے آدمی کے افکار سے خارجی دنیا کی ہم آہنگی بھی اس کا ثبوت ہے۔ لینن اور اینگلز بھی اس پر زور دیتے ہیں کہ دونوں کے تطابق کو ایک امر مسلم کے طور پر تسلیم کر لیا جائے چنانچہ وحدت الوجود کا مسئلہ جدلیاتی مادیت کے منافی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ وحدت الوجود ایک ایسے شعورِ اعلیٰ کا تصور پیش کرتا ہے جس کے دو مظاہر انسان اور خارجی دنیا ہیں۔ انسان کی اخلاقی زندگی اس ہی شعورِ اعلیٰ سے ماخوذ ہے۔ فرض کر لیجئے کہ یہ شعور موجود نہ ہوتا تو دنیا ایک ہیولیٰ کی شکل میں ہوتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تمام بے ترتیبوں کے باوجود دنیا منظم اور آراستہ شکل میں موجود ہے اور انسان اس کی اصلاح پر قادر بھی ہے۔ یہ سب اس ہی شعورِ اعلیٰ کی وجہ سے ہے جو انسان کی قدرت کو طاقت بخش کر اسے اس لائق بنا تا ہے کہ وہ ہر چیز کو متغیر کر سکے اور اسے ترتیب دیدے۔

وحدت الوجود کی تعلیم سب سے پہلے اپنشدوں نے دی مشرقی فلسفہ و افکار میں اس کی ایک امتیازی حیثیت ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے صوفیہ اس کی نشر و اشاعت میں اس لئے پس و پیش کرتے تھے کیونکہ حکمراں طبقہ سے متعلق ہو جانے کے بعد (سولھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے) بعض اس کی انقلابی نوعیت سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وحدت الوجود ایک ایسا مانوس لفظ ہو گیا جو ہر شخص کی زبان پر آنے لگا اور اس کے اظہار کی ہر شخص کو اجازت ہو گئی کیونکہ اب یہ فکر و عمل کے کسی بلند جذبہ کو متحرک نہیں کر سکتا تھا۔ حکمراں طبقہ

سے وابستگی کی یہ نوعیت اب ختم ہو چکی ہے۔ جاگیردار طبقہ اب فنا ہو رہا ہے اور وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ وحدت الوجود کے اساسی نقطۂ نظر کی طرف ایک بار پھر رجوع کیا جائے اور اس کے مطالب ومفہوم کی دوبارہ تشریح کی جائے۔

اس کے بعد ہم تصوف کے اخلاقی پہلو پر آتے ہیں خلیق صاحب نے بڑے غور و فکر کے ساتھ اس امر کی تشریح کی ہے کہ صوفیہ کردار کی فضیلت پر زور دیتے تھے اور خدمت خلق کو اس فضیلت کا معیار ٹھہراتے تھے۔ بنی نوعِ انسان کی خدمت کے بغیر خدا پر صوفی کا ایمان ناقص رہتا تھا۔ خلیق صاحب نے جس کمالِ حسن وخوبی کے ساتھ اس کی تشریح کی ہے اس میں میں کچھ اضافہ کرنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اخلاقی زندگی انقلابی جذبہ کے بغیر بالکل بے معنی ہے جو شخص میری طرح سماج کے صحیح اور غلط کے مروجہ معیار کا خیال رکھتے ہوئے بے کیف زندگی گذار سکتا ہے وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اخلاق کہتے کسے ہیں۔ اخلاقی زندگی مروج معیار کو تسلیم کر لینے سے عبارت نہیں ہے بلکہ سماجی نظام کے قیام کی خاطر مروج معیار کی مخالفت کا نام اخلاقی زندگی ہے۔ خدا خود ایک زبردست انقلابی ہے وہ خود کسی چیز کو اس کی حالت پر نہیں چھوڑتا۔ ایک مشہور ہندو مقولہ میں یہ خیال اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ "خدا سمندر کو ہمیشہ بلوتا رہتا ہے" شیخ نظام الدین اولیاؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ سماجی نظام چونکہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اس لئے انسان کا اخلاقی ضابطہ بھی اس کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے کہا تھا "میں سکون وقیام لے کر نہیں بلکہ تلوار لے کر آیا ہوں"۔ اس اعلان کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "میری تعلیم گھر گھر میں ایک کشاکش پیدا کردے گی اور روایتی عقائد کا باقی رہنا ناممکن ہو جائیگا"۔ خود رسول عربیؐ نے فرمایا تھا "مجھے اس لئے بھیجا گیا ہے کہ میں رسوم ورواج اور پرانی اقدار کو زیر وزبر کردوں"۔

ساتویں سے چودھویں صدی تک تصوف کی نوعیت ایک انقلابی ضابطہ کی

سی رہی۔ ابتدائی دور کے صوفیہ (مثلاً حبیب عجمیؒ اور ان کی جماعت) جن کو ڈاکٹر نکلسن نے Quietists کے نام سے یاد کیا ہے، سلطنت بنی امیہ کی محکوم اقوام سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطنت کے تمام دقیع عہدے عرب نژاد لوگوں کے پاس تھے چنانچہ صوفیہ کے مختلف سلسلوں کے بانیوں پر ظلم و تشدد کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ شہر در شہر مارے مارے پھرتے تھے لیکن نہ تو کوئی کامیاب قسم کے انقلاب کے آثار پیدا ہو پاتے تھے اور نہ صوفیہ کا ہی کو ارادہ تھا کہ وہ شخصی اغراض و مقاصد کی خاطر حصول قوت کے لئے جد و جہد کریں بلکہ شیخ جنیدؒ نے تو یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ زمانۂ وحشت گذر رہا ہے اور پھر بعد میں ایک ایسا نظریہ پیش کر دیا جس سے پانچ سو برس تک صوفیہ بالکل مطمئن و متفق رہے۔ نظریہ یہ تھا کہ نہ تو حکمراں طبقہ کی مخالفت کی جائے نہ موافقت۔ وہ علیحدہ اپنی ایک دنیا میں رہتے تھے۔ اس دور کے حالاتِ رسل و رسائل میں یہ ایک حد تک ناگزیر بھی تھا۔ چودھویں صدی میں جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں مفاہمت کے اس رویہ کو صوفیہ نے بالکل ترک کر دیا۔ شاہی جماعات کے خنک سایہ میں وقت کاٹنا ان کا مطمح نظر ہو گیا اور فقر و فاقہ کی زندگی عہدِ ماضی کی ایک داستان بن کر رہ گئی۔

لیکن یہاں ہمارا تعلق تصوف کے انحطاط و تنزل سے اس قدر نہیں ہے جتنا اس سے کہ صحت و عروج کے زمانہ میں تصوف نے دنیا کے افکار میں کیا اضافہ کیا۔ حالانکہ صوفیہ قرونِ وسطیٰ کے پیداوار اور رسل و رسائل کے سقیم ذرائع کی وجہ سے اپنے زمانہ کے معاشرہ کی کسی نئے انداز سے تشکیل تو نہ کر سکے لیکن ان کی تعلیمات میں ایسے جدید اور ترقی پسندانہ نظام العمل کا مل جانا یقینی ہے جس کی بنا صرف انھوں نے ہی رکھی ہے۔ مختصراً ذیل میں چند ضروری نکات کا حوالہ دینا کافی ہوگا۔

۱۔ صوفیۂ صافی سے توقع کی جاتی تھی کہ اگر مروج اخلاقی اور سماجی قوانین ان کے روحانی مطمح نظر سے ٹکرائیں تو وہ ان قوانین کو فوراً رد کر دیں۔ کچھ صوفیہ نے مروج روایت کو پاس

وضع کی خاطر رد بھی کر دیا اور پھر ملامتی کہلائے لیکن یہ امر اس چیز کی پردہ پوشی نہیں کر سکتا کہ یہ قرآنی ضابطہ ــــ "وہ ان لوگوں کے الزامات سے ذرا نہیں گھبراتے جن کا کام انھیں الزام دینا ہے" ــــ تمام صوفیہ کا مذہب بن چکا تھا۔

۲۔ شخصی ملکیت کے اصول کے تمام صوفیہ مخالف تھے۔ بڑے بڑے صوفیہ مثلاً شیخ نظام الدین اولیاؒ کسی کو اس وقت تک مرید ہی نہ کرتے تھے جب تک کہ وہ اپنی ہر چیز کو بیچ کر روپیہ غربا میں تقسیم نہ کر دے۔ حکومت کی ملازمت اختیار کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ نے اپنے ایک مرید سے خلافت نامہ صرف اس بنا پر واپس لے لیا تھا کہ اس نے اپنے کنبہ کی فاقہ زدگی کو دیکھ کر دور دور تک علاء الدین خلجی کے اس فرمان پر غور کیا تھا جس کی رو سے اُسے اودھ کا قاضی مقرر کر دیا گیا تھا۔ وجہ معاش کے لئے دو صورتیں اختیار کرنے کی اجازت تھی ایک تو ہمسایوں کی بے مانگی مدد یعنی فتوح اور دوسرے زمین احیا یعنی کاشت۔

۳۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ کے جماعت خانہ میں تمام لوگ ایک اشتراکی اصول پر زندگی بسر کرتے تھے کپڑے، تسبیح، جانماز، اکل و شرب کے چند برتن اور کتابوں کے علاوہ ملکیت کا تصور کسی طرح بھی روا نہ سمجھا جاتا تھا۔ شیخ کے رہنے کے لئے ایک کمرہ علیحدہ ہوتا تھا اور تمام غیر شادی شدہ مرید ایک کمرۂ عام میں رہتے تھے۔ کھانا سب ساتھ مل کر کھاتے تھے۔ امداد کے طور پر ہمسایہ اگر کچھ دے دیں تو فبہا ورنہ جماعت خانہ کے تمام لوگ محنت مزدوری کرتے تھے اور ہر شخص کے لئے یہ تقریباً ضروری تھا کہ وہ طعام مشترک کے لئے کچھ نہ کچھ مہیا کرے۔ جماعت خانہ میں زندگی بسر کرنے کے اصول مقرر تھے "سیرالاولیا" میں شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے جماعت خانہ کا بڑا اچھا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ جماعت خانہ کے لوگ دن بھر مشقت کرتے تھے۔ لکڑیاں اور کریلے تو جنگل سے لاتے تھے لیکن نمک کو جسے وہ اپنی مشقت سے حاصل نہ کر سکتے لوگوں کی طرف سے قبول کر لیا جاتا تھا۔

(۴۔ تمام صوفیہ عالم اور فاضل ہوتے تھے۔ صوفیہ کا عوام سے گہرا تعلق ہوتا تھا۔ کیونکہ تصوف زیر دستوں اور مظلوموں کا مسلک تھا۔ چیرمین ماؤسی تنگ کا کہنا ہے کہ "کیونزم ایک ایسا مسلک ہے جس کا منشا انسانیت کی خدمت ہے"۔ بڑے بڑے صوفیہ کو ماؤسی تنگ کے سے انقلابی مواقع تو میسر نہ تھے لیکن ان کا نظریۂ خدمت بالکل وہی تھا جس کا حوالہ ماؤسی تنگ نے دیا ہے۔ خلیق صاحب نے بھی جابجا اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔

۵۔ قرون وسطیٰ کے کل ادب میں عورت سے شدید نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ بغیر کسی وجہ کے عورتوں کو منحوس تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن صوفیہ نے عورتوں کے سلسلے میں ایک بالکل متضاد نظریہ اختیار کیا۔ وہ عورتوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ ایک جگہ کہتے ہیں" فرض کر لیجیے جنگل سے یک لخت ایک شیر برآمد ہو۔ اس وقت یہ کون پوچھے گا کہ شیر مادہ ہے یا نر"۔ عورت شیخ کے درجہ کو تو نہ پہنچ سکتی تھی۔ لیکن اور قسم کا جنسی امتیاز قطعاً نہ کیا جاتا تھا۔ عورتوں کا احترام کیا جاتا تھا۔ مشقت عورتوں کے لیے بھی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ ان کے لئے لازم تھا کہ وہ نماز پڑھیں اور روزہ رکھیں۔ مستند مصنفین اس پر متفق ہیں کہ متصوف عورتیں اپنے کام کو بڑی تن دہی سے انجام دیتی تھیں۔

۶۔ ہر جماعت خانہ علم و فضل کا ایک مرکز ہوتا تھا اور ساتھ ساتھ ایک ایسا مقام بھی جہاں مہمان صوفیہ قیام بھی کر سکیں۔ دستور یہ تھا کہ مہمان جماعت خانہ کے لوگوں سے ملنے نہیں جاتے تھے بلکہ جماعت خانہ کے ساکنین کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ مہمان سے جاکر ملیں۔ نشست و برخاست کے آداب ہر شخص پر سختی سے عاید کئے جاتے تھے، ہر جاندار کا احترام کیا جاتا تھا۔ جماعت خانہ میں ہر قسم کی گفتگو کی اجازت تھی لیکن مناظرہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ شیخ کی حیثیت ایک روحانی قسم کے آمر کی سی تھی۔ تمام معاملات میں اس کا فیصلہ قطعی سمجھا جاتا تھا لیکن اس سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مریدین کے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش آئیگا۔

۷۔ تصوف کے مبتدی کو جماعت خانہ میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی اس کی تفصیلی

تشریح تو خلیق صاحب کریں گے لیکن یہاں میں اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ سفر صوفیہ کی تعلیم کا نہایت ہی اہم جز تھا جس زمانہ میں منگولوں کے حملہ کی وجہ سے سفر ناممکن ہو گیا تھا اس وقت بھی صوفیہ لمبے لمبے سفر کرتے تھے، بے برگ و نوا طعام و قیام کے لئے انھیں لوگوں کے سلوک کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ تین چار مہینہ تک غیر ممالک کا سفر ان کے لئے معمولی بات تھی مختلف ممالک کے سماجی حالات کا براہ راست مطالعہ کرنے کی وجہ سے ان میں ایک کائناتی نقطۂ نظر پیدا ہو جاتا تھا۔ اور یہ کائناتی نقطۂ نظر اس زمانہ کے مفکرین میں صرف ان ہی کا طرۂ امتیاز تھا۔ سکندر لودی اور ہمایوں کے ہم عصر شیخ جمال الدین دہلوی اس کی بہترین مثال ہیں شیخ صاحب دہلی سے مصر گئے، ہرات گئے اور مولانا جامی کے ساتھ قیام کیا۔ واپس آئے تو لوگوں نے کہا کہ ہندوستان کے انتہائی جنوبی گوشہ میں آدم کے پیر کے نشانات کا سراغ ملا ہے۔ چنانچہ پھر عصا سنبھالی اور نکل کھڑے ہوئے۔

۸۔ صوفیہ انفرادی آزادی کے بھی زبردست علمبردار تھے وہ تین کا احترام کرتے تھے۔ خدا، رسول اور شیخ یا بالفاظ دیگر سلسلے کی روایات۔ ان تین کے علاوہ کسی کے سامنے جھکنا ایک صوفی کے مشرب سے خارج تھا۔ بعض صوفیہ تو اس حد تک انفرادیت پسند تھے کہ سلسلے کی روایات سے بھی احتیاج اکتاتا تھا۔ نہ ان کا کوئی مرشد ہوتا تھا اور نہ کوئی مرید۔ یہ لوگ اویسی کہلاتے تھے۔ مریدین کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حالات کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ ایک دن شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی حمید قلندر سے (جنھوں نے شیخ نصیر الدین چراغ کے ملفوظات کو قلمبند کیا ہے) کہنے لگے غنی کے مدارج بہت ہیں، لیکن اس کا آخری درجہ غنیں عن اللہ پھر کہنے لگے یہ آخری درجہ کیا ہے اس بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں۔

۹۔ صوفیہ طبعاً بڑے امن پسند ہوتے تھے۔ نظامی صاحب نے اس مسئلہ کو بالتفصیل بیان کیا ہے اس لئے اس کی تکرار میرے لئے بے کار ہے۔ بعد کی روایات نے صوفیہ کی ایک نئی قسم تخلیق کر لی ہے جو جلالی کہلاتی ہے۔ جلالی صوفیہ کا کام لوگوں کو زجر و توبیخ ادبہ

ملامت کرنا تھا۔ بہرکیف ان جلالی صوفیہ کا تصورِ حیات تصوف کے اصولوں کے منافی ہے، قرآن کہتا ہے" اے رسول ہم نے تجھے انسانیت کے لئے رحم دا تنا بنا کر بھیجا ہے" خود اللہ کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے" رحم وکرم اس کا مزاج ہے" چنانچہ ایک صحیح قسم کے صوفی کا فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لئے رحمت ثابت ہو اور وہ ان کی خدمت کرے نہ تو اس کا شیوہ ملامت ہونا چاہیئے اور نہ اس کا عمل تشدد۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ کا کہنا تھا کہ درویشوں کا راستہ عوام کے راستہ سے مختلف ہے، درویش دوست اور دشمن دونوں کا دوست ہوتا ہے

گذشتہ صفحات میں میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ ایک ایسا صحیح فلسفیانہ نقطۂ نظر ہے جو اپنے انقلابی افتاد ورجحان کے باعث انسان کے لئے ناگزیر ہے۔ دوم یہ کہ تصوف کی روایات ایک جیتے جاگتے ضابطہ کی حیثیت سے اس باب میں ہماری مدد کر سکتی ہیں کہ ہم ماضی اور حال کے سماجی مسائل کا صحیح انقلابی حل تلاش کرلیں اور یہ حل صوفیہ کے خدمتِ خلق کے شعار کے مطابق ہو۔

موجودہ نسل کا فرض ہے کہ وہ بہتر حالات کے تحت اس منصب کو اپنانے کی کوشش کرے جس میں صوفیہ ناکام رہے۔ صوفیہ نے کوشش کی وہ قرونِ وسطیٰ کے ناکارہ ضوابط کو فنا کردیں اور عوام کی مادی اور ثقافتی بہبود کے لئے بے لوث خدمت کے ذریعہ ایک نئے معاشرہ کی تشکیل کریں، یہ کام پورا نہ ہوسکا اور آج اس کا متقاضی ہے کہ موجودہ نسل اس کو تکمیل تک پہنچا دے۔

نظامی صاحب کی تیسری خصوصیت کے بارے میں شوپنہار کے الفاظ میں میں صرف اتنا کہوں گا کہ وہ تصوف کے لئے جیتے ہیں لیکن تصوف پر ان کا مدارِ زندگی نہیں ہے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ سے کمال وابستگی کی بنا پر وہ خود کو نظامی کہتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی مخصوص پیر یا مرشد نہیں ہے، البتہ ماضی کے تمام صوفیہ ان کے پیر کی حیثیت رکھتے ہیں، نہ ان کے کوئی مرید ہیں سوائے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے طلبا کے۔

یہ کتاب اس لئے پیش نہیں کی جا رہی ہے کہ یہ بازار میں کامیابی سے فروخت ہو سکے۔ اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ تاریخ اور تنقید کی روشنی میں ان مفکرین کی تعلیمات کو پیش کیا جائے اور باقی رکھا جائے جو گفتار و کردار، فکر و عمل میں حق پرستی اور سچائی کے علمبردار تھے۔

نظامی صاحب ہندوستانی تاریخ کے ہونہار نوجوان فاضلوں میں ہیں۔ میری دعا ہے کہ رب العالمین میرے اس نوجوان شریک کار کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے ان علمی کاموں کو پورا کر سکے جن کو اس نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے!

محمد حبیب
پروفیسر تاریخ و سیاسیات

بدر باغ
مسلم یونیورسٹی
علیگڑھ

مقدمہ

حرم جویاں درے رامی پرستند　　فقیہاں دفترے رامی پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد　　کہ یاراں دیگرے رامی پرستند

مسلمانوں کے فکر و عمل کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر تصوف سے زیادہ تنقید و تبصرہ کیا گیا ہو۔ ماخذ سے لے کر مقاصد اور اثرات تک اس کے ہر ہر پہلو پر انتہائی شد و مد کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ناقدین نے صرف اس کے سرچشموں ہی کو غیر اسلامی بتانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ملتِ اسلامیہ کے اکثر امراض کا باعث ہی اس کو قرار دیا ہے کشمکشِ حیات سے گریز، راہبانہ زندگی، اتباعِ شریعت سے انحراف، غیر اسلامی فکر و کردار ——— غرض طرح طرح کے الزامات تصوف اور صوفیہ کرام پر عائد کئے گئے ہیں۔ بعض ناقدین نے تو اپنے لہجے میں اس قدر سختی پیدا کر لی ہے کہ صدق و انصاف کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور انھوں نے تاریخی حقائق سے چشم پوشی کر کر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تصوف اسلام کے رُخِ روشن پر ایک بدنما داغ تھا ——— اگر یہ الزامات صرف "صوفیۂ خام" اور "مسخ شدہ تصوف" پر ہیں تو ان کی صداقت میں کلام نہیں، لیکن اگر بلا استثنا تصوف اور صوفیۂ کرام پر ہیں تو غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہیں۔ حقیقی تصوف مذہب کی روح، اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال ہے۔ اس کی اساس شریعت ہے اور

اس کا سرچشمہ قرآن وحدیث۔

(۱) تصوف کی مستند کتابوں مثلاً قوت القلوب، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب، عوارف المعارف، تذکرۃ الاولیاء، فوائد الفواد، خیر المجالس کے صفحے کے صفحے الٹ جائیے، صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عملاً کتاب وسنّت کی تلقین ملے گی، جو لوگ حافظ شیرازیؒ کے اس شعر میں ؎

بے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ ورسمِ منزلہا

اپنی بے راہ روی کا جواز تلاش کرتے ہیں، انھیں بوڑھے سعدیؒ کی یہ نصیحت ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی یہ تنبیہہ:-

"مشرب پیرا ...... حجت نمی شود	(مشرب پیرا) ...... حجت نہیں۔ دلیل
دلیل از کتاب وحدیث می باید[۱]	کتاب وحدیث سے ہونی چاہیے"

بھی سامنے رکھنی چاہیے۔ حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ اس منزل کی رسم وراہ کا اعلان اس طرح کرتے ہیں،

ایں راہ کسے یابد کہ کتاب بر دست	یہ راہ تو صرف وہی پاسکتا ہے جس
راست گرفتہ باشد وسنت مصطفےٰ	کے سیدھے ہاتھ میں قرآن پاک ہو
صلی اللہ علیہ وسلم بر دست چپ	اور بائیں ہاتھ میں سنت مصطفےٰ
و در روشنائی ایں دو شمع می رود	صلی اللہ علیہ وسلم، اور ان دونوں

[۱] اخبار الاخیار۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح ص ۸۱

تا نہ در مغاک شبہت اُفتد نہ در ظلمت بدعت" ؎۵۱ | چراغوں کی روشنی میں راستہ طے کرے تاکہ نہ تو شبہے کے گڑھوں میں گرے نہ بدعت کے اندھیرے میں پھنسے

شیخ ابوبکر طمستانیؒ فرماتے ہیں:

الطریق واضح والکتاب والسنۃ قائمۃ بین اظہرنا ؎۵۲ | راستہ کھلا ہوا ہے اور کتاب و سنت ہمارے سامنے موجود ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ روحانی ترقی کے لئے اتباعِ شریعت کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ اور "اتباعِ شریعت" کی ایسی جامع تعریف کرتے ہیں کہ اجماعِ اُمت کا اتباع بھی اس کا ایک لازمی جزو بن جاتا ہے۔

فرماتے ہیں :-

رکن اول از شریعت کتاب است چنانکہ گفت عز من قال فِيهِ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ | پہلا رکن شریعت میں کتاب اللہ ہے جیسا کہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے، قرآن مجید میں آیات محکمات ہیں کہ وہ اصل کتاب ہیں۔

و دیگر سنت است۔ چنانکہ گفت وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا | اور دوسرا رکن سنت ہے جیسا کہ فرمایا :- جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس پر عمل کرو۔ اور جس بات کو منع فرمایا ہے اس سے بچو۔

وسیوم اجماع امت۔ چناں کہ رسول گفت علیہ السلام | اور تیسرا رکن اجماع امت ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے،

؎۵۱ تذکرۃ الاولیا۔ ص ۸ ؎۵۲ رسالہ قشیریہ ص ۴۴

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ	میری اُمت گمراہی پر جمع نہیں
علیکم بالسواد الاعظم[۱]	ہوتی ہے اختیار کرو سواد اعظم کو۔

کہاں تو وہ کتاب وسنت سے بے توجہی کا التزام اور کہاں اتباعِ اجماعِ امت کی تلقین۔ حقائق سے بے اعتنائی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ مشائخ نے جگہ جگہ اپنے متعلقین اور مریدین کو ہدایت کی ہے کہ اگر کسی شخص کی روحانی عظمت کا اندازہ لگانا ہو تو اس کی زندگی کو شریعت وسنت کے آئینہ میں دیکھا جائے۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی ایک خط میں لکھتے ہیں:

اے برادر! در تفاوت مراتب فقرا اگر امروز خواہی کہ دریابی بحاب شریعت او نگاہ کن۔ کہ شریعت معیار است، عیار فقیر بر شریعت روشن می گردد"[۵۲]	اے برادر، اگر تم آج فقراء کے مراتب کا پتہ لگانا چاہو تو اُن کے اتباع شریعت پر نظر کرو۔ کہ شریعت معیار ہے۔ اسی کسوٹی پر فقیر کی حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔

شیخ حسین نوری کا مشورہ تھا۔

من رایتہ یدعی مع اللہ عزوجل حالۃ تخرجہ عن حد علم الشرع فلا تقربنہ ومن رایتہ یدعی حالۃ لا یدل علیھا دلیل ولا یشھد لھا حفظ ظاھر فاتھمہ علی دینہ[۵۳]	اگر ایک شخص کو دیکھو کہ خداوند تعالےٰ کے ساتھ ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جو اس کو علم شریعت کی حد سے نکال دیتی ہو تو اس کے قریب نہ جاؤ اور اگر ایک شخص کو دیکھو کہ وہ ایک ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں اور ظاہری احکام کی پابندی اس کی شہادت نہیں دیتی، تو اس کے دین پر تہمت لگاؤ۔

---

[۱] کشف المحجوب ص ۱۱ [۵۲] مکتوبات کلیمی ص ۲، مکتوب ۹۵ [۵۳] تلبیس ابلیس ص ۱۷۸، ۱۷۹

خواجہ فریدالدین عطارؒ فرماتے ہیں ؎

جاوید در متابعت مصطفیٰ گزیں
تا نور شرع او شود بر تو مقتدا

حقیقت یہ ہے کہ صوفیۂ صافی کا ہمیشہ عقیدہ یہ رہا ہے کہ جس عمل کو کتاب و سنت رد کردیں وہ "زندقہ" ہے۔ جس شخص کی زندگی، شریعت و سنت کے مطابق نہیں اسے صوفیہ کے طبقہ میں شمار ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ چہ جائے کہ اس کے عمل کو تمام صوفیہ کا عمل تصور کرکر، تصوف پر تنقید کی جائے۔

(۲) پھر کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ تصوف جہلا کا مسلک تھا۔ اور صوفیۂ کرام علمِ دین سے نابلد تھے۔ مشائخ کے حالات کا سرسری مطالعہ بھی اس الزام کی نوعیت دریافت کرنے کے لئے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز پر ان بزرگوں نے سب سے زیادہ زور دیا وہ علم ہی تھا۔ حضرت بابا فریدگنج شکرؒ فرمایا کرتے تھے کہ جاہل پیر مسخرِ شیطان ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ حقیقت اور سراب میں امتیاز کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ وہ دل کی بیماریوں کی صحیح تشخیص اور مناسب علاج نہیں کرسکتا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں:

"پیر آنچناں باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم باشد۔ وچوں ایں چنیں باشد، اوخود ہیچ نامشروع نہ فرماید" ؎۱	پیر ایسا ہونا چاہیئے کہ احکامِ شریعت طریقت اور حقیقت کا علم رکھتا ہو، اگر ایسا ہوگا تو خود کسی نامشروع چیز کے لئے نہ کہے گا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ اصول تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو جو عالم نہ ہو، خلافت عطا نہیں

؎۱ فوائدالفواد ۔ ص ۱۴۷

فرماتے تھے [۱] شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن اور حدیث کے علم کو ایک پیرومرشد کے لئے لازمی قرار دیا ہے [۲] حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رح کا قول ہے:

اجتنب صحبة ثلاثة صنافٍ	تین قسم کے آدمیوں کی صحبت سے
من الناس العلماء الغافلین	بچنا چاہیئے۔ ایک غافل عالم سے
والفقراء المداهنین	اور دوسرے مکار فقیر سے، اور
والمتصوفة الجاهلین [۳]	تیسرے جاہل صوفی سے۔

علامہ ابن جوزی رح، تصوف کے حامیوں میں نہیں تھے، لیکن اُن کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا ہے۔

وما كان المتقدمون في	قدمائے صوفیہ قرآن، فقہ
التصوف الا رؤسا في	حدیث اور تفسیر کے امام
القرآن والفقه والحدیث	تھے۔
والتفسیر" [۴]	

(۳) پھر صوفیۂ کرام پر ایک عام الزام رہبانیت کا ہے۔ لیکن الزام لگانے والوں نے کبھی یہ غور نہیں کیا کہ جس چیز کو صوفیہ نے ترک کیا وہ دنیا نہ تھی۔ دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال تھا۔ [۵] وہ کہتے تھے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی سب نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اس کائنات کی ایک ایک چیز سے مستفید ہو۔ لیکن اس طرح کہ دُنیا کی محبت اُس کے

---

[۱] سیر الاولیاء۔ ص ۲۸۸ [۲] قول الجمیل۔ ص ۱۴ [۳] کشف المحجوب۔ ص ۱۳۔ [۴] تلبیس ابلیس ص ۱۶۴ [۵] مولانا ابو الکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اسی حقیقت کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے "دنیا نہیں، دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال روحانی سعادت کے خلاف ہے" ج ۲ ص ۷

دل کو آلودہ نہ کرنے پائے [۱] اور حب جان دینے اور اس کی لذتوں سے دست بردار ہونے کی دعوت دی جائے تو وہ لبیک کہتے ہوئے ، اس طرح دوڑے گویا بھوکے کو غذا کی اور پیاسے کو پانی کی پکار سنائی دی - اس کی زندگی کا مرکز و محور رضائے خداوندی بن جائے اور اس کے قلب کی بے چین دھڑکنیں صبح و شام یہ ہی پکارتی رہیں ؎

مقصود من بندہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم ز برائے تو زیم [۲]

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رح کے یہ الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں - فرماتے ہیں :

"ترک دنیا آں نیست کہ کسے خود را برہنہ کند مثلاً لنگوتہ بہ بندد و بنشیند ترک دنیا آں است کہ لباس بپوشد و طعام بخورد و آنچہ می رسد روا بدارد و بجمع او میل نکند و خاطر را متعلق چیزے ندارد ، ترک دنیا است [۳]"	ترک دنیا کے یہ معنی نہیں کہ کوئی اپنے آپ کو ننگا کرے ، اور لنگوٹہ باندھ کر بیٹھ جائے . بلکہ ترک دنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے اور کھائے بھی اور حلال کی جو چیز پہنچے اسے روا رکھے لیکن اس کے جمع کرنے کی طرف رغبت نہ کرے اور دل کو اس سے نہ لگائے - ترک دنیا یہ ہے

[۱] کسی صوفی شاعر کا کہنا ہے کہ انسان دنیا میں اس طرح سے رہے ، جیسے مرغابی پانی میں کہ جب پانی سے باہر نکلتی ہے تو پر خشک ہوتے ہیں

بگیر رسم تعلق دلا ز مرغابی ۔۔۔ کہ او ز آب چو برخاست خشک پر برخاست

[۲] بابا فرید گنج شکر رح تنہائی میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے - ملاحظہ ہو ، فوائد الفواد ، خیر المجالس وغیرہ

[۳] فوائد الفواد - ص ۹

عارف رومیؒ نے اس خیال کی ترجمانی اس طرح کی ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

شیخ ہجویریؒ ایک بزرگ کا قول نقل کرتے ہیں کہ فرمایا کرتے تھے :

لیس الفقیر من خلی من الزاد	فقیر وہ نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ متاع
انما الفقیر من خلا من المراد [۵۱]	اور توشہ سے خالی ہووے ، بلکہ فقیر
	وہ ہے جس کی طبیعت مراد سے خالی ہووے

اگر یہ "رہبانیت" ہے تو پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ اسلام کی تعلیم کیا ہے ؟[۵۱]

(۴) شاید حقایق سے اس قدر بے اعتنائی کا ثبوت کبھی نہیں دیا گیا جتنا یہ کہہ کر کہ صوفیہ نے ملت کے قوائے عمل کو مضمحل کر دیا۔ یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے ملت کے عروقِ مردہ میں ہمیشہ نئی روح پھونکی ہے اور زوال و انحطاط کے زمانہ میں تجدید و احیاء کے راستے تلاش کئے ہیں ، اور یہ ہی ان کے کارناموں کا ایک ایسا گوشہ ہے جس کا اب تک تعصب اور تنگ نظری سے الگ ہو کر جائزہ نہیں لیا گیا۔ تاریخ کے طلبار نے شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کی داستانوں میں اپنے آپ کو کچھ اس طرح گم کر دیا ہے کہ اُن کے نزدیک تاریخ صرف دربار اور میدانِ جنگ سے ہی عبارت ہو کر رہ گئی ہے۔ گویا سنائیؒ کا یہ دعوت نامہ اُن کے کانوں تک پہنچا ہی نہیں ؎

اے کہ شنیدی صفتِ روم و چین
خیز و بیا مُلکِ سنائی بہ بیں

---

[۵۱] کشف المحجوب (اردو ترجمہ) ص ۵۶

مذہبی تذکرہ نگاروں نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس طرح کہ ان بزرگوں کے اصلی خط وخال ہی چھپ گئے ۔ اور ماحول کے صحیح پس منظر کے ساتھ نہ اُن کو دیکھا جاسکا اور نہ انسانیت کی سطح پر ان کی عظمت و بلندی کا اندازہ لگایا جاسکا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بزرگوں کی سوانح حیات ، کرامات کی چند بے معنی داستانوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ، وقت کا تقاضا ہے کہ اِن بزرگوں کے حالات بنی نوع انسان اور ملت کی ضروریات کے آئینہ میں دیکھے جائیں ۔ تاکہ اُن کے صحیح خط وخال نمایاں ہوسکیں ۔

یورپ کے مستشرق جب اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال کبھی اُن کے دینی نظام کو تباہ نہ کرسکا ۔ بلکہ بقول پروفیسر ہٹی (HITTI) اکثر ایسا ہوا کہ "سیاسی اسلام" کے تاریک ترین لمحات میں "مذہبی اسلام" نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں[1] ہولینڈ کے ایک فاضل لوکے گارد (FREDE LOKKEGAARD) نے دبے انداز میں اس بات پر استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ گو اسلام کا سیاسی زوال تو یارہا ہوا لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا[2]

کیا ان اسباب کا تجزیہ ممکن نہیں جنھوں نے مسلمانوں کی دینی زندگی کو سیاسی زوال کے خطرناک اثرات سے بچایا اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کے فکروعمل میں تبدیلیاں پیدا کیں ۔ انگلستان کے ایک مشہور اور ذی علم مستشرق پروفیسر ایچ ۔ اے ۔ آر گیب (H. A. R. GIBB) نے ایک مرتبہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی مجلس کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :-

---

[1] HISTORY OF THE ARABS P 475

[2] ISLAMIC TAXATION IN THE CLASSIC PERIOD, (COPENHAGEN 1950)

"تاریخ اسلام میں بارہا ایسے موقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا ہے لیکن بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیہ کا اندازِ فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا تھا اور اس کو اتنی قوت اور توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔" [۵]

پروفیسر گب کی رائے سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ اسلامی تاریخ میں صوفیۂ کرام کے کارنامے یقیناً اسی نظر سے خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ مسلمانوں کی ملی زندگی میں جب کوئی مشکل مقام آیا ہے تو ان ہی بزرگوں نے بصیرت اور حکمت کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کیا ہے، ان کا ہاتھ ملت کی نبض پر اور اُن کا دماغ تجدید و احیاء کی تدبیریں سوچنے میں مصروف رہتا تھا۔ اسلامی سوسائٹی کا صحیح مزاج قائم رکھنے کے لئے انھوں نے بڑی پُرخلوص جدوجہد کی تھی۔ حقیقت میں اس حکم خداوندی کی تعمیل کہ

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ	اور تم میں ایک اُمت ہونا چاہیے
اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	جو خیر کی طرف بلائے اور ممنوعات
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔	سے روکے۔

اُن ہی کے ذریعے ہوئی۔ اسلامی تاریخ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اِن بزرگوں نے کس طرح "يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ" اور "يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" کی خدمات انجام دی ہیں۔ جب مسلمانوں کی سیاسی ترقی کا دور آیا اور عسکری کامیابیوں نے آنکھوں کو خیرہ کردیا، تو یہ بزرگ مادیت کے سیلاب کو روکنے میں لگ گئے۔ جب سیاسی نظام درہم برہم ہوا، تو "ذہنی انتشار" کے خلاف لڑنے لگے۔ جب قوم کا اخلاقی مزاج بگڑتا ہوا پایا تو اُنھوں نے اپنی تمام ذہنی اور عملی صلاحیتیں صحت مند عناصر کو اُبھارنے میں صرف

[۵] ISDAMIC CULTURE 1942, P. 265

کردیں۔ میر خورد رح نے سچ کہا ہے:

وکانوالدین اللہ حصناً مؤیداً (وہ خدا کے دین اور پیغمبر
وسنۃ من سمیتہ خیر مرسل[ا] کی سنت کے لئے مضبوط قلعے
تھے۔)[ا]

(۵) کوئی انسانی تحریک، خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، جب افراط و تفریط، عمل ورد عمل کا بازیچہ بنتی ہے تو اس کی شکل مسخ ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ فقہ اسلامی کی تدوین نے مسلمانوں کی دینی اور سماجی زندگی کو سنوارنے میں عظیم الشان کام کیا لیکن جب اس کو حیلہ بازیوں اور مکاریوں کا ذریعہ بنایا گیا، تو مسلمانوں کی عملی زندگی بالکل بے روح ہو کر رہ گئی۔ متکلمین نے اسلام کو یونانی فلسفہ کی زد سے بچانے میں بڑی خدمت کی لیکن جب علم کلام نے شبہات و شکوک پیدا کرنا اپنا مقصد بنا لیا تو مسلمانوں کی ذہنی زندگی میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا۔ یہی حال تصوف کا بھی ہوا۔ جب باطنی زندگی کو ظاہری زندگی سے الگ کیا گیا تو شریعت و طریقت کی تفریق پیدا ہو گئی۔ دنیا پرستی سے گریز کو رہبانیت کی شکل دے دی گئی۔ مجاز پرستی، پیر پرستی، قبر پرستی، نغمہ و سرود کو روحانی ترقی کا لازمی جزو قرار دے لیا گیا——— بے شک یہ سب گمراہیاں تصوف میں پیدا ہوئیں۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ صوفیۂ صافی نے ہمیشہ اِن گمراہیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اور اِن فاسد عناصر کو خارج کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رح، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح، حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی رح وغیرہم جنھوں نے صوفیۂ خام کی صدہا برائیوں کی نشان دہی کی ہے، خود صوفی تھے ! حقیقی تصوف

[ا] سیر الاولیا۔

اور مسخ شدہ تصوف میں امتیاز کئے بغیر اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کا صحیح تجزیہ ممکن نہیں۔

(۶) اس کتاب میں چشتیہ سلسلہ کے کچھ مشایخ کے حالات، ماحول کے پس منظر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سب مشایخ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان میں یاس و قنوطیت، انتشار و ابتری کا دور دورہ تھا۔ تمام وہ خصائل جو ایک سیاسی اور سماجی نظام کو قائم رکھنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں، فنا ہو چکے تھے۔ اور ایشیائی تاریخ کا وہ سلسلہ پورا ہو رہا تھا جس کی طرف 'زوال و انحطاط روما' کے مشہور مصنف ایڈورڈ گبن نے ان بلیغ الفاظ میں اشارہ کیا ہے: "ایشیائی خاندانوں کی تاریخ شجاعت، عظمت، تفرقہ، اخلاقی پستی اور زوال کا ایک نہ ختم ہونے والا چکر ہے"

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی سیاسی بصیرت اور مستعدی سے ایک زبردست طوفان کو بڑی کامیابی کے ساتھ روکا تھا لیکن جوں ہی اس نے آنکھیں بند کیں، زوال و تخریب کی تمام قوتیں ابھر آئیں۔ عیش و عشرت میں غرق، ہنگامہائے نائو نوش میں مدہوش فرماں روا ان تخریبی قوتوں کا بروقت اور صحیح جائزہ نہ لے سکے سیاسی بصیرت کے فقدان۔ فرائض کے عدم احساس اور آپس کے تفرقوں نے وہ کوششیں بھی نہ کرنے دیں جو یہ کمزور ہاتھ اور ضعیف اعضاء ان حالات میں کر سکتے تھے۔ جب "این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ" کی صدائیں بلند ہوئیں تو فطرت کا اٹل قانون مکافات متحرک ہو گیا۔ ہر طرف سے طوفانی عناصر نے گھیر لیا۔ شمالی مغربی علاقوں میں سکھوں کی آتشیں قوت نے زور پکڑا، جنوبی ہند سے مرہٹوں کا سیلاب کف بر دہان امڈنے لگا۔ خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے بیرونی طاقتوں نے اپنے پنجے جمانے

شروع کیے۔ مرکزی حکومت میں ان طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کی قوت سب عیش و عشرت کی نذر ہو چکی تھی۔ ان نئی طاقتوں میں کوئی بھی طاقت ایک باضابطہ کل ہند نظام چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ملکی اقتدار ہندوستان میں مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گیا۔

ابتلاء و مصائب، انحطاط و تنزل کے اس دور میں اللہ کے کچھ بندوں نے حکومت سے قطع نظر کرکے، اسلامی سوسائٹی کو انتشار سے بچانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ غیر ملکی حکومت کا طوفان پوری استعمارانہ قوت کے ساتھ آیا، لیکن مسلمانوں کی دینی اور ملی زندگی کو صدمہ نہ پہنچا سکا۔ سلطنت کے نکل جانے کا ان بزرگوں پر اثر ہوا، لیکن اتنا نہیں کہ وہ ناامید ہو جاتے۔ جس چیز کی ان کو فکر تھی وہ یہ تھی کہ کہیں اس سلطنت کے ساتھ اسلامی روح، اسلامی فکر، اسلامی کردار اور اسلامی سرمایۂ زندگی تباہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ ان بزرگوں نے اپنی کوششوں کا رُخ اسلامی سوسائٹی کی درستی کی جانب کر دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی بالخصوص اور ہندوستانیوں کی بالعموم اِصلاح اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کرنے کے لئے جو کوششیں کیں وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ہندوستان کا مورخ جب اُن اسباب کی تلاش کرے گا جن کے باعث سلطنت کے زوال کے بعد بھی ہندوستان میں اسلامی سوسائٹی کا شیرازہ منتشر نہیں ہوا، تو اس کو صوفیۂ کرام اور بزرگانِ عظام کی پُر خلوص جد و جہد کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

(۷) یہ جلد ایک سلسلے کی کڑی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ چشتیہ سلسلہ کی تاریخ پانچ جلدوں میں اس طرح پر مرتب کی جائے:

جلد اول۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے لے کر حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رحؒ تک۔

جلد دوم۔ حضرت خواجہ کمال الدین علامہ رح سے لے کر حضرت یحییٰ مدنی رح تک۔ نیز دکن، بنگال، مالوہ اور گجرات میں چشتیہ سلسلہ کی خانقاہوں اور مشائخ کے تفصیلی حالات۔

جلد سوم۔ (صابریہ سلسلہ) حضرت علی احمد صابر رح سے لے کر حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی رح تک

جلد چہارم۔ (نظامیہ سلسلہ) حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی رح سے لے کر حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی رح تک

جلد پنجم۔ (صابریہ سلسلہ) حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی رح سے لے کر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح اور مولانا اشرف علی تھانوی رح تک

اس وقت جو جلد پیش کی جا رہی ہے وہ اس سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے۔ یہ آج سے تقریباً سات سال قبل تیار ہو گئی تھی۔ نامساعد حالات اس کی اشاعت میں مانع رہے۔ اس دوران میں اور جلدوں کے لئے بھی مواد فراہم ہو گیا۔ تاہم ابھی پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس جلد کی تکمیل کا موقع پہلے ملے گا۔ توفیق الٰہی نے ساتھ دیا تو انشا اللہ یہ جلدیں جلد مکمل ہو جائیں گی۔ اس وقت چونکہ چوتھی جلد سب سے پہلے شائع ہو رہی ہے۔ اس لئے بہت سے ایسے مباحث جو پہلی جلد میں آنے چاہئیں (مثلاً تصوف اسلام، چشتیہ سلسلہ کا نشو و نما۔ مشائخ چشت کا انداز تبلیغ و اشاعت) یہاں بھی مختصراً درج کرنے ضروری سمجھے گئے۔

اس کتاب میں جو خامیاں رہ گئی ہیں اُن کا مجھے پورے طور سے احساس ہے۔ اور جب اُن کی طرف میری نظر جاتی ہے تو حضرت شیخ بدرالدین اسحاق رح کے یہ اشعار جو انھوں نے تصریف بدری کے خاتمہ پر لکھے تھے، بے اختیار زبانِ قلم پر آ جاتے ہیں ؎

إِنِّیْ بَسَطْتُ یَدَیَّ إِلَیْكَ إِلٰهِیْ | وَتَسِیْلُ سَیْلُ الدَّمْعِ مِنْ مَاقِیْ
فَارْحَمْ بُکَائِیْ وَاعْفُ عَمَّا قَدْ حَوٰی | مِنْ غَفْلَةٍ فِیْ هٰذِهِ الْأَوْرَاقِ

نفیس منزل
علی گڈھ
۱۹ اپریل سنہ ۵۲ء

خلیق احمد نظامی

(۱) تصوّف اسلام پر ایک نظر

(ماخذ۔ نشوونما۔ اثرات)

۱۔ لفظ "صوفی" کی تحقیق لفظ "صوفی" کے مادہ اشتقاق پر علماء میں بڑا اختلاف رہا ہے۔ حضرت شیخ علی ہجویری ؒ فرماتے ہیں:

مرداں اندر تحقیق ایں اسم	لوگوں نے اس اسم کی تحقیق کے بارے
بسیار سخن گفتہ اند و کتب	میں بہت باتیں کہی ہیں، اور کتابیں
ساختہ" ۱	تصنیف کی ہیں۔

عام طور پر کتب تصوّف میں مندرجہ ذیل مادہ اشتقاق سے بحث کی گئی ہے۔

(۱) **صَفا** (بمعنی پاکیزگی و صفائی قلب)

(۲) **اہل صُفّہ** (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کچھ بزرگ تھے جو مسجد نبوی میں ہر وقت عبادت کرتے رہتے تھے۔)

(۳) **صَف** (وہ لوگ جو ہمیشہ صف اول میں نماز ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

---

۱ کشف المحجوب۔ ص ۲۲ (مطبوعہ لاہور)

(۴) **صوفہ** (ایک قدیم قبیلہ کا نام ہے جو کعبہ کا خادم تھا)
(۵) **صفوت القفا** (گدی پر جو بال ہوتے ہیں اُن کو کہتے ہیں)
(۶) **ثیوصوفیا** (یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں حکمت الٰہی)
(۷) **صوفانہ** (ایک قسم کا پودا ہوتا ہے۔)
(۸) **صُوف** (بمعنی پشمینہ یا اون)

ہر مکتب خیال کے لوگوں نے اپنی رائے کی تائید میں طویل بحثیں کی ہیں، لیکن کسی نے بقول شیخ ہجویری رح "مقتضائے لغت" کی طرف توجہ نہیں کی۔ عربی لُغت کی رو سے صَفا سے جو لفظ بنے گا وہ "صفوی" ہوگا نہ کہ صوفی، صُفّہ سے صُفّی بنے گا نہ کہ صوفی۔ اسی طرح صَف سے "صفی" بن سکتا ہے، صوفی نہیں، اگر صوفی کی نسبت صوفانہ کی طرف ہوتی تو یہ لفظ "صوفانی" ہوتا، نہ کہ صوفی۔

ابوریحان البیرونی کا خیال ہے کہ لفظ صوفی کا مادۂ اشتقاق ایک یونانی کلمہ ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

السوفیہ ہم الحکماء فان سوف بالیونانیۃ الحکمۃ وبہا یسمی الفیلسوف فیلاسوفا ای محب الحکمۃ ولما ذہب فی الاسلام قوم الی قریب من رایہم سموا باسمہم ولم یعرف اللقب [۱]	صوفی بمعنی فلاسفر ہے۔ کیونکہ یونانی میں لفظ سوف بمعنی فلسفہ ہے، یہی وجہ ہے کہ یونانی میں فیلسوف کو فیلاسوفا کہتے ہیں یعنی فلسفہ کا دلدادہ چونکہ اسلام میں ایک جماعت ایسی تھی جو ان کے مسلک کے قریب قریب تھی اسی بنار پر اس جماعت کا نام بھی صوفی پڑ گیا۔

[۱] کتاب الہند۔ ص ۱۶

مشہور مستشرق نالڈکی (NOLDEKE) نے اس خیال کی نہایت پر زور تردید کی ہے اور تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یونانی الفاظ کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا جو عام قاعدہ تھا اس کے لحاظ سے لفظ صوفی کا مادہ اشتقاق کسی طرح بھی یونانی کلمہ نہیں ہو سکتا[۱]

جمہور صوفیہ کا خیال یہ ہے کہ لفظ صوفی، صوف سے مشتق ہے۔ چنانچہ شیخ ابونصر سراج رح فرماتے ہیں :-

الصوفیہ نسبوا الی ظاهر اللبسة، لان لبسة الصوف دأب الانبیاء وشعار الاولیاء والاصفیاء[۲]	صوفیہ اپنے ظاہری لباس کی وجہ سے صوفی کہلائے، یہ اس لئے کہ بھیڑوں کی اون کے کپڑے پہننا، انبیاء، اولیا برگزیدہ ہستیوں کا نشان خاص ہے۔

پروفیسر براؤن (E. BROWNE) نے لکھا ہے کہ اس خیال کی تائید کہ صوفی کی نسبت صوف کی طرف ہے۔ اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایران میں صوفی کو پشمینہ پوش کہا جاتا ہے[۳]

اسی سلسلہ میں ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صوفی کا لفظ کب اور کس کے لئے استعمال ہوا ؟ —— امام قشیری رح اپنے رسالے میں لکھتے ہیں :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کے سوا برگزیدہ مسلمانوں کا اور کوئی لقب قرار نہیں دیا گیا۔ کیونکہ شرف صحبت سے بڑھ کر اور کوئی شرف نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر جن لوگوں نے صحابہ کی صحبت پائی، ان کو تابعین کہا گیا، اس کے بعد

---

[۱] Z. D. M. G, X J VIII, P -45 [۲] کتاب اللمع ص ۲۱

[۳] LITERARY HISTORY OF PERSIA VOL I P417

لوگ تبع تابعین کے لقب سے پکارے گئے۔ پھر لوگوں کے مختلف درجے ہوتے گئے۔ اس لئے جن بزرگوں کی توجہ دین کی طرف زیادہ ہوئی اُن کو زاہد وعابد کے لقب سے پکارا گیا لیکن جب بدعات کا ظہور ہوا اور مختلف فرقے پیدا ہوگئے تو ہر فریق نے یہ دعویٰ کیا کہ ان میں زہاد پائے جاتے ہیں اس لئے خواص اہلِ سُنت، تصوف کے نام سے ممتاز ہوئے اور دوسری صدی سے پہلے ان بزرگوں نے اس نام سے شہرت پائی۔"[۵۱]

مولانا جامیؒ کی تحقیقات یہ ہے کہ سب سے پہلے جو بزرگ صوفی کے لقب سے مشہور ہوئے وہ شیخ ابو ہاشم کوفیؒ (المتوفی ۱۵۰ھ) تھے۔ چنانچہ نفحات الانس میں لکھتے ہیں:

"اول کسیکہ ویرا صوفی خواندہ اند وے بود، پیش از وے کسے را باین نام نخواندہ بودند" [۵۲]

ابو محمد جعفر بن احمد بن حسین السراج القاری نے امیر معاویہ کا ایک خط نقل کیا ہے جو انھوں نے ابن ام الحکم، گورنر مدینہ کے نام لکھا تھا اس میں ایک شعر تھا:

قد کنتَ تشبہُ صوفیاً لہٗ کتبٌ
من الفرائض او آیات فرقان [۵۳]

(تو مشابہ تھا ایسے صوفی سے جس کے پاس کتابیں ہوں جن میں فرائض اور آیات قرآن مذکور ہوں)

اس روایت کو اگر صحیح مان لیا جائے [۵۴] تو صوفی کا لفظ پہلی صدی ہجری میں بھی استعمال ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

---

۵۱ رسالہ قشیریہ۔ ص ۹ (مطبوعہ مصر)؛ ۵۲ نفحات الانس ص ۲۲، مطبوعہ بمبئی)

۵۳ مصارع العشاق۔ ص ۲۲۴ (مطبوعہ الجوائب قسطنطنیہ

۵۴ یہ روایت سند متصل کے طور پر ابو مخنف سے ہشام بن عروہ تک جاتی ہے۔

۲۔ تصوف کے ماخذ | تصوف کے ماخذ کیا ہیں؟ اس کا منبع و مخرج کہاں تلاش کرنا چاہیے؟ ———— علمائے اسلام اور مستشرقین نے اس مسئلہ میں مختلف آرا کا اظہار کیا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تصوف، یونانی فلسفہ کے زیر اثر پیدا ہوا۔ پروفیسر نکلسن (NICHOLSON) نے اس خیال کو بڑے وثوق کے ساتھ اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے۔ اور صوفیۂ کرام اور حکمائے یونان کے خیالات میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔ ڈوزی (DOZY)، فان کریمر (VON KREMER) وغیرہ کی رائے ہے کہ تصوف، فلسفہ ویدانت سے ماخوذ ہے۔ پھر کچھ لوگ بدھ مذہب کو اس کا منبع قرار دیتے ہیں[۵]۔ جن لوگوں کا یہ اصرار ہے کہ تصوف کا مخرج غیر اسلامی ہی قرار دیا جائے۔ انھیں مندرجہ ذیل پہلوؤں کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔

(۱) اگر دو تحریکوں کے بنیادی اصولوں میں یکسانیت ہو، تو محض اس یکسانیت کی بنا پر، ایک تحریک کو دوسری تحریک سے ماخوذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ دونوں تحریکیں ایک ہی قسم کے اسباب اور ایک ہی قسم کے حالاتِ گرد و پیش کا نتیجہ ہوں۔

(۲) تصوف کے خیالات کا اظہار، ہر ملک، ہر زبان، اور ہر مذہب میں ہوا ہے، ظاہر سے ہٹ کر باطن کی طرف متوجہ ہونا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ ولبر فورس کلارک (WILBERFORCE CLARKE) اور لوئی میسی نون (LOUIS MASSIGNON)

---

[۵] ایک زمانے میں ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کا بھی یہی خیال تھا۔ چنانچہ انھوں نے وکیل (امرتسر) میں ۱۹۱۶ء میں کچھ مضامین لکھے جن میں اس حدیث نبوی سے کہ "سب زمانوں سے بہتر زمانہ میرا ہے، پھر تابعین کا، پھر تبع تابعین کا، پھر اس کے بعد ایک ایسی قوم آئے گی جو گواہی دینے میں عجلت کریں گے، حالانکہ اُن سے کوئی شہادت طلب نہیں کی گئی وہ امانت میں خیانت کریں گے۔ ایفائے عہد نہ کریں گے اور اُن کے درمیان سِمَن کا ظہور ہوگا" (بخاری و مسلم) استدلال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ سِمَن سے مراد بدھ مذہب کے راہب ہیں (وکیل امرتسر ۲۵ نومبر ۱۹۱۶ء۔ ص ۵)

کا خیال ہے کہ ہر قوم ایک خاص وقت میں تصوف کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ خیالات دوسروں ہی سے اخذ کئے جائیں۔ حالات خود انسانی فطرت کو باطنی اصلاح و تربیت کی راہیں تلاش کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

(۳) مستشرقین اور عیسائی مصنفین کا ایک خاص رویہ یہ ہے کہ وہ اسلام میں بہت سے قدیم مذاہب کی تعلیمات اور اثرات تلاش کرنے میں بڑی جد و جہد کرتے ہیں اور پھر نہایت فاتحانہ انداز میں اپنی تحقیقات، کا 'انکشاف' کرتے ہیں۔۔۔ یہ کوشش، ایک بنیادی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر کی جاتی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے تھے۔ انھوں نے وہی چیز پیش کی جو اُن سے پہلے انبیاء کرام پیش کرتے چلے آئے تھے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ط

(اے محمدؐ تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔

سورۂ بقر میں ہے:

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ

(اے مسلمانو) کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہماری طرف اُترا اور جو ابراہیم پر اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر، یعقوب پر اور اُن کی اولاد پر اُترا، اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا (سب پر) ایمان لائے۔ ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے

بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ج

فرماں بردار ہیں۔ تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انھوں نے سیدھی راہ پائی، اور اگر جو اس سے باز رہیں وہ محض ضد پر ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی قوموں کے دینی سرمایہ سے بے تعلقی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ یہ بتایا کہ وحیِ الٰہی کا جو سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا وہ اُن پر ختم ہو گیا۔ ہر قوم کی شریعت میں سچائیاں تھیں ماننے والوں نے اُن کو مسخ کر دیا۔ بہر حال اسلام میں اگر کوئی چیز ایسی پائی جائے جو پہلے کسی قوم کے دینی سرمایہ کا خاص جزو رہی ہو تو اس کو "غیر اسلامی" کہنا صحیح نہیں

(۴) بعض لوگوں سے ایک شدید غلطی یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے تصوف کے ماخذ کا تعین، بعد کے اثرات کی بنا پر کیا ہے۔ جب کوئی انسانی تحریک اپنے مولد سے نکل کر دوسرے علاقوں میں پھیلتی ہے تو وہاں کی ذہنی آب وہوا، مخصوص اقتصادی اور جغرافیائی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ہر تحریک نئے ملک اور نئے ماحول میں پہنچ کر اس جگہ کے ہم آہنگ عناصر کو ساتھ لینے کی کوشش کرتی ہے۔ تاکہ اس کو تقویت حاصل ہو اور نشو و نما کا صحیح موقع ملے۔ جب تصوف کی تحریک وسطِ ایشیا میں پہنچی تو ناگزیر تھا کہ بدھ مذہب کے کچھ اثرات قبول نہ کئے جائیں۔ حضرت شیخ علی ہجویری رحؒ نے کچھ صوفیوں کے گروہوں کا حال لکھا ہے۔ غور سے پڑھیے تو معلوم ہو گا کہ بدھ مذہب کے کتنے اثرات اس طبقہ نے قبول کر لئے تھے۔ جب ہندوستان میں یہ تحریک پہنچی تو ناممکن تھا کہ یہاں کے اُن قدیم مذہبی اصولوں کو جذب نہ کرے جو اس کے بنیادی اصولوں سے نہ ٹکراتے ہوں۔ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری شطاری رحؒ نے بحر الحیات اور دارا شکوہ نے مجمع البحرین میں اسلامی تصوف اور

مذہب و فلسفہ کا اسی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کا خیال ہے کہ مختلف روحانی سلسلوں نے اذکار و اشغال کے جو طریقے اختیار کئے وہ مخصوص علاقوں کے بسنے والے لوگوں کے طبعی رجحانات کو سامنے رکھ کر کئے گئے تھے[1] ہو سکتا ہے کہ مشائخ نے دیگر مذاہب کے ان نظریات کو جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے نہ ٹکراتے ہوں اور جن کا قبول کرنا اس ماحول میں ناگزیر ہو، اسی مصلحت کے پیش نظر اختیار کر لیا ہو۔ اتحادِ عمل کے جتنے پہلو بھی ممکن ہوں۔ ان پر عامل ہونا، اسلام کے لئے مضر نہیں، مفید تھا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (آلِ عمران - ۷)	اے کتاب والو! آؤ، ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے متفق ہو جائیں وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک کو خدا کو چھوڑ کر رب بنا لے اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکم الٰہی کے تابع ہیں۔

لیکن واضح رہے کہ دوسرے مذاہب سے ایسا معاملہ کرنے میں پیغمبرانہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ یہ کام صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کا مذہبی وجدان پوری طرح نشو و نما پا چکا ہو، جس کی روح پر اسلامی رنگ چڑھ چکا ہو، جس کی نگاہ حق و باطل میں امتیاز کرنے

[1] تفہیمات الٰہیہ۔

ہیں کبھی دھوکا نہ کھائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو گمراہی و ضلالت کے علاوہ اس کا کوئی نتیجہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وہ دو راہہ ہے جہاں اسلام کی ترقی اور زوال کے راستے مل جاتے ہیں۔ ذرا سی لغزش سے صدہا گمراہیوں کے دروازے کھل سکتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ذرا سی حکمت سے ہزاروں کو ضلالت و گمراہی سے نکلنے کا موقع مل جائے۔ روحانی سلاسل کے وجود میں آنے کے بعد ہمارے مشایخ نے اس بنیادی مسئلہ پر بڑی توجہ کی وسط ایشیا، ہندوستان، افریقہ، چین، ملایا، جاوا وغیرہ میں صوفیائے کرام نے جو اندازِ تبلیغ و اشاعت اختیار کیا وہ اسی بنیادی حکمت پر مبنی تھا۔ افغانستان کو مذہب بدھ کے اثر سے نکال کر اسلام کے آغوش میں کس طرح لایا گیا؟ منگولوں کو کس طرح حلقہ بگوش اسلام بنایا گیا؟ — معلوم نہیں اسلامی تاریخ کا طالب علم کب ان سوالات کے جواب دے سکے گا! یہاں ان مباحث پر تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں "مشایخ چشت" کی پہلی جلد میں ان پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

(۵) موجودہ زمانہ میں تصوف کے ماخذ کو غیر اسلامی بتانے کا رجحان کم ہو چلا ہے۔ پروفیسر لوئی میسی نیون نے جو تصوف اسلام پر مستشرقین میں سب سے بڑا عالم مانا جاتا ہے۔ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف

"ESSAI SUR LES ORIGINES DE LEXIQUE TECHNIQUE DE LA MYSTIQUE MUSULMANE"

(PARIS, 1922)

میں بڑی تحقیق و کاوش سے یہ ثابت کیا ہے کہ تصوف کا منبع و مخرج، قرآن و احادیث ہی ہیں۔ اور یہ تحریک خالصًا اسلامی ہے۔

۳۔ تصوف، کتاب و سنت کی روشنی میں

صوفیۂ کرام اپنے عمل کا جواز قرآن و سنت سے پیش کرتے ہیں۔ تصوف کی بنیاد دو چیزوں پر ہے محبت الٰہی

اور معیتِ ذاتی۔ صوفیہ کا کہنا ہے کہ کتاب اللہ میں خود محبتِ الٰہی کی دعوت دی گئی ہے اور بے شمار آیتوں میں اس کے نتیجہ کے طور پر "معیت اور قربِ ذاتی" کا وعدہ کیا گیا ہے یہ ہی چیز ہے جس کو تصوّف کی اصطلاح میں معرفت کہتے ہیں۔

(۱) مولانا ابو الکلام آزاد، ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں:

"قرآن نے انسان کے لئے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت و محبت ہی پر رکھی ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی روحانی زندگی کو کائناتِ فطرت کے عالمگیر کارخانہ سے کوئی الگ اور غیر متعلق چیز قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اسی کا ایک مربوط گوشہ قرار دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ چنانچہ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔ اور سچی عبودیت اسی کی عبودیت ہے، جس کے لئے معبود صرف معبود ہی نہ ہو بلکہ محبوب بھی ہو:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

(۲ : ۱۶۰)

اور (دیکھو) انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے ہیں جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ انھیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں، جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہہ دو، اگر واقعی تم اللہ سے محبت رکھنے

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ط (۳ : ۲۹)

والے ہو، تو چاہیئے کہ میری پیروی کرو (میں تمھیں محبت الٰہی کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں اگر تم نے ایسا کیا تو (صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اللہ سے محبت کرنے والے ہوجاؤگے بلکہ خود) اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

وہ جابجا اس حیثیت پر زور دیتا ہے کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت اور محبوبیت ہے"[1]

مولانا آزاد کی یہ عبارت صوفیہ کے مسلک کی بہترین وضاحت کرتی ہے۔ قرآن محبتِ الٰہی کو دینی عقائد و اعمال کا مرکزی نقطہ قرار دیتا ہے۔ اور صوفیہ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تھے۔ اس کی تفصیل اگلے باب میں دیکھیے۔

(۲) قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ

اور اللہ نے تم پر (اے محمدؐ) کتاب آتاری اور حکمت نازل کی اور وہ باتیں بتائیں جو تم کو معلوم نہ تھیں۔

صوفیہ کا کہنا ہے کہ یہاں حکمت سے مراد علم باطن ہے۔ اس کی تعلیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی طور پر کچھ صحابہ کو دی تھی۔ اُن سے یہ سلسلہ جاری ہوا۔

(۳) عبادت الٰہی میں انہماک پر صوفیہ زور دیتے تھے۔ اور قرآن حکیم کی اِن آیتوں کو پیش کرتے تھے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں

[1] ترجمان القرآن۔ ج ۱ ص ۸۰

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ	پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے، اور لیٹے یاد کرو۔

مقبول بندوں کے متعلق فرمایا جاتا ہے:

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران ۲۰)	جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے، اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (سجدہ ۔ ۲)	جن کے پہلو (رات کو) خواب کاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (فتح ۔ ۴)	تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ میں پڑے ہوئے، خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ (مزمل ۔ ۲)	بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور ایک تہائی رات کے بعد اٹھتا ہے اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔

(۴) قربِ ذاتی یا معرفت جس کو صوفیہ اپنا منشا رو مقصد قرار دیتے ہیں کلام پاک سے ثابت ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"اقربیت او تعالےٰ بما از ما بہ نص قطعی ثابت شدہ است" [۱]

کلام پاک کی جن آیتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مومن - ۶)	تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا
وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ [۲] (پ ۲۷، ع ۱)	اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ جہاں کہیں تم ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو وہ دیکھتا ہے۔
نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (پ ۲۷ ع ۱۶)	ہم اس سے تمھاری بہ نسبت قریب تر ہیں مگر تم نہیں دیکھتے۔
وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ	ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں اور اس سے رگ جان سے زیادہ قریب ہیں۔

---

[۱] مکتوبات مجدد الف ثانیؒ ج ۱ م ۲۵

[۲] حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، فتح الرحمٰن میں وھو معکم اینما کنتم کا ترجمہ کرتے ہیں:
"او باشما است ہر جا کہ باشید"

پھر صوفیہ کرام احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اُن کے لئے مکمل رہبر ہے۔ اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کا جواز سنت میں موجود ہے۔

(۱) قرآن میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کر کہا گیا ہے:

یٰاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ؕ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ، اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا ؕ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ، وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ؕ (مزمل - ۱)	اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام رات اُٹھ کر نماز پڑھ، آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش، اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں۔ بے شک رات کو اُٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور موثر ہوتا ہے۔ تیرے لئے دن کو بڑی فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اسی کی طرف ہو جا۔

صوفیہ کا کہنا ہے کہ "ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جانے" کی جو ہدایت رسول اکرم صلعم کو کی گئی تھی، وہ اسی پر عمل کرتے ہیں۔

(۲) احادیث نبوی میں جس چیز کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے وہ تصوف ہی ہے ارشاد ہوتا ہے:

الاحسان ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراك۔	احسان یہ ہے کہ تم اس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس حدیث نبوی پر بحث کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ حقیقی تصوف یہی ہے۔

(۳۱) کشف المحجوب میں ہے کہ حارثہ رض ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور ؐ نے فرمایا:

كيف اصبحت ياحارثة قال اصبحت مؤمنا بالله حقا فقال انظر ما تقول يا حارثة ان لكل شئ حقيقة فما حقيقة ايمانك فقال عرفت نفسي عن الدنيا فاستوى عندي حجرها وذهبها وفضتها ومدرها فاسهرت انظر الى اهل الجنة يتزاورون فيها وكاني انظر الى اهل النار يتصارعون وفي رواية يتعادون الحديث

یعنی اے حارثہ تو نے صبح کس طرح کی کہا میں نے صبح ایسی حالت میں کی کہ میں مومن تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے حارثہ باغور سے دیکھ کیا کہتے ہو؟ ہر حق کے واسطے ایک حقیقت اور برہان ہوا کرتی ہے۔ اور تیری اس بات کی برہان کیا ہے۔ حارثہ نے جواب دیا کہ یہ ہے کہ میں اس دنیا سے اپنے بدن کو توڑ دوں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سونا اور پتھر اور ڈھیلا میرے نزدیک سب برابر ہیں اور جب میں دنیا سے جدا ہو گیا تو عقبیٰ میں مل گیا۔ یہاں تک کہ بہشت دوزخ اور عرش کو دیکھ رہا ہوں اس پر آپ نے فرمایا کہ تو نے پہچان لیا فالزم قالها ثلثا یعنی اس کو لازم پکڑ اور یہ آپ نے تین بار فرمایا [۱]

[۱] کشف المحجوب ص ۲۵۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رح نے بھی حارثہ رض کے اس قول سے استدلال کیا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۱۶۸

(۴) صحیح بخاری میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے، تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے" [۵]

(۵) رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصحاب صُفّہ کا وجود، خود اس بات کا ثبوت ہے کہ رسول اکرم صلعم عبادت میں ہمہ وقت انہماک کو ایک خاص طبقہ کے لئے بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ شیخ ہجویری ؒ فرماتے ہیں:

"اندر وقت پیغامبر فقراء، مہاجرین بودہ اند۔ آنانکہ اندر حکم آداب عبودیت حق تعالیٰ وصحبت متابعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نشستہ بودند، اندر مسجد وئے۔ واز اشغال جملہ اعراض کردہ وترک معارضہ بگفتہ وخداوند تعالےٰ بدادن روزی خود باور داشتہ۔ وتوکل بروے کردہ تا رسول علیہ السلام مامور بودہ بصحبت وقیام کردن بحق الیشان۔ چنانکہ خدائے گفت، قولہ عزوجل

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مہاجرین فقراء ایسے تھے کہ خدا کی عبادت کے آداب اور حضور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اتباع پورا پورا بجالاتے تھے اور آپ کی مسجد یعنی مسجد نبوی میں بیٹھے رہتے تھے۔ اور تمام اشتغال اور جھگڑوں کو ترک کر دیا تھا اور اس امر کا کامل یقین رکھتے تھے کہ خدائے تعالیٰ روزی رساں ہے اور اس پر توکل تھا اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی صحبت کے واسطے مامور تھے اور ان کے حق کو قائم رکھتے تھے جیسا کہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے

[۵] بخاری۔ کتاب الرقاق۔ باب التواضع۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ

ان لوگوں کو کہ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس کی ذات پاک کی خواہش رکھتے ہیں دور مت کر۔ اور فرمایا:

ونیز گفت

وَلَا تَعْدُ عَیْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا

اپنی آنکھیں یعنی توجہ کی نگاہ اُن کی طرف رکھ۔ اور ان کو نظر حقارت سے نہ دیکھ، کیا تو دنیا کی زندگی میں زینت چاہتا ہے۔ اسی واسطے رسول اللہ، جہاں کہیں اُن کو دیکھتے تو فرماتے کہ میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں خدائے تعالیٰ نے تمہاری بابت مجھ پر عتاب فرمایا۔

تا رسول علیہ السلام ہر کجا کہ از ایشاں بدیدے گفتے، مادر و پدرم فدا تیاں باد کہ خداوند تعالیٰ از برائے ایشاں با من عتاب کرد[1]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ صُفّہ کے متعلق یہاں اجمالاً کچھ عرض کر دیا جائے۔ صحابہ کی اس مقدس جماعت نے جو اصحابِ صُفّہ کے نام سے مشہور رہے، اپنی زندگی صرف عبادت اور تعلیمِ قرآن پر وقف کر دی تھی۔ دنیوی معاملات سے ان کا کوئی سروکار نہ تھا، رات دن عبادت، تلاوت اور قرأت میں مصروف رہتے تھے۔ ان بزرگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقے سے نکل جاتے تھے۔ معاش کا زیادہ تر دارومدار صحابہ اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت پر تھا۔ اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور مسجد کی چھت میں لٹکا دیتے، جو کھجوریں ٹپک ٹپک کر گرتیں، یہ لوگ اُن کو اُٹھا کر کھا لیتے۔ ان میں سے کچھ لوگ دن کو پانی بھر لاتے، جنگل سے لکڑیاں چن لاتے اور ان کو بیچ کر جو آمدنی ہوتی اس کو وجہ معاش میں صرف کرتے۔ لیکن زیادہ تر ان بزرگ

[1] کشف المحجوب ص ۱۵۱ ترجمہ ص ۲۰۸-۲۰۷

کی گذر اوقات صدقات پر ہوتی تھی۔ چنانچہ ابن کعب القرضی نے لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ
اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ فقراء سے اصحاب صفہ مراد
ہیں۔ اُن کے حالات میں ابن الاعرابی احمد بن محمدؒ البصری (المتوفی ۳۴۱ھ)،
علامہ جلال الدین سیوطی، اور دیگر علماء نے رسالے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔
سورہ انعام اور سورہ کہف میں ان بزرگوں کی عبادت وریاضت کی تعریف کی گئی
ہے۔

۴۔ تصوف اور صوفیہ کا مقصد حیات | تصوف کی تعریفیں مشایخ کی کتابوں
میں کثرت سے ملتی ہیں لیکن ان تعریفوں کی بنار پر صوفیۂ کرام کے مقاصد کے متعلق
کچھ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شیخ ابوالحسن فوشنجہؒ فرمایا کرتے تھے:

التصوف الیوم اِسمٌ ولا	تصوف آج کل ایک بے حقیقت
حقیقۃ وقد کان حقیقۃ	نام ہے۔ اس سے پہلے حقیقت
ولا اِسمٌ [۱]	بلا نام کے تھا۔

اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود صوفیۂ کرام کی زندگی میں تصوف کے معنی
تلاش کئے جائیں۔ اور اُن کے مقاصد کا تعین اسی کی بنا پر کیا جائے۔

محبتِ الٰہی۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ ایک خط میں مولانا فخر الدین مروزیؒ
کو لکھتے ہیں:

اتفاق اصحابِ طریقت و اربابِ	اصحابِ طریقت اور اربابِ حقیقت
حقیقت است کہ اہم مطلوب و	کا اس باب میں اتفاق ہے کہ انسان
اعظم مقصود از خلقت بشر محبت	کی پیدائش کا اہم مطلوب اور بڑا
رب العالمین است [۲]	مقصود رب العالمین کی محبت ہے

---

[۱] کشف المحجوب۔ ص ۷۷، اردو ترجمہ [۲] سیر الاولیا ص ۵۵۴، ۵۴۷

ضروری ہے کہ قرآن حکیم اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں محبتِ الٰہی کی نوعیت اور اہمیت کو سمجھا جائے۔ قرآن میں ایمان کی سب سے بڑی علامت اور خاصیت محبتِ الٰہی کو قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ - ۲۰۰)

اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبّت رکھتے ہیں۔

پھر ایک جگہ تنبیہ کی جاتی ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (۵ : ۵۹)

اے پیروان دعوتِ ایمانی! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین کی راہ سے پھر جائے گا (تو وہ یہ نہ سمجھے کہ دعوتِ حق کو اس سے کچھ نقصان پہنچے گا) عنقریب اللہ ایک گروہ (سچّے خدا پرستوں کا) پیدا کر دے گا جنھیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، محبت الٰہی میں سرشاری کی زندگی تھی۔ آپ دعا فرمایا کرتے تھے:۔

اللهم اجعل حبك احب الي من نفسي واهلي ومن الماء البارد (ترمذی)

الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے میرے اہل وعیال سے، اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

آپ راتوں کو اتنی دیر تک عبادت کیا کرتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا تھا۔ گو

یہ سمجھتے تھے کہ آپ کی یہ عبادت خشیتِ الٰہی سے ہے، اور چونکہ آپ گناہوں سے پاک کر دیئے گئے تھے اس لئے آپ کو ریاضتِ شاقہ کی ضرورت نہ تھی۔ آپ نے اس شبہہ کو دفع کرتے ہوئے فرمایا کہ ان عبادتوں کا مقصد محبتِ الٰہی ہے۔ خشیتہ الٰہی نہیں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا:

وجعلت لی قرۃ عینی فی الصلوٰۃ۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

صوفیۂ کرام نے اسی محبت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ نہایت سوز و گداز کے ساتھ یہ رباعی پڑھا کرتے تھے ؎

دنیا شہ را و قیصر و خاقان را دوزخ بدرا بہشت مر نیکاں را
تسبیح فرشتہ را صفا مر انساں را جاناں مارا و جان ما جاناں را [۵۱]

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے ایک دن بابا فریدؒ کو دیکھا کہ بند حجرے میں پشت پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے کھڑے ہیں، قبلہ کی طرف چند قدم بڑھتے ہیں اور یہ اشعار پڑھ کر وجد کرتے جاتے ہیں:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ ز کونین توئی از بہر تو میرم ز برائے تو زیم [۵۲]

صوفیہ کا کہنا ہے کہ محبت ہی رازِ حیات ہے۔ اگر اس کی آگ دل میں نہ ہو، تو وہ گوشت ایک بے جان ٹکڑا ہے۔ اگر عشق کی گرمی ہو تو انوارِ ربانی کا محل ؎

سلامتی دلِ عشاق از محبتِ تست
وگرنہ ایں دِل پر خوں چہ جائے منزلِ تست

---

۵۱ خیر المجالس (قلمی نسخہ) ۵۲ خیر المجالس (قلمی نسخہ)

محبت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی زندگی سمٹ کر ایک مرکز پر آجائے۔ اُس کا بال بال یہ پکارنے لگے:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بے شبہ میری نماز اور میری قربانی، اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے۔

اس کو ایک لمحہ بھی بغیر اللہ کے چین نہ ملے۔ شبلیؒ کا یہ قول اُس کے حالات کا آئینہ دار بن جائے۔

الفقیر من لا یستغنی لشیٔ دون اللہ

فقیر سوائے حق کے کسی چیز سے آرام نہیں پاتا۔ [۵۱]

وہ عملاً اس ارشادِ خداوندی کی تفسیر ہو:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ

میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

اس کے نفس کے تقاضے خاموش ہوجائیں۔ رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو۔ وہ اپنے لئے رہنا چھوڑ دے، خدا کے لئے جینے لگے۔

خدا کے لئے جینا۔ کہنے کو تو ایک معمولی سا جملہ ہے، لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارتقاءِ انسانیت کی آخری منزل یہی ہے۔ "خدا کے لئے جینے" کے معنی یہ نہیں کہ انسان دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کرے اور ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرنے لگے۔ وہ شادی بھی کرے، کھائے بھی۔ اللہ کی مخلوق سے ملے بھی — لیکن اس طرح کہ وہ علائق کے ہجوم اور تعلقات کے ازدحام میں گرفتار ہو کر اپنے معبود

---

[۵۱] کشف المحجوب۔ ص ۱۹

معبودِ حقیقی کو نہ بھول جائے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے مستفید ہو۔ لیکن دنیا کی محبت اس کے دل میں جگہ نہ حاصل کرنے پائے۔ وہ ہر کام میں رضائے الٰہی کا طلب گار ہو۔ ـــــ خدا کے لئے جینا، نیت کا ایک زبردست انقلاب ہے۔ ایسا انقلاب جو انسانی زندگی کے مرکز و محور کو بدل دیتا ہے۔ انسان کا ہر کام کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لئے ہونے لگتا ہے۔ وہ دنیا کا ہر کام کرتا ہے۔ لیکن اس کی نیت عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے ـــــ فوائد الفواد میں حضرت محبوب الٰہیؒ سے اور خیر المجالس میں حضرت چراغ دہلویؒ سے دو حکائتیں نقل کی گئی ہیں جن سے بہتر 'خدا کے لئے جینے' کے مفہوم کی وضاحت ممکن نہیں۔

ہفتہ کا دن ہے۔ اور ذیقعدہ (۷۱۸ھ) کی ساتویں تاریخ۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے سامنے تفسیر امام ناصری رکھی ہوئی ہے۔ دین میں استغراق کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگتے ہیں:

ایک بزرگ شیخ دریا کے کنارے رہا کرتا تھا۔ اس کی ایک عورت تھی۔ ایک روز عورت سے کہا کہ کھانا لے کر دریا کے پار جا، اس فقیر کو جو وہاں بیٹھا ہے دے آ۔ عورت نے کہا۔ پانی گہرا ہے، عبور کس طرح کروں گی۔ شیخ نے کہا: دریا کے کنارے جا کر کہنا کہ میرے شوہر کی حرمت سے جس نے کبھی مجھ سے صحبت نہیں کی مجھے راہ دے۔ عورت حیران رہ گئی اور اپنے دل میں کہا کہ اس سے میرے یہاں اتنے بچے پیدا ہوئے اور یہ کہتا ہے کہ میں نے صحبت ہی نہیں کی۔ آخر شوہر کے فرمان کے مطابق دریا کے کنارے پہنچی، اور وہی کہا، تو دریا نے راستہ دیا۔ اور وہ پار ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر درویش کے سامنے کھانا رکھا۔ اس نے کھا لیا تو عورت سوچنے لگی کہ آئی مرتبہ تو اس طرح آئی۔ اب جاؤں کس طرح۔ درویش نے پوچھا۔ کس طرح آئی تھی؟ عورت نے ساری بات کہہ سنائی۔ درویش

نے کہا۔ اچھا اب جاکر یہ کہنا کہ اے دریا اس شیخ کی حرمت سے جس نے تیس برس سے کسی قسم کا کھانا نہیں کھایا مجھے رستہ دے۔ عورت حیران رہ گئی کہ میرے سامنے ابھی اس نے کھانا کھایا ہے اور ابھی اس طرح کہتا ہے۔ خیر اس نے دریا کے کنارے ایسا ہی کیا۔ رستہ مل گیا اور اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی۔ اور کہا کہ مجھے ان دونوں باتوں کا بھید بتلا کہ تو نے کئی سال مجھ سے صحبت کی اور اس درویش نے بھی میرے سامنے کھانا کھایا اور یہ دونوں جھوٹ باتیں کہہ کر میں نے دریا سے رستہ لیا۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ شیخ نے کہا: تجھے واضح رہے کہ میں نے ہوائے نفسانی سے کبھی تجھ سے صحبت نہیں کی۔ اسی طرح اس درویش نے بھی کبھی نفسانی طمع سے کھانا نہیں کھایا۔ بلکہ محض عبادت وطاعت کی خاطر۔ اس لحاظ سے اس نے کبھی کھانا نہیں کھایا۔"

یہ حکایت بیان کرنے کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا:

"ایں بود معنی ہر دو سخن یعنی مردانِ خدا ہرچہ کنند برائے خدا کنند نیت شاں ہمہ حق باشد[1]

ان دونوں باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ مردان خدا کرتے ہیں وہ خدا کے لئے کرتے ہیں۔ ان کی نیت سب حق کی خاطر ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت چراغ دہلویؒ نے شیخ عبداللہ خفیف کا قصہ سنایا کہ:

"شیخ عبداللہ خفیف کو کہیں دعوت میں بلایا گیا۔ وہاں قسم قسم کے کھانے تھے حلوائے لوزینہ سب کھانوں سے زیادہ شیخ کے قریب تھا۔ شیخ نے صحنک سے ایک لوزینہ اٹھا کر نوش کیا۔ اچھا معلوم ہوا۔ لہذا دوسرا بھی اٹھا کر کھایا۔

---

[1] فوائد الفواد

اس وقت خیال ہوا کہ یہ دوسرا لوزینہ خدا کے واسطے نہیں کھایا۔ لذت کو کھایا کہ دل کو پسند آیا تھا۔ ہنوز وہ لوزینہ منہ میں تھا کہ شیخ نے اپنی زبان چاب لی۔ خون نکلنے لگا۔ معتقدین پریشان ہوئے۔ سبب دریافت کیا تو فرمایا۔ میں نے پہلے ایک لوزینہ کھایا تھا بہت لذیذ تھا، دوبارہ پھر وہی کھایا خیال آیا کہ یہ کھانا خدا کے واسطے نہیں، لذت کو تھا۔ لہذا سزائے نفس کو اپنی زبان چاب لی ہے"۔ [1]

جب زندگی اس طرح بسر کی جائے تو اس کی اساس ہی بالکل بدل جاتی ہے۔ انسان کا ہر کام عبادت بن جاتا ہے۔ عبادت کے اسی مفہوم کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سمجھایا کہ ایک مرتبہ حضرت سعدؓ نے ارادہ کیا کہ اپنی ساری دولت راہِ خدا میں دے دیں، تو فرمایا: "اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مقصود ہے۔ اس کا تم کو ثواب ملے گا۔ یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں دو اس کا بھی ثواب ہے"۔ ایک مرتبہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو مسعود انصاری سے فرمایا: مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے"۔ ——— یہ ہے خدا کے لئے جینا، اور یہ ہے نیت کا وہ انقلاب جو انسان کی زندگی میں ایک بنیادی تغیر پیدا کر دیتا ہے۔

جب خدا کے لئے جینے کا یہ وسیع مفہوم تسلیم کر لیا جائے تو پھر انسان کا ہر دنیوی کام عبادت بن جائے۔ بلکہ اس کی پوری زندگی ہی عبادتِ الٰہی ہو جائے ویسی ہی عبادت جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ — میں نے جنوں کو اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

---

[1] خیر المجالس (قلمی نسخہ)

صوفیہ کا کہنا ہے کہ زندگی صرف وہی ہے جو یادِ حق میں بسر کی جائے۔ باقی سب سراب ہے اور دھوکا حضرت محبوب الٰہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ زندگی تو عبارت ہی یادِ حق سے ہے۔
"حیات آنست کہ درویش بذکر حق مشغول باشد"۔ [۵۱]
اس کی وضاحت میں انھوں نے یہ قصہ بیان فرمایا جو بڑا نصیحت آموز ہے۔

"ایک درویش میرک نامی تھا۔ ایک اور درویش کو اس کی زیارت کا شوق ہوا اس درویش میں یہ کرامت تھی کہ جو خواب دیکھتا، سچ ہوتا۔ اس کی تعبیر عین وہی ہوتی تھی جو وہ دیکھتا تھا۔ جب اُسے اشتیاق غالب ہوا تو زیارت کے لئے روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں ایک منزل پر خواب میں سُنا کہ میرک گرامی فوت ہو گیا۔ صبح اُٹھ کر کہا کہ افسوس میں نے اتنی راہ اس کی زیارت کے لئے قطع کی اور وہ بھی مرگیا۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ چلو وہاں چل کر اس کی قبر کی ہی زیارت کریں گے۔ وہاں پہنچ کر پوچھنا شروع کیا کہ میرک گرامی کی قبر کہاں ہے۔ سب نے کہا کہ وہ تو زندہ ہے اور تم قبر کی بابت پوچھتے ہو۔ وہ درویش حیران رہ گیا کہ میرا خواب جھوٹ کس طرح ہو گیا۔ الغرض میرک گرامی کے پاس جا کر سلام کیا۔ اس نے کہا۔ اے خواجہ فی الواقع تیرا خواب ٹھیک تھا۔ کیونکہ میں ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہتا تھا۔ آج کی رات اس کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہو گیا تھا، پس عالم میں منادی ہوگئی کہ میرک گرامی مرگیا۔" [۵۲]

محبت الٰہی کا اثر انسانی زندگی پر محبت الٰہی کا جذبہ جب انسان کے دل میں گھر کر لیتا ہے، تو فکر و عمل کا کوئی گوشہ اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

---

[۵۱] فوائد الفواد۔ ص ۲۰ [۵۲] فوائد الفواد۔ ص ۲۰

(۱) محبت الٰہی کا سب سے بڑا اور گہرا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں "مرکزیت" پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مرکزیت 'نظامِ ربوبیت' کی ایک شان اور خدا کی وحدانیت پر کامل ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ شرک، انسانی فکر و عمل کی مرکزیت کو فنا کرتا ہے اس لئے کوئی انسانی گناہ اُس سے بڑھ کر شدید نہیں ہو سکتا پھر جو چیز اس مرکزیت کو جو ایمان کی اصلی شان ہے برقرار ہی نہیں بلکہ صحیح معنی میں پیدا کرتی ہے وہ محبت ہے۔

(۲) اللہ سے سچی محبت کا رشتہ رکھنے والا انسان ہر وقت اپنے آپ کو اُس کی بارگاہ میں پاتا ہے۔ خدا کی موجودگی کا یقین اس کو اس طرح سے ہوتا ہے گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ میر خورد رح نے حضرت شیخ نظام الدین اولیا رح کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خدا کی طرف اس محویت کے ساتھ متوجہ رہتے تھے' گویا اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

جب انسان' ذاتِ باری تعالےٰ کو اس طرح اپنے نزدیک محسوس کرنے لگتا ہے تو معصیت کی تمام راہیں اس کی زندگی میں بند کر دی جاتی ہیں۔ وہ گناہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا "مالکِ یوم الدین" کا دربار ہر وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ اپنے محبوب میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ گناہ کرنے کی فرصت ہی اس کو نہیں ملتی۔

حضرت شیخ علی ہجویری رح نے لکھا ہے کہ صرف یہ علم کہ خدا دیکھ رہا ہے انسان کو معصیت سے روکتا ہے:[1]

"چوں بندہ عالم بود کہ خداوند   جب بندہ یہ بات یقین کی رو سے جان

---

[1] شیخ ہجویری رح نے اس کی تشریح میں ایک قصہ لکھا ہے۔ بصرہ کا ایک رئیس اپنے باغ
(بقیہ صفحہ ۸۲ پر)

بدو ناظر است، کارے نکند کہ ازو شرم دارد بقیامت"۔[۵۱]

جائے گا کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے تو وہ ہرگز ایسا کام نہ کرے گا جس سے اس کو قیامت کے دن خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

لیکن جب معبودِ حقیقی کی ذات ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہو، تو زندگی کے انقلاب کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

(۴) جب محبت الٰہی کا پوری طرح غلبہ ہوتا ہے، تو انسان کی نظر میں سونا اور پتھر برابر ہو جاتا ہے[۵۲] مادی دنیا کی کششیں اس کے لئے بے اثر ہو جاتی ہیں خیر المجالس میں لکھا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک رات کو بارگاہِ خداوندی میں التجا کی کہ اے اللہ مجھے یہ بتا دے کہ بہشت میں میرا یار اور مصاحب کون ہوگا آواز آئی۔ فلاں چرواہا۔ حضرت جنید بغدادیؒ اس چرواہے سے جا کر ملے اور کئی دن اس کا حال دیکھنے کے بعد پوچھا: تم پنج وقتہ نماز جماعت سے پڑھتے ہو۔ اس کے سوا کوئی کام ایسا نہیں کرتے جو اس قدر قبولیت کا باعث ہو۔

(بسلسلہ صفحہ ۴۱) میں گیا۔ باغبان کی بیوی خوب صورت تھی۔ اس پر راغب ہوگیا۔ اور باغبان کو کسی کام سے باہر بھیج کر، عورت سے دروازے بند کرنے کے لئے کہا۔ عورت نے جواب دیا۔ سب بند کر دئے۔ ایک نہیں بند کر سکتی۔ پوچھا۔ وہ کون سا؟ جواب دیا ——— "درے کہ میان ما و خدا وند است" رئیس پر اس جملہ کا ایسا اثر ہوا کہ فوراً استغفار پڑھی اور توبہ کی۔ کشف المحجوب۔ ص ۱۰

[۵۱] کشف المحجوب۔ ص ۱۰

[۵۲] ملاحظہ ہو، حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم۔ ص ۱۶۸

شاید یہ اعلیٰ مرتبہ جو تمھیں ملا ہے وہ تمھارے کسی باطنی معاملہ کے سبب سے ہے
چرواہے نے جواب دیا۔ اے خواجہ جنید! میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ میں
نہیں جانتا کہ معاملہ کس کو کہتے ہیں اور باطن کیا ہوتا ہے۔ البتہ مجھ میں دو
خصلتیں ہیں ایک یہ کہ اگر اللہ تعالےٰ اِن سب پہاڑوں کو سونے کا کردے
اور میرے قبضۂ تصرف میں ہوں، اور وہ سب میرے پاس سے جاتے رہیں
تو مجھ کو اُن کے نہ ہونے کا رنج وغم نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی مجھ پر جفا کرے
یا مجھ سے احسان و وفا کرے تو میں وہ جفا و وفا اس کی طرف سے نہیں جانتا
بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانتا ہوں"[۵۱] یہ سب کیفیات
محبتِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

(د) جب محبتِ الٰہی اس درجے پر پہنچ جائے کہ:

وکنت الی المحبوب امری کلّہ	میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے
فان شاء احیانی وان شاء اتلفا	حوالہ کیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے۔

تو انسان میں توکل و استغنا کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب دُنیا
کی جاہ وحشمت، دولت وثروت اُس کے سامنے آتی ہے تو وہ یہ کہہ کر منہ موڑ
لیتا ہے:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کیا اللہ بندے کے لئے کافی نہیں۔

اللہ کی ربوبیت پر کامل ایمان رکھنے والا انسان اپنے رزق کی طرف سے بے نیاز ہو جاتا
ہے۔ وہ اللہ کے اس وعدے پر پورا یقین رکھتا ہے کہ

---

[۵۱] خیر المجالس (قلمی نسخہ۔ مجلس ہفتم) اردو ترجمہ (مطبوعہ) ص ۲۷

مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا وَّیَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسۡبُہٗ	جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اُس کے لئے راستہ نکالتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتا ہے جہاں کسی کا سان گمان بھی نہیں ہوتا، جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اُس کے لئے کافی ہے۔

یہی وہ یقین ہے جو اس کو دارا و سکندر سے اونچا اٹھا دیتا ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک فقیر سے کہا کہ مجھ سے کچھ مانگ جواب دیا میں اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں۔ بادشاہ نے کہا۔ یہ کیا کہا۔ غلاموں کا غلام کیسا۔ جواب دیا:

مرا دو بندہ اند، کہ آں ہر دو	میرے دو بندے ہیں اور وہ دونوں
خداوندانِ تو اند یکے حرص و	تیرے آقا ہیں۔ ایک حرص
دیگر امل [۵۷]	دوسرے امید

انسانی کردار کے نشوونما اور تشکیل میں اس احساس کا کہ وہ اپنی روزی کے لئے کسی دنیوی طاقت کا محتاج ہے، بڑا مہلک اثر پڑتا ہے "تعمیر خودی" اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک انسان اپنے پورے ایمانی جذبہ کے ساتھ

[۵۷] کشف المحجوب۔ ص ۱۶ - ۱۵

حق تعالیٰ کو اپنا روزی رساں نہ مان لے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر اللہ کی محبّت، انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے تو اس کی زندگی کا سانچہ ہی بدل جائے۔ فکر و عمل کی بلندی، خدمتِ خلق، راست بازی اور سچائی، ——— کتنی خوبیاں ہیں جو صرف اسی جذبہ کا نتیجہ ہیں۔

محبتِ الٰہی کی عملی راہ - یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے بعد کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بندے کے لئے خدا کی محبّت کی عملی راہ کیا ہے؟ ——— مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں:

"خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گزری ہے۔ جو انسان چاہتا ہے خدا سے محبت کرے، اُسے چاہیئے، خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (۲: ۱۷۷)	اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں۔
وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (۷۶: ۸)	اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں، قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا یہ کھانا کھلانا، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لئے ہے۔ نہ تو ہم تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ کسی طرح کی شکرگزاری"[1]

احادیثِ نبوی میں متعدد جگہ محبت کی عملی راہ پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت ابی ہریرہؓ

[1] ترجمان القرآن - جلد اول - ص ۸۱

مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا ، اے ابن آدم! میں بیمار ہوگیا تھا، مگر تونے میری بیمار پرسی نہ کی۔ بندہ متعجب ہوکر کہے گا بھلا ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے اور تو تو رب العالمین ہے۔ خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہوگیا تھا اور تونے اس کی خبر نہیں لی تھی حالانکہ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتا تو مجھے اُس کے پاس پاتا۔ (یعنی اس کی خدمت کرنے ہی میں میرے لئے خدمت گزاری تھی۔) اسی طرح خدا فرمائے گا ، اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، مگر تونے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تونے انکار کردیا تھا۔ اگر تو اُسے کھلاتا تو تو مجھے اُس کے پاس پاتا۔" [1]

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بدوی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھائیے جو مجھے جنت میں لے جائے فرمایا :۔

"انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کرسکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا۔ اور نیکی بتا اور برائی سے روک ، اگر یہ بھی نہ کرسکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک۔" [2]

---

[1] مسلم عن ابی ھریرۃ

[2] ادب المفرد امام بخاری باب من لا یوذی جارہ

صوفیۂ کرام نے محبت الٰہی کی اس عملی راہ کو اختیار کیا تھا۔ اُن کی زندگیاں خدمت خلق کے لئے وقف تھیں۔ وہ دن رات انسانی دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں پرونے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو دل پریشان ہو جاتا۔ بھوکوں کا خیال آتا تو لقمے، حلق میں اٹکنے لگتے۔ ملفوظات مشائخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ خدمتِ خلق کو اِن بزرگوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فریضہ بنا لیا تھا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے بازار میں دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ کسی چیز کی قدر نہ ہوگی[۵۱] میر خوردؒ نے لکھا ہے:

می فرمود کہ مرا در واقعہ کتابے دادند	فرمایا کہ مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی
دراں مسطور بود تا توانی راحتے بدلے	جس میں لکھا ہوا تھا کہ جہاں تک ہوسکے
می رساں کہ دل مومن محل اسرار	دلوں کو راحت پہنچا کیونکہ مومن کا
ربوبیت است، بزرگے خوش	دل اسرار ربوبیت کا محل ہے
گوید۔ بیت	ایک بزرگ نے کیا خوب کہا ہے۔
میکوش کہ راحتے بجانے برسد	میکوش کہ راحتے بجانے برسد
یا دست شکستۂ بنانے برسد	یا دست شکستۂ بنانے برسد
ومی فرمود کہ در بازار قیامت ہیچ	اور فرمایا کہ قیامت کے بازار میں کوئی
کالائے را آنچناں رواج نخواہد	اسباب اتنا مروج اور قیمتی نہ ہوگا۔
بود کہ دریافت دلہا را"[۵۲]	جتنا دلوں کو راحت پہنچانا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس حقیقت کو مختلف انداز میں متعدد جگہ سمجھایا ہے۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

---

۵۱ سیر الاولیا۔ ص ۱۲۸ ۵۲ سیر الاولیا۔ ص ۱۲۸

طاعت دو طرح کی ہوتی ہے ۔ لازمی اور متعدی ۔ لازمی وہ ہے جس کا نفع صرف کرنے والے کی ذات ، کو پہنچے ۔ اور یہ نماز ، روزہ ، حج ورد اور تسبیح ہے ۔ متعدی وہ ہے جس سے اوروں کو فائدہ پہنچے ، اتفاق ، شفقت ۔ غیر کے حق میں مہربانی کرنا وغیرہ اسے متعدی طاعت کہتے ہیں ۔ اس کا ثواب بے شمار ہے "۵۱

خود حضرت محبوب الٰہی رح کی حیاتِ طیبہ اس طاعتِ متعدی کی بہترین مثال ہے ۔ حضرت بابا فرید رح کے ایک عزیز ، خواجہ عزیز الدین ، ایک دعوت میں شرکت کرنے کے بعد حضرت محبوب الٰہی رح کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ شیخ رح نے دریافت کیا کہاں تھے ۔ عرض کیا ، ایک دعوت میں گیا تھا ۔ وہاں لوگ یہ کہتے تھے :

خدمت شیخ نظام الدین عجب فراغ باطنی دارد ، او را ہیچ غمے و اندیشہ ایں جہاں نیست

شیخ نظام الدین رح کو بڑا فراغ باطنی حاصل ہے ۔ انھیں اس جہاں کا کوئی غم اور فکر نہیں ہے ۔

حضرت محبوب الٰہی رح نے فرمایا :

"ایں قدر و غم و اندوہ کہ مرا ہست ہیچ کس را دریں جہاں نیست ۔ زیرا کہ چندیں خلق می آیند و غم و اندوہ خویش می گویند ، آں ہمہ بر دل و جان من می نشیند ۔ عجب دلے باشد کہ غم برادر مسلمان بشنود و در وے اثر نکند "۵۲

جس قدر غم و اندوہ مجھے رہتا ہے کسی کو اس جہان میں نہ ہوگا ۔ اس واسطے کہ اتنی مخلوق میرے پاس آتی ہے ، اور اپنے رنج اور تکلیف بیان کرتی ہے ۔ ان سب کا بوجھ میرے جان و دل پر پڑتا ہے وہ عجیب دل ہوگا جو مسلمان بھائی کا غم سنے اور اس پر اثر نہ ہو ۔

۵۱ فوائد الفواد ۔ ص ۱۴ ، ۱۳   ۵۲ خیر المجالس (قلمی نسخہ) مجلس ۱۱ ، دیکھیں

حضرت محبوب الٰہیؒ کی پوری زندگی خلق کی اسی درد مندی میں گزری۔ وہ اپنے پرائے سب کا غم کھاتے تھے۔ ہر شخص کی پریشانی کو دور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے لوگ جب اپنی درد بھری داستانیں سُناتے تو ان کا دل بے چین ہو جاتا جس طرح ممکن ہوتا ہر آنے والے کی دل جوئی کرتے۔ دشمن بُرا بھلا کہتے گالیاں دیتے، لیکن ان کے دل پر میل نہ آتا، بلکہ یہ شعر گنگنانے لگتے ؎

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد
ہر کہ خارے افگند در راہِ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد ؎[۱]

ان کا یقین تھا کہ اگر برائی کا بدلہ برائی ہی سے دیا جائے تو یہ دنیا انسانوں کی بستی نہ رہے۔ ایک دن فرمانے لگے:

یکے خار نہد و تو ہم خار نہی۔ ایں خار خار باشد........ میاں مرداں ہم چنیں است کہ بانغزاں نغزی باکوزاں کوزی، اما میاں درویشاں ہم چنیں نیست کہ بانغزاں نغزی باکوزاں ہم نغزی ؎	اگر کوئی کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے عوض کانٹا رکھے تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔ عام لوگوں میں تو یہ دستور ہے کہ نیک کے ساتھ نیک اور بد کے ساتھ بد ہوتے ہیں، لیکن درویشوں میں یہ دستور نہیں۔ یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ نیک ہونا چاہیئے۔

؎[۱] فوائد الفواد۔ ص ۸۶۔ سیر الاولیا ص۔ ۵۵۴ ؎ فوائد الفواد ص ۸۷

ایک اور موقع پر فرمایا :

"نفس است و قلب است ۔ ہرگاہ کہ کسے بنفس پیش آید و ایں کس می باید کہ بقلب پیش آید یعنی در نفس ہمہ خصومت ست و غوغا و فتنہ و در قلب سکوت و رضا و ملاطفت پس چوں کسے بنفس پیش آید و ایں کس بقلب پیش آید نفس مغلوب شود . اما اگر کسے مقابلہ نفس ہم بنفس پیش آید پس خصومت و فتنہ را حد کجا است[1]	دو چیزیں ہیں - ایک نفس دوسرے قلب - جب کوئی نفس سے پیش آئے تو اس سے قلب سے پیش آنا چاہیئے - یعنی نفس میں دشمنی، غوغا اور فتنہ ہے - اور قلب میں سکوت رضا اور نرمی - پس جب کوئی نفس (دشمنی) سے پیش آئے تو قلب (نرمی) سے پیش آنا چاہیئے اس طرح نفس (دشمنی) مغلوب ہو جائے گا - لیکن اگر کوئی نفس سے پیش آئے اور دوسرا بھی اس کا مقابلہ نفس سے کرے تو پھر دشمنی اور فتنہ کی کوئی حد نہیں رہتی -

فوائد الفواد میں قدم قدم پر یہ ہی تلقین ہے - حضرت محبوب الٰہیؒ نے ، ہر ہر موقع پر اپنے مریدین کو سمجھایا ہے کہ اس دنیا میں فوز و کامرانی کے الفاظ اُس وقت تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتے جب تک انسان خدمتِ خلق کو اس طرح اپنی زندگی کا مقصد نہ بنالے کہ برائی کا خیال ہی اس کے دل میں نہ آئے - دنیا جفا کرے اور وہ وفا کرے ؛ دنیا تکلیف پہنچائے تو وہ راحت کا سامان بن جائے - لوگ اس کو بُرا کہیں تو ابرو پر شکن نہ آئے ، بلکہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ

[1] فوائد الفواد - ص ۱۲۴

ہو جائے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"اگر میاں دو کس آزارے باشد سبیل آنست کہ ایں کس از طرف خود درونۂ خود صاف کند، چوں ایں کس درونۂ خود از عداوت پاک کند، البتہ از جانب او ہم آزار کم شود" [۵۱]	اگر دو آدمیوں میں جھگڑا اور رنجش ہو، تو طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنا دل بالکل پاک و صاف کرے۔ جب ایک شخص اپنا باطن عداوت سے پاک کرے گا، تو دوسرے کی طرف سے بھی آزار کم ہو جائے گا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ بُرا کہنا بُرا ہے لیکن بُرا چاہنا اس سے بھی بُرا ہے۔

"بد گفتن اندک است اما بد خواستن ازاں بد تر است" [۵۲]	برا کہنا، برا چاہنے کے مقابلے میں کم بُرا ہے۔ برا چاہنا بد تر ہے۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ کچھ لوگ آپ کو بر سرِ منبر برا کہتے ہیں۔ اور ہم ایسا سُننے کی تاب نہیں رکھتے۔ فرمایا۔ میں نے ان سب کو معاف کر دیا۔ تم بھی معاف کر دو۔

"من آں از ہمہ عفو کردم، چہ جائے آنست کہ کسے بعداوت مردم مشغول شود و ہر کہ مرا بد گفت ازو عفو کردم۔ اکنوں باید کہ شما عفو کنید و ایں نوع مذاکرہ دیگر بار مکنید .... مردم ازیں	میں نے ان تمام لوگوں کو معاف کر دیا ہمارا شیوہ یہ نہیں ہے کہ کسی کی عداوت میں مشغول ہوں، جس نے مجھے بُرا اور ناسزا کہا ہے۔ میں نے اُسے معاف کر دیا۔ تمھیں بھی چاہئے کہ ان لوگوں کو معاف کر دو۔ اور

[۵۱] سیر الاولیا ص ۵۵۵۔ [۵۲] سیر الاولیا۔ ص ۵۵۴

بدگفتہا چہ رنجد چوں گفتہ اند کہ صوفی آنست کہ مال او سبیل است و خون او مباح است۔ چوں ہم چنیں است از بدگفتن چہ باک است، چرا خصومت می باید کرد۔ ؎[۵۱]	اس قسم کا مذاکرہ دوبارہ نہ کرو۔۔۔ آدمیوں کو اس قسم کی بدگوئیوں اور برائیوں سے رنجیدہ نہ ہونا چاہئے چونکہ کہا گیا ہے کہ اصل میں صوفی وہ شخص ہے جس کا مال وقف اور خون مباح ہو۔ اور جب یہ ہے تو پھر اسے کسی کی بدگوئی اور (غیبت) سے کیا خوف ہو اور کسی سے خصومت کیوں رکھے۔

کچھ حاسد اور تنگ دل لوگوں نے یہاں تک جرأت کی کہ خانقاہ میں آکر حضرت محبوب الٰہی رح کے منہ پر اُن کو بُرا بھلا کہا۔ حضرت شیخ رح نے سب کچھ سنا، لیکن زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ ایک دن فرمانے لگے:

"معاملہ خلق بر خلق سہ قسم است قسم اول آنست کہ ازیں کس بدیگرے نہ منفعت برسد و نہ مضرت، حکم ایں کس حکم جماد باشد، قسم دوم ازیں بہتر کہ بدیگرے منفعت برسد نہ مضرت۔ قسم سیوم، از ہر دو خوشتر است کہ ازیں کس	لوگوں کے آپس میں معاملہ کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ ایک شخص سے دوسرے کو نہ فائدہ پہنچے نہ نقصان ایسا شخص جماد کا حکم رکھتا ہے دوسری قسم اس سے بہتر ہے اس میں وہ لوگ شامل ہیں جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، نقصان نہیں پہنچتا۔

---

۵۱ سیر الاولیا۔ ص ۵۵۵۔ ۵۵۴

بدیگرے منفعت رسد واگر اورا مضرت رسانند او مکافات نکند وتحمل کند وحلم ورزد و ایں کار صدیقانست "[۵]

تیسری قسم جو پہلی دونوں قسموں سے بہتر ہے وہ یہ ہے کہ اس سے دوسروں کو ہمیشہ فائدہ پہنچتا ہے، اگر لوگ اسے مضرت پہنچاتے ہیں تو وہ اس کی پاداش ومکافات کا خیال نہیں کرتا بلکہ تحمل کرتا ہے اور تکلیفوں کو سہتا ہے اصل میں یہ کام صدیقوں کا ہے۔

مصیبت زدوں اور غریبوں سے سچی ہمدردی صرف وہی کرسکتا ہے جو مصیبت اور غربت کی تمام تکلیفوں کو اپنے اوپر طاری کرسکتا ہو، جس کو پیٹ بھر کر کھانا ملے وہ فاقہ زدوں کی حالت کا کیا اندازہ لگا سکتا ہے، جس کو زندگی کی تمام آسائشیں میسر ہوں وہ کس طرح حاجت مندوں کی بے چینی اور تکلیف کا احساس کرسکتا ہے!

حضرت محبوب الٰہیؒ کی زندگی کے واقعات شاہد ہیں کہ ان کی اخلاقی تعلیم زبان تک محدود نہ تھی۔ وہ ان اخلاقی اصولوں کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ ایک دن حاضرین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ سائے میں جگہ نہ رہی۔ لوگ دھوپ میں بیٹھنے لگے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی طبیعت بے چین ہوگئی۔ فرمایا:

"ذرا پاس پاس ہو بیٹھو۔ تاکہ وہ بھی سائے میں بیٹھیں۔ کیونکہ دھوپ میں بیٹھے تو وہ ہیں اور جلتا میں ہوں "[۵]

حضرت محبوب الٰہیؒ اکثر روزہ رکھا کرتے تھے۔ لیکن اس طرح کہ شاذ ونادر ہی کبھی سحری کھائی ہو۔ خواجہ عبدالرحیمؒ جن کے ذمہ سحری کا حضرت کی خدمت میں پیش کرنا

[۵] فوائد الفواد ص ۹۱

مقرر تھا عرض کرتے : مخدوم! آپ نے افطار کے وقت بہت ہی کم کھانا تناول فرمایا ہے۔ اگر سحری کے وقت بھی تھوڑا سا کھانا تناول فرمائیں گے تو ضعف بڑھ جائے گا اور طاقت سلب ہو جائے گی۔ خواجہ عبدالرحیم کی یہ بات سُن کر حضرت محبوب الٰہیؒ زار و قطار رونے لگتے اور فرماتے :

"چندیں مسکیناں و درویشاں در کنجہائے مساجد و دوکانہا گرسنہ و فاقہ زدہ افتادہ اند، ایں طعام در حلق من چگونہ فرو رود" [۵۱]	بہت سے مساکین اور درویش مسجدوں کے کونوں اور دکانوں میں بھوکے اور فاقہ زدہ پڑے ہوئے ہیں۔ کھلایہ کھانا میرے حلق میں کس طرح اُتر سکتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ حقیقی تصوف، خدمتِ خلق کا دوسرا نام ہے۔ مشایخ نے محبتِ الٰہی کو خدمتِ خلق ہی کے ذریعہ تلاش کیا تھا۔ حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے مدینہ کی گلیوں میں حق کو پایا ہے۔ ان سے پوچھا گیا، کیسے؟ جواب دیا :-

روزے در بازار مدینہ می رفتم۔ شکستگانے دیدم از غایت شکستگی کہ صفت نتواں کرد بر ایشاں رحم آمد، خواستم کہ با ایشاں باشم دموانست بگیرم، در صحبت ایشاں بودم، پنداشتم کہ خدا باشکستگاں است" [۵۲]	ایک دن میں مدینہ کے بازار میں چلا جا رہا تھا کہ چند خستہ حال لوگوں کو دیکھا جن کی پریشان حالی کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔ مجھے ان پر رحم آیا۔ اور چاہا کہ میں بھی اُن کے ساتھ رہوں اور اُن سے موانست اختیار کروں چنانچہ اُن کی صحبت میں رہا۔ اور سمجھ گیا کہ خدا خستہ حالوں کے ساتھ ہے۔

---

[۵۱] سیر الاولیا۔ ص ۱۲۸ - [۵۲] سیر الاولیا ص ۵۵۹ - ۵۵۸

صوفیہ اور تعلیم اخلاق۔ خدمتِ خلق کے معنی صرف یہ ہی نہیں کہ چند بھوکوں کا پیٹ بھر دیا جائے یا چند حاجت مندوں کی ضرورت کو پورا کر دیا جائے۔ بلکہ اس سے زیادہ اہم بھی ایک کام ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کو برائی سے روکا جائے اور بھلائی کی طرف بلایا جائے۔ مسند میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا:

"میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں، لیکن قیامت میں اُن کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے اور بُری باتوں سے روکتے ہیں۔"

بنی نوعِ انسان کے اخلاق کی درستگی کے لئے جدوجہد وہ کام ہے جس کے لئے پیغمبر مبعوث کئے گئے ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق	میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

قرآن میں پیغمبرانہ فریضہ کے متعلق فرمایا جاتا ہے۔

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ [1]	پیغمبر اُن اَن پڑھ جاہلوں کو) پاک صاف کرتا اور ان کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے

[1] ابن درید (المتوفی ۳۲۱ھ) نے "حکمت" کے یہ معنی لکھے ہیں:۔

فکل کلمة وعظتك او زجرتك او دعتك الی مکرمة او نهتك من قبيح فهی حکمة وحکم	ہر بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے۔ یا کسی بُری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔

جمہرۃ اللغۃ ج ۲ ص ۱۸۲ (حیدرآباد)

قرآن مجید اور احادیث قدسی میں جگہ جگہ انسانی اخلاق کی درستگی کی ضرورت اور اہمیت کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے سورہ بقرہ میں ہے:

"نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو، بلکہ اصلی نیکی اس کی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود (یا خدا کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو، اور غلاموں کو آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا، اور جو وعدہ کرکے اپنے وعدے کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں، یہی ہیں جو راستباز ہیں۔ اور یہی تقویٰ والے ہیں۔"

ارشادِ نبوی ہے کہ مسلمانوں میں کامل ایمان اُس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔ (اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقاً) تمام مذہبی عبادات کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان میں اچھے اخلاق پیدا ہوں۔ حدیث شریف میں ہے جس کی نماز اس کی برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے۔"[ف] ایک جگہ فرمایا جاتا ہے کہ انسان حسنِ خلق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے:

ان الرجل لیدرک بحسن خلقہ درجۃ
قائم اللیل وصائم النھار۔

تصوف کی تعریفوں کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیشتر تعریفیں

[ف] احیاء العلوم۔ امام غزالیؒ

ایسی ہیں جن میں تصوف کو اخلاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مشائخ کے نزدیک تصوف کا مقصد یہ ہے کہ انسان خود اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرے اور دنیا کے دوسرے بسنے والوں کو مادی نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک وصاف کرے۔ بنی نوع انسان کے ساتھ تعلقات میں شگفتگی پیدا کرنا، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا، برائی سے بچانا، بھلائی کی طرف بلانا ـــــ یہ وہ کام ہیں جو عبادت سے زیادہ اہم ہیں۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے :

"بہت نماز پڑھنا اور وظائف میں بکثرت مشغول رہنا۔ قرآن مجید کی تلاوت میں بہت مصروف رہنا، یہ سب کام چنداں مشکل نہیں ہیں۔ ہر باہمت شخص کرسکتا ہے بلکہ ایک ضعیف بڑھیا بھی کرسکتی ہے۔ روزہ پر مداومت کرسکتی ہے۔ تہجد گذاری میں مصروف رہ سکتی ہے۔ قرآن مجید کے چند پارے پڑھ سکتی ہے۔ لیکن مردان خدا کا کام کچھ اور ہی ہے" [۵۱]

مشائخ متقدمین کی نظر میں تصوف ایک اخلاقی پروگرام کا نام تھا جس میں اپنے نیز دوسروں کے اخلاق کی درستگی کو زندگی کا سب سے اہم فرض سمجھا جاتا تھا۔ حضرت شیخ ابوالحسنؒ کا قول ہے :

لیس التصوف رسوما ولا علوما ولکنہ اخلاق [۵۲]	تصوف رسوم اور علوم کا نام نہیں ہے، بلکہ اخلاق کا نام ہے۔

حضرت شیخ محمد بن قصابؒ کہا کرتے تھے۔

التصوف اخلاق کریمۃ ظهرت فی زمان کریم من رجل کریم مع قوم کریم [۵۳]	تصوف اخلاق کریمہ ہیں جو بہتر زمانہ میں بہتر شخص سے بہتر قوم کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔

[۵۱] سیر الاولیا۔ ص۔ ۵۰۹ [۵۲] کشف المحجوب [۵۳] رسالہ قشیریہ

حضرت محمد بن علی بن حسین بن علیؓ بن ابی طالب کا قول ہے:

تصوف خلق فمن زاد علیک فی الخلق زاد علیک فی التصوف [۵۱]	تصوف خوش اخلاقی کا نام ہے یعنی جو شخص زیادہ کرتا ہے صوفی زیادہ ہوتا ہے۔

حضرت شیخ مرتعشؒ فرماتے ہیں:

التصوف حسن الخلق [۵۲]	تصوف خلق نیک کا نام ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ تصوف راہِ صدق و اخلاق حسنہ کا نام ہے [۵۳]

صوفیۂ کرام کے حالاتِ زندگی اور تصوف کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلامی تصوف، نفوسِ انسانی کو مادی نجاستوں سے پاک کرنے اور اعلیٰ اخلاق و کردار پیدا کرنے کی ایک عظیم الشان تحریک تھی۔ صوفیہ نے کارِ نبوی کو جاری رکھا اور بنی نوع انسان کے اخلاق و اطوار، فکر و عمل کو درست کرنے کی کوششیں کیں۔ مشائخِ متقدمین کے ملفوظات، تعلیم اخلاق کی سلسبیل و کوثر ہیں۔ جن کی خاموش روانی دلوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور دلوں میں اچھے عمل کا جذبہ اور ولولہ جوش مارنے لگتا ہے۔ ان بزرگوں کی کوشش صرف یہی نہ تھی کہ انسان کے ظاہری اعمال درست ہو جائیں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ برائی کے سوتے ہی بند ہو جائیں۔ انسان کا دل برائی کی طرف راغب ہی نہ ہو کہ دل کی نجاست، جسم کی نجاست سے بدرجہا بری ہے۔

---

[۵۱] کشف المحجوب
[۵۲] کشف المحجوب
[۵۳] خیر المجالس (مجلس ۱۱ قلمی نسخہ)

حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ فرمایا کرتے تھے:

"جنابت بر دو نوع است، جنابت دل ست و جنابت تن و جنابت تن از صحبت بازن حاصل شود، و جنابت دل بصحبت ناہموار، جنابت تن پاک بآب شود، اما جنابت دل بآب دیدہ محو گردد"[۵]

جنابت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک جنابت دل کی۔ دوسری جنابت بدن کی۔ بدن کی جنابت وہ ہے جو عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے حاصل ہو۔ اور دل کی جنابت نالائقوں کی صحبت سے ہوتی ہے۔ بدن کی جنابت تو پانی سے پاک ہو جاتی ہے لیکن دل کی جنابت آنسوؤں سے دھوئی جاتی ہے۔

صوفیۂ کرام کی زندگیوں کا جو پہلو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے وہ اُن کی تعلیم اخلاق ہے جن مصنفین نے اوراد و وظائف اور کشف و کرامات کے افسانوں کو مرکزی اور بنیادی حیثیت دے دی ہے۔ انھوں نے تصوف کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ خواجہ اجل شیرازیؒ کا یہ واقعہ جو حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک بار اپنی مجلس میں بیان فرمایا۔ مشائخ متقدمین کے لائحہ عمل، طریق کار اور مقصد حیات کا بہترین آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ایک شخص خواجہ اجل شیرازیؒ کی خدمت میں آیا اور مرید ہو کر خواجہ صاحبؒ کے حکم کا منتظر تھا کہ اب مجھے نماز یا درد بتلاتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے صرف یہ کہا جو بات اپنے لیے پسند نہیں کرتا وہ اوروں کے لئے بھی پسند نہ کر اور اپنے لئے اس بات کی خواہش کر جس کی اوروں کے لئے خواہش کرتا ہے۔ مدت بعد جب وہ شخص پھر حاضر خدمت ہوا تو عرض کی

[۵] اخبار الاخیار۔ ص ۶۴

کہ میں فلاں روز آپ کا مرید ہوا تھا اور منتظر تھا کہ آپ مجھے نماز یا ورد کی بابت فرمائیں گے لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ اب بھی میں اسی بات کا منتظر ہوں۔ خواجہ صاحبؒ نے فرمایا، اُس روز تجھے کیا سبق دیا تھا۔ مرید حیران رہ گیا اور کچھ جواب نہ دیا حضرت خواجہ صاحبؒ نے مسکرا کر فرمایا، اس روز میں نے کہا تھا کہ جو بات اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہ دوسروں کے لئے بھی نہ کر اور اپنے لئے اسی بات کی خواہش کر جس کی اوروں کے لئے کرتا ہے۔ چونکہ تو نے پہلا سبق یاد نہیں کیا، اب میں دوسرا سبق کس طرح سکھاؤں" ۵ل

حقیقت یہ ہے کہ تصوف، نام ہی خدمتِ خلق اور تعلیم اخلاق کا ہے۔ ہمارے مشائخ متقدمین نے اس کو یہی سمجھا تھا اور اسی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔

اِرتقاءِ روحانی۔ محبتِ الٰہیؒ، خدمتِ خلق، تعلیمِ اخلاق ——— ان سب کا نتیجہ کیا ہے؟ صوفیہ کا کہنا ہے کہ ان سب کا نتیجہ "ارتقاءِ روحانی" ہے ———

"ارتقاءِ روحانی" کی وضاحت مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی سنیئے کہ اس سے بہتر وضاحت ممکن نہیں۔ فرماتے ہیں:

"فی الحقیقت وہ "قانونِ ارتقاء" جو لامارک، ہلیپر، ابن مسکویہ اور ڈارون نے دریافت کیا ہے۔ صرف مخلوقات کے جسم ہی تک محدود ہے۔ وہ کچھ نہیں بتلاتا کہ ارتقاء کی یہ زنجیر ہیکلِ انسانی کی کڑی تک پہنچ کر پھر کہاں چلی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد ارتقاء کے منازل باقی رہتے ہیں یا نہیں؟ لیکن وہ قانونِ ارتقاء جیسے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا وہ بتلاتا ہے کہ بلاشبہ انسانیت کے مرتبہ تک پہنچنے کے بعد "ارتقاءِ جسمی" تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے بعد

ملہ فوائد الفواد۔ ص ۸ (اردو ترجمہ ص ۶

ایک "ارتقائے روحانی" کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور جسم حیوانی کو انسان کا ہیکل اختیار کرنے کے بعد بھی انسان بننے کے لئے بہت کچھ بننا اور ترقی کرنا باقی رہتا ہے۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۸ : ۱۱)	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جن لوگوں نے علم حق حاصل کیا۔ سو اللہ تعالیٰ ان کے مدارج کو ترقی دیتا ہے اور ارتفاع بخشتا ہے۔

یہی مدارج ہیں جو اولیاء اللہ اور اصحاب الجنّۃ کے ذہاب الی اللہ کی مختلف منزلیں ہیں۔ ایمان باللہ اور محبت الٰہی اس ارتقائے روحانی کی اصل ہے۔ اور ارتقاء انسانی کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پر ایمان وایقان ترقی کرے، اور اللہ کی ولایت اور دوستی اپنے اونچے مرتبوں اور مقاموں تک بلند ہو جائے:۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (۳۵ : ۱۱)	کلمات طیبہ اور صالح اللہ ہی کی طرف بلند ہوتے ہیں اور وہ عمل صالح کرنے والوں کو ارتفاع بخشتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں دو چیزیں بیان کی ہیں "کلم الطیب" اور "عمل صالح" پس انسانیت کی تکمیل اور ارتقاء کی بنیاد بھی یہی دو چیزیں ہیں۔ "کلم الطیب" سے مقصود ایمان باللہ ہے اور "عمل صالح" سے مقصود انسان کے وہ تمام کام جو صحت و اصلاح اور عدل و حقیقت کے مطابق ہوں، فرمایا کہ ایمان باللہ صعود کرتا ہے اور بلند ہوتا ہے اور عمل صالح کو خدا اونچے درجوں تک لے جاتا ہے۔[۵۱]

[۵۱] اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان" (طبع ثانی ۱۹۳۹ء لاہور) ص ۵۵، ۵۴

تصوف اور صوفیۂ کرام کے مقصدِ حیات کے متعلق جو گفتگو گذشتہ صفحات میں ہم نے کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیۂ کرام نے محبت الٰہی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا تھا۔ خدمتِ خلق کو انھوں نے اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ اس کا صلہ "ارتقار روحانی" کی شکل میں ان کو ملا۔ اور یہ "ارتقار روحانی" انسانیت کی تکمیل تھی۔

(۲) تصوفِ اسلام کی تاریخ

تصوف کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی سماج اور سیاست کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور رجحانات پر پوری طرح توجہ کی جائے تاکہ اگر ایک طرف صوفیہ کے کام کی نوعیت تاریخ کے پس منظر میں واضح ہو جائے تو دوسری طرف اُن کے دینی و مذہبی خیالات کے نشو و نما کے اصل محرکات کا پتہ بھی چل جائے۔ صوفیہ کے افکار و اعمال میں حالاتِ گرد و پیش کا ردِ عمل تلاش کرنا ازبس ضروری ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم تاریخ کو اپنا رہبر بنا کر حالات کا تجزیہ نہ کریں۔

قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا سیاسی و سماجی نظام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سیاسی نظام ترتیب دیا تھا وہ مکمل طور پر اسلام کے اصولِ مساوات کا آئینہ دار تھا۔ حاکم و محکوم کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ حکومت کا سارا کام مسلمانوں کے مشورے سے ہوتا تھا۔ بیت المال قوم کا مشترکہ سرمایہ تھا۔ رسول اکرمؐ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے اونٹ کے ایک بال زیادہ کا بھی مستحق نہیں سمجھتے تھے[1]۔ قانون تعزیرات بڑے اور چھوٹے سب کے لئے یکساں تھا۔ رسول اکرمؐ کے عدل و انصاف کے آگے اُن کی

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب الصلوٰۃ ۔ باب الصلوٰۃ القاعد۔

لخت جگر فاطمہؓ اور ایک عام مجرم دونوں برابر تھے[۱] آپ کی بارگاہ میں سلمانؓ صہیبؓ، اور بلالؓ وہی مرتبہ رکھتے تھے جو رؤسائے قریش۔ آپ کے دروازے پر نہ حاجب[۲] ہوتے تھے نہ پہرہ دار، مدینہ کی گلیوں میں غریبوں اور بے کسوں کی مدد کے لئے آپ اکثر گھومتے ہوئے نظر آتے تھے۔ چشم روزگار نے ابتدائے آفرینش سے ایسا عادلانہ نظام کائنات ہستی میں نہیں دیکھا تھا

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ کے اوپر سے خطبہ ارشاد فرمایا جو اسلامی تاریخ کا سب سے اہم خطبہ ہے۔ اس میں اسلامی سماج اور ریاست کے سب بنیادی اصول اجمالاً لیکن پوری وضاحت کے ساتھ بیان کردئے گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا[۳]

"لوگو! توجہ سے سنو اور یاد رکھو۔ ممکن ہے کہ آیندہ مجھے تم سے ملنے کا موقع نہ مل سکے۔ جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں .... جس طرح تم اس دن، اس مہینہ اور اس مقام کی حرمت کرتے ہو، اسی طرح ایک مسلمان کا خون، مال اور آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھارے ہر کام کا حساب لے گا .... دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہوجانا کہ باہم ایک

---

[۱] صحیح بخاری۔ کتاب الحدود۔

[۲] امام بخاریؒ (۸۱۰ء-۸۷۰ء) اپنے زمانے میں حاجیوں کی زیادتی سے متاثر ہوکر ایک باب کا عنوان قائم کرتے ہیں "باب ماذکر ان النبی لم یکن لہ بواب"

[۳] یہ مکمل خطبہ حدیث کی کسی کتاب میں یک جا نہیں ملتا۔ اس کے ٹکڑے مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہاں یہ سب ٹکڑے جمع کردئے گئے ہیں۔ اصل میں یہ ایک طویل خطبہ تھا۔ جس شخص کو جو جملہ یاد رہ گیا اسی کی اس نے روایت کردی۔

دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ جس طرح تمھارے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی طرح عورتوں کے حقوق تمھارے اوپر ہیں...... اُن کے ساتھ نرمی کرنا اور مہربانی سے پیش آنا۔ اور اللہ سے ڈر کر اُن کے حقوق کا لحاظ رکھنا...... غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلانا، اور جو خود پہنو وہی اُن کو پہنانا۔ اُن سے کوئی خطا ہو تو درگذر کرنا یا اُن کو جدا کر دینا۔ وہ بھی اللہ ہی کے بندے ہیں۔ ان پر سختی روا نہ رکھنا۔

نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر۔ تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم خاک سے بنے تھے۔

تمھارے کسی بھائی کی کوئی چیز تمھارے لئے اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ رضامندی نہ بخش دے۔ دیکھو ناانصافی نہ کرنا۔

میں نے تمھارے درمیان ایک چیز چھوڑی ہے۔ جس کو اگر تم مضبوط پکڑو گے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ یاد رکھو وہ قرآن ہے۔

لوگو! عمل میں خلوص، مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی، اور جماعت میں اتحاد یہ تین باتیں ایسی ہیں جو سینہ کو پاک رکھتی ہیں.......

جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دئے گئے۔ اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ربیعۃ بن الحرث کے بیٹے کا خون باطل کئے دیتا ہوں۔

جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دئے گئے۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود، عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔"

یہ صدائے دل نواز جو ناقہ پر سے بلند ہوئی تھی، دنیا میں اخوت، مساوات اور عدل کا پہلا اور آخری پیغام تھی۔ اسلامی سماج اور سیاست جن اصولوں پر منظم

ہوئی تھی وہ پوری وضاحت کے ساتھ یہاں بیان کر دیئے گئے تھے ۔ آنے والی نسلوں کے لئے سرورِ کائنات صلعم کا یہ خطبہ چراغِ راہ کی مانند تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین نے پوری طرح اس اعلانِ نبوت کی پاسداری کی۔ انھوں نے نظامِ خلافت، منہاجِ سنت پر ترتیب دیا اور اپنے طریقہ کار میں راہِ نبوی کا اتباع کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں :

"جس طرح وجودِ نبوت میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا، اسی طرح ان کی شخصیت بھی جامع و حاوی تھی۔ دینی دعوت اور شرعی اجتہاد و امر، حکومت و فرمانروائی اور قوام ۔نظامِ شرع، نظامِ شریعت اور نظامِ سیاست ۔ یہ سب اُن کی ذات میں اکٹھے تھے ۔ ان کی حکومت سچے اور حقیقی اسلامی نظام پر تھی۔ یعنی حکومتِ شوریٰ ۔جس کو آج کل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہہ کے ساتھ ری پبلک کہہ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہو گیا [۱]

خلافتِ راشدہ کے بعد جو سیاسی نظام قائم ہوا وہ منہاجِ سنت پر نہ تھا۔ بنی اُمیہ کے زمانے میں اسلام کے سیاسی نظام کا سارا مرکز و محور بدل گیا۔ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ عوام سے وہ پورا ربط اور تعلق، جو خلفاء راشدین کے عہد کی خصوصیت تھی، ختم ہو گیا۔ دروازوں پر حاجب بٹھا دیئے گئے۔ مسجدوں میں مقصورے تعمیر کرلئے گئے۔ بیت المال ذاتی ملکیت سمجھا جانے لگا۔ مسلمانوں کی دینی زندگی کی اصلاح و تربیت، جو اب تک خلفاء کے اہم ترین فرائض میں شامل تھی نظر انداز کردی گئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم اور خلفاء راشدین کے زمانے میں سیاسی اور دینی فرائض کا جو اجتماع تھا، وہ ماضی کی داستان بن کر رہ گیا۔ اسلامی زندگی کی اجتماعیت فنا

---

[۱] جزیرۂ عرب اور مسئلہ خلافت ۔ ص ۱۰

ہوگئی۔ مذہب اور سیاست کے راستے بدل گئے۔ مسلمانوں کی ملّی زندگی کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ شیخ علی ہجویری رح نے اس واقعہ کو اپنے صوفیانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

"یکے از مدعیان علم درویشے را گفت کہ ایں کبود چرا پوشیدی۔ گفت از پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سہ چیز بماند یکے فقر و دیگر علم، و سہ دیگر شمشیر شمشیر سلطاناں یافتند، نہ در جائے آں کار فرمودند۔ و علم علماء اختیار اختیار کردند۔ باموختن بندہ کردند۔ و فقر گروہ فقراء اختیار کردند، و آنرا آلتِ غنا ساختند من بر مصیبت ایں سہ گروہ کبود اندر پوشیدم"[1]

ایک علم کے مدعی نے ایک فقیر سے کہا کہ تو نے نیلگوں لباس کیوں پہنا ہے، اس نے جواب دیا کہ پیغمبر صلعم سے تین چیزیں باقی رہیں۔ ایک فقیری دوسرے علم، تیسرے تلوار۔ تلوار بادشاہوں نے پائی مگر انھوں نے اس کو موقع پر استعمال نہ کیا، اور علمائے علم اختیار کیا، مگر صرف سیکھنا ہی پسند کیا اور فقیری فقیروں کے گروہ نے پسند کی مگر اس کو امیری کا آلہ بنایا۔ میں نے ان تینوں گروہوں کی مصیبت پر نیلگوں لباس پہنا ہے۔

اسلامی زندگی کی اجتماعیت کے ختم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی وحدتِ عمل جاتی رہی۔ مسلمانوں کا دین دار طبقہ یہ خیال کرنے لگا کہ حکومت کی ملازمت اب دین کی خدمت نہیں رہی بلکہ دنیاداری کے مترادف ہوگئی۔ اس بنا پر بہت سے بزرگوں نے حکومتِ وقت سے قطع تعلق کرلیا، اور پہلی صدی ہجری ہی میں

---

[1] کشف المحجوب۔ ص ۳۹۔

مسلمانوں کا سیاسی نظام بعض بہترین شخصیتوں کی خدمات سے محروم ہوگیا۔

پھر بنی امیہ کے زمانے میں کچھ ایسے ناخوش گوار واقعات رونما ہوئے جنھوں نے ملت کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچایا۔ وہ حسرت ویاس کے ساتھ نبی صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانے کو یاد کرتے تھے۔ بنی امیہ نے اپنے طرزِ عمل سے ایسا شدید تقابل پیدا کر دیا تھا کہ لوگوں کو بڑی تکلیف ہونے لگی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی علاقے میں گورنر مقرر کرتے تو ہدایت فرماتے کہ لوگوں پر نرمی کی جائے جب معاذ بن جبل کو یمن کی گورنری پر مامور کیا تو فرمایا:

یسرا ولا تعسرا و بشرا ولا تنفرا و تطاوعا ولا تختلفا	آسانی پیدا کرنا، دشواری پیدا نہ کرنا لوگوں کو بشارت دینا، اور اُن کو وحشت زدہ نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا اور اختلاف نہ کرنا۔

معاذ جب چلنے کے لئے تیار ہوئے، اور رکاب پاؤں میں ڈالی تو پھر مزید ہدایت فرمائی۔

احسن خلقك للناس	لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کا برتاؤ کرنا [۵]

حضرت عمرؓ کا یہ معمول تھا کہ ہمیشہ گورنروں کے متعلق لوگوں سے پوچھتے رہتے تھے۔ اصابہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے جریرؓ سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کے متعلق دریافت فرمایا تو انھوں نے یہ الفاظ کہے:

[۵] سیرت النبی (حصہ اول، مجلد دوم) ص ۷۰

ترکتہٗ فی ولایتہ اکرم الناس مقدرۃ واقلھم قوۃً وھو بھم کالام البرۃ یجمع بھم کما یجمعُ الذرۃ اشد الناس عند الباس واجب قریش عند الناس۔	میں نے ان کو گورنری میں اس حال میں چھوڑا کہ وہ مقدرت میں شریف ترین انسان تھے۔ ان میں سختی بہت کم تھی اور لوگوں کے لئے مثل مادر مشفقہ کے تھے، اُن کی روزی کو چیونٹی کی طرح جمع کرتے تھے۔ لڑائی میں سب سے زیادہ سخت تھے اور قریش میں لوگوں کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔

عہد بنی اُمیہ میں گورنروں کا طرزِ عمل بالکل اس کے برعکس تھا۔ زیاد، مغیرہ بن شعبہ اور حجاج کے مظالم سے لوگ کانپ اُٹھے تھے۔ ایک طرف رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بے تابی کہ بار بار فرماتے ہیں کہ خوش خلقی کا برتاؤ کرنا، دوسری طرف زیاد کا وہ خطبۂ تبرا جو اس نے بصرہ کی جامع مسجد میں دیا تھا

ناممکن تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اس تبدیلی کا ردِ عمل ظاہر نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ شام کے کچھ نبطیوں کو جزیہ ادا نہ کرنے کی سزا میں دھوپ میں کھڑا ہوا دیکھ کر ہشام بن حکیم بن حزام بے اختیار پکار اُٹھے تھے۔

اشھد لسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ لیعذب الذین یعذبون الناس فی الدنیا۔	میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

حجاج بن یوسف کے مظالم دیکھ کر حضرت خواجہ حسن بصری ؒ کو اتنی تکلیف ہوئی کہ گیارہ سال تک گوشہ گیر رہے اور جب حجاج کے مرنے کی خبر سنی تو سجدہ میں

گر گئے اور کہا :

اللّٰھم اِنی اخافک واخاف من لا یخافک [1] — اے اللہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں اور اس سے ڈرتا ہوں جو تجھ سے نہیں ڈرتا۔

واقعہ کربلا، محاصرۂ مکہ، واقعۂ حرہ۔ یہ سب ایسے واقعات تھے جن سے مسلمانوں کے دین دار طبقے کو بڑا شدید رنج ہوا۔

پھر فتوحات کا جو ہنگامہ برپا تھا اس میں دینی تقاضوں کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ ولید کے زمانے میں مسلمانوں کی فوجیں اگر ایک طرف اسپین میں وزی گوتھ کے سیاسی نظام کو مسمار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں تو دوسری طرف وسط ایشیا میں مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب پوری قوت کے ساتھ امنڈ رہا تھا۔ ان رزمی ہنگاموں میں دینی جذبات کم، جاہ و حشمت کی خواہش زیادہ کارفرما تھی۔ وہ معاصرین جن کے دل و دماغ پر غزوات نبوی اور خلفاء راشدین کی جنگوں کے نقشے جمے ہوئے تھے، جب اس حب زر و حشم کے نظارے دیکھتے تھے تو ان کے دلوں کو تکلیف ہوتی تھی

کیا 'اسلام' ان جنگوں کی اجازت دیتا ہے ؟ کیا 'اسلام' صرف حکومتیں قائم کرنے کے لئے آیا ہے ؟ کیا مغیرہ، زیاد اور حجاج کا طریقۂ کار کسی طرح احکام شرع کے مطابق ہے ؟ —— یہ اور ایسے ہی صدہا سوالات دین دار لوگوں کے ذہن میں گھومتے تھے۔ وہ نہایت افسوس کے ساتھ ملی وحدت کے خاتمہ کو محسوس کرتے تھے اُن کی نظروں میں اب 'خلافت'، 'خلافت' نہ تھی، ملک عضوض، میں بدل چکی تھی۔ ان کا دل ان حالات سے ایسا گھبرایا کہ سوائے حکومتِ وقت سے قطع تعلق کر لینے کے کوئی دوسری راہ اُن کو نظر نہ آئی ۔

[1] سرور الصدور (قلمی نسخہ) ملفوظات شیخ حمید الدین ناگوری ؒ

دامن اُس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بے کار، گریباں تو میرا دور نہیں

یزید بن معاویہ نے ابوالاشعث صغانی کو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ وہ مدینہ میں ایک صحابی سے ملے اور اس فتنہ کے متعلق ان کی رائے دریافت کی۔ جواب دیا "میرے دوست! ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے وصیت کی ہے کہ اگر تمھارے زمانے میں اس قسم کے فتنے پیدا ہوں تو احد پر جاکر اپنی تلوار توڑ ڈالو۔ پھر اپنے گھر میں بیٹھ رہو۔ اور اگر کوئی تمھارے گھر میں گھس آئے تو بستر پر لیٹ جاؤ، اگر بستر کا بھی رُخ کرے، تو گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ اور کہو کہ اپنے اور میرے دونوں کے گناہوں کا وبال اپنے سر پر لو اور دوزخ میں چلے جاؤ اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔ اس لئے میں نے اپنی تلوار توڑ ڈالی ہے اور خانہ نشین ہوگیا ہوں" ——— ایسے بہت سے بزرگ تھے جنھوں نے عہد بنی اُمیہ میں حکومتِ وقت سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے گوشہ گیر ہونے کے بجائے عملاً اصلاح کی کوشش کیوں نہ کی؟ انھوں نے بنی اُمیہ کے اقتدار کو تسلیم کیوں کیا؟ اگر وہ خاموش رہنے کے بجائے عملاً نظامِ حکومت کی اصلاح کی کوشش کرتے تو ملت کو کہیں زیادہ فائدہ پہنچتا! ——— یہ سب سوالات اپنی جگہ درست ہوسکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طبقہ نے جو خاموشی اختیار کی وہ بھی ملت کے مفاد ہی کی خاطر تھی۔ بنی اُمیہ کے اقتدار کے خلاف جنگ، ملت میں انتشار پیدا کرنے کے مترادف ہوتی۔ مسلمان اس وقت شدید اندرونی اور بیرونی خطرات سے دوچار تھے۔ صدہا فتنے تاک میں لگے ہوئے تھے۔ ایسے نازک وقت میں بنی اُمیہ کے خلاف اگر کوئی تحریک اٹھتی تو ملت کے سارے اجزاء درہم برہم ہو جاتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوذر غفاریؓ جیسا مجاہد بھی اِن حالات میں خاموشی اختیار

کرنے پر مجبور ہو گیا!

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح انعقاد خلافت کی صورتوں کے ضمن میں فرماتے ہیں :-

"پھر اگر کوئی ایسا شخص جو ان اوصاف کا جامع نہ ہو لوگوں پر غلبہ حاصل کرلے تو اس کی مخالفت پر بھی جرأت نہ کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ غالباً اب وہ شخص بغیر لڑائیوں اور جھگڑوں کے خلافت سے معزول نہیں ہو سکتا ہے اور یہ فساد بہ نسبت اس مصلحت کے بہت بڑا ہے جو خلافت سے مقصود ہوتی ہے۔ اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ کیا ہم اُن آئمہ سے قتال نہ کریں۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں۔ جب تک وہ تمہارے اندر نماز کو قائم رکھیں اور فرمایا جس صورت میں تم صریح کفر دیکھو اور خدا کی طرف تمہارے پاس اس کی دلیل موجود ہو" [۵۱]

اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:-

"انفراد و فرقہ ہر حال میں بربادی و ہلاکت ہے۔ پس جماعت سے کسی حال میں باہر نہ ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ اوائل عہد بنو اُمیہ میں جب کہ صحابۂ کرام کی جماعت ہر ناحیۂ ملک میں موجود تھی، تمام صحابہ نے اس پر اجماع کیا کہ گو امراء بنو اُمیہ خلافت کے اہل نہیں۔ طریق ہدیٰ و سنت سے منحرف ہو گئے، نظام شوریٰ درہم برہم ہو گیا، بدعت و احداث اور صریح ظلم و جور اُن کا شیوہ ہے۔ بایں ہمہ اُن پر خروج جائز نہیں۔ اِنھی کی اطاعت کرنی چاہیئے، اِنھی کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیئے۔ اِنھی کو زکوٰۃ دینی چاہیئے۔ حفظِ ملک و ملت کی راہ میں

---

۵۱ حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم۔ ص ۳۵۸ (لاہور ایڈیشن)

نکلیں تو انھی کے جھنڈے کے نیچے سمع و طاعت کے ساتھ جمع ہو جانا چاہیے"[۵۱]

بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن بزرگوں نے بنی اُمیہ کے خلاف خروج کے مقابلے میں گوشہ گیری کو ترجیح دی۔ اُنھوں نے ملت کی بہبودی کی خاطر ایسا کیا تھا۔

صوفیہ کا پہلا طبقہ یہ ہے حالات کا وہ پس منظر جس میں صوفیہ کا پہلا طبقہ وجود میں آیا۔ بصرہ اور کوفہ، جہاں اُموی گورنروں نے ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے تھے، تصوف کے سب سے پہلے مرکز بنے اور یہیں سے یہ تحریک اسلامی دنیا کے اور حصوں میں پھیلی۔

صوفیہ کے اس پہلے طبقہ کا زمانہ سنہ ۱۶ھ سے سنہ ۸۵۰ھ تک مقرر کیا گیا ہے اس میں حضرت اویس قرنی رض حضرت حسن بصری رح، حضرت مالک دینار رح۔ حضرت محمد واسع رح، حضرت حبیب عجمی رح، حضرت خواجہ فضیل بن عیاض رح۔ حضرت ابراہیم ادہم رح وغیرہم شامل ہیں۔ ان بزرگوں کے حالات خواجہ فریدالدین عطار رح نے تذکرۃ الاولیا میں درج کئے ہیں۔

اس دور کے صوفیہ کی خصوصیات یہ تھیں:-

(۱) ان بزرگوں پر "خشیتِ خداوندی" کا بڑا غلبہ تھا اور اس بنا پر وہ "توبہ" پر بہت زور دیتے تھے۔ ان کی پوری زندگی سے توبہ و استغفار کی کیفیت ظاہر ہوتی تھی۔ حضرت رابعہ بصری رح فرمایا کرتی تھیں کہ "زبانی توبہ جھوٹوں کا کام ہے"[۵۲]

حضرت حسن بصری رح ایک رات اپنے گھر میں رو رہے تھے۔ کسی نے رونے کا سبب

---

[۵۱] جزیرۂ عرب اور مسئلہ خلافت ص ۱۶ [۵۲] تذکرۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) ص ۵۷

دریافت کیا۔ اور کہا آپ تو بڑے پرہیز گار ہیں۔ جواب دیا۔ اس لئے روتا ہوں کہ شائد بے علمی سے یا بے ارادہ کوئی کام مجھ سے ہوگیا ہو یا غلطی سے کوئی قدم نامناسب مقام پر رکھ دیا ہو اور میرا یہ فعل درگاہِ ایزدی میں ناپسند ہوا ہو۔"[1]

بعض مستشرقین کا کہنا ہے کہ "خشیۃ الٰہی" کا جذبہ ان بزرگوں میں "حب الٰہی" سے بڑھ کر تھا۔

(۲) اِن بزرگوں نے اپنے طرزِ فکر کو اجتماعی شکل دینے کی کوشش نہیں کی، وہ انفرادی طور پر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے گرد مریدین کا کوئی وسیع حلقہ پیدا نہیں کیا۔ علاوہ ازیں اس دور کے صوفیہ نے کوئی نئی اصطلاح یا کوئی نیا طریقہ کار ایجاد نہیں کیا۔ وہ اپنے ماحول سے کچھ ایسے دل برداشتہ تھے کہ اس سے علیحدہ رہ کر عبادت کرنے میں اس کو سکون حاصل ہوتا تھا۔ حُب جاہ و حشم کے وہ مناظر جو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا طرّہ امتیاز ہو کر رہ گئے تھے۔ رسول عربی ؐ کی تعلیم کے منافی تھے۔ اور اس دور کے صوفیہ کو اُن سے یہ ایک بنیادی اختلاف تھا۔

(۳) اس دور کے صوفیہ نے اپنے خیالات کا اظہار تصانیف میں بہت کم کیا ہے صرف شیخ عبداللہ بن مبارک ؒ (المتوفی ۱۸۱ھ/۷۹۷ء) اور حضرت سفیان ثوری ؒ (المتوفی ۱۶۱ھ/۷۷۷ء) نے کچھ کتابیں تصنیف کی تھیں۔ شیخ عبداللہ ؒ نے کتاب الزہد لکھی تھی[2] حضرت سفیان ثوری ؒ کے قلم سے چار کتابیں نکلیں:

(۱) الجامع الکبیر فی الفقہ و الاختلاف (۲) الجامع الصغیر

---

[1] تذکرۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) ص ۴۴

[2] BROCKELMANN, GESCHICHTE DER ARABISCHEN LITTERATUR (SUPPLEMENT) I P.256

(۳) کتاب الفرائض اور (۴) کتاب التفسیر۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے مرتے وقت وصیت کر کے اپنی تمام تصانیف نذرِ آتش کرادی تھیں، لیکن اُن کی کتاب التفسیر کا ایک قدیم اور نادر نسخہ رام پور کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۱۴) اس دور کے صوفیہ نے جیساکہ اوپر عرض کیا گیا ہے حکومت سے قطع نظر کر لیا تھا۔ وہ سرکاری ملازمت اور خلفار کی صحبت کو بُری نظر سے دیکھتے تھے خلفار سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرتے، اگر کبھی مجبوراً ملنا پڑ جاتا تو نہایت جرأت اور ہمّت کے ساتھ اُن پر تنقید کرتے) خواجہ فریدالدین عطار رح نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید، اپنے وزیر فضل کے ہمراہ خواجہ فضیل بن عیاضؒ کے درِ دولت پر حاضر ہوا، دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوچھا۔ کون ہے؟ وزیر نے جواب دیا۔ امیرالمومنین۔ خواجہ فضیل رح نے فرمایا۔ امیرالمومنین کو مجھ سے کیا کام۔ اور مجھے اُن سے کیا واسطہ۔ وزیر نے کہا بادشاہ کی اطاعت واجب ہے، فرمایا مجھے حیران نہ کرو۔ وزیر نے کہا۔ اندر آنے کی اجازت دو، ورنہ ہم حکماً اندر آجائیں گے۔ فرمایا۔ اجازت تو نہیں دیتا، حکماً اندر آسکتے ہو۔ چنانچہ وزیر اور خلیفہ اندر گئے۔ خواجہ فضیل رح نے چراغ گل کر دیا تاکہ ہارون الرشید کو نہ دیکھ سکیں۔ اسی اثنا میں ہارون کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے چھو گیا۔ فرمایا۔ کیسا نرم ہاتھ ہے۔ کاش کہ دوزخ کی آگ سے بچ جائے۔ خلیفہ نے درخواست کی کہ کچھ ہدایت فرمائیے۔ جواب دیا۔ تیرا باپ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا مصطفےٰ صلعم سے اس نے درخواست کی تھی کہ مجھے کسی صوبے کا حاکم بنا دو تو انھوں نے فرمایا: یا عم بلک لنفسک یعنی تجھے تیرے نفس کا امیر کیا۔ ہارون الرشید بولا کچھ اور فرمائیے، فرمایا۔ یہ مُلک تیرا گھر ہے اور خلقت تیری اولاد۔ ماں باپ کے ساتھ نرمی، بہن بھائیوں پر مہربانی، بچے بچیوں سے نیک سلوک کر

اگر کوئی مفلس بڑھیا رات کو بھوکی سو جائے گی تو قیامت کے دن وہ بھی تیری دامن گیر ہوگی۔ تیرے ساتھ جھگڑے گی۔ [۱]

حضرت خواجہ فضیلؒ کے علاوہ اور بہت سے بزرگ تھے جنھوں نے اسی قسم کا رویہ اختیار کر لیا تھا اور جب کبھی مجبوراً خلفاء سے دو چار ہو جاتے تھے تو سخت الفاظ میں ان کو فرائض سے آگاہ کرتے تھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں خلیفہ منصور کو پکڑ لیا اور کہا: امیر المومنین! حضرت عمرؓ نے ایک حج میں جس کے تمام مصارف پر سولہ دینار خرچ ہوئے تھے، فرمایا تھا۔

مَا اَرَانَا اِلَّا وَقد اجحفنا بیت المال۔ — یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے سارا بیت المال لے لیا

آپ نے خدا اور اُمتِ محمدیہ کا بے شمار مال بغیر اجازت صرف کیا ہے۔ آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ ——— منصور لاجواب ہو گیا۔ بعد کو انھیں سلسلۂ حکومت میں منسلک کرنا چاہا تو وہ روپوش ہو گئے۔

امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ نے طرح طرح کے مصائب برداشت کئے لیکن حکومتِ وقت کی ملازمت کو ناپسند کیا۔ یزید گورنر کوفہ نے امام صاحبؒ کو میر منشی اور افسر خزانہ مقرر کرنا چاہا۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ یزید نے قسم کھا کر کہا جبراً منظور کرنا ہوگا۔ دوستوں نے بھی سمجھایا، لیکن امام صاحب انکار پر قائم رہے، اور کہا کہ اگر یزید یہ کہے کہ "مسجد کے دروازے گن دو" تو بھی مجھ کو گوارا نہیں چہ جائیکہ وہ کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پر مہر کروں" یزید نے غصہ میں

[۱] تذکرۃ الاولیاء ص ۸۴-۸۳ (اردو ترجمہ)

آکر حکم دیا کہ ہر روز اُن کے دس درے لگائے جائیں۔ اس ظالمانہ حکم کی بھی تعمیل ہوئی لیکن امام صاحب اپنی ضد سے باز نہ آئے [۵۱] پھر خلیفہ منصور نے قضا کا عہدہ پیش کیا۔ امام صاحب نے انکار کیا اور کہا کہ میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا منصور نے غصہ میں آکر کہا "تم جھوٹے ہو۔ امام صاحب نے کہا، اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ دعوے ضرور سچا ہے کہ میں قضا کے قابل نہیں، کیونکہ جھوٹا شخص قاضی مقرر نہیں ہو سکتا" منصور نے قسم کھا کر کہا کہ تم کو قبول کرنا ہوگا۔ امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ ہرگز قبول نہ کروں گا، امام صاحب قید خانے میں بھیج دئے گئے اور وہاں سے اس وقت چھوٹے کہ قید حیات سے چھوٹے [۵۲]

قرونِ اولیٰ کے دین دار طبقہ کا یہ طرزِ عمل حقیقت میں حکومت کی بے راہ روی کے خلاف احتجاج تھا۔ وہ مسلمانوں کی سیاست اور سماج کو خالص اسلامی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے ——— ان بزرگوں کے اس رویّہ سے ملت کو بڑا فائدہ پہنچا۔

(۱) اگر یہ بزرگ باطنی اصلاح و تربیت، تزکیۂ نفس، عبادات وغیرہ پر زور نہ دیتے تو اسلام محض ایک سیاسی پروگرام بن کر رہ جاتا۔ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے زمانے میں ان بزرگوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام صرف ملک گیری و ملک رانی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ اصلاح و تربیت کا ایک مکمل نظام ہے جو انسان کو "ارتقاءِ روحانی" کا راستہ دکھاتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے دورِ اول میں سے اگر ان بزرگوں کے حالات کو حذف کر دیا جائے تو مسلمانوں کی تاریخ ملک گیری

---

[۵۱] سیرۃ النعمان۔ مولانا شبلی۔ (کانپور ۱۸۹۳ء) ص ۵۸-۵۷۔

[۵۲] سیرۃ النعمان ص ۶۳-۶۲۔ نیز کشف المحجوب۔ ص ۱۴۶، ۱۴۵ (اردو ترجمہ)

اور جہاں بانی کی داستان بن کر رہ جائے۔

(۲) تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ اسلام کی تعلیم اور اثرات، خلفاء کے ذریعے نہیں بلکہ ان ہی بزرگوں کے ذریعے پھیلے۔ خلفاء کا نہ عوام سے کبھی براہ راست تعلق رہا۔ نہ اُن کی زندگیوں میں خلفاء راشدین کی زندگی جیسی کشش پیدا ہوئی۔ وہ اسلامی طرزِ زندگی کے آئینہ دار نہ تھے، اس لئے اسلام کی تعلیم کی نشرو اشاعت کا ذریعہ ہی نہیں بن سکتے تھے۔ اسلام کے دینی نظام کو زندہ رکھنے اور پھیلانے کا کام ان ہی بزرگوں کے ذریعہ ہوا۔

(۳) پھر جس طبقہ نے اپنی علیحدگی اور بے تعلقی سے خلفاء کو اُن کی بے راہ روی کا احساس دلایا، اور موقعہ پاکر متنبہ بھی کیا، وہ ان ہی بزرگوں کا تھا۔ ابھی اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ جو شخص اللہ کی ربوبیت پر ایمان کامل رکھتا ہے وہ دنیا کی طاقتوں کے سامنے بڑا بے باک اور حق گو ہوتا ہے کہ ع

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

امام ابوحنیفہ رح، امام سفیان ثوری رح، خواجہ فضیل بن عیاض رح، خواجہ حبیب عجمی رح، حضرت ابراہیم ادہم رح وغیرہم وہ بزرگ تھے جنھوں نے خلفاء کو اُن کی بے راہ روی پر سختی سے آگاہ کیا اور اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دکھایا کہ حکومت سے بے تعلقی کا سبب ان کا غیر اسلامی کردار تھا۔ اگر ہمارے مذہبی تذکرے اور تاریخ کی کتابیں کسی حد تک بھی قابلِ اعتبار ہیں (اور میرے خیال میں نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں)، تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ اِن بزرگوں ہی نے مسلمان فرمانرواؤں کو اسلام کے احکامات کو مکمل طور پر فراموش کر دینے سے روکا ہے۔ ان لوگوں کو جو اپنی طاقت وسطوت کے غرور میں سب کچھ بھول چکے تھے، یہ یاد دلانا کہ اُن سے بالاتر بھی کوئی ہستی ہے

جو انسانی اعمال کا جائزہ لیتی ہے۔ اِن ہی بزرگوں کا کام تھا۔ دربار میں ایسے خوشامدیوں کا ہجوم رہتا تھا، جن کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ خلفاء وقت کے مزاج کے خلاف کوئی بات کہنے کی جرأت کریں۔ ان سیاسی طاقتوں کے رویے پر تنقید کی کوئی آواز سُنائی دیتی ہے تو اٹھی بوریہ نشین فقراء کے جھونپڑوں سے۔

(۴) ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جب تاریخ کا کوئی طالب علم، اسلام کا بہ حیثیت ایک مذہبی تحریک کے مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے بعد ان ہی بزرگوں کی حیات طیبہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ بزرگ اسلام کی دینی تاریخ کا ایک جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اُن کی زندگیوں کو غیر اسلامی قرار دے کر اگر نظر انداز کر دیا جائے تو نہ صرف اسلام کی مذہبی تاریخ میں ایک خلا پیدا ہو جائے بلکہ اسلام کے دینی نشوونما کا صحیح مطالعہ ہی ناممکن ہو جائے "تکمیلِ اخلاق" جو بعثتِ نبوی کا اہم مقصد تھا، ہمیشہ اِن بزرگوں کا مطمح نظر رہا۔

صوفیہ کا دوسرا طبقہ اِسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کا سب سے اہم واقعہ خلافت کا ملوکیت میں تبدیل ہونا تھا۔ طبقۂ اول کے صوفیہ اپنے فکری و عملی نشوونما کے اعتبار سے اس تبدیلی کے خلاف ردِ عمل کو ظاہر کرتے ہیں، صوفیۂ کرام کا یہ دوسرا طبقہ اسلامی تاریخ کے ایک دوسرے نہایت اہم دور سے تعلق رکھتا ہے، یونانی فلسفہ اور علوم جب مُسلمانوں میں رائج ہوئے تو اسلامی سوسائٹی میں "عقلیت" کا ایک طوفان آیا اور عوام کے عقائد میں تذبذب، ایمان میں شک اور ذہن میں خلش پیدا ہونے لگی۔ اس دور کے صوفیہ کے کارناموں کا اسی پس منظر میں مطالعہ کرنا چاہیے۔

یونانی علوم سے مسلمانوں کا سب سے پہلا تعارف فتح مصر کے بعد ہوا

اسکندریہ، یونانی علوم کا مرکز تھا۔ بنی اُمیہ کے زمانے میں صرف طب اور کیمسٹری (CHEMISTRY) کی طرف توجہ کی گئی۔ اور ان ہی فنون سے متعلق کچھ کتابیں بھی عربی زبان میں منتقل کی گئیں۔ خلافتِ عباسیہ کی بنیاد پڑنے کے بعد دوسرے یونانی علوم بھی آہستہ آہستہ مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بننے لگے۔ ہارون الرشید نے ایک بیت الحکمت قائم کیا جس میں غیر زبانوں کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کا انتظام تھا۔ یونانی فلسفہ کی گرم بازاری مامون الرشید سے شروع ہوئی۔ اس نے قیصر روم کو خط لکھا کہ ارسطو کی جس قدر کتابیں مل سکیں، بغداد بھیج دی جائیں۔ قیصر روم نے تلاش کے بعد ایک بڑے ذخیرے کا پتہ لگا لیا۔ لیکن بھیجنے میں تامل کیا اور ارکانِ دولت سے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے یک زبان ہو کر کہا "کچھ مضائقہ نہیں فلسفہ اگر مسلمانوں میں پھیلا تو اُن کے مذہبی جوش کو بھی ٹھنڈا کرکے رہے گا۔"[ف۵] چنانچہ پانچ اونٹ لاد کر فلسفہ کی کتابیں مامون کے پاس بھیج دی گئیں۔ مامون نے یعقوب بن اسحاق کندی کو ترجمے پر مامور کیا۔ بیت الحکمت کے افسروں کو روم، آرمینیا، مصر، شام وغیرہ مقامات پر فلسفہ کی کتابیں جمع کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ مامون کی دلچسپی کو دیکھ کر تمام دربار میں جوش پھیل گیا۔ مامون کے ندیموں نے اپنے ایلچی دوسرے ملکوں میں بھیج کر فنونِ حکمیہ کی ہزاروں کتابیں منگوائیں۔

مامون نے مناظرہ کا باقاعدہ اہتمام کیا۔ سہ شنبہ کو صبح ہی سے علماء اور فلاسفہ اس میں شرکت کرتے تھے۔ فلسفہ کی اس گرم بازاری نے آخر اپنا اثر دکھایا اور مامون عقائد میں معتزلی المذہب ہو گیا۔ قرآن کے حادث ہونے کا

ف۵ المامون، حصہ دوم ص ۱۷۷ (طبع سوم آگرہ)

مسئلہ اس کے دل میں بیٹھ گیا۔ اس نے اعلان کرادیا کہ جو لوگ قرآن کے قِدم کے قائل ہیں اور اس عقیدے سے باز نہیں آتے انھیں پابہ زنجیر بغداد بھیج دیا جائے۔ تاکہ خلیفہ خود ان کی موت و حیات کا فیصلہ کرے۔ مامون کے ان احکامات سے عوام میں خوف و ہراس پیدا ہوگیا۔ علامہ ابن تیمیہؒ رسالہ الفرقان میں لکھتے ہیں:

"مامون الرشید نے طرطوس سے جو کہ بغداد اور مسلمانوں کا سب سے بڑا سرحدی مقام تھا اور ہر طرف سے اہل دین وہاں آتے تھے، اور قیام کرتے تھے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ اور سری سقطیؒ نے وہاں قیام کیا اور ابو عبیدہ اور صالح بن احمد بن حنبلؒ وہاں کے قاضی مقرر ہوئے، بغداد میں اپنے نائب اسحاق بن ابراہیم بن مصعب کے نام ایک مراسلہ روانہ کیا کہ وہ لوگوں کو مسئلہ خلق قرآن کی دعوت دے لیکن کسی نے اس عقیدے کو قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد اس نے دوسرا مراسلہ بھیجا جس میں یہ حکم تھا کہ جو لوگ اس عقیدے کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے نام قلم بند کرکے اس کے پاس بھیج دے۔ اب اکثر لوگوں نے اس عقیدے کو تسلیم کرلیا اور جن سات آدمیوں نے انکار کیا وہ قید کرلئے گئے۔ قید ہونے کے بعد ان میں سے بھی پانچ آدمیوں نے اس عقیدے کو قبول کرلیا۔ صرف دو شخص یعنی امام احمد بن حنبلؒ اور محمد بن نوحؒ رہ گئے جو اپنے انکار پر قایم رہے۔ اس لئے ان لوگوں نے مامون کی خدمت میں ان دونوں بزرگوں کو روانہ کردیا، لیکن ان کے پہنچنے سے پیشتر وہ اپنے بھائی ابو اسحاق کو وصیت کرکے مرگیا۔ یہ ۲۱۸ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد امام احمد بن حنبلؒ ۲۲۰ھ تک قید میں رہے لیکن جب ان لوگوں کو فتنہ و فساد کا خوف ہوا تو ان کو مار پیٹ کر رہا کردیا۔ اب جہمیہ کے مذہب کو فروغ حاصل ہوا چنانچہ جو لوگ اس کو قبول کرلیتے تھے وہ ان کو عطیہ دیتے تھے ورنہ ان کا وظیفہ بند کردیتے تھے۔ ان کو سرکاری عہدوں سے معزول کردیتے تھے اور ان کی شہادت

قبول نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب لڑائیوں میں قیدی پکڑتے تھے، تو ان کو بھی اس مذہب کے قبول کرنے پر مجبور کرتے تھے، اگر وہ لوگ اس مذہب کو مان لیتے تھے تو فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیتے تھے، ورنہ ان کا فدیہ قبول نہیں کرتے تھے اس کے بعد واثق خلیفہ ہوا تو یہ سختی اور بھی بڑھ گئی، لیکن متوکل کا زمانہ آیا تو ابتلاء وامتحان کے اس دور کا خاتمہ اور سنت کا ظہور ہوا"[1]

عقلیت کا جو سیلاب مامون کے دربار سے نکلا تھا مسلمانوں کی زندگی میں لامرکزیت پیدا کرنے کا باعث بن گیا۔ اعتقاد کی ساری بنیادیں ہل گئیں اور ملت کی ذہنی زندگی میں انتشار پیدا ہوگیا۔ یہاں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام تلاش وتحقیق، فلسفہ وحکمت کا مخالف ہے۔ قرآن نے انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ کائناتِ ارضی وسماوی کی ایک ایک چیز پر غور کرے اور نتائج اخذ کرے[2] لیکن اپنے دینی وجدان پر مہر نہ لگالے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ وہ عقلیت جس نے دینی وجدان کے سایے میں پرورش نہ پائی ہو۔ انفرادی اور ملی زندگی میں سم قاتل کا اثر رکھتی ہے۔

(۱) جب اعتقاد ویقین کی جگہ شک وانکار لے لیتا ہے تو ذہن میں الجھنیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ ذہنی مرکزیت اور وجدانی یک رنگی جو شخصی اور ملی زندگی میں سب سے زیادہ ضروری چیز ہے فنا ہو کر رہ جاتی ہے۔ انسان مستقلاً کسی لائحہ عمل پر کام نہیں کر سکتا وہ آج ایک عمارت تعمیر کرتا اور کل اُسے مسمار کر دیتا ہے۔ اس تلون مزاجی سے جو عقل کو رہبر بنا لینے سے پیدا ہوتی ہے، نہ شخصی زندگی درست ہو سکتی ہے اور نہ قومی زندگی

---

[1] رسالہ الفرقان۔ ص ۱۴۳

[2] علامہ اقبال نے اپنی کتاب (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) میں اس پر بصیرت افروز بحث کی ہے

[حض]رت شیخ محی الدین ابن عربی رح نے ایک خط میں امام فخر الدین رازی رح کو ان کا ایک [وا]قعہ یاد دلایا ہے جو بڑا سبق آموز ہے۔ لکھا ہے کہ آپ اپنے اس واقعہ سے عبرت حاصل [کر]یں کہ تیس سال کی محنت کے بعد ایک نتیجے پر پہنچے تھے۔ لیکن عقل نے ایک لمحہ میں [ش]بہ پیدا کرکر ساری عمارت گرا دی۔[1]

حضرت امام غزالی رح نے المنقذ من الضلال میں خود اپنے تجربات بتلائے ہیں کہ [ع]قل نے کس طرح ان کو پریشانی میں ڈالا تھا اور ان کی زندگی کو وبال کر دیا تھا۔ ان [ک]ی اس کتاب کا ہر ہر صفحہ تجربات کی بنا پر پکار کر کہتا ہے ؂

بگذر از عقل و بیا و یز بہ موج یم عشق
کہ دریں جوئے تنک مایہ گہر پیدا نیست

حد یہ ہے کہ عقل کے ناقص رہبر ہونے کا اعتراف امام رازی رح کو بھی کرنا [پڑا]۔ اور انھوں نے اپنے وصیت نامہ میں یہ لکھوایا۔

ویمنع عن التعمق فی ایراد	اور معارضات و مناقضات سے
المعارضات والمناقضات وما	احتراز کیا جائے، اس لئے کہ عقول
ذالک الا للعلم بان العقول	انسانی ان عمیق اور خفی مسائل میں
البشریۃ تتلاشی فی تلک	بے کار محض ہیں۔
المضائق العمیقۃ والمناھج	
الخفیۃ۔[2]	

[ب]حال، عقلیت کی گرم بازاری نے مسلمانوں کی زندگی پر بہت برا اثر ڈالا۔ اور ان کی [دی]نی مرکزیت کو فنا کر دیا۔

[1] [ش]یخ اکبر رح کے اس خط کی نقل آصفیہ کتب خانہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ اس میں عقل و وجدان یا دل و [دم]اغ کی صلاحیتوں پر نہایت ہی پُرتاثیر گفتگو کی گئی ہے [2] یہ وصیت نامہ امام صاحب رح نے اپنے شاگرد [خ]اص ابراہیم بن ابی بکر اصفہانی کو لکھوایا تھا۔ امام سبکی نے طبقات الشافعیہ میں اسے نقل کیا ہے۔

(۲) عقلیت کے ساتھ ساتھ "وضعیت" کا طوفان آنا بھی ناگزیر تھا۔ وضعیت کے اثرات، مولانا آزاد کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں :-

"فطرت سے جب بُعد ہو جاتا ہے اور وضعیت کا استغراق طاری ہو جاتا ہے تو طبیعتیں اس پر راضی نہیں ہوتیں کہ کسی بات کو اس کی قدرتی سادگی میں دیکھیں وہ سادگی کے ساتھ حسن و عظمت کا تصور کر ہی نہیں سکتیں۔ وہ جب کسی بات کو بلند اور عظیم دکھانا چاہتی ہیں تو کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وضعیت اور صناعیت کے پیچ و خم پیدا کریں"۔ [۱]

اس وضعیت کا سب سے بُرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی آواز دل تک نہیں پہنچتی اور جب دل ہی متاثر نہ ہو، تو مذہب کی حقیقی روح سے آشنا ہونا، ناممکن ہے۔

(۳) اس عقلیت کے مہلک اثرات نے مسلمانوں کی دینی زندگی کے کسی گوشہ کو نہیں بخشا۔ ذات و صفات خداوندی۔ خلق قرآن۔ دوزخ، جنت، معجزات، معراج۔ غرض ہر مسئلہ عقل کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔ آیاتِ قرآنی کی ایسی تاویلات کی گئیں جن سے یونانی فلسفہ کی تائید ہو سکے" اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا طریقِ استدلال دماغ کاوی کی دقیقہ سنجیوں میں گم ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے تمام بیانات کا محور و مرکز اس کا طریقِ استدلال ہی ہے۔ اس کے ارشادات و بصائر، اس کے قصص و امثال۔ اس کے مواعظ و حکم، اس کے مقاصد و مہمات، سب اسی چیز سے کھلتے اور ابھرتے تھے۔ یہ ایک چیز کیا گم ہوئی گویا اس کا سب کچھ ہی گم ہو گیا۔" [۱]

صوفیہ کا وہ طبقہ جو ان حالات میں پیدا ہوا، اس عقلیت اور وضعیت سے بیزار تھا۔ حضرت بایزید بسطامی ؒ، حضرت ذوالنون المصری ؒ، حضرت جنید بغدادی ؒ کے حج

---

[۱] ترجمان القرآن۔ جلد اول۔ ص ۶۶۔ ۶۷ [۲] ایضاً صفحہ ۹۰

ہا دورِ ثانی کے مشہور مشائخ میں تھے۔ عقلیت کے خلاف آواز اُٹھائی۔ "اور عشق
زور دیا کہ عقلیت اور وضعیت کے مسموم اثرات کو عشق ہی دور کر سکتا تھا ؎

سپاہِ تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

اُن کا کہنا تھا کہ ستاروں کی گزرگاہوں کو ڈھونڈنے کے بجائے انسان اگر اپنے افکار
کی دنیا میں سفر کرے تو وہ اپنی شخصی اور قومی زندگی کو شاید بہتر بنا سکے اور سورج
کی شعاعوں کو گرفتار کرنے کے بجائے اگر زندگی کی شب تاریک کو سحر کرنے کی کوشش
کرے تو اس سے بنی نوع انسان کو زیادہ فائدہ ہو۔ وہ مادی ترقی جو انسان کو
معبودِ حقیقی سے دور لے جائے، ترقی نہیں زوال ہے۔

چنانچہ ان بزرگوں نے عشق سے عقلیت کا مقابلہ کیا۔ اور بتایا کہ عشق ہی سے
منزلِ مقصود کا پتہ چل سکتا ہے۔ ورنہ عقل تو پائے چوبیں ہے کہ دو قدم بھی اس سے
نہیں چلا جا سکتا ؎

عشقِ دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفٰے
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

اس دور کے صوفیہ کی خصوصیات یہ ہیں:

(۱) جس طرح گذشتہ دور کے صوفیہ نے بنی اُمیہ کی ملوکیت سے متاثر ہو کر "خشیتِ
الٰہی" پر زور دیا تھا، اس دور کے صوفیہ نے معتزلہ اور دیگر عقلیت پسند گروہوں
کی وضعیت سے متاثر ہو کر "عشقِ الٰہی" پر زور دیا۔ اور خود محبتِ الٰہی میں سرشاری
کی زندگی بسر کی۔ حضرت بایزید بسطامی رح کے متعلق خواجہ فریدالدین عطار رح لکھتے
ہیں۔ "آتشِ محبت میں غرق تھے۔ اور تن کو ہمیشہ مجاہدہ اور دل کو مشاہدہ میں مشغول
رکھتے تھے" ؎ اُن کی مناجات کا کچھ حصہ خواجہ عطار رح نے نقل کیا ہے۔ وہ غور سے

؎ تذکرۃ الاولیاء، ص ۱۲۵ (اردو ترجمہ)

مطالعہ کے قابل ہے۔ عرض کیا کرتے تھے۔" بارخدایا کب تک میرے اور تیرے درمیان میں من اور تو ہوگا۔ اس من کو درمیان سے اٹھالے تاکہ میرا من تجھ سے ہو اور میں کچھ نہ رہوں، الٰہی جب تک میں تیرے ساتھ ہوں سب سے زیادہ ہوں اور جب تک اپنے ساتھ ہوں سب سے کم ہوں ...... الٰہی مجھے زاہدی درکار نہیں اور عالمی کی ضرورت نہیں اگر مجھے اہل خیر میں سے کرنا چاہتا ہے تو اپنے دوستوں کے درجے تک پہنچا دے ــــــ میں تجھی سے ناز کرتا ہوں ــــــ الٰہی فطرت دل پر تیرے الہام کیسے اچھے معلوم دیتے ہیں"[۵۱] ــــــ یہ مناجات نویں صدی عیسوی کے اس ماحول میں جب عقلیت ہی عقلیت کا دور دورہ تھا ایک دوسری دنیا کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

(۲) اس دور کے صوفیہ نے فلسفہ کی پیدا کی ہوئی ذہنی لامرکزیت کو قلبی کیفیات کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ دل کو اگر ایک مرکز پر لگا دیا جائے تو ذہن کی الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ حضرت معروف کرخیؒ نے استغراق پر زور دیا۔ حضرت سری سقطیؒ نے توحید کا وہ نظریہ پیش کیا جس نے بعد کو وحدت الوجود کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت ذوالنون مصریؒ نے اپنی تصانیف میں حال و مقام پر بحث کی۔ اگر بغور دیکھا جائے کہ ان نظریات نے عملی طور پر مسلمانوں کے ذہن پر کیا اثر ڈالا تو معلوم ہوگا کہ ان کے ذریعے عقلیت کے پیدا کیے ہوئے ذہنی ہیجان کو دور کرنے اور اس کے بنائے ہوئے سانچوں کو توڑنے کا سامان مہیا ہو گیا۔

(۳) گو امام احمد ابن حنبلؒ کو عموماً اس دور کے صوفیہ میں شامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی ذہنی کیفیات بھی اس زمانے کے صوفیہ سے ملتی جلتی تھیں عقلیت کے مذموم اثرات کو اُن کی دوربیں نظر نے بھی دیکھا تھا اور اس کا علاج "عشق خداوندی" ہی میں پایا تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب الزہد[۵۲] میں محبتِ الٰہی پر بڑا زور دیا ہے۔

[۵۱] تذکرۃ الاولیا۔ ص ۱۵۲ (اردو ترجمہ)

[۵۲] BROEKELMANN (SUPPLEMENT) I. P. 352

صوفیہ کا تیسرا طبقہ | تصوف کا یہ تیسرا دور دسویں صدی عیسوی سے متعلق ہے۔ اس زمانے کے صوفیہ کی ذہنی کیفیات کو سمجھنے کے لئے فقہ اسلامی کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور نئے نئے مُلک مسلمانوں کے زیر اثر آئے تو اجتہاد اور استنباط کی ضرورت پڑی۔ بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوئے جن کے متعلق قرآن پاک اور احادیث نبوی میں کوئی صریح حکم نہیں تھا۔ چنانچہ حالات کا تقاضا ہوا کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ایسے مسائل پر غور و فکر کرکے کوئی راہ متعین کی جائے۔ چنانچہ تدوین فقہ کا دور شروع ہوا۔ امام ابو حنیفہ رح (سنہ ۶۹۹-۷۶۶ء) امام مالک رح (سنہ ۷۱۵-۷۹۵ء)۔ امام شافعی رح (سنہ ۷۶۷-۸۲۰ء) اور امام احمد بن حنبل رح (سنہ ۷۸۰-۸۵۵ء) نے اپنی پوری دینی بصیرت کو استعمال کیا اور مختلف مسائل پر اپنی رائے پیش کرکے چار مذاہب کی بنیاد ڈالی ؎

آں امامانے کہ کردند اجتہاد
رحمتِ حق بر روانِ جملہ باد

اسلامی سوسائٹی کی ایک زبردست ضرورت کو ان بزرگوں نے پورا کر دیا۔ ان بزرگوں کے ذہن میں بعیدی طور پر بھی کبھی یہ خیال نہیں تھا کہ اُن کے اجتہاد کو حرف آخر کا مرتبہ دیدیا جائے گا۔ ہارون الرشید نے چاہا تھا کہ موطا امام مالک رح کو خانۂ کعبہ میں آویزاں کر دیا جائے اور تمام مسلمانوں کو فقہی احکام میں اس کی پیروی پر مجبور کیا جائے۔ امام صاحب رح نے اس خیال کو پسند نہیں کیا بلکہ تنبیہہ فرمائی کہ "ایسا نہ کرو، خود صحابہ فروع میں مختلف ہیں اور وہ ممالک اسلامیہ میں پھیل چکے ہیں، اور ان میں ہر شخص راہِ صواب پر ہے"[1]

[1] حیات مالک۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ ص ۶۸ - ۶۷ (طبع دوم)

لیکن ابھی ان بزرگوں کے وصال کو سو سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ علمار نے بابِ اجتہاد بند کر دیا۔ اور قرآن و حدیث سے براہ راست استنباط کرنے کے بجائے اُن ائمہ دین کی آرار کو ہر زمانہ اور ہر حال کے لئے قطعی اور لازمی مان لیا گیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ؎

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط — قوم را بر ہم ہمی پیچد بساط

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر — اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

لیکن کسی سماج کو مستقل طور پر ایسے قانون سے باندھ دینا جو بہر حال انسانی اجتہاد کی پیداوار ہو، ٹھیک نہیں۔ انسانی سماج کے بدلتے ہوئے رجحانات اور تقاضے، نئے اجتہاد کی طلب کرتے ہیں۔

پھر ایک زبردست گمراہی اس زمانے میں یہ پیدا ہوئی کہ فقہی مسائل میں حیلہ بازی کا دروازہ کھول دیا گیا۔ ہر شرعی حکم سے بچنے کے لئے حیلے اور ہر قید شرعی سے نکل بھاگنے کے لئے بہانے تراشے جانے لگے[۵] فقہ کی کتابوں میں ایک مستقل باب، باب الحیل

---

[۵] زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لئے لوگوں نے یہ حیلہ نکالا کہ سال کے آخر میں تمام مال بیوی کے نام ہبہ کر دیا۔ پھر جب بیوی پر زکوٰۃ فرض ہونے کا وقت آیا تو مال اپنے نام منتقل کرا لیا۔ انھیں حیلہ تراشیوں کو دیکھ کر شیخ ایوب سختیانی رح نے کہا تھا:

یخادعون اللہ کما یخادعون الصبیان — یہ لوگ خدا کو اسی طرح دھوکہ دینا چاہتے ہیں، جیسے بچوں کو بہلاتے ہیں

حفص بن غیاث نے کہا تھا: کتاب الحیل پر لکھ دو کہ کتاب الفجور ہے۔

اکبر کے زمانے میں مخدوم الملک نے بھی یہی حیلہ اختیار کیا تھا۔ حالانکہ دولت کی فراوانی کا عالم یہ تھا کہ گھر میں سونے اور چاندی کی قبریں بنی ہوئی تھیں

کا اضافہ کیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :

"کتاب و سنت کی تقدیم و حفظ کا بند تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا اور بنیادِ فقاہت محض اٹکل اور ظن و وہم پر قرار پا چکی تھی۔ پھر کیا تھا ؟ ہر ذہن نے تیزی دکھائی اور ہر قیاس نے بلند پروازی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شریعتِ الٰہی جو عدل و صداقت کے قیام کے لئے آئی تھی اسی کے نام سے مکر و فریب اور ظلم و غضب و نہب و سلب کے تمام کاروبار جاری ہو گئے، اور دنیا کی تباہی کے لئے اس سے بدتر و قت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا پاک نام لے کر اُس کی دنیا میں برائی پھیلائی جائے، کتنی ہی زناکاریاں ہیں جو حیلے نکال کر نکاحِ شرعی بنائی گئیں ! کتنے ہی غضب ، ظلم اور اکلِ اموال بالباطل کے مصائب ہیں جن کو ایک شرعی معاملہ بنا کر جائز کیا گیا ! کتنے ہی عقودِ فاسدہ ہیں جن کو اسی شیطانِ حیل نے جائز کرا کے بندگانِ الٰہی کے حقوق تلف کرائے ! کتنے ہی حج ہیں جو ساقط ہوئے ! کتنی ہی زکاتیں ہیں جو کبھی ادا نہیں کی گئیں ! کتنے ہی شارب الخمر اور زانیِ محصن ہیں جو حدودِ شرعیہ سے صاف بچا لئے گئے !" [ل]

اِن حیلہ بازیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن جو مذہب کا اصلی مقصد تھا بالکل بھلا دیا گیا اور مذہبی روح بالکل مردہ ہو کر رہ گئی۔

صوفیہ کا وہ طبقہ جو ان حالات میں پیدا ہوا ، اس نے مذہب کی حقیقی روح کو بیدار کرنے۔ باطن کی اصلاح اور اخلاق کی درستگی کی طرف خاص توجہ کی۔ جو فقہی گتھیوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ان سے للکار کر کہا ؎

در کنز و ہدایہ نتواں دید خدا را
آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

[ل] تذکرہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ص ۸۹۔ (نیا ایڈیشن)

ان بزرگوں نے بتایا کہ جب تک دِل کی دنیا پاک و صاف نہ ہوگی، انسانی زندگی میں کیف پیدا نہ ہوگا ؎

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک
نقش ہا بینی بروں از آب و خاک

دسویں صدی عیسوی کے صوفیہ میں شیخ ابوسعید ابن العربیؒ (المتوفی ۹۵۲ء) شیخ ابومحمد الخلدیؒ (المتوفی ۹۵۹ء) شیخ ابونصر السراجؒ (المتوفی ۹۸۸ء) شیخ ابوطالب مکیؒ (المتوفی ۹۹۶ء) شیخ ابوبکرؒ (المتوفی ۱۰۰۰ء) اور ابوعبدالرحمٰن السلمیؒ (المتوفی ۱۰۲۱ء) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے زبان اور قلم سے صحیح مذہبی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور اِصلاحِ باطن پر خاص زور دیا۔ ان حیلہ بازیوں کو دور کرنے کے لئے (جنھوں نے باطنی زندگی کو گندہ کر دیا تھا) ضروری تھا کہ اخلاق کی صحیح تعلیم لوگوں کو دی جائے۔ اور انھیں بتایا جائے کہ کسی قسم کی انسانی ترقی اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک انسان کا دل تمام آلودگیوں سے پاک نہ ہو جائے۔ صوفیہ کے نزدیک اخلاق کا جو معیار تھا اس کے متعلق مولانا شبلی مرحوم کی یہ عبارت بڑی بصیرت افروز ہے:

"شریعت اور علم الاخلاق میں جن احکام کی تعلیم دی جاتی ہے مثلاً صبر، رضا، توکل، استغنا، قناعت وغیرہ وغیرہ، ان پر انسان عمل کرتا ہے تو اس بناء پر کرتا ہے کہ شریعت نے اس کی تعلیم دی ہے اور شریعت کی سرتابی عذابِ قیامت کی مستوجب ہے۔ لیکن تصوف میں ایک حالت طاری ہو جاتی ہے جس سے خود بخود اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ صوفی دل پر جبر کرکے صبر اختیار نہیں کرتا، بلکہ طبعاً اس سے صبر سرزد ہوتا ہے۔ وہ نماز اس لئے نہیں پڑھتا کہ نہ پڑھوں گا تو دوزخ میں جانا پڑے گا، بلکہ اس لئے پڑھتا ہے کہ پڑھنا اس کے اختیار میں

نہیں ——— یہ تصوف کا علمی حصہ ہے "۔ ؎۵

اس دور کے صوفیہ نے تصوف کے اسی "عملی حصّہ" پر زور دیا۔

(۱) اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے مشایخ متقدمین کے حالات اور سوانح کو بطور نمونہ پیش کیا۔ شیخ ابو سعید ابن العربی رح، شیخ ابو محمد الخلدی رح، شیخ ابو عبد الرحمٰن رح کی کتابوں کا منشاء یہ ہی تھا۔ شیخ ابو سعید ابن العربی بڑے جید عالم، محدث اور فقیہ تھے۔ خواجہ جنید بغدادی رح کے مرید تھے۔ انھوں نے طبقات نامی کتاب لکھی جس میں متقدمین صوفیہ کے حالات اور تعلیمات کو بڑی تفصیل سے پیش کیا۔ بدقسمتی سے یہ کتاب اب ناپید ہے لیکن اس کے جو اقتباسات کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت مستند تھی اور محنت سے ترتیب دی گئی تھی۔ شیخ ابو محمد الخلدی رح نے حکایات الاولیاء اسی زمانے میں لکھی، یہ کتاب بھی اب معدوم ہے۔

مشایخ کے حالات میں جس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، وہ ابو عبد الرحمٰن السلمی رح کی طبقات الصوفیئن ہے۔ اس کتاب کو جے۔ پیڈرسن (J. PEDERSEN) مرتب کر رہے ہیں۔ طبقات الصوفیئن بہت سی کتابوں کا ماخذ ہے۔ شیخ عبد اللہ انصاری رح نے طبقاتِ صوفیہ میں اسی سے مدد لی پھر مولانا جامی رح نے نفحات الانس کی ترتیب میں طبقاتِ صوفیہ کو اپنا رہبر بنایا۔

(۲) اس زمانہ میں ایک زبردست کوشش یہ بھی کی گئی کہ تصوف کو شریعتِ اسلامی کے مطابق ثابت کیا جائے۔ شیخ ابو طالب مکی رح اور شیخ ابوبکر رح میں یہ چیز خاص طور سے قابل غور ہے۔ شیخ ابو طالب رح قرآن و حدیث پر بڑی

؎۵ شعر العجم، حصہ پنجم (طبع دوم) ص ۱۴۱

گہری نظر رکھتے تھے ۔ قوت القلوب میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف حقیقتاً قرآن وحدیث کی پیداوار ہے۔ انھوں نے عبادات کا ذکر بالکل اسی انداز میں کیا ہے، جس طرح فقہ کی کتابوں میں ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے عبادات کے باطنی پہلو اور منشا پر بڑا زور دیا ہے۔

شیخ ابوبکرؒ نے اپنی کتاب التعارف لمذہب اہل التصوف[۵۱] میں اسلام کے ایک ایک بنیادی اصول سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ہی صوفیہ کا ایمان وعمل تھا۔ تصوف کی حمایت اس کتاب میں بڑے مدلل انداز میں کی گئی ہے۔ اسی بناء پر یہ بہت مقبول ہوئی اور اس پر متعدد حاشیے لکھے گئے

(۳) تصوف کی اصطلاحات کو مقبول عام بنانے کی کوشش اسی زمانے سے شروع ہوئی۔ تولید اصطلاحات کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ منطق وفلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی مصطلحات پیدا کر دی تھیں اور یہ انداز علم وفن کے ہر شعبہ میں کام کر رہا تھا۔

(۴) تصوف کی سب سے زیادہ اہم کتاب جو اس دور میں لکھی گئی وہ شیخ ابونصر سراج رحؒ کی کتاب اللمع ہے۔[۵۲] اس میں تصوف کے بنیادی تصورات اور معمولات پر بڑی خوبی سے بحث کی گئی ہے، اور نیت کی اصلاح پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ وقت کا سب سے اہم تقاضہ یہ ہی تھا۔ خواجہ فریدالدین عطارؒ

---

[۵۱] پروفیسر اربیری (A.J. ARBERRY) نے ۱۹۳۴ء میں مصر سے شائع کیا تھا میرے سامنے اس کا انگریزی ترجمہ ہے جو پروفیسر مذکور نے THE DOCTRINE OF THE SUFIS کے نام سے کیا ہے۔

[۵۲] پروفیسر آر۔ اے نکلسن (R.A. NICHOLSON) نے ۱۹۱۴ء میں گب میموریل سیریز میں شائع کیا تھا۔

لکھتے ہیں کہ شیخ سراج رح، ابن سالم رح کا یہ قول نقل کیا کرتے تھے کہ نیت خدا کے ساتھ ہے اور خدا سے ہے اور خدا کے لئے ہے۔[۵۱]

(۵) دسویں صدی کے تصوف کی تاریخ میں ایک اہمیت یہ ہے کہ اس زمانے میں صوفیہ کے حلقے اور گروہ بننے شروع ہوگئے۔ شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رح نے کشف المحجوب میں بارہ گروہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

دو گروہ ازاں مردود اند، و دہ گروہ مقبول[۵۲]	ان میں دو گروہ مردود ہیں، دس مقبول ہیں۔

ان گروہوں کے نام یہ ہیں:

(۱) مردود گروہ میں حلولی اور حلاجی کا شمار کیا جاتا تھا۔ حلولی تناسخ کے قائل تھے۔

(۲) طیفوریہ۔ اس کی نسبت حضرت بایزید طیفور بسطامی رح[۵۳] سے تھی۔ اس گروہ پر شوق اور مستی کا بڑا غلبہ تھا، اور اس کے پیرو 'سکر' کو 'صحو' پر ترجیح دیتے تھے۔

(۳) قصاریہ۔ اس گروہ کی نسبت شیخ حمدون قصار رح[۵۴] کی جانب تھی۔ یہ گروہ بعد کو ملامتیہ کی صورت اختیار کر گیا۔

---

۵۱ تذکرۃ الاولیا۔ ص ۳۷۹-۳۷۸ (اردو ترجمہ) ۵۲ کشف المحجوب ص ۱۳۹

۵۳ کشف المحجوب کے علاوہ حضرت بایزید بسطامی رح کا حال مندرجہ ذیل کتابوں میں ملتا ہے:-

تذکرۃ الاولیا۔ باب ۱۴ (اردو ترجمہ ص ۱۵۲-۱۲۵)

نفحات الانس ص ۳۸ (مطبوعہ بمبئی ۱۲۸۵ھ)

رسالہ قشیریہ ص ۱۶ (مطبوعہ ۱۲۸۷ھ) (بقیہ صفحہ ۹۴ پر)

(۴) نوریہ ۔ اس گروہ کی نسبت شیخ ابی الحسن بن نوری رح[۵۱] جانب تھی یہ گروہ تصوف کا مقصد 'فقر' سے اونچا سمجھتا تھا۔ اور 'صحبت' کو 'عزلت' سے بہتر جانتا تھا

(۵) محاسبیہ ۔ ان کی نسبت شیخ حارث بن اسد محاسبی رح[۵۲] کی جانب تھی ۔ اس گروہ کا خیال تھا کہ رضا، 'مقام' نہیں ہے بلکہ 'حال' ہے ۔ تقریباً دوسو سال تک اس مسئلہ پر شدید اختلاف رہا۔ اہل خراسان نے اُن کی رائے کی تائید کی۔ اہل عراق نے مخالفت کی، شیخ ہجویریؒ لکھتے ہیں " ان دونوں قوموں میں آج تک اختلاف پڑا ہوا ہے

(۶) تستریہ ۔ اس گروہ کی نسبت شیخ سہل بن عبداللہ تستری رح[۵۳] کی جانب ہے ۔ اس گروہ نے تزکیۂ نفس کے اصول ترتیب دئے تھے ۔ یہ لوگ سزائے نفس

(بسلسلہ صفحہ ۹۳) [۵۰] کشف المحجوب کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابوں میں حالات ملتے ہیں :۔

تذکرہ الاولیا ۔ ص ۲۷۷ - ۲۷۵ (اردو ترجمہ)

نفحات الانس ص ۳۹

[۵۱] ۔ حالات کے لئے ملاحظہ ہو :۔

تذکرۃ الاولیا ۔ ص ۳۱۵ - ۳۱۰ (اردو ترجمہ)

نفحات الانس ۔ ص ۵۲

[۵۲] ملاحظہ ہو :۔

تذکرۃ الاولیا ۔ ص ۱۹۷ - ۱۹۴

نفحات الانس ص ۴۴

[۵۳] حالات کے لئے ملاحظہ ہو :۔

تذکرۃ الاولیار ص ۲۲۹ - ۲۱۵

نفحات الانس ۔ ص ۴۴

کے قائل تھے۔

(۷) حکیمیہ۔ اس کی نسبت حضرت ابی عبداللہ بن علی الحکیم الترمذی رحؒ[۵۱] سے تھی۔ ولایت کا تصور اسی گروہ سے شروع ہوا۔ حکیم ترمذی رحؒ کا قول تھا کہ تمام دنیا اللہ کے ولیوں میں تقسیم ہے، اور ہر علاقہ (ولایت) ایک بزرگ کے تحت میں ہے۔

(۸) خرازیہ۔ اس گروہ کی نسبت شیخ ابوسعید خرازی رحؒ[۵۲] سے تھی۔ فنا کا تصور اس گروہ نے پیش کیا۔

(۹) خفیفیہ۔ اس گروہ کی نسبت شیخ ابوعبداللہ محمد بن خفیف رحؒ[۵۳] کی جانب تھی۔ اس گروہ نے حضور اور غیبت کا تصور پیش کیا۔

(۱۰) سیاریہ۔ اس گروہ کی نسبت شیخ ابوالعباس سیاری[۵۴] کی جانب تھی اس گروہ نے جمع و تفریق کا نظریہ پیش کیا۔

مندرجہ بالا گروہ دسویں صدی عیسوی میں وجود میں آئے تھے لیکن اُن کی نسبت مشائخِ متقدمین کی جانب کر دی گئی۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو: تذکرۃ الاولیاء ص ۲۳۷ - ۲۳۵

J.R.A.S. ARTICLE BY AMEDROZ 1912, P 584

میسی نیوں (MASSIGNON) کا خیال ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی رحؒ، حکیم ترمذی رحؒ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور انھوں نے حکیم رحؒ کی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا تھا

(ESSAI SUR LA MYSTIQUE, P.256-264)

۵۲ ملاحظہ ہو: تذکرۃ الاولیاء ص ۳۰۹ - ۳۰۶

۵۳ - تذکرۃ الاولیا ص ۳۴۷

۵۴ - تذکرۃ الاولیا ص ۴۰۲

تصوف، دسویں صدی عیسوی میں : دسویں صدی عیسوی تک تصوف نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کرلی تھی۔ مستند کتابوں کا خاصہ ذخیرہ مہیا ہوگیا تھا۔ اصطلاحات بھی کافی تعداد میں وجود میں آگئی تھیں۔ گروہوں کی ابتدا بھی ہوگئی تھی۔ لیکن یہ تینوں چیزیں ابھی ابتدائی منازل میں تھیں۔ کتابوں کی نوعیت رسالوں کی تھی، ایسے رسالے جن میں یا تو متقدمین مشائخ کے حالات تھے، یا کسی ایک خاص موضوع پر بحث تھی۔ تصوف کا پورا فلسفہ ابھی مدوّن نہیں ہوا تھا اصطلاحات ایجاد ضرور ہوگئی تھیں لیکن ان کا مفہوم ابھی وضاحت کے ساتھ متعین نہیں ہوا تھا۔ اور ابھی بہت کچھ اصطلاحات کی کمی بھی تھی۔ گروہوں کا حال بھی یہی تھا۔ ابھی 'سلسلوں' کی باقاعدہ شکل اختیار نہیں کی تھی۔ اس منزل تک پہنچنے میں کافی رکاوٹیں باقی تھیں۔ اگلے تین سو سالوں میں یہ تینوں چیزیں پوری طرح نشوونما پاگئیں اور تصوف کی تحریک، مسلمانوں کی دینی زندگی کا ایک خاص عنصر بن گئی۔ آئندہ تصوف کی ترقی کا مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صدی بہ صدی اس کی ارتقائی کیفیت کا جائزہ لیا جائے۔

تصوف، گیارویں صدی میں : گیارویں صدی عیسوی کے مشائخ میں مندرجہ ذیل بزرگ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے حالات کے مطالعہ سے تصوف کے عام رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :۔

(۱) شیخ ابو نعیم اصبہانیؒ (المتوفی ۱۰۳۰ء)
(۲) شیخ ابوالقاسم قشیریؒ (المتوفی ۱۰۷۲ء)
(۳) شیخ علی ہجویریؒ (المتوفی ۱۰۷۲ء اور ۱۰۷۹ء کے درمیان)
(۴) شیخ عبداللہ انصاریؒ (المتوفی ۱۰۸۸ء)
(۵) شیخ ابوسعید ابی الخیرؒ (المتوفی ۱۰۴۹ء)

شیخ ابونعیم احمد بن عبداللہ بن اسحاق اصبہانی رح، شافعیؒ المذہب تھے۔ علم حدیث کے ماہر تھے، انھوں نے اپنی مشہور تصنیف حلیۃ الاولیاء میں ہزاروں صوفیہ کے حالات جمع کیے ہیں۔ یہ کتاب دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور متقدمین مشائخ کے حالات میں بہت مستند اور معتبر مانی جاتی ہے۔ امام ابن جوزی رح نے اس کتاب کا خلاصہ پانچ جلدوں میں کیا ہے۔

شیخ ابوالقاسم قشیری اس عہد کے دوسرے مشہور و معروف بزرگ ہیں اُن کا رسالہ فن تصوف میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ اور اس پر متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ شیخ قشیری رح علوم دینی میں اچھی نگاہ رکھتے تھے۔ قرآن کا مطالعہ بڑی توجہ سے کیا تھا اور اس کی شرح لطائف الاشارات کے نام سے لکھی تھی رسالہ قشیریہ میں تصوف کی مندرجہ ذیل اصطلاحات ملتی ہیں :-

وقت - مقام - حال - قبض و بسط - ہیبت - انس - تواجد وجد - وجود - جمع و فرق - فنا و بقا - غیبت و حضور صحو و سکر ذوق و شرب - ستر و تجلی - محاضرہ - کشف و مکاشفہ، مشاہدہ و معائنہ - لوائح - طوالع - لوامع - ہجوم - تلوین و تمکین - قرب و بعد - شریعت - حقیقت - طریقت - نفس - خواطر - علم الیقین عین الیقین - حق الیقین - شاہد - نفس، روح، سر۔

اس رسالے میں شیخ قشیری رح نے اُن تمام اعتراضات کی تردید کی ہے جو اس زمانے میں عام طور پر تصوف اور صوفیہ پر عاید کئے جاتے تھے۔ ان کا انداز گفتگو بڑا سلجھا ہوا اور دل کش ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ تصوف، شریعت و سنت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ شیخ قشیری رح کے اس رسالے نے معترضین کی زبانیں بند کر دیں اور تصوف کی ترقی اور قبولیت کے دروازے کھول دیے۔

شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج رح جید عالم اور مرتاض بزرگ تھے۔ اپنے زمانے کے بے شمار مشایخ سے ملے تھے اور فیض حاصل کیا تھا۔ ابتدائی زمانے میں سفر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ شام سے لے کر ترکستان تک، اور دریائے سندھ سے لے کر بحر کیسپین تک گشت کیا تھا۔ آخر میں لاہور آئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ شیخ ہجویری رح نے کشف المحجوب میں اپنی نو تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ اب سوائے کشف المحجوب کے سب معدوم ہو گئی ہیں۔

کشف المحجوب کا شمار تصوف کی اعلیٰ ترین کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے:

"... کشف المحجوب مشہور و معروف	کشف المحجوب مشہور و معروف ہے
است و ہیچ کس را بر آں جائے	کسی کو اس پر اعتراض کی جرأت
سخن نیست و مرشدیست کامل	نہیں ہو سکتی۔ وہ مرشدِ کامل ہے
در کتب تصوف بخوبی آں در زبان	فارسی زبان میں تصوف میں ایسی
فارسی کتابے تصنیف نشدہ "[1]	عمدہ کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

امام قشیری رح کی طرح شیخ ہجویری رح نے تصوف کو اسلامی شریعت سے قریب لانے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیخ رح کے خیالات میں بڑی صفائی اور اندازِ بیان میں بڑی گیرائی ہے۔ تصوف کی کتابیں اب تک عربی زبان میں تھیں اس لئے عوام کو استفادہ کا موقع بہت کم تھا۔ یہ پہلی کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی۔ حقیقی تصوف کو عوام تک پہنچانے میں اس کتاب کا بڑا حصہ ہے۔ بعض مشایخ کا تو یہ کہنا ہے کہ جس شخص کا کوئی پیر نہ ہو۔ اس کے لئے کشف المحجوب کافی ہے۔

[1] سفینۃ الاولیاء (قلمی نسخہ)

۱۹۳۱ء میں جب پروفیسر محمد حبیب صاحب کابل گئے تھے تو ملا تسور بازار نے اُن سے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ کشف المحجوب عربی زبان میں لکھی گئی تھی، اس کا فارسی ترجمہ بعد کو ہوا۔ عربی اصل ضائع ہوگئی۔ فارسی ترجمہ باقی رہ گیا۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب نے اس رائے کو قبول کرلیا اور ان کا خیال بھی اب یہی ہے کہ اصل کتاب عربی میں تھی [۵] جو ضائع ہوگئی۔ ان کا کہنا ہے کہ فارسی کا اندازِ تحریر ایسا ہے کہ ترجمے کا خیال ہوتا ہے۔ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں، جہاں تک فارسی طرزِ تحریر کا تعلق ہے اس زمانے کی دوسری کتابیں بھی اسی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ابوالفضل بیہقی کی تاریخ آل سبکتگین کی فارسی بھی اسی طرح کی ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں کسی تذکرہ یا تاریخ میں اس کتاب کے عربی میں ہونے کا اشارہ نہیں ملتا۔ متقدمین مشائخ نے اپنی کتابوں میں جہاں جہاں اس کے اقتباسات دیئے ہیں وہ سب فارسی میں ہیں اور اسی موجودہ نسخہ کے مطابق ہیں۔ کشف المحجوب، جیسا کہ اندرونی شہادت سے ظاہر ہے، لاہور میں لکھی گئی۔ یہاں کے بسنے والوں کے لئے فارسی زبان ہی کی کتاب زیادہ مفید ہوسکتی تھی۔

بہرحال، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شیخ ہجویری رح کی اس کتاب نے ایک طرف تصوف سے متعلق عوام کی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ دوسری طرف اس کی ترقی کی راہیں کھول دیں۔

شیخ عبداللہ انصاری ہروی رح، پیر ہری کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے زمانے کے مشہور محدث اور صوفی تھے۔ حنبلی مذہب کی طرف رجحان تھا۔ اتباعِ سنت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اہلِ بدعت سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے تھے

[۵] MEDIEVAL INDIA QUARTERLY VOL NO 2 P12

اور اسی وجہ سے پانچ مرتبہ ان کو لوگوں نے قتل کی دھمکی دی۔ انھوں نے تصوف کو مقبولِ عام بنانے میں بڑا کام کیا۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف دستیاب ہوتی ہیں۔

(۱) منازل السائرین

(۲) طبقات الصوفیہ

(۳) کتاب جامع الکلام

(۴) مناجات

منازل السائرین، عربی زبان میں ہے۔ اور تصوف کے مسائل پر اس قدر مقبول کتاب ہے کہ اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ طبقات الصوفیہ، عبدالرحمن سلمیؒ کی تصنیف سے ماخوذ ہے۔ جامع الکلام میں دینیات کے مسائل پر بحث کی گئی ہے اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ پیر ہری کی مناجات بڑی پُر درد اور پُر تاثیر ہے۔ اس کے ترجمے متعدد زبانوں میں ہوئے ہیں۔

شیخ عبداللہ ہروی کی تصانیف کو ہندوستان میں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ سرور الصدور ملفوظ شیخ حمید الدین ناگوریؒ خلیفہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ) میں متعدد جگہ اُن کی تصانیف کا ذکر ہے اور بڑی عقیدت سے اُن کے حوالے دئے گئے ہیں۔

اس زمانے کے شعراء میں سب سے پہلا مرتبہ شیخ ابوسعید ابی الخیرؒ کا ہے جن بزرگوں کا اب تک ذکر کیا گیا ہے، انھوں نے اپنی تصانیف (مناجات کے علاوہ) فارسی یا عربی نثر میں چھوڑی ہیں۔ شیخ ابوسعیدؒ نے فارسی رباعیات کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نثر کے ذریعے خیالات کی ترویج اتنی آسان نہیں جتنی نظم کے ذریعے ہوتی ہے۔ ایک انگریز مصنف کا قول ہے

کہ شعرا تو اپنے زمانے کے قانون ساز ہوتے ہیں۔ جو بات اُن کے قلم سے نکل گئی ہر جا بہ گشت کر گئی۔ مولانا شبلی مرحوم اُن کے متعلق لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے صوفیانہ خیالات، حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیرؒ نے ادا کئے۔ وہ شیخ بوعلی سینا کے معاصر تھے۔ اُن سے اور شیخ سے اکثر مراسلت رہتی تھی۔ شیخ مشکل مسائل ان سے دریافت کرتا تھا، اور وہ جواب دیتے تھے۔ یہ مراسلات آج بھی موجود ہیں"[۱]

شیخؒ کے اشعار میں عشقِ حقیقی کی آگ بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی دو رباعیاں جو مولانا شبلی نے انتخاب کی ہیں۔ اُن کے جذباتِ عشق کی آئینہ دار ہیں۔

غازی برہِ شہادت اندر تگ و پوست غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تراز وست
در روز قیامت ایں بداں کے ماند کیں کشتۂ دشمن ست واں کشتۂ دوست

دل جز رہِ عشقِ تو نپوید ہرگز جز محنت و دردِ تو نجوید ہرگز
صحرائے دلم عشقِ تو شورستاں کرد تا مہر کسے دگر نہ روید ہرگز

مختصراً، اس صدی میں تصوف کی حالت یہ تھی۔

(۱) تصوف کے خیالات تیزی کے ساتھ عوام میں پھیل رہے تھے، تقریباً ہر مذہب کے مشاہیر صوفیہ اور علماء نے تصوف کی حمایت میں قلم اٹھالیا۔ (شیخ ابونعیم اصبہانیؒ، شافعی مذہب تھے، شیخ علی ہجویریؒ حنفی تھے، شیخ عبداللہ انصاریؒ حنبلی تھے۔)

---

[۱] شعر العجم۔ جلد پنجم ص۔ ۱۲۰ (طبع دوم)

(۲) تصوف اور شریعت اسلامیہ کے درمیان تطابق کی کامیاب کوشش کی گئی تھی اور اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیندہ صدیوں میں علمار کا بڑا حصہ تصوف کی طرف کھنچ آیا۔

(۳) شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ نے اپنی رباعیات، شیخ عبداللہ ہرویؒ نے اپنی مناجات اور شیخ ہجویریؒ نے اپنی کشف المحجوب کے ذریعے تصوف کے خیالات کو عوام تک پہنچا کر، تصوف کے عوامی تحریک بننے اور سلاسل کے منظم ہونے کا سامان بہم پہنچا دیا۔

تصوف، بارہویں صدی عیسوی میں: بارہویں صدی عیسوی کو اسلامی تصوف کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس زمانے میں تصوف کا فلسفہ پورے طور پر ترتیب دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اسی زمانے میں بعض روحانی سلاسل کی داغ بیل بھی پڑی گو اُن کا عروج تیرہویں صدی میں ہوا۔ اس دور میں تصوف کے نشوونما کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے چند ممتاز مشائخ کے حالات کا مطالعہ ضروری ہے۔

حضرت امام غزالیؒ (المتوفی ۱۱۱۱ء) نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف احیاء العلوم الدین اسی صدی کے شروع میں مکمل کی۔ حضرت امامؒ کو اسلامی تصوف کی تاریخ میں جو عظمت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

مولانا شبلی مرحوم لکھتے ہیں:۔

"حضرات صوفیہ اور فلاسفۂ اسلام کے سرگروہ مولانا روم، شیخ الاشراق ابن رشد، اور شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ ان بزرگوں کی تصنیفات اور حقیقت امام صاحب ہی کے خیالات کا آئینہ ہیں .... نبوت، وحی، الہام حالات مابعد الموت، معاد، قضا و قدر، خیر و شر کی جو حقیقت امام رازیؒ،

شیخ الاشراق، ابن رشد، شاہ ولی اللہ نے بتائی ہے ...... امام غزالی ہی سے سُن کر کہا ہے۔"[1]

امام صاحبؒ ابتدائی زمانے میں درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے۔ اُن کے درس میں تین سو مدرسین اور سو امراء اور رؤساء حاضر ہوتے تھے درس کے علاوہ وعظ بھی فرمایا کرتے تھے، ان وعظوں کو شیخ صاعد بن الفارس المعروف بابن اللبان قلم بند کرتے جاتے تھے۔ ایک دن وعظ کہہ رہے تھے کہ اتفاق سے اُن کے چھوٹے بھائی احمد غزالیؒ جو صوفی منش تھے ادھر آنکلے اور یہ اشعار پڑھے:

واصبحت تهدى ولا تهدى — تم دوسروں کو ہدایت کرتے ہو لیکن خود ہدایت

وتسمع وعظا ولا تسمع — نہیں پکڑتے اور وعظ سناتے ہو لیکن خود نہیں سنتے

فيا حجر الشحذ حتى متى — اے سنگ نسان! کب تک تو لوہے کو

تسن الحديد ولا تقطع — تیز کرتا رہے گا لیکن خود نہ کاٹے گا۔

ان اشعار کا دل پر ایسا اثر ہوا کہ مجاہدہ وریاضت کا شوق پیدا ہو گیا پھر ایک عرصہ تک بیابانوں میں پھرتے رہے۔ ۴۹۶ھ میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے مزار مبارک پر حاضر ہو کر عہد کیا (۱) کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جاؤں گا۔ (۲) کسی بادشاہ کا عطیہ نہ لوں گا (۳) کسی سے مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا۔[2]

ابن الاثیر کا کہنا ہے کہ اسی زمانے میں انھوں نے احیاء العلوم الدین تصنیف کی مولانا شبلی لکھتے ہیں:-

"احیاء العلوم میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر

---

[1] الغزالی۔ ص ۲۶۱ ــ ۲۶۰ (نامی پریس کانپور ۱۹۰۲ء)

[2] مکاتبات امام غزالی۔ ص ۷

ہوتا ہے۔ ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے۔ ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے۔ ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانے میں لکھی گئی خود امام صاحب رح تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے۔ بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا۔ تمام مذاہب کو چھانا کسی سے تسلی نہیں ہوئی۔ آخر تصوف کی طرف رخ کیا۔ لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی، بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا........ آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کملی پہن، بغداد سے نکلے اور دشت پیمائی شروع کی۔ سخت مشاہدات اور ریاضات کے بعد، بزم راز تک رسائی پائی۔ یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بےخبر بن جاتے۔ لیکن ع بیاد آر حریفان بادہ پیمارا۔ کے لحاظ سے افادۂ عام پر نظر پڑی، دیکھا تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ امیر و غریب، عام و خواص، عالم و جاہل، رند و زاہد۔ سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ علماء جو دلیل راہ بن سکتے تھے، طلب جاہ میں مصروف ہیں۔ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور اسی حالت میں یہ کتاب لکھی [۵۱]

ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ صوفیہ نے تعلیم اخلاق کو اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد قرار دیا تھا۔ اس فرض کی ادائیگی نے امام غزالی کو مجبور کیا کہ مہر سکوت کو توڑیں اور عوام کے اخلاق کی درستگی کے لئے کوشش کریں۔ امام صاحب نے اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں اُن کو سمجھنے کے لئے اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ یہاں ہم اس تفصیل میں نہیں جا سکتے [۵۲] خود امام صاحب

---

[۵۱] الغزالی۔ ص ۶۳۔ ۶۲۔ [۵۲] پروفیسر عمرالدین صاحب صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنی فاضلانہ تصنیف THE ETHICAL PHILOSOPHY OF AL-GHAZZALI میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

اپنے زمانہ کا حال احیار العلوم کے دیباچہ میں اس طرح لکھتے ہیں :-

"میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھا لیا ہے اور سعادتِ اُخروی کی راہیں بند ہوگئی ہیں۔ علمار جو دلیلِ راہ تھے۔ زمانہ اُن سے خالی ہوتا جاتا ہے۔ جو رہ گئے وہ نام کے عالم ہیں جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گردیدہ بنالیا ہے۔ اور جنھوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے۔ مناظرہ (جو فخر اور نمود کا ذریعہ ہے) وعظ و پند (جس میں عوام کی دل فریبی کے لئے رنگین اور مسجع فقرے استعمال کئے جائیں۔) فتوئ دنیا، جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ باقی آخرت کا علم تو تمام عالم سے ناپید ہوگیا ہے، اور لوگ اس کو بھلا چکے ہیں۔"

تصوف کے سلسلے میں امام صاحب کی خدمات اجمالاً یہ ہیں :-

(۱) امام صاحبؒ نے تصوف کو ایک باقاعدہ فن کی حیثیت دے دی جو کچھ مشائخِ متقدمین نے (مثلاً امام قشیریؒ، ابوطالب کیؒ وغیرہ نے) تصوف پر لکھا تھا اُس کو امام صاحب نے پورے طور پر جذب کیا اس کے بعد نہایت وضاحت اور ترتیب سے تصوف کا پورا فلسفہ مُدوّن کر دیا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں :- "بڑی خصوصیت جس نے عام و خاص، عارف و جاہل سب میں اس کو (احیار العلوم کو) مقبول بنا دیا ہے یہ ہے کہ حکمت و موعظت دونوں کو ساتھ ساتھ نباہا ہے۔"

(۲) امام صاحبؒ خود فلسفہ کے ماہر تھے، اور عرصہ تک عقلیت کے پھندوں میں اُلجھے رہے تھے۔ اُنھوں نے المنقذ من الضلال میں عقل کی بے چارگی کا جس طرح نقشہ کھینچا ہے وہ بڑا مؤثر ہے۔

(۳) امام صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں حکمت و استدلال کا انداز قائم رکھا ہے، لیکن گفتگو اس طرح کی ہے کہ مذہبی وجدان خود بخود بیدار ہو جاتا ہے۔

(۴) امام صاحب رح نے اپنی اخلاقی تعلیم کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی ہے۔ صحیح مذہبی وجدان۔ حکمت، نفسیات۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں ایک نفسیاتی گیرائی ہوتی ہے جو ایسے حکیمانہ انداز سے پیش کی جاتی ہے کہ صحیح مذہبی وجدان بیدار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

(۵) امام صاحب رح نے تصوف کی اصطلاحات کا مفہوم متعین کیا اور اُن کی وضاحت کی۔ علامہ ابن خلدون مقدمۂ تاریخ میں لکھتے ہیں :-

وجمع الغزالی بین الامرین فی الاحیاء فدون فیہ احکام الورع والاقتداء ثم بین اداب القوم وسنتھم و شرح اصطلاحاتھم فی عباداتھم وصار علم التصوف فی الملتہ علما مدوناً بعد ان کانت الطریقۃ عبادۃً فقط

امام غزالی نے احیاء میں دونوں طریقوں کو جمع کیا۔ چنانچہ ورع اور اقتداء کے احکام لکھنے کے ساتھ ارباب حال کے آداب اور طریقے بتلائے اور ان کے مصطلحات کی شرح کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف بھی ایک باقاعدہ علم بن گیا۔ حالانکہ پہلے اس کا طریقہ صرف عبادت کرنا تھا۔

امام قشیری رح کے زمانہ تک جو اصطلاحات مشہور ہوگئی تھیں، ان کا ذکر اوپر آچکا ہے امام غزالی نے مندرجہ ذیل اصطلاحات کا اضافہ کیا :-

سفر، سالک، مکان، شطح۔ ذہاب۔ وصل۔ فصل۔ ادب۔ تجلی تخلی۔ علت۔ انزعاج۔ غیرت۔ حریت۔ فتوح۔ وسم۔ رسم زوائد۔ ارادہ۔ ہمت۔ غربت۔ مکر۔ اصطلام۔ رغبت۔ وجد۔

(۶) صوفیۂ متقدمین کی بہت سی مخصوص روایات اور کردار کی اب تک توجیہ نہیں ہوئی تھی۔ امام صاحب رح نے ہر ہر مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی اور صوفیہ کے عمل کو صحیح ثابت کیا۔ مثلاً حکومت کی ملازمت نہ کرنا۔ صوفیہ کا یہ رویہ تو سب کو معلوم تھا

لیکن شرعی وجوہات پر کسی نے بحث نہیں کی تھی۔ امام صاحبؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ دربار میں نہ جانے پر بحث کرتے ہوئے احیاء میں لکھتے ہیں: "انسان کو سلاطین کے دربار میں ہر قدم پر گناہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ شاہی مکانات بالکل مغصوب ہوتے ہیں۔ اور زمین مغصوبہ میں قدم رکھنا گناہ ہے۔ دربار میں پہنچ کر سر جھکانا اور ہاتھ کو بوسہ دینا ہوتا ہے۔ اور ظالم کی تعظیم کرنا گناہ ہے۔ دربار میں ہر طرف جو چیزیں نظر آتی ہیں یعنی پردہ ہائے زرنگار، البسۂ ریشمیں، ظروف زریں، یہ سب حرام ہیں اور ان کو دیکھ کر چپ رہنا داخلِ معصیت ہے۔ آخر میں بادشاہ کی جان ومال کی سلامتی کی دعا مانگنی پڑتی ہے اور یہ گناہ ہے۔"

سلاطین کی ملازمت اور ادرارات کو قبول نہ کرنے کا سبب بیان فرماتے ہیں:

ان اموال السلاطین فی عصرنا حرام کلھا او اکثرھا فکیف لا والحلال ھو الصدقات والفئی والغنیمۃ ولا وجود لھا ولم یبق الا الجزیۃ وانھا توخذ بالواع الظلم لا یحل اخذھا بہ[۵]

ہمارے زمانے میں سلاطین کی جس قدر آمدنی ہے کل یا قریب کل حرام ہے۔ اور کیوں حرام نہ ہو۔ حلال آمدنی زکوٰۃ، خمس، فئے، مالِ غنیمت ہے۔ سو ان چیزوں کا اس زمانہ میں وجود ہی نہیں۔ صرف جزیہ رہ گیا وہ ایسے ظالمانہ طریقوں سے وصول کیا جاتا ہے کہ جائز اور حلال نہیں رہتا۔

بارہویں صدی کی دوسری عظیم المرتبت شخصیت حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ (المتوفی ۵۶۱ھ) ہیں۔ امام غزالیؒ نے اگر علمی حیثیت سے تصوف کو ایک مستقل فن بنانے کی خدمت انجام دی، تو شیخ جیلانیؒ نے عملی اعتبار سے اس تحریک میں ایک جان

---

۵ احیاء العلوم۔ باب خامس

ڈال دی اور جس چیز کو مولانا ضیاء الدین برنی، مصنف تاریخ فیروز شاہی نے "فن شیخی" سے تعبیر کیا ہے اس کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔ اُن سے پہلے کسی بزرگ نے تصوف کو اسلام کے زرین اصولوں کی نشر و اشاعت کا ذریعہ اس طرح نہیں بنایا تھا ارشاد و تلقین کا جو ہنگامہ انھوں نے برپا کیا وہ اسلامی تصوف کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ غور، غرجستان، بامیاں اور اردگرد کا تمام علاقہ مہایانہ بدھ مت کے زیر اثر تھا۔ اسلام کا کچھ اثر اگر اس علاقہ میں پہنچا تھا تو وہ کرامیہ فرقہ کے ذریعہ۔ شیخ جیلانی رح کی تعلیم سے افغانستان اور اُس کے قرب و جوار میں ایک زبردست دینی انقلاب آیا۔ اور ہزاروں آدمیوں نے اُن کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔

شیخ جیلانی رح کے وعظ بڑے پُرتاثیر ہوتے تھے۔ ہر طرح کے لوگ اُس میں شرکت کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے لکھا ہے:۔

مجلس آنحضرت ہرگز از جماعت یہود و نصاریٰ و امثال ایشاں کہ بردست او بیعت اسلام آورد ندے و از طوائف عصاۃ از قطاع طریق و ارباب بدعت و فساد در مذہب و اعتقاد کہ تائب می شدند خالی نبودے[۵۱]	حضرت کی مجلس کبھی یہود و نصاریٰ سے جو مشرف بہ اسلام ہوتے تھے اور قزاق، بدعتی اور فسادیوں سے جو دستِ حق پرست پر توبہ کرتے تھے خالی نہ ہوتی تھی۔

بعض اوقات حاضرین کی تعداد ۷۰،۰۰۰ ہزار تک پہنچ جاتی تھی[۵۲]۔ چار سو کاتب

۵۱۔ اخبار الاخیار۔ ص ۱۳

۵۲۔ اخبار الاخیار۔ ص ۱۲

قلم دوات لئے بیٹھے رہتے تھے اور جو لفظ شیخ کی زبان مبارک سے نکلتا اُسے فوراً لکھ لیتے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی راوی ہیں:۔

درمجلس وعظ آنحضرت چارصد نفر دوات و قلم گرفتہ می نشستند وانچہ ازوے می شنیدند املا می کردند۔[۵۱]	حضرت کی مجلس وعظ میں چارسو آدمی قلم دوات لئے بیٹھے رہتے تھے اور جو اُن سے سنتے تھے وہ لکھ لیتے تھے۔

شیخ کے مواعظ حسنہ کے دو مجموعے فتوح الغیب[۵۲] اور فتح ربانی[۵۳] اب بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ فتوح الغیب میں ۷۸ وعظ نقل کئے گئے ہیں۔ فتح ربانی میں شیخ کے وہ ۶۲ خطبات شامل ہیں جو انھوں نے ۵۴۵ھ اور ۵۴۶ھ میں دیے تھے ان خطبات کا ایک ایک حرف دل سے نکلا ہے اور اسی بنا پر وہ دل کی انتہائی گہرائیوں میں اپنی جگہ تلاش کرتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک متعصب مستشرق پروفیسر مارگولیتھ (PROF. D.S. MARGOLIOUTH) کو بھی اُن کے پُرتاثیر ہونے کا اعتراف کرنا پڑا ہے[۵۴] شیخ گیلانی کی دو اور مشہور تصانیف یہ ہیں (۱) غنیۃ الطالبین (۲) الفیوضات الربانیہ۔ اول الذکر کتاب میں شیخ نے ۷۳ اسلامی فرقوں کا ذکر نہایت شرح و بسط سے کیا ہے۔ بارویں صدی میں مسلمانوں کا دینی ماحول سمجھنے کے لئے یہ کتاب بے حد کارآمد ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کتاب کو اسی افادیت کی بنا پر، فارسی زبان میں منتقل کیا تھا

[۵۱] اخبار الاخیار۔ ص ۱۲

[۵۲] مطبوعہ مصر۔ سنہ ۱۳۰۴ھ

(۵۳) مطبوعہ مصر۔ سنہ ۱۳۰۲ھ

[۵۴] (ص ۴۱) ENCY OF ISLAM VOL I P 41.

شیخ گیلانی کے وعظوں میں اگر ایک تاثیر تھی، تو ان کے اخلاق میں ایک کشش
شیخ ابوالمعمر مظفر منصور ابن المبارک الواعظ المعروف بہ جرادہ کہا کرتے تھے
کہ میری آنکھ نے کسی کو سیدنا شیخ محی الدین عبدالقادر سے بڑھ کر خلیق، وسیع الصدر
کریم النفس، نرم دل اور حافظِ عہد و پیماں نہیں دیکھا۔ جلالتِ قدر اور علوِ منزلت
کے باوجود آپ ہر چھوٹے بڑے کی عزت کرتے تھے۔ کمزوروں کے ساتھ بیٹھتے۔
فقیروں کی تواضع کرتے۔ لیکن کبھی کسی امیر کے لئے کھڑے نہ ہوتے، نہ کبھی کسی
وزیر یا سلطان کے در پر جاتے۔

اس دور کے ایک اور مشہور بزرگ شیخ نجیب الدین عبدالقاہر سہروردیؒ
(المتوفی ۵۶۳ھ) ہیں۔ انھوں نے شیخ احمد غزالیؒ، شیخ جیلانیؒ اور
دیگر بزرگوں سے فیض حاصل کیا تھا۔ دارا شکوہ نے ان کے متعلق لکھا ہے:
"دو صحبت حضرت قطب ربانی محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ
مشرف گشتہ بودند"

شیخ نجیب الدین سہروردی نے بھی اصلاح و تربیت کا کام بڑے اعلیٰ پیمانے پر انجام
دیا۔ دجلہ کے مغربی کنارے پر آپ کی خانقاہ تھی۔ اس سے متصل ایک مدرسہ بھی
بنوا دیا تھا۔ ایک طرف علومِ ظاہری کا ہنگامہ تھا دوسری طرف تصفیۂ قلوب و تزکیۂ
نفوس کا کام جاری تھا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے ظهرت برکته علیٰ تلامذته[1]
یعنی اُن کے فیوض و برکات تمام شاگردوں پر ظاہر ہوئیں۔

بارویں صدی کے آخر میں دو اور عظیم المرتبت شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے
تصوف کی تحریک کو وہ سب کچھ دیا جس کی اس کو ضرورت تھی۔ حضرت شیخ
محی الدین ابن عربیؒ (۱۱۶۵ء تا ۱۲۴۰ء) اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

[1] وفیات الاعیان ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۱۲۔ (مطبوعہ مصر)

(۱۱۲۳ء ۔ ۱۱۹۸ء) دو مختلف مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے ۔ لیکن دونوں نے اپنی اپنی جگہ حیرت انگیز خدمات انجام دیں ۔

شیخ اکبرؒ ۱۱۶۵ء میں اسپین کے مشہور شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے تھے ۔ ۸ سال کی عمر میں مرسیہ سے لسبن آئے وہاں قرآن و حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد اشبیلیہ چلے گئے اور وہاں کے مشاہیر کی صحبت سے مستفیض ہوئے ۔ ناساعد حالات نے ان کو اشبیلیہ میں نہ ٹھہرنے دیا ۔ اسپین کے ہر ہر گوشہ میں شیخ اکبرؒ پہنچے اور وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کیا ۔ قرطبہ میں ابن رشد سے ملاقات ہوئی ۱۲۰۱ء میں شیخ اکبرؒ نے مغرب کو خیر باد کہا اور مشرق کی راہ لی ۔ مصر، حجاز، بغداد ۔ ایشیائے کوچک ہر ہر جگہ گئے لیکن اُن کے نظریات میں کچھ ایسی نُدرت اور سختی تھی کہ کسی جگہ لوگوں نے اُن کو چین سے نہ بیٹھنے دیا ۔ عمر کا بیشتر حصہ اسی مسافرانہ حالت میں گذارا یہاں تک کہ ۱۲۴۰ء میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی ۔

شیخ اکبرؒ ، کثیر التصانیف بزرگ تھے ۔ مولانا جامیؒ نے اُن کی تصانیف کی تعداد ۵۰۰ بتائی ہے ۔ برکلمان نے اُن کی ڈیڑھ سو ایسی تصانیف کی فہرست دی ہے جو اب بھی دستیاب ہوتی ہیں[۵۱] ۔ شیخ کی ان سب کتابوں میں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ۔ شیخ کے نظریات اور عقائد کا نچوڑ ان ہی کتابوں میں ملتا ہے ۔ فتوحات کے متعلق فرماتے ہیں ۔

کان الاغلب فیما ادعت هذه الرسالة ما فتح الله به علیّ عند طوافی ببیته المکرم او قعودی مراقباً له بجرمه الشریف المعظم[۵۲]

---

[۵۱] "محی الدین ابن عربیؒ" از عفیفی ۔ ص XVII

[۵۲] فتوحات مکیہ ۔ جلد اول ص ۱۰

یعنی جو حقائق و معارف میں نے اس کتاب میں ناظرین کے لئے بطور امانت درج کئے ہیں وہ اکثر خانۂ کعبہ کا طواف کرنے کے وقت یا حرم شریف میں بحالت مراقبہ خدا تعالےٰ نے مجھ پر کھولے ہیں۔

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں :۔

فشغلنا هذا الكتاب عنه وعن غيره بسبب الامر الالهى الذى ورد علينا فى تقييده ۔[۵]

یعنی ہم پر اس کتاب کی تکمیل کے لئے خدا تعالےٰ کا تاکیدی حکم وارد ہوا ۔ بدیں وجہ ہم دوسرے امور کو سرانجام کرنے سے رک گئے۔

شیخ اکبرؒ کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ وحدت الوجود ہے۔ مختصراً اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کائنات میں کوئی چیز موجود نہیں ۔ یا یہ کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے ۔ اہلِ ظاہر کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے بالکل الگ ایک جداگانہ ذات ہے ۔ صوفیہ کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے الگ نہیں ؎

با وحدتِ حق زکثرت خلق چہ باک   صد جائے اگر گرہ زنی رشتہ یکیست

دھاگے میں جو گرہیں لگا دی جاتی ہیں، اُن کا وجود اگرچہ دھاگے سے ممتاز نظر آتا ہے لیکن فی الواقع دھاگے کے سوا کوئی زاید چیز نہیں، صرف صورت بدل گئی ہے۔

شیخ اکبرؒ کے اس نظریہ وحدت الوجود سے اسلام کے بہترین دماغ متاثر ہوئے اور یہ نظریہ تصوف کی روح بن گیا۔ وحدت الوجود کے متعلق چند باتیں ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنی چاہئیں کہ ان کے بغیر اس نظریہ کا صحیح جائزہ حدامکان سے باہر ہے۔

(۱) مسئلہ وحدت الوجود پر عوام میں گفتگو کو مشایخ بہت برا سمجھتے تھے ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ فرمایا کرتے تھے :۔

---

[۵] فتوحاتِ مکیہ جلد اول ص ۹۸

مسئلۂ وحدت الوجود را پیش ہر آشنا و بیگانہ نخواہید بر زبان آورد[۵۱]	مسئلہ وحدت الوجود کو ہر آشنا و بیگانہ کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیئے۔

شاہ نور محمد مہاروی رح کا قول ہے :

ہر امم ماضیہ کہ حوادث واقع می شدند محض برائے اظہار وحدت وجود[۵۲]	پہلی امتوں پر جو حوادث نازل ہوئے وہ صرف اظہار وحدت وجود کی بنا پر تھے

حقیقت میں یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ عوام اس کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے اور ایسی صورت میں بے راہ روی پیدا ہو جانا لازمی چیز ہے۔ اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی عوام کو اس گفتگو میں شریک کیا گیا ہے۔ الحاد و زندقہ کے دروازے کھل گئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں مشایخ نے ہمیشہ یہ احتیاط برتی ہے کہ (۱) مریدین کو اس پر گفتگو کرنے کی سخت ممانعت کی ہے (۲) شیخ اکبر رح کی کتابوں کو پڑھنے اور پڑھانے پر پابندیاں عاید کی ہیں۔ محمد غوثی مصنف گلزار ابرار کے ایک بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فصوص الحکم کو پڑھانے کے لئے باقاعدہ سند حاصل کی جاتی تھی[۵۳] (۳) فصوص الحکم کی زیادہ تر شرحیں عربی میں لکھی گئی ہیں تاکہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی ان سے استفادہ کر سکے ——

واضح رہے کہ یہ تمام احتیاطیں ان مشایخ نے برتی ہیں جن کا وحدت الوجود پر ایمان تھا۔

(۲) نظریۂ وحدت الوجود میں اعتقاد کا اثر عملی زندگی میں بڑا زبردست پڑتا ہے اس پر اعتقاد رکھنے والے کا مطمح نظر بلند، ہمدردیاں وسیع اور مقاصد اعلیٰ ہوتے ہیں وہ عملاً الخلق عیال اللہ کا قائل ہوتا ہے۔ وہ ہر نظریہ کو ہمدردانہ سمجھنے کے لئے تیار رہتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر میں حقیقت تو ایک ہی ہے —— وحدت الوجود پر ایمان لانے کے بعد انسان میں تنگ نظری اور تعصب، کا تو وجود رہتا ہی نہیں۔ ہمارے مشایخ نے اس نظریے کے ذریعے دوسری قوموں کے مزاج کو پہچانا، ان کے مذہبی اور

---

[۵۱] مکتوبات کلیمی ص ۷۸۔ [۵۲] مناقب المحبوبین ص ۹۷ [۵۳] گلزار ابرار (قلمی نسخہ) اردو ترجمہ ص ۵۴۴

سماجی حالات کو پرکھا اور پھر اسلام کے زرین اصولوں کو ان تک پہنچانے کی کوشش کی مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی بالغ نظر نے اسلامی تاریخ کے اس راز کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں فلسفۂ وحدت الوجود کو بڑا دخل رہا ہے۔ اور اسی بنا پر وہ ایسا محسوس کرنے لگے تھے کہ اسلام کا فکری انقلاب اسی راہ سے ہو کر گزرے گا ——— ان کا خیال صحیح تھا، اور بالکل صحیح۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ وحدت الوجود کو عملی زندگی میں ایک انقلابی عنصر کی حیثیت سے استعمال کرنے کے لئے مجددانہ بالغ نظری اور بیدار مذہبی شعور کی ضرورت ہے۔ ورنہ اس کی گمراہیاں کبھی دین الٰہی کی شکل اختیار کرتی ہیں اور کبھی فتنۂ نمود و نمود کی۔

حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ (۱۱۴۴-۱۲۳۴ء) حضرت ابن عربیؒ کے معاصر تھے۔ ایک روایت ہے کہ مکہ معظمہ میں اتفاقاً دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، ایک لفظ زبان سے نہ نکالا، اور دونوں رخصت ہو گئے۔ شیخ سہروردیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ کے مکتب خیال کے لوگوں میں تھے شیخ اکبرؒ۔ شیخ بایزید بسطامیؒ اور شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے نظریات سے متاثر تھے۔

شیخ سہروردیؒ کی کتاب عوارف المعارف، تصوف کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ تیرہویں صدی میں جب سلاسل کی تنظیم شروع ہوئی تو سہروردیہ سلسلہ کے علاوہ دیگر سلسلوں نے بھی اس کتاب کو اپنا لیا۔ عوارف المعارف کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تصوف کے بنیادی اعتقادات، خانقاہوں کی تنظیم، مریدین و شیوخ کے تعلقات اور دیگر مسائل پر نہایت وضاحت سے کتاب و سنت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ تصوف کی اصطلاحات کے معنی مختصر، لیکن جامع طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ایک طرف تو تصوف کا پورا

فلسفہ اس میں مدون ہو گیا ہے۔ دوسری طرف خانقہی نظام کے متعلق تفصیلی بحث آگئی ہے چشتیہ سلسلہ کے مشائخ بھی اس کتاب کی بڑی قدر کرتے تھے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اپنے اعلیٰ مریدین اور خلفاء کو اس کا درس دیا کرتے تھے۔ محمد غوثی کا بیان ہے کہ حضرت بابا صاحب رح نے اس پر ایک حاشیہ بھی لکھا تھا[۵۱]

آخیر عمر میں شیخ سہروردی رح کی شہرت ممالک اسلامیہ میں دور دور پھیل گئی تھی علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ:

ولم یکن فی آخر عمرہٖ فی عصرہٖ مثلہ وکان شیخ الشیوخ ببغداد[۵۲]	آپ کی آخر عمر میں آپ کے معاصرین میں کوئی آپ کا مثل وہم پایہ نہ تھا اور آپ بغداد کے شیخ الشیوخ تھے۔

امام تاج الدین سبکی محدث رح نے لکھا ہے:

"حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی، فقیہہ، فاضل، عارف، کامل، زاہد متورع اور علم حقیقت میں اپنے وقت کے شیخ اور امام جلیل تھے مریدین وطالبین کی تربیت، خلق کی خالق کی طرف دعوت۔ مخلوق کی رشد و ہدایت تکمیلِ سلوک سالکان اور تعلیم و تلقینِ طریق عبادت و خلوت وغیرہ آپ پر ختم تھی"[۵۳]

شیخ سعدی رح کو، جنھوں نے اسلامی دنیا کے کونے کونے کو چھان مارا تھا، جب مرشدِ کامل کی تلاش ہوئی تو شیخ سہروردی رح ہی کے آستانہ کی طرف دوڑے۔ شیخ کی اصلاح وتربیت کا نچوڑ یہ تھا کہ کبھی "خود بیں" نہ بننا اور کبھی "بدبیں" نہ

---

۵۱ گلزار ابرار۔ مصنفہ محمد غوثی (قلمی نسخہ)

۵۲ وفیات الاعیان۔ جلد اول ص ۳۸۰

۵۳ طبقات امام سبکی جلد ۵ ص ۱۴۲-۱۴۳۔

ہونا۔ فرماتے ہیں :-

مرا پیر دانائے فرخ شہاب — دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش — دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ اعلیٰ تصوف، اصلاح و تربیت اور تعلیم اخلاق کا ایک زبردست نظام تھا ——— !

بارویں صدی عیسوی میں اسلامی دنیا کی حالت بہت زبوں تھی۔ خلافتِ بغداد پر نزع کا عالم طاری تھا۔ بغداد کی عظمت ماضی کی داستان بن چکی تھی۔ نئی نئی طاقتیں اُبھر رہی تھیں اور ہر طاقت پہلے بغداد ہی کی طرف رُخ کرتی تھی۔ اخلاقی پستی اپنی اپنی آخر حد پر پہنچ چکی تھی۔ امراء و سلاطین خلفاء و وزراء سب پر ایک اخلاقی انحطاط کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ عجم کا سیاسی نظام بے جان ہو چکا تھا اور کچھ ہی دنوں میں گرا چاہتا تھا۔ اُدھر اندلس میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ہچکیاں لے رہا تھا ——— سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں پیدا ہونے والے مشایخ نے سیاسی حالات کی درستگی کے لئے بھی کچھ کیا یا نہیں۔ ضروری ہے کہ اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈال دی جائے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہم نے اس صدی کے صوفیہ میں سب سے پہلے کیا ہے، ایسے زمانے میں پلے بڑھے تھے۔ جب ملک شاہ سلجوقی سریر آرائے سلطنت تھا۔ وہ عدل و انصاف میں مشہور تھا۔ اور رعایا کی بہبودی کا خیال رکھتا تھا۔ ملک شاہ کے بعد اس کے تین بیٹے برکیا رق، محمد، اور سنجر سلطنت کے دعویدار ہوئے۔ اور خانہ جنگیوں کا ایک ایسا ہولناک سلسلہ شروع ہوا کہ شہر کے شہر تباہ ہو گئے، دیہات و قصبات میں خاک اڑنے لگی۔ ہزاروں جانیں ضائع ہو گئیں اور امن و امان کا نام و نشان نہ رہا [1]

[1] ابن الاثیر۔ واقعات ۴۹۷ھ

امام صاحب رح نے پوری بصیرت کے ساتھ حالات کا جائزہ لیا۔ وہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے ہر گوشے سے واقف تھے۔ بغداد میں وہ دربارِ خلافت میں باریاب ہوئے تھے، سلاجقہ کے دربار میں آتے جاتے تھے، وزرائے سلجوقیہ اُن کے ارادت مند تھے، پھر خراسان سے لے کر بیت المقدس تک اسلامی دنیا کا پورا مطالعہ کیا تھا۔ امام صاحب رح نے احیاء العلوم میں سلاطین کے کردار پر کھل کر تنقید کی اور اُن کی گمراہیوں کے ایک ایک منبع و مخرج کا پتہ لگایا۔ اس تنقید نے عوام میں ہمت و جرأت پیدا کی اور سلاطین کو بھی اُن کی خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا۔ محمد بن ملک شاہ کو (جو سنجر کا بڑا بھائی تھا) ایک ہدایت نامہ جو نصیحت الملوک کے نام سے مشہور ہے لکھ کر بھیجا۔ اس میں عقائد دینی سے بحث کرنے کے بعد حکومت کے فرائض سے آگاہ کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں سب سے زیادہ عذاب جس کو دیا جائے گا وہ ظالم بادشاہ ہوں گے۔ حضرت عمر رض فرمایا کرتے تھے کہ "اگر ایک خارشتی بکری کی خبر گیری مجھ سے رہ گئی تو قیامت میں مجھ سے مواخذہ ہوگا"
اے بادشاہ! دیکھو حضرت عمر رض کو باوجود اپنے کمالِ احتیاط، عدل و انصاف کے مواخذے کا کس قدر ڈر تھا۔ اور تیرا یہ حال ہے کہ تجھ کو اپنی رعایا کی کچھ پروا نہیں اور کچھ نہیں جانتا کہ تیرے ملک والوں کا کیا حال ہے۔ تجھ کو صرف اس پر قناعت نہیں کرنی چاہیئے کہ خود ظلم کا ارتکاب نہیں کرتا۔ بلکہ تو اس بات کا بھی ذمہ دار ہے کہ تیرے غلام، عہدہ دار، عامل کسی پر ظلم و ستم نہ کریں۔

(۲) اے سلطان! اگر تو دنیا کی لذات کی غرض سے لوگوں پر مظالم کرتا ہے تو غور سے دیکھ! دنیا کی لذات کیا ہیں! اگر تو کھانے کا زیادہ حریص ہے تو جانور ہے۔ اگر حریر و دیبا کے استعمال کا دلدادہ ہے تو مرد نما عورت ہے اگر اپنے غیظ و غضب کے قابو میں ہے تو آدمی کی صورت

میں درندہ ہے۔

سلاطین کے علاوہ امام صاحبؒ نے ارکانِ سلطنت اور وزرار کو اُن کی بے راہ روی پر متنبہ کیا۔ انھوں نے وزرا کے نام بہت سے خطوط لکھے ہیں جن میں عدل و انصاف کی پابندی کی تاکید ہے۔

اسپین کے دردناک حالات سے بھی امام صاحبؒ ناواقف نہ تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موحدین کی سلطنت امام صاحبؒ ہی کی وجہ سے وجود میں آئی۔ محمد بن عبداللہ تومرت، بانیِ سلطنت موحدین امام غزالیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور امام صاحبؒ کی اس خواہش سے کہ کوئی اسلامی سلطنت وجود میں آئے اتنا متاثر ہوا کہ وطن واپس ہونے پر ایک سلطنت کے قائم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ امام صاحبؒ سے ذکر کیا تو فرمایا کہ اگر اسباب مہیّا ہوں تو کوشش کی جائے۔

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے[1]:

ولقي فيما زعموا ابا حامد الغزالي وفاوضه بذات صدره بذلك فاراده عليه لما كان فيه الاسلام يومئذ باقطار الارض من اختلال الدولة وتقويض اركان السلطان الجامع للأمة المقيم للملة بعد ان سئله عمن له من العصابة والقبائل التي يكون بها الاعتزاز والمنعة

جیساکہ لوگوں کا خیال ہے۔ وہ (محمد بن عبداللہ تومرت) ابو حامد غزالی سے ملا اور ان سے اپنے دلی خیالات کے متعلق مشورہ کیا۔ امام صاحب نے اس کی تائید کی کیونکہ اس زمانہ میں اسلام تمام دنیا میں ضعیف ہو رہا تھا اور کوئی ایسا سلطان موجود نہ تھا جو تمام امت کو فراہم کر سکے اور دین اسلام کو قائم رکھے لیکن پہلے امام صاحبؒ نے اس سے پوچھ لیا کہ تمھارے پاس اتنا سروسامان اور جمعیت ہے یا نہیں جس سے قوت اور حفاظت ہو سکے۔

[1] مقدمہ ابن خلدون

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح، خلفاء وقت پر عوام کے سامنے تنقید کرتے تھے کسی بے راہ روی کا پتہ چل جاتا تو سخت مذمت کرتے۔ خلفاء خاموشی سے اُن کی تنبیہہ کو سنتے۔ بہجۃ الاسرار میں ایک واقعہ لکھا ہے جس کو کرامت کا رنگ دے دیا گیا ہے، لیکن بایں ہمہ بڑا عبرت آموز ہے۔ شیخ ابو العباس خضر بن عبد اللہ حسینی موصلی سے مروی ہے کہ ایک رات ہم بغداد میں سیدنا شیخ محی الدین عبد القادر کے مدرسے میں تھے۔ امام مستنجد باللہ ابو المظفر یوسف، آپ کی خدمت میں آیا۔ اور عرض کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں اور دس تھیلیاں اشرفیوں کی خدمت میں پیش کیں۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے ان تھیلیوں کی ضرورت نہیں۔ خلیفہ نے اصرار کیا تو آپ نے ایک تھیلی اپنے دائیں ہاتھ میں لے لی اور دوسری بائیں میں اور دونوں کو دبا کر نچوڑا تو اُن میں سے خون بہنے لگا۔ پھر آپ نے فرمایا ابو المظفر کیا تو حیا نہیں کرتا کہ لوگوں کا خون لے کر میرے پاس آیا ہے[۵۱]

حقیقت میں وہ تھیلیاں عوام کے خون ہی سے بھری ہوئی تھیں! خلفاء متاخرین کے طرزِ حکومت پر اس سے بڑی تنقید اور کیا ہوسکتی ہے۔

اسلامی دنیا کے عام حالات، خصوصاً اندلس کی ابتری نے شیخ محی الدین ابن عربی رح پر جو اثر کیا وہ خود اُن ہی کی زبانی سننے کے قابل ہے۔ سلطان روم سلطان عزالدین کیکاؤس کو لکھتے ہیں:[۵۲]

کتبت کتابی والدموع تسیل — ومالی الی ما ارتضیہ سبیل

میں اپنا خط لکھ رہا ہوں اور آنسو بہہ رہے ہیں — اور میرے بس میں نہیں ہے کہ ان کو راضی کروں

---

۵۱ بہجۃ الاسرار۔ ص ۶۱

۵۲ فتوحات مکیہ۔ ج ۴ ص ۶۹۲ (مطبوعہ بولاق)

ارید اری دین النبی محمداً　　یقام و دین المبطلین یزول

چاہتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو دیکھوں کہ وہ بلند کیا جائے اور جھوٹوں کا دین مٹ جائے

فلم ار الا الزور یعلو و اھلہ　　یعزون والدین القویم ذلیل

مگر بناوٹی سخن سازیوں کے اور اس کے کاروبار کرنے والوں کے سوا کسی کو معزز ہوتے ہوئے نہیں پا رہا ہوں۔

فیا عز دین اللہ سمعاً لناصح　　شفیقاً فنصاح الملوک قلیل

اے اللہ کے دین کی عزت ایک بہی خواہ کی نصیحت سُن جو تجھ پر مہربان ہے، یاد رکھ کہ بادشاہ کو نصیحت کرنے والے کم ہیں

وحاذر بتائین الا لہ بطانۃ　　تشیر بامر ما علیہ دلیل

اور بچو اللہ کی مدد سے ایسوں کو راز دار بنانے سے جو اشارے ایسی باتوں کی طرف کرتا ہو جس کی دلیل نہ ہو

اس کے خطاب عز الدین پر اعتراض کرتے ہیں :-

اذا انت اعززت الھدی وتبعتہ　　فانت لھذا الدین عز کما تدعی

اگر دینی ہدایت کو تم سے عزت نصیب ہو اور اس کی خود بھی تم پیروی کرو تو بیشک تم دین کی عزت ہو جیسا کہ بہلانے جاتے ہو

وان انت لم تحفل بہ واھنتہ　　فانت تذل الدین تخفضہ وضعا

اور اگر تم نے دین کو نہیں سمیٹا اور اُسے ذلیل کیا تو پھر دین کے تم خوار کرنے والے، اور اسے تم نے پست کر دیا

فلا تاخذ الالقاب زوراً فانکم　　تسئل عنھا یوم یجمعکم جمعا

پس جھوٹ موٹ کے القاب نہ اختیار کرو کیونکہ جس دن تم لوگ (قیامت میں جمع کئے جاؤ گے، اس کے متعلق پوچھا جائے گا

وان قال دین کنت بملکہ　　ذلیلاً واھلی فی میادینہ صرعا

اور سے دین نے اگر کہا کہ میں اس شخص کی حکومت میں ذلیل تھا اور دین دار لوگ اس ملک میں پچھڑے پڑے تھے تو قیامت کے دن تمہارا کیا جواب ہوگا۔

حق کی یہ آوازیں اس وقت اُٹھی تھیں جب مسلمانوں کا سارا سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہو رہا تھا!

حضرت شیخ نجیب الدین سہروردی رح اور اُن کے برادر زادے شیخ شہاب الدین سہروردی رح

کا زیادہ وقت عوام کی اصلاح و تربیت میں گزرتا تھا۔ لیکن جب سیاسی حالات کا تقاضا ہوتا کہ وہ اپنی خانقاہ سے باہر نکلیں تو ان کو کبھی تامل نہ ہوتا۔ خلیفہ الراشد سے جب شیخ نجیب الدین رح نے بیعت خلافت کی تو اس کو بہت نصیحتیں فرمائیں۔ ابن اثیر نے لکھا ہے :-

وبایع له الشیخ ابو النجیب ووعظه وبالغ فی الموعظة[۵۱]

شیخ ابوالنجیب نے ابوجعفر الراشد باللہ کی بیعت خلافت کی اور نہایت مبالغہ کے ساتھ اس کو پند و نصیحت فرمائی۔

جب خوارزم شاہ کی فوجیں بغداد پر حملہ آور ہوئیں تو شیخ شہاب الدین سہروردی رح نے نہایت جرأت کے ساتھ خوارزم شاہ سے گفتگو کی۔ روضۃ الصفا میں لکھا ہے :-

"شیخ بطریق سنت سلام کرد و پادشاہ از غایت نخوت جواب داد.....
شیخ ہم چناں بر پائے ایستادہ بہ عربی خطبہ بلیغ فصیح خواند، سخنان تلخ برزبان آورد"[۵۲]

ایک مرتبہ اربل میں سفارت کے نازک کام کو انجام دینے کے لئے شیخ شہاب الدین سہروردی رح ہی کا انتخاب کیا گیا۔[۵۳] اور انھوں نے بڑی خوبی سے اس کو پورا کیا۔

بارھویں صدی کے ان مشاہیر صوفیہ کا تذکرہ ختم کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ان صوفی شعراء کا ذکر بھی کر دیا جائے جنھوں نے تصوف کی تحریک کو عوام تک

---

۵۱ الکامل - جلد یازدہم ص ۱۲

۵۲ روضۃ الصفا - ج ۴ ص ۱۱۸

۵۳ ملاحظہ ہو، "علمائے سلف" از نواب صدر یار جنگ

پہنچانے میں ایک زبردست خدمت انجام دی تھی۔

حکیم سنائیؒ۔ نظامی گنجویؒ اور خواجہ فریدالدین عطارؒ اس عہد کے مشہور صوفی شعراء تھے۔ صوفیانہ شاعری کے متعلق مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

"فارسی شاعری اس وقت تک بے جان تھی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا۔ شاعری اصل میں اظہارِ جذبات کا نام ہے۔ تصوف سے پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ قصیدہ، مدّاحی اور خوشامد کا نام تھا۔ مثنوی واقعہ نگاری تھی۔ غزل زبانی باتیں تھیں۔ تصوف کا اصلی مایۂ خمیر، عشقِ حقیقی ہے، جو سرتا پا جذبہ اور جوش ہے، عشقِ حقیقی کی بدولت مجازی کی بھی قدر ہوئی اور اس آگ نے تمام سینہ و دل گرما دئے۔ اب زبان سے جو کچھ نکلتا تھا گرمی سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ اربابِ دل ایک طرف اہلِ ہوس کی باتوں میں بھی تاثیر آگئی۔"[۵]

شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اُن کے بعد حکیم سنائیؒ ہی نے اس باغ کی آبیاری کی۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں :-

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پسِ سنائی و عطار آمدیم

حکیم سنائیؒ نے تصوف میں دو مستقل کتابیں حدیقہ اور سیر العباد تصنیف کی تھیں ان کے علاوہ ان کی چھ مثنویاں بھی ہیں۔ حدیقہ میں تصوف کے اکثر مقامات صبر، رضا، توکل، وغیرہ کے مستقل عنوان قرار دئے ہیں۔ اور اُن کی حقیقت بتائی ہے۔ سیر العباد میں اس قسم کے مسائل سے بحث کی ہے، نفس ناطقہ، سالکانِ طریقت، اہلِ رضا، مراتبِ نفس وغیرہ۔

۵۔ شعر العجم۔ جلد پنجم۔ ص ۱۲۰

حکیم سنائی رح سے پہلے کسی نے تصوف کے اسرار و معارف کو اس طرح ادا نہیں کیا تھا۔ خود اُن کا دعوےٰ ہے:۔

کس نہ گفت این چنیں سخن بجہاں	ور کسے گفت، گو بیار و بخواں
زیں نمط ہر چہ در جہاں سخن است	گر یکے در ہزار، آنِ من است
چوں ز قرآن گزشتی وز اخبار	نیست کس را ازیں نمط گفتار

مولانا شبلی کا خیال ہے کہ اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم سنائی رح نے قائم کی، اور گو آگے چل کر اس صنف کو بہت وسعت ہوئی، لیکن اصول اور آئین حکیم سنائی ہی نے قائم کر دئے تھے۔

ابتدائی زمانے میں سنائی رح درباروں میں رہتے تھے اور قصیدہ گوئی میں وقت صرف کرتے تھے۔ ایک دن ایک مجذوب کی بات کا ایسا اثر ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ بہرام شاہ نے اپنی بہن کو عقدِ نکاح میں دینا چاہا تو جواب میں لکھ بھیجا:۔

من نہ مردِ زن و زر و جاہم	بخدا گر کنم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم	بہ سرِ تو کہ تاج نہ ستانم

ایک رئیس نے اُن کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا تو اسے لکھا:۔

ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوہا۔ گوشہ دل ایں گوشہ گرفتہ را بہ تفقد ستائش خود خراب نہ کند، جسم حقیر ایں بندہ نہ سزائے خشم خداوندی است" [1]

خواجہ فرید الدین عطار رح نے صوفیانہ شاعری کی وسعت کا دائرہ نہایت وسیع

[1] تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی

کردیا۔ ان کی بدولت قصیدہ، رباعی، غزل تمام اصنافِ سخن تصوف سے مالامال ہوگئے۔ اُن کے اشعار کی تعداد لاکھ سے زیادہ ہے"[۵۱]

مولانا رومؒ فرماتے ہیں :-

ہفت شہرِ عشق را عطار گشت
ماہماں اندر خمِ یک کوچہ ایم

وحدت الوجود کا مضمون خواجہ صاحبؒ کی خاص توجہ کا مرکز بنا۔ انھوں نے اکثر اشعار اسی مضمون کے لکھے" وہ نہایت جوش و خروش اور ادعا سے اس کو بار بار کہتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ سیر نہیں ہوتے۔ اُن کا فلسفہ یہ ہے کہ تمام اشیا میں وہی جاری و ساری ہے اور اسی نے ہر چیز میں حُسن پیدا کر دیا ہے۔ وہ قد میں جلوہ، زلف میں شکن، ابرو میں وسمہ، یاقوت میں آب، مشک میں خوشبو ہے"

تاب در زلف و وسمہ بر ابرو — سرمہ در چشم و غازہ بر رخسار
رنگ در آب و آب در یاقوت — بوئے در مشک و مشک در تاتار[۵۲]

حاصل کلام یہ ہے کہ بارہویں صدی کے آخر تک تصوف بہ حیثیت ایک فن کے انتہائے کمال کو پہنچ گیا تھا۔ امام غزالیؒ، شیخ اکبرؒ، شیخ شہاب الدین سہروردی نے اس کا فلسفہ، اصطلاحات، بنیادی مسائل سب کی وضاحت کر دی تھی حکیم سنائیؒ اور خواجہ عطارؒ نے عشقِ الٰہی کی آگ بھڑکنے میں اپنے شاعرانہ کمال سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا تھا —— اب تصوف کا صرف عوامی تحریک بنا باقی تھا۔ تیرہویں صدی میں سلاسل کی تنظیم سے وہ کمی بھی پوری ہوگئی۔

تصوف، تیرہویں صدی میں تیرہویں صدی عیسوی میں روحانی سلاسل وجود میں

---

[۵۱] شعرالعجم۔ حصہ پنجم ص ۱۲۵ [۵۲] شعرالعجم۔ حصہ پنجم ص ۱۲۶ - ۱۲۵

آئے اور اُن کی تشکیل سے تصوف کی تحریک میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ اسلامی تصوف کی تاریخ تیرہویں صدی میں ہر اعتبار سے مکمل ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں یہ سلاسل اس کے ارتقاء اور نشوونما کی آخری منزل ہیں۔ آئندہ صدیوں میں تصوف کی تحریک زوال و انحطاط، اصلاح و تجدید کی مختلف حالتوں سے گزرتی رہی۔ لیکن بنیادی طور پر نہ اُس کے فلسفہ میں کوئی اضافہ ہوا نہ اس کے عملی پروگرام میں کوئی تبدیلی۔ امام غزالیؒ اور شیخ اکبرؒ کے افکار کے گرد تصوف کی ساری دنیا گردش کرتی رہی۔ اِن بزرگوں کی تصانیف کے حاشیوں اور خلاصوں سے باہر نکلنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی، مثنوی مولانا رومؒ نے شاعری کی ساری دنیا کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ غرض ہر اعتبار سے تیرہویں صدی میں تصوف کی تحریک معراجِ کمال کو پہنچ گئی تھی۔

اس سے قبل کہ ہم روحانی سلاسل پر بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن حالات کا بھی ایک سرسری جائزہ لے لیں جن میں یہ سلاسل وجود میں آئے۔ عجمی مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی تو عرصہ سے زوال پذیر تھی، لیکن تیرہویں صدی میں یہ اپنی تباہی کی آخری منزل پر پہنچ گئی۔ سیاسی نظام بے جان ہو گیا، اور سماج میں ابتری و انتشار پھیل گیا۔ عطا ملک جوینی کا بیان ہے کہ اگر خوارزم شاہ نئو فوجی افسروں کو طلب کرتا تھا تو دس حاضر ہوتے تھے[1]۔ زندگی کے ہر ہر شعبہ میں یہ ہی حال تھا۔ ہر طرف لوٹ مار، غارت گری کا دور دورہ تھا، صنعت و حرفت اور تجارت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ بغداد کے وہ علاقے جہاں کبھی تاجروں کا ہجوم رہتا تھا، اب کبوتر بازوں کے اڈے بن گئے تھے[2]۔

---

[1] تاریخ جہاں کشا۔ (گیب میموریل سیریز) ص ۳۵-۳۴

[2] THE RENAISSANCE OF ISLAM; BY ADAM MEZ P. 7

اخلاقی زبوں حالی اس سے کہیں زیادہ تھی۔ تمام وہ انسانی اوصاف جو سماج میں فوز و کامرانی، خوش حالی و اطمینان کی ضمانت ہوتے ہیں ختم ہو چکے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سیاسی زوال سے پہلے اخلاقی زوال کی ساری منزلیں طے ہو چکی تھیں۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا زوال منگولوں کے حملہ کا نتیجہ تھا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ منگولوں کے حملے مسلمانوں کے زوال کا نتیجہ تھے، سبب نہ تھے۔

بہرحال اسلامی دنیا میں سیل تارتار سے بڑھ کر کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی۔ ان کی تباہ کاریوں سے عجم کے زرخیز اور لہلہاتے علاقے، بنجر اور ویران ہو گئے۔ ہر طرف تباہی اور بربادی کے مناظر نظر آنے لگے۔ ساری اسلامی دنیا زیروزبر ہو گئی۔ بغداد جو تارکِ اسلام کا تاج تھا، خون میں نہا گیا۔ دریائے دجلہ مسلمانوں کی لاشوں سے پٹ گیا اور میلوں تک اس کا پانی لال ہی لال نظر آنے لگا۔ خانقہیں اور مدرسے بے نور و بے چراغ ہو گئے۔ کتب خانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ سعدیؒ کا یہ جاں سوز مرثیہ جس میں اب بھی سوزِ دل کی بو آتی ہے، بغداد کے کھنڈرات میں گونجنے لگا ـــــــ

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المومنیں

اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری زخاک
سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں

ـــــــ ان روح فرسا مناظر کو دیکھ کر طبیعتیں خود بخود تصوف کی طرف راغب ہو گئیں۔ انابت، خضوع، تضرع، توکل جو تصوف کے خاص مقامات ہیں خود بخود دل پر طاری ہو گئے۔

اس زمانے کے صوفیہ نے مسلمانوں کی سیاسی اور ذہنی ابتری کے دردناک نظارے دیکھے تھے۔ اُن پر ان حالات کا بڑا اثر تھا، اُن کی فطرت کا تقاضا تھا ؎

دارد کوئی سوچ اُن کی پریشاں نظری کا

چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے ذہنی انتشار کو دور کرنے کے لئے سلاسل کی تنظیم شروع کر دی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سلسلوں کے عروج سے اسلامی سوسائٹی کو جو فائدہ پہنچا وہ یہ ہی تھا کہ مسلمانوں کی پریشان نظری ختم ہوگئی، اُن کی طبیعتیں ایک چیز پر لگ گئیں، اور اُن کے ذہن ایک مرکز پر آگئے قوموں کی زندگی میں سب سے زیادہ خطرناک وقت وہ ہوتا ہے جب سیاسی انتشار، ذہنی انتشار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہمارے مشائخ نے "ذہنی انتشار" کو دور کرنے میں جس بالغ نظری کا ثبوت دیا وہ محتاج بیان نہیں اسلامی دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ باقی ہو جہاں خانقاہیں قائم نہ ہوئی ہوں اور جہاں عوام کی اصلاح و تربیت کا انتظام نہ کیا گیا ہو۔ جو قوم منگولوں کی چیرہ دستیوں اور سفاکیوں سے مضمحل ہو کر نبضیں چھوڑ چکی تھی، تصوف کے ذریعے سے پھر ایک بار زندہ ہوئی۔ زندگی کی یہ نئی لہریں طاقتوں کی پیدا کی ہوئی تھی خدا پر اعتماد اور بھروسہ۔ انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی کے لئے قربان کر دینے کا جذبہ۔ اور اخلاقی اقدار کو زندہ کرنے کا عزم۔

فطرت کا اندازہ بھی خوب ہے۔ جب زوال انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو یہ انتہا ہی تجدید و احیاء کی صورتیں پیدا کر دیتی ہے۔ جب تباہی حد سے گزر جاتی ہے تو ترقی کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ شکست میں فتح کے اسباب مہیا کئے جاتے ہیں اور دشمن سے ہمدردی کرا دی جاتی ہے۔ منگولوں نے جس بیدردی اور سفاکی

کے ساتھ اسلام کے سیاسی اور سماجی نظام کو درہم برہم کیا۔ اس سے کون واقف نہیں! پھر انھیں دشمنانِ اسلام کو حلقہ بگوشِ اسلام بناکر ان ہی سے مسلمانوں کی اُجڑی ہوئی بستیوں کو از سرِ نو آباد کرنے کا کام لیا گیا ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

خواجہ فریدالدین عطار ؒ کو ایک مغل نے شہید کیا ـــــــــ پھر وہی مغل اُن کے مزار کا مجاور بنا!! بغداد کی جامع القصر کو ہلاکو کے حکم سے تباہ کیا گیا۔ اور پھر اسی کے حکم سے اس کی مرمت کی گئی!!!

اس عہد کے اُن شعراء میں جنھوں نے حالاتِ گردوپیش سے متاثر ہوکر تصوف کی طرف رُخ کیا اور پھر ساری فضاؤں کو صوفیانہ جذبات سے معمور کردیا، مولانا روم، شیخ سعدی ؒ، اوحدی اور عراقی خاص طور سے مشہور ہیں۔

مولانا روم، ابتدائی زمانہ میں علمِ ظاہری کے ماہر تھے، بڑے تزک و احتشام سے اُن کی سواری نکلتی تھی، ایک دن شمس تبریز ؒ نے سواری روک لی، اور حکیم سنائی ؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولانا پر ایسا اثر ہوا کہ علمِ ظاہری سے طبیعت ہٹ گئی، اور علمِ باطنی کی طرف رغبت پیدا ہوگئی۔ اور پھر مشاہیرِ صوفیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دمشق میں طالب علمی کے زمانے میں شیخ محی الدین ابن عربی ؒ سے ملاقات ہوئی تھی۔ بعد کو اُن کے مریدِ خاص مولانا صدرالدین قونوی ؒ سے صحبتیں رہیں شیخ شہاب الدین سہروردی ؒ سے بھی فیض حاصل کیا۔

مولانا روم کی مثنوی اُن کی شہرت دوام کا باعث بنی اور لوگوں کو اس کی مقبولیت دیکھ کر کہنا پڑا کہ ۵

هست قرآں در زبانِ پہلوی

مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم یا نثر میں لکھی گئی ہیں۔ کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فارسی پر موقوف نہیں اس قسم کے نکات اور دقائق کا عربی تصنیفات میں مشکل سے پتہ لگتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر علمار اور اربابِ فن نے مثنوی کی طرف تمام اور کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی، اور یہاں تک مبالغہ کیا کہ مصرعہ

هست قرآں در زبان پہلوی تو کچھ تعجب کی بات نہیں [۱]

اس زمانے میں ایک طرف اگر شعرار نے اپنے دل گداز اشعار کے ذریعے صوفیانہ خیالات کی ترویج و اشاعت کی تو دوسری طرف اکابر مشایخ نے روحانی سلاسل کی ترتیب و تنظیم سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ولایتوں کی تقسیم اور قطب، ابدال وغیرہ کی نوعیت پر عموماً تو بہانہ سطح پر غور کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منگولوں کی پیدا کی ہوئی ذہنی ابتری کو مشایخ نے اس طرح پر ختم کیا کہ چپّہ چپّہ پر اپنا روحانی نظام قائم کر دیا اور ہر جگہ لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے مقامی ذمہ داری کے ساتھ کوششیں کیں۔

اس زمانے کے سلسلوں میں خاص طور سے سلسلۂ خواجگان، سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ چشتیہ اور سلسلۂ سہروردیہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

۱؎ سوانح مولانا روم - ص ۶۹

سلسلۂ خواجگان - قدامت کے اعتبار سے سلسلۂ خواجگان سب سے پہلے آتا ہے۔ یہ سلسلہ ترکستان میں قائم ہوا تھا۔ اس کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ خواجہ محمد آتا یسوی رح[۱] (المتوفی ۱۱۶۶ء) ہیں۔

اُن کے بعد خواجہ عبدالخالق غجدوانی رح[۲] (المتوفی ۱۱۷۹ء) نے سلسلہ کی مندرجہ ذیل اصطلاحات وضع کیں اور ان کو اپنے روحانی نظام کا لازمی جزو بنایا۔ ہوش دردم نظر برقدم۔ سفر در وطن خلوت در انجمن۔ یاد کرد۔ بازگشت۔ نگاہ داشت۔ یادداشت[۳]

خواجہ آتا رح اور خواجہ غجدوانی رح نے اس سلسلے کو فروغ دینے کے لئے بڑی کوششیں کیں، لیکن اس کو مقبولِ عام بنانے کا شرف خواجہ بہاء الدین نقش بند[۴] (المتوفی ۱۳۸۹ء) کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔ ان کے بعد یہ سلسلہ نقش بندیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ خواجہ نقش بند رح نے اتباعِ سنت پر خاص زور دیا۔ اور اعلان کیا:۔

"طریقۂ ما عروۃ الوثقیٰ است چنگ در ذیل متابعت حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم زدنست واقتدا با آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کردنست ------- وہر کہ از طریقۂ ما ذوئے گردند خطر در دین دارد"[۵]

---

[۱] آتا ترکی زبان میں باپ کو کہتے ہیں۔ رشحات میں ہے: آتا را بہ ترکی پدر است بمشایخ بزرگ اطلاق کنند
یساۃ ترکستان میں ایک شہر تھا جہاں خواجہ محمد نے رہ کر کام کیا تھا۔

[۲] ان کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو نفحات الانس ص ۴-۲۴۲ اور رشحات (قلمی نسخہ)

[۳] وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو قول الجمیل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح

[۴] حالات کے لئے ملاحظہ ہو نفحات الانس ص ۷-۲۴۰
رشحات ص ۴۰-۳۴ (اردو ترجمہ)

[۵] نفحات الانس ص ۲۴۹

گو سلسلۂ خواجگان سب سے زیادہ قدیم سلسلہ ہے، لیکن ہندوستان میں یہ سلسلہ سب سلسلوں کے بعد پہنچا۔ خواجہ باقی باللہؒ (المتوفی ۱۰۱۲ھ) اس کو ہندوستان میں لائے۔ خود فرمایا کرتے تھے:۔

"این تخم پاک را از سمرقند و بخارا آوردیم و در زمین برکت آگین ہند کشتیم"

خواجہ باقی باللہ کے عزیز مرید اور خلیفہ حضرت شیخ احمد المعروف بہ مجدد الف ثانیؒ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) نے اس سلسلے کو ہندوستان میں ترقی دی اور اُن کے بعد یہ سلسلہ، سلسلہ مجددیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

سلسلہ قادریہ:۔ حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ جن کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ کے سرِ لشکر ہیں۔ حضرت شیخ نے اپنی زندگی ہی میں اصلاح و تربیت کا نہایت اعلیٰ نظام قائم کر دیا تھا اور اپنے خلفاء کو دور دور تبلیغ و اشاعت کے لئے بھیج دیا تھا۔ اُن کے بعد اسلامی ممالک کے دور دراز حصّوں میں اس سلسلہ کی شاخیں قائم ہو گئیں۔

چشتیہ سلسلہ:۔ چشتیہ سلسلہ کی داغ بیل تو شیخ ابو اسحاق شامیؒ (المتوفی سنہ ۹۴۰ھ) نے ڈالی تھی۔ لیکن اس کو پروان چڑھانے اور پھیلانے کا کام حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجریؒ (المتوفی ۱۲۳۵ء) نے انجام دیا۔ اس سلسلہ کی تاریخ آئندہ ابواب میں ملے گی۔

سہروردیہ سلسلہ:۔ اس سلسلہ کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (المتوفی ۱۲۳۴ء) ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ کی ترویج و اشاعت بڑی محنت سے کی تھی۔ اور اپنی مشہور کتاب عوارف المعارف میں خانقہی نظام کے متعلق پوری تفصیلات درج کر دی تھیں ہندوستان میں انھوں نے اپنے بہت سے مرید بھیجے تھے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے فرمایا

تھا: خلفائی فی الھند کثیرۃ (ہندوستان میں میرے کافی خلفاء ہیں) شیخ نورالدین مبارک غزنوی رح، مولانا مجد الدین حاجی رح، شیخ ضیاء الدین رومی رح، قاضی حمید الدین ناگوری رح، ان کے مشہور خلفاء تھے لیکن جس بزرگ کو ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کو پھیلانے کا شرف حاصل ہوا وہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رح ہیں انھوں نے ملتان، اوچہ اور دیگر مقامات پر سہروردیہ سلسلہ کی مشہور خانقاہیں قائم کیں۔

ان سلسلوں کے نشو و نما اور عروج و زوال کی داستان بہت دلچسپ ہے لیکن یہاں ہم اس تفصیل میں جانے سے قاصر ہیں۔ اس باب میں ہمارا مقصد تاریخ کی روشنی میں تصوف کا ہلکا سا نقشہ بنانا تھا تاکہ عام غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے۔ بہت سے ایسے مباحث جن پر تفصیل سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا تھا، بے موقع ہونے کے خیال سے قلم انداز کر دیے گئے ہیں۔

روحانی سلاسل ہندوستان میں ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں مندرجہ ذیل روحانی سلسلوں نے کام کیا ہے۔

(۱) حبیبیان
(۲) طیفوریان
(۳) کرخیاں
(۴) سقطیاں
(۵) جنیدیاں
(۶) کازرونیاں
(۷) طوسیاں
(۸) فردوسیاں

(۹) سہروردیاں

(۱۰) زیدیاں

(۱۱) عباسیاں

(۱۲) ادھمیاں

(۱۳) ہبیریاں

(۱۴) چشتیاں [۱]

یہ فہرست ضرورت سے زیادہ طویل ہے اور اس میں اکثر ایسے سلاسل بھی شامل کر لئے گئے ہیں جن کو درحقیقت ہندوستان میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے چشتیہ سلسلہ کی داغ بیل رکھی گئی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری رح، پرتھوی راج کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے اور اجمیر کو اپنا مستقر بنا کر سلسلہ کا کام شروع کر دیا۔ چشتیہ سلسلہ کے بعد سہروردیہ سلسلہ ہندوستان میں پہنچا۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا رح ۱۱۹۲ء میں بمقام ارور پیدا ہوئے تھے بغداد میں شیخ سہروردی رح سے خلافت حاصل کر کر ہندوستان آئے اور ملتان میں سہروردیہ سلسلہ کی خانقاہ قایم کی۔

اسلامی ہندوستان کی تاریخ کے ابتدائی دور میں یعنی عہد سلطنت میں چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں ہی نے کام کیا تھا۔ سہروردیہ سلسلہ کی خانقاہیں ملتان اور سندھ تک محدود رہیں چشتیوں نے اپنا نظام پاک پٹن سے لے کر لکھنوتی اور دہلی سے لے کر دیوگیر تک قایم کیا تھا۔

اسی زمانے میں ایک اور سلسلہ فردوسیہ سلسلہ، ہندوستان میں قایم

---

[۱] آئین اکبری (مرتبہ سر سید احمد خاں) ص ۲۰۳ حصہ دوم

ہوا۔ لیکن یہ بہار تک محدود رہا۔ اس سلسلے کو ہندوستان میں لانے والے تو شیخ بدر الدین سمرقندیؒ خلیفہ شیخ سیف الدین باخرزیؒ تھے، لیکن اس کو پروان چڑھانے کا کام حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے انجام دیا۔ ان کے مکتوبات تصوف کا بڑا بیش قیمت ذخیرہ ہیں۔

پندرویں صدی کے وسط میں قادریہ اور شطاریہ سلسلے ہندوستان میں قائم ہوئے۔ قادریہ سلسلہ کو شاہ نعمت اللہ قادریؒ نے ہندوستان میں قائم کیا۔ سید محمد غوث گیلانیؒ، مخدوم شیخ عبدالقادر ثانیؒ، سید موسیٰ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس سلسلہ کو عہدِ مغلیہ میں فروغ دیا۔

شطاریہ سلسلہ شاہ عبداللہ شطاریؒ (المتوفی ۸۹۰ھ) نے قائم کیا تھا سید محمد غوث گوالیاریؒ اور شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتیؒ نے اس کو ہندوستان میں ترقی دی۔ جہانگیر کے بعد اس سلسلہ کا اثر ہندوستان میں بہت کم ہو گیا تھا۔

اکبر کے عہدِ حکومت میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے نقشبندیہ سلسلہ ہندوستان میں قائم کیا ان کے عزیز مرید شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانیؒ نے اس کو مقبولِ عام بنا دیا۔ اور ان کے خلفاء نے اس کے اثرات دور دور پہنچائے۔ بعد کو یہ سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اگر مسلمانانِ ہند کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی روحانی زندگی کی اصلاح و تربیت کا کام ان ہی چھ سلسلوں نے انجام دیا ہے۔

(۳) ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کا نشو ونما

وجہ تسمیہ سلسلہ کی ابتدا۔ مشائخ کے حالات۔ سلسلہ کی تاریخ
نظامِ اصلاح وتربیت۔ اندازِ تبلیغ واشاعت۔ بنیادی اصول

وجہ تسمیہ | چشت، خراسان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ وہاں کچھ بزرگانِ دین نے روحانی اصلاح وتربیت کا ایک بڑا مرکز قائم کیا۔ اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور یہ نظام اس مقام کی نسبت سے چشتیہ سلسلہ کہلانے لگا۔ شجرۃ الانوار[1] میں لکھا ہے:

"واٰں دو مقام اند یکے شہر یست درمیان ولایت خراسان قریب ہرات و چشت دویم دیہیست در ولایت ہندوستان درمیان اوچ وملتان وخواجگان چشت از چشت خراسان"

(چشت نام کے) دو مقام ہیں۔ ایک شہر خراسان میں ہرات کے قریب واقع ہے دوسرا چشت، ہندوستان میں اوچ اور ملتان کے درمیان ایک قصبہ ہے

---

[1] شجرۃ الانوار، مولانا رحیم بخش خلیفہ حضرت فخر الدین دہلوی رح کی تصنیف ہے۔ مشائخ چشت کے حالات بڑی تلاش اور محنت سے جمع کئے ہیں۔ پیش نظر نسخہ کا سنہ کتابت ۱۲۸۱ھ ہے۔

بودہ اند" خواجگانِ چشت، خراسان والے چشت سے تعلق رکھتے ہیں۔

سید علاء الدین اودہی[۵۱] نامقیماں میں فرماتے ہیں ؎

گر بہ ہندوستاں شدیم چہ باک
سبزۂ گلشنِ خراسانیم[۵۲]

حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی رح (المتوفی ۳۲۹ھ / ۹۴۰ء) پہلے بزرگ ہیں جن کے اسم گرامی کے ساتھ تذکروں میں چشتی لکھا ہوا ملتا ہے۔ افسوس ہے کہ اُن کے حالات تفصیل سے کسی تذکرہ میں درج نہیں۔ سیر الاولیاء میں اُن کے متعلق صرف چند سطریں لکھی گئی ہیں[۵۳]۔ ظاہر ہے کہ اُن کی مدد سے تو شیخ کی ایک دھندلی سی تصویر بھی نہیں بن سکتی۔ بعد کے تذکروں مثلاً مراۃ الاسرار، شجرۃ الانوار، خزینۃ الاصفیاء میں جو تفصیل دی گئی ہے وہ کرامت کے چند قصوں اور سماع کے چند واقعات تک محدود ہے اور کسی طرح شیخ کی پوری شخصیت کو اُجاگر نہیں کرتی۔ ایک زبردست روحانی نظام کا یہ بانی فکر و عمل کی جن صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کا کوئی اندازہ اِن تذکروں سے نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خواجہ ابو اسحاق شام کے رہنے والے تھے۔ اپنے وطن سے چل کر بغداد آئے اور حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری رح کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ خواجہ دینوری رح (المتوفی ۲۹۸ھ / ۹۱۰ء) اپنے زمانے کے مرتاض بزرگ تھے۔ دور دور

---

[۵۱] مولانا سید علاء الدین اودہی رح۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رح کے مرید اور خلیفہ تھے۔ نامقیماں ان کی مشہور تصنیف ہے اور عرصے تک نصاب میں شامل رہی ہے۔

[۵۲] نامقیماں۔ مطبع مصطفائی واقع بیت السلطنت لکھنؤ ۱۲۵۶ھ ص ۹

[۵۳] سیر الاولیاء۔ (فارسی مطبوعہ چرنجی لال دہلی) ص ۴۰ - ۳۹

سے عقیدت مند اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اُن کا حال خواجہ فریدالدین عطار نے تذکرۃ الاولیا[۵۱] اور مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے نفحات الانس[۵۲] میں لکھا ہے۔

خواجہ عطارؒ کا بیان ہے کہ وہ اپنی خانقاہ کا دروازہ عموماً بند رکھتے تھے۔ جب کوئی آتا تو پوچھتے کہ مسافر ہو یا مقیم۔ پھر فرماتے، اگر مقیم ہو تو اس خانقاہ میں آجاؤ۔ اگر مسافر ہو تو یہ خانقاہ تمھاری جگہ نہیں ہے۔ چونکہ جب تم چند روز یہاں رہو گے اور مجھے تم سے اُنس ہو جائے گا اور پھر تم جانا چاہو گے تو مجھے اس کی تکلیف ہو گی اور مجھ میں فراق کی طاقت نہیں[۵۳]

جب خواجہ ابواسحاقؒ اُن کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تو پوچھا: تمھارا کیا نام ہے؟

عرض کیا: ابواسحاق شامی۔

فرمایا:

"از امروز ترا ابواسحاق چشتیؒ	آج سے لوگ، تجھے ابواسحاق چشتی
خوانند کہ خلائق چشت و دیار	کہہ کر پکاریں گے اور چشت اور اس کے
آں از تو ہدایت یابند۔ و ہر کہ	نواح کے لوگ تجھ سے ہدایت پائیں گے
سلسلۂ ارادت تو درآید آنہا را	اور ہر وہ شخص جو تیرے سلسلۂ ارادت
نیز تا قیام قیامت چشتی	میں داخل ہو گا، اس کو قیامت تک
خوانند[۵۴]	چشتی کہہ کر پکاریں گے۔

---

۵۱ تذکرۃ الاولیا (اردو ترجمہ عبدالرحمٰن شوق امرتسری) ص ۳۸۲ - ۳۸۳

۵۲ نفحات الانس (مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۲۸۴ھ) ص ۶۲ - ۶۰ نیز ص ۲۰۶ وغیرہ

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں لکھا ہے: "آنچہ در تذکرۃ الاصفیا و بعضے (بقیہ ص ۱۳۸ پر)

اس کے بعد خواجہ دینوریؒ نے ان کو تذکیر و ارشادِ حق کے لئے چشت روانہ کر دیا۔ جہاں اُن کی پُر خلوص جد و جہد سے ایک عظیم الشان سلسلہ کی داغ بیل پڑی اور چشت بہت جلد ایک زبردست روحانی نظام کا مرکز بن کر چمک اُٹھا۔ ایک بزرگ نے ان کے متعلق یہ اشعار لکھے ہیں ؎

وبه اقتدى من اهل چشت شيوخهم
كل ولى الله فى ميلاده
منهم ابو اسحٰق اكبر شيخهم
طود سما من اشمخ اطواده
اضحى هداة الدين يتبعونه
لا يعدلون النهج فى معتاده[1]

(یعنی اہل چشت کے مشائخ میں سے تمام اولیاء اللہ نے اُن کے میلاد میں اقتدار کی ان میں سب سے بڑے اور ذی وجاہت شیخ ابو اسحاق ہیں جو مشائخ میں ایسے ہیں جیسے پہاڑوں میں ایک بلند اور اونچا پہاڑ۔ دین کے رہبر اُن کے پیرو ہیں اور اُن کی

(بسلسلہ صفحہ ۱۳۷) شجرات مشائخ چشت نوشتہ اند این ست کہ شیخ علو دینوری و شیخ ممشاد دینوری یکیست و شیخ ممشاد علو دینوری می نویسند، اما از نفحات الانس و از بعضے کتب چنین مفہوم می شود کہ شیخ علو دینوری غیر ممشاد دینوری اند (قلمی نسخہ)

[3] تذکرۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) ص ۳۸۳

[4] ملاحظہ ہو لطائف اشرفی (قلمی نسخہ مراۃ الاسرار (قلمی نسخہ) شجرۃ الانوار (قلمی نسخہ) خزینۃ الاصفیاء (جلد اول) ص ۲۴۰ وغیرہ

[1] سیر الاولیاء (فارسی) ص ۴۰

راہ سے عدول کرنے کی طاقت نہیں رکھتے)۵۱

خواجہ ابو اسحاق فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ایک دن اپنے مرید خواجہ ابو احمد چشتی سے فرمانے لگے :

"اے ابو احمد درویشی بالا ترست از پادشاہیِ عرب و عجم ، واللہ اگر ابو اسحاق را ملک سلیمان دہند ہم قبول نکند" ۵۲	اے ابو احمد! درویشی عرب و عجم کی بادشاہی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر ابو اسحاق کو ملک سلیمان بھی دیں تو خدا کی قسم وہ قبول نہیں کرے گا۔

مشائخ سلسلہ بہت سے دیگر روحانی سلسلوں کی طرح چشتیہ سلسلہ بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی سے شروع ہوتا ہے۔مشہور مشائخ کے اسمائے گرامی یہ ہیں :-

(۱) حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

(۲) حضرت خواجہ حسن بصری

(۳) حضرت خواجہ ابی الفضل عبد الواحد ابن زید

(۴) حضرت خواجہ ابی الفیض فضیل ابن عیاض

(۵) حضرت خواجہ ابراہیم ادہم البلخی

(۶) حضرت خواجہ سدید الدین حذیفۃ المرعشی

---

۵۱ سیر الاولیا۔ (اردو ترجمہ) ص ۴۶ (مطبوعہ مسلم پریس)

۵۲ رسالہ احوال پیران چشت (قلمی) از بہا بن...... نبیرۂ بندگی مخدوم قاضی حمید الدین ناگوری المعروف براجا۔ میرے پاس اس کا قدیم قلمی نسخہ ہے جو شاہان اودھ کے کتب خانہ میں رہ چکا ہے۔ سنہ کتابت درج نہیں۔کسی شاہی کتب خانہ میں تحویل کی تاریخ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) درج ہے۔

(۷) حضرت خواجہ امین الدین ابی ہبیرۃ البصری رح

(۸) حضرت خواجہ مشاد علی دینوری رح

(۹) حضرت خواجہ ابی اسحاق شامی چشتی رح

(۱۰) حضرت خواجہ ابی احمد ابن فرسنافہ الچشتی رح

(۱۱) حضرت خواجہ ابی محمد ابن احمد چشتی رح

(۱۲) حضرت خواجہ ابی یوسف چشتی رح

(۱۳) حضرت خواجہ مودود چشتی رح

(۱۴) حضرت خواجہ حاجی شریف زندانی رح

(۱۵) حضرت خواجہ عثمان ہرونی رح

(۱۶) حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی رح [۱]

عصامی نے فتوح السلاطین میں ان مشایخ کا ذکر اسی طرح کیا ہے۔

علیؑ چوں ازیں کارواں رخت برد | یکے خرقہ بر پیر بصری سپرد
حسن چوں سفر کرد ازیں کوچگاہ | شرف یافت ازو عبد واحد کلاہ
رسیدہ ازو بر فضیل عیاض | کہ شد تازہ از بوئے خلقش ریاض
وزو خرقہ بر پور ادہم رسید | ملک وار آں حلہ در بر کشید
الٰہ یافت آں خواجۂ مرحشی | حذیفہ بہ صد فرحت و دلخوشی

[۱] صحیح لفظ "سجزی" ہے، "سنجری" نہیں۔ خواجہ صاحب رح کا وطن سجستان تھا، اسی کی نسبت سے "سجزی" کہے جاتے تھے۔ کاتب کی غلطی سے یہ لفظ "سنجری" مشہور ہو گیا۔ رسالہ احوال پیران چشت غالباً پہلا قدیم مسودہ ہے جس میں یہ لفظ صحیح لکھا ہوا میری نظر سے گذرا ہے۔ فتوح السلاطین (تصنیف ۷۵۰ھ) کے اشعار "سجزی" ہی سے موزوں ہوتے ہیں۔ ایک شعر ہے۔

معین الدین آں سجزی دیں پناہ | کہ خفت است بہ اجمیر آں مرد راہ

ص ۴۴۶

پس آں کہ بہ صدقِ ارادت بود | ھبیرہ کہ تعریفش از بصرہ بود
ازاں پس بہ خواجہ علو کش عرب | بہ دینور نسبت کند در نسب
وزو خواجہ اسحٰق چشتی نژاد | بہ بردر کشیدآں لباس مراد
پس آں خرقہ بواحمد چشت یافت | کہ خورش برشت وملائک بیافت
محمد کہ او نیز از چشت بود | ز سودائے خوش کرد ازآں مایہ سود
وزو یوسف آں پیر چشتی گرفت | چو روحش ہوائے بہشتی گرفت
وزو یافت آں قطب چشتی سرشت | کہ بود ست مودود مقبول چشت
وزو یافت آں اشرف الدین شریف | کہ شد زندنی نسبتِ آں حریف
وزو یافت ہاروتی عثماں بہر | درآورد آں خلعتِ خوش بہ بر
وزو در برآں خرقہ عہدے بعید | معین الدین آں پیر سجزی کشید[1]

فتوح السلاطین، ہندوستان کے مذہبی اور غیر مذہبی لٹریچر میں پہلی کتاب ہے جس میں مشایخ چشت کا شجرہ نظم کیا گیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب انتباہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چشتیہ سلسلہ خواجہ حسن بصریؒ کے ذریعے حضرت علیؓ تک نہیں پہنچتا۔ اس لئے کہ خواجہ بصری اس وقت خورد سال تھے اور وہ خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے۔ حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ نے جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے معاصر تھے، اس خیال کی تردید میں ایک کتاب فخر الحسن لکھی ہے جس میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا حضرت علیؓ سے خلافت پانا ثابت کیا ہے۔ اس کتاب کی شرح مولانا احسن الزماں حیدر آبادی نے قول المستحسن فی شرح فخر الحسن کے نام سے عربی زبان میں لکھی ہے۔

---

[1] فتوح السلاطین (بہ تصحیح محمد یوشع۔ مدراس ۱۹۴۸ء) ص ۸ - ۷

ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کا اجراء اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خواجہ معین الدین چشتی رح سے قبل کچھ چشتی بزرگ ہندوستان میں تشریف لاچکے تھے [۵۱] لیکن حقیقت یہ ہے کہ چشتیہ سلسلہ کو ہندوستان میں جاری کرنے کا شرف ان ہی کو حاصل ہوا وہ پرتھوی راج کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے اور اجمیر کو اپنا مستقر بنا کر تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کردیا۔ میر خورد نے ان کو "نائب رسول اللہ فی الہند" [۵۲] لکھا ہے۔

ابوالفضل لکھتا ہے :-

"عزلت گزیں باجمیر شد، و فراواں چراغ برافروخت، و از دم گیرائے او گروہا گروہا مردم بہرہ برگرفتند [۵۳]

ان دنوں اجمیر راجپوت سامراج کا مضبوط مرکز اور ہندوؤں کا مذہبی گڑھ تھا۔ دور دور سے ہندو اپنی مذہبی رسومات پوری کرنے کے لئے وہاں جمع ہوتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے اخبار الاخیار میں اجمیر کی مذہبی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے [۵۴]

ایک ایسے زبردست سیاسی اور مذہبی مرکز میں قیام کا فیصلہ نہ صرف خواجہ صاحب رح کے عزائم کی ترجمانی کرتا ہے، بلکہ اُن کی غیر معمولی خود اعتمادی کا بھی آئینہ دار ہے

---

[۵۱] مثلاً خواجہ ابو محمد بن ابی احمد چشتی جن کے متعلق مولانا جامی نے لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ نفحات الانس ص ۲۰۷

[۵۲] سیر الاولیاء (فارسی) ص ۴۵

[۵۳] آئین اکبری (سرسید ایڈیشن) ص ۲۷۰

[۵۴] اخبار الاخیار ص ۲۴

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی محمد غوری کے حملوں کے بعد شروع ہوئی۔ یہ خیال غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ محمد غوری کے حملہ سے قبل (یعنی ہندو راجاؤں کے عہدِ حکومت میں) ہندوستان میں متعدد جگہ مسلمانوں کی نو آبادیات تھیں جہاں اُن کے مدرسے، خانقاہیں اور دینی ادارے قائم تھے۔ جو لوگ دینی اداروں کی تشکیل و تعمیر کی حوصلہ شکن مشکلات کا تھوڑا سا بھی تجربہ رکھتے ہیں، وہی اِن مصائب کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں جن سے اِن بزرگوں کو دوچار ہونا پڑا۔ حالات کی نامساعدت اور ماحول کی برہمی قدم قدم پر دامن پکڑ کر کھینچتی تھی، لیکن شوق کی بے پایانی پکار پکار کر کہتی تھی ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

اجمیر کے علاوہ جہاں خواجہ معین الدین چشتی رح نے پرتھوی راج کے زمانہ[1] میں اپنی خانقاہ بنائی تھی۔ بدایوں، قنوج، ناگور، اور بہار کے بعض شہروں میں مسلمانوں کی خاصی آبادی تھی۔ حضرت مولانا رضی الدین حسن صنعانی رح صاحب مشارق الانوار، جن کا نام ہندوستان کے علمائے حدیث میں سرِفہرست آتا ہے۔ محمد غوری کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہونے سے تقریباً دس سال قبل بدایوں میں پیدا ہوئے تھے[2] وہیں انھوں نے دینی تعلیم حاصل کی اور وہیں اپنا ابتدائی زمانہ گذارا۔ جب بدایوں کا یہ عظیم المرتبت فرزند بغداد پہنچا تو بڑے بڑے عالموں کی گردنیں اس کے آگے جھک گئیں۔

---

[1] سیر الاولیاء ص   اخبار الاخیار ص

[2] فوائد الفواد ص ۱۰۳ (نول کشور ۱۳۰۲ھ) "او از بدائوں بود"

بنارس یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر آر۔ایس ترپاٹھی نے قنوج کے متعلق حال ہی میں ایک کتاب شائع کی ہے۔جس میں بتایا ہے کہ قنوج میں مسلمانوں کی حکومت کے قائم ہونے سے قبل مسلمان موجود تھے۔ بہار کے متعلق بھی جدید تحقیقات یہ ہی ہے کہ محمد بن بختیار خلجی کی فتح (۵۹۹ھ/۱۱۹۹ء) سے قبل وہاں صوفیہ کرام اور بزرگانِ دین پہنچ چکے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ کا یہ پہلو اب تک تشنۂ تفسیر و تعبیر ہے۔ضرورت ہے کہ محمد غوری سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی نوآبادیوں، اُن کی تاریخی حیثیت، اور عام سماجی نقشے میں ان کی اہمیت پر تفصیل سے تحقیقات کی جائے۔ہم یہاں یہ بحث قلم انداز کرتے ہیں۔انشاء اللہ "مشایخ چشت" کی پہلی جلد میں اس پر سیر حاصل بحث کی جائے گی۔

بہرحال، اس وقت یہ عرض کرنا مقصود تھا کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ہندوستان تشریف لانا ایک زبردست روحانی اور سماجی انقلاب کا رونما ہونا تھا۔اس انقلاب کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے ہندوستان کی سماجی حالت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ضروری ہے۔

گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سماجی حالت حد درجہ تباہ تھی۔ہر شخص نہ صرف "اسیرِ امتیازِ ما و تو" تھا بلکہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار۔ اتحادِ فکر و عمل کا کہیں دور دور نام نہ تھا۔چھوت چھات نے مدنی زندگی کے سارے سرچشمے مسموم کر دئے تھے۔زندگی کی ساری لذّتیں اونچی ذات کے لوگوں کے لئے مخصوص تھیں۔غریب عوام جن مصائب میں مبتلا تھے۔اُن کی دردناک تصویر ابی الریحان البیرونی نے کتاب الہند میں پیش کی ہے۔زندگی اُن کے لئے بوجھ تھی۔اللہ نے انھیں آدمی بنایا تھا، لیکن اس کے بندوں نے انھیں جانوروں کی

زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

البیرونی لکھتا ہے "ہندوؤں میں بکثرت ذاتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں کا مسلک عام مساوات ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ کے مطابق ان سے بالکل جداگانہ ہے اور یہی وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہے۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے چھوت چھات کے اس بھیانک ماحول میں اسلام کا نظریۂ توحید "عملی حیثیت سے پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف ایک تخئیلی چیز نہیں ہے، بلکہ زندگی کا ایک ایسا اُصول ہے جس کو تسلیم کر لینے کے بعد ذات پات کی سب تفریق بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک زبردست دینی اور سماجی انقلاب کا اعلان تھا۔ ہندوستان کے بسنے والے ہزاروں وہ مظلوم انسان جن کی زبان حالی پکار رہی تھی ع

جینے سے مراد ہے نہ مرنا شاید

اس اعلان کو سُن کر دوبارہ زندگی کا کیف محسوس کرنے لگے۔ صاحب سیر الاولیاء نے لکھا ہے :-

---

لہ (نوٹ صفحہ ۱۴۴) کتاب الہند کا انگریزی ترجمہ جرمنی کے مشہور مستشرق پروفیسر زخاؤ نے کیا تھا جو بہت مستند مانا جاتا ہے۔ اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستان کے سماجی حالات کے متعلق البیرونی کے خیالات کا خلاصہ پروفیسر محمد حبیب نے INDIAN CULTURE AND SOCIAL LIFE AT THE TIME TURKISH INUASIOUS (ALIGARH, 1941) میں کر دیا ہے جو مطالعہ کے قابل ہے۔

"وکرامت دیگر آنکہ مملکت ہندوستان تا حد بر آمدن آفتاب ہمہ دیار کفر و کافری وبت پرستی بود و متمردان ہند ہر یکے دعوی انا ربکم الاعلیٰ می کردند، و خدائے را جل وعلی شریک می گفتند و سنگ و کلوخ و دار و درخت و ستور گاو و سرگیں ایشاں را سجدہ می کردند و بہ ظلمت کفر قفل دل ایشاں مظلم و محکم بود .... بوصول قدم مبارک آں آفتاب اہل یقین کہ بحقیقت معین الدین بود ظلمت ایں دیار بنور اسلام روشن و منور گشت [۵۱]

خواجہ اجمیری رح کی زندگی بہت سادہ لیکن دل کش تھی۔ ہندوستان کے سب سے بڑے سماجی انقلاب کا یہ بانی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک پھٹی ہوئی دوتہی میں لپٹا ہوا بیٹھا رہتا تھا۔ پانچ مثقال سے زیادہ کی روٹی کبھی افطار میں میسر نہ آئی [۵۲] لیکن نظر کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جس کی طرف دیکھ لیتے معصیت کے سوتے اُس کی زندگی میں خشک ہو جاتے۔ رسالہ احوال پیران چشت میں لکھا ہے :-

"نظر شیخ معین الدین بر ہر فاسقے کہ افتادے در زماں تائب شدے باز گرد معصیت نگشتے"	شیخ معین الدین کی نظر جس فاسق پر پڑ جاتی وہ تائب ہو جاتا اور پھر کبھی گناہ کے پاس تک نہ جاتا۔

ہمارے پاس شیخ اجمیری رح کے مستند حالات مرتب کرنے کے لئے مواد کی بہت کمی ہے۔ بعد کے تذکرے تاریخی اعتبار سے ناقص ہیں۔ اس لئے اجمیر میں اُن کے اثرات کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ سیر الاولیا کے بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ پرتھوی راج کا ایک مقرب درباری، اُن کے حلقۂ مریدین میں شامل تھا [۵۳] جس کے معنی

---

[۵۱] سیر الاولیا۔ ص ۴۷

[۵۲] سیر الاولیا و سیر العارفین

[۵۳] سیر الاولیا۔ ص ۴۶

یہ ہیں کہ اُن کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔

محمد غوری اور قطب الدین ایبک کی فتوحات کے بعد، اجمیر کی سیاسی حیثیت اور اہمیت میں کمی آگئی۔ سلطنت کا مرکز پہلے لاہور اور پھر دہلی کو منتقل ہو گیا۔ خواجہ صاحبؒ اس سیاسی تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر اجمیر ہی میں مقیم رہے اور جو شمع بادِ مخالفت کے تیز و تند جھونکوں کے درمیان روشن کی تھی اس کو جلاتے رہے۔ انھوں نے صرف ایک عزیز مرید اور خلیفہ کو دہلی میں رہ کر سلسلہ کی نشر و اشاعت پر متعین کر دیا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے شمالی ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کو پھیلانے کی کوشش کی اور مدت العمر اپنے پیر و مرشد کے اصولوں پر سختی سے عامل رہے۔

خواجہ اجمیریؒ کے خلفاء میں دو بزرگ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شیخ حمید الدین صوفی سوالی ناگوریؒ۔ مؤخر الذکر نے ناگور[1] میں قیام کر لیا تھا اور وہاں ایک بگیہ زمین کی کاشت کر کر اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ ایک چادر کمر سے بندھی رہتی۔ دوسری جسم پر پڑی رہتی۔ بیوی کا یہ حال تھا کہ سر پر دوپٹہ تک نہ تھا۔ پیراہن کا دامن سر پر ڈال لیا کرتی تھیں لیکن اُن کی اس غریبی میں استغنا کی ایک عجیب شان تھی۔ دنیاوی جاہ و حشم کا ذکر کبھی اُن کی مجلس میں کسی نے نہیں سنا[2]۔ ایک مرتبہ والیِ ناگور نے شاہِ وقت

---

[1] ناگور کے متعلق ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا مضمون "NAGAUR : A FORGOTTEN KINGDOM" مطبوعہ دکن کالج ریسرچ انسٹیٹیوٹ بلیٹن (پونہ) نومبر ۱۹۴۰ء (ص ۱۴۳ - ۱۶۶) مطالعہ کے قابل ہے۔

[2] سیر الاولیا۔ ص ۱۵۷ - ۱۵۶

کی جانب سے کچھ زمین اور نقد روپیہ پیش کیا اور قبول کرنے کی درخواست کی فرمایاع

مرا طریق امارت نہیں محبت ہے

ہمارے خواجگان میں سے کسی نے ایسی چیز قبول نہیں کی۔ ایک بیگہ زمین جو میرے پاس ہے، میرے لئے کافی ہے [۵۱]

راجپوتانہ کے ایک گاؤں میں کاشت کرنے والا یہ "مرد فقیر" ایک جیّد عالم تھا، علوم دینی پر اُن کی نگاہ کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جنھوں نے سرور الصدور کا غور سے مطالعہ کیا ہے جس کتاب کے متعلق جو رائے ظاہر کردی ہے وہ اپنی جگہ حرفِ آخر ہے۔ تفسیر کشاف کے متعلق فرماتے ہیں:

"آنچہ در کتابہائے دیگر است ہم ازیں کتاب است۔ ہر چہ دانستہ اند و خوش آمدہ است ازینجا نقل کردہ اند و کتابے علیحدہ بنام خویش کردہ اند" [۵۲]

مولانا فخر الدین رازی رح کے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے۔ اس کو پڑھ کر بے اختیار مولانا ابو الکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا مقدمہ یاد آجاتا ہے۔

شیخ حمید الدین ناگوری رح اپنے مریدین و متعلقین کو علم فرائض حاصل کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ سرور الصدور میں لکھا ہے:

"فرمودند اگر فرائض بحث کنند نیکو باشد کہ اول علمے کہ مقصود شود علم فرائض باشد و پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمود است کہ تعلموا الفرائض و علموھا" [۵۳]

---

۵۱ سیر الاولیاء ص۔ ۱۵۷-۱۵۶

۵۲ سرور الصدور قلمی نسخہ ص ۴۸

سرور الصدور کا یہ قلمی نسخہ میں نے حبیب گنج کے کتب خانہ سے نقل کرا کر منگوایا ہے اور ایک دوسرے قدیم نسخے سے مقابلہ کرنے کے بعد اس کو مرتب کیا ہے۔ چودھویں صدی کے ملفوظات میں سرور الصدور کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی رح کے کسی خلیفہ کا اس کے علاوہ کوئی ملفوظ نہیں ملتا۔

۵۳ سرور الصدور۔ ص ۲۹

اپنے مریدین کو کیمیائے سعادت کے مطالعہ کی خاص طور سے ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ "بابا پیوستہ ایں را در نظر می باید داشت" [۵۱] اگر نصاب تعلیم سے مقصد تعلیم کا پتہ لگایا جاسکتا ہے تو سرور الصدور میں شیخ کی مجوزہ کتابوں [۵۲] کو پیش نظر رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ صحیح دینی جذبہ پیدا کرنے کے لئے بے چین رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہر مسلمان دین کے بنیادی مسائل اور اوامر و نواہی اور فرائض سے پوری طرح واقف ہو۔

شیخ حمیدالدین ناگوری رح نے علم حدیث کو علم تصوف سے زیادہ اہمیت دی اور اپنا بیشتر وقت اسی میں صرف کیا۔ ایک دن اپنے ایک مرید سے فرمانے لگے۔

مرا ایں جا مشغولی ست کہ خلق	مجھے یہاں یہ مشغولیت ہے کہ آج کل
ناگور، دریں وقت از من علم احادیث	ناگور کے لوگ مجھ سے علم حدیث سنتے
می شنوند و مرا فرصت نیست کہ	ہیں۔ مجھے فرصت نہیں کہ اس دوران
دریں میاں ترا علم تصوف بیاموزم [۵۳]	میں تجھے علم تصوف سکھاؤں

---

[۵۱] سرور الصدور۔ ص ۳۱

[۵۲] سرور الصدور میں جن کتابوں کے حوالے ہیں، اُن کے نام ملاحظہ ہوں۔

قدوری۔ کتاب فائق (ایں کتاب را لازم گیر کہ بزرگ است و ہر کسے ایں کتاب را نداند ص ۴۰) تفسیر مدارک۔ تفسیر کشاف۔ تفسیر مقاتل۔ مقامات شیخ ابوسعید۔ ابوالخیر۔ کیمیائے سعادت تحفہ الشباب۔ مکتوبات فخرالدین رازی رح۔ اسناد حلیہ شیخ عبداللہ تستری مکتوبات عین القضاۃ۔ صحاح لغت۔ (مولانا رضی الدین صنعانی)، مشارق الانوار۔ مصباح الدجی۔ (مولانا رضی الدین صنعانی) رح۔ قوت القلوب۔ تفسیر زاہد۔ تفسیر امام ناصر الدین۔ نہج البلاغت۔ اخبار الآثار۔ سیر الملوک۔

[۵۳] سرور الصدور۔ ص ۷۳ (قلمی)

غالباً دینی مسائل میں اُن کی بالغ نظری ہی کا خیال کرتے ہوئے سلطان التمش نے ان کو اس جلسہ میں مدعو کیا تھا جو شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے خلاف ایک جھوٹے الزام کی تحقیق کے سلسلے میں طلب کیا گیا تھا۔[۵۱] اس جلسہ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بھی شریک تھے۔ دونوں بزرگوں کے درمیان فقر و غنا پر بہت دلچسپ گفتگو ہوئی۔[۵۲]

شیخ ناگوریؒ صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ اُن کی تصانیف، مکتوبات اور اشعار سب وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کی ایک کتاب اصول الطریقہ علماء و صوفیہ میں بہت مقبول تھی۔ خاکسار کے قلمی کتب خانہ میں اُن کے مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے جس کا ہر خط "اے جانِ من" سے شروع ہوتا ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں پر پورا عبور تھا۔ عموماً ہندی میں گفتگو کرتے تھے۔ سرور الصدور میں لکھا ہے:-

به زبانِ ہندوی گفتند[۵۳]

شیخ ناگوریؒ نے طویل عمر پائی ۶۷۳ھ؍۱۲۷۴ء میں وصال فرمایا۔ اُن کے فرزند شیخ عزیز کا انتقال اُن کے سامنے ہی ہو گیا تھا۔ اس لئے اپنے پوتے شیخ فرید الدین کو سجادہ نشین مقرر کر دیا۔ شیخ فرید، کے خلفاء اور مریدین میں مولانا ضیاء الدین نخشبی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔[۵۴]

دہلی میں چشتیہ سلسلہ کا مرکز! دہلی میں چشتیہ سلسلہ کا مرکز شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ

---

[۵۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیر الاولیا، سیر العارفین، و اخبار الاخیار

[۵۲] سرور الصدور۔ ص ۱۰

[۵۴] مولانا ضیاء الدین نخشبیؒ کے حالات اور تصنیفات کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون مطبوعہ "برہان" نومبر ۱۹۵۱ء

کی کوششوں سے قائم ہوا۔ انھوں نے سلطان شمس الدین التتمش کے عہد میں دہلی آکر ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا کیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب دہلی کی تعمیر و تشکیل پورے جوش و خروش کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ وسط ایشیا میں منگولوں کا طوفان کف بردہاں امنڈ رہا تھا اور ہزاروں کی تعداد میں علماء و مشائخ، شعراء و ادبا دہلی کی طرف رجوع ہو رہے تھے[۵۱] اس طرح دہلی کی حیثیت ایک بین الاقوامی شہر کی سی ہو گئی تھی جہاں اسلامی ایشیاء کے گوشہ گوشہ کا آدمی پناہ گزیں تھا۔ عصامی نے لکھا ہے:

غرض چونکہ خورشید روئے زمیں — شہ التتمش آں شمس دنیا و دیں
بہ دہلی چناں تخت گاہے بساخت — سپاہش در اقصائے آں ملک تاخت
درآں شہر یک رونقے شد پدید — بلے لذتے باشد اندر جدید
بسے سیّدانِ صحیح النسب — رسیدند دروے ز ملکِ عرب
بسے کاسبانِ خراساں زمین — بسے نقش بندانِ اقلیم چیں
بسے عالمانِ بخارا نژاد — بسے زاہد و عابد از ہر بلاد
ز ہر ملک و ہر جنس صنعت گراں — ز ہر شہر و ہر اصل سیمیں براں
بسے ناقدانِ جواہر شناس — جواہر فروشاں بروں از قیاس
حکیمانِ یوناں طبیبانِ روم — بسے اہل دانش ز ہر مرز و بوم
دراں شہر فرخندہ جمع آمدند — چو پروانہ بر نور شمع آمدند
یکے کعبۂ ہفت اقلیم شد — دیارش ہمہ دار التسلیم شد
شنیدم کہ بنائے آں تخت گاہ — رسانید رایاتِ دیں را بہ ماہ

---

۵۱ ملاحظہ ہو، طبقات ناصری، منہاج السراج۔ ص ۱۶۶

۵۲ فتوح السلاطین۔ (مترجمہ محمد یوشع)، ص ۱۱۵ - ۱۱۴

سلطان کو علما، مشایخ سے بڑی عقیدت تھی[۱] جب کسی بزرگ کی آمد کی خبر سن پاتا تو میلوں تک استقبال کے لئے نکل جاتا، اور محل میں قیام کرنے پر اصرار کرتا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ جب دہلی پہنچے تو سلطان نے اُن کی بھی بہت عزت کی قطب صاحب نے دربار سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہیں کیا۔ لیکن سلطان برابر عقیدت کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ اور یہ عقیدت رفتہ رفتہ اتنی بڑھ گئی کہ سلطان نے قطب مینار اُن کی یادگار میں تعمیر کرایا۔ اور حوض شمسی بنانے کے سلسلے میں اُن کے مشوروں پر خلوص سے عمل کیا۔ قطب صاحب سے سلطان کا اتنا گہرا تعلق دیکھ کر بعض جاہ پرست لوگوں کی آتش حسد بھڑک اٹھی اور اُنھوں نے شیخ کو دہلی سے ہٹانے کی کوششیں شروع کردیں۔ ایک مرتبہ خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے مرید سے ملنے کے لئے دہلی تشریف لائے تو انھیں یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی کہ دہلی کا شیخ الاسلام، نجم الدین صغریٰ محض اس بنا پر قطب صاحب کا دہلی میں قیام پسند نہیں کرتا کہ لوگ ان سے بے حد عقیدت اور ارادت رکھتے ہیں۔ بالآخر اُنھوں نے قطب صاحبؒ کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب عوام کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان کے غم و الم کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ تفصیل مرخورد کی زبانی سنئے:

"پس دراں مرتبہ شیخ قطب الدین	الغرض اس مرتبہ شیخ قطب الدین اپنے
ہمراہ شیخ روانہ اجمیر گردید۔ ازیں	شیخ کے ہمراہ اجمیر روانہ ہوئے۔ اس
مقدمہ در تمام شہر دہلی شور افتاد	خبر سے تمام شہر دہلی میں ایک تہلکہ پڑ گیا
ہمہ اہل شہر مع سلطان شمس الدین	اور ہر طرف کہرام مچ گیا۔ تمام اہل شہر

---

[۱] ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون ILTUTMISH, THE MYSTIC مطبوعہ ISLAMIC CULTURE اپریل ۱۹۴۶ء

دنبال بر آمدند و ہر جا شیخ قطب الدین
قدم می گذاشت خلائق خاک آں
زمیں بہ تبرک بر میداشت و نہایت
اضطراب و زاری می نمودند۔ شیخ
معین الدین این حال را معاینہ
کرد۔ فرمود بابا بختیار! ہمدریں مقام
باش کہ خلائق از بیروں آمدن تو
در اضطراب و خراب است۔ روا
ندارم کہ چندیں دلہا خراب و
کباب باشند۔ برو ایں شہر را در پناہ
تو گذاشتیم۔ پس سلطان شمس الدین
سعادت قدم بوسی شیخ را دریافتہ
ہمراہ شیخ قطب الدین بشادی تمام
متوجہ شہر گردید و شیخ معین الدین
بطرف اجمیر روانہ گشتند۔"[۵]

مع سلطان شمس الدین آپ کے پیچھے
نکلے جس جگہ شیخ قطب الدین قدم رکھتے
تھے۔ لوگ اس جگہ کی خاک کو تبرکاً
اُٹھا لیتے تھے اور انتہا درجے کی بیقراری
وزاری کرتے تھے۔ شیخ معین الدین نے
جب یہ صورت دیکھی تو فرمایا۔ بابا بختیار
تم یہیں رہو، کیونکہ خلقت تمھارے
جانے سے اضطراب و بیقراری میں ہے
میں ہرگز اس بات کو جائز نہیں سمجھتا
کہ اتنے دل خراب و کباب ہوں جاؤ
میں نے اس شہر کو تمھاری پناہ میں
چھوڑا۔ پس سلطان شمس الدین نے شیخ کی
سعادت قدمبوسی حاصل کی اور شیخ قطب الدین
کے ہمراہ نہایت خوشی کے ساتھ شہر کی
طرف متوجہ ہوا۔ ادھر شیخ معین الدین
اجمیر کی طرف روانہ ہوگئے۔

قطب صاحبؒ کا دہلی میں قیام کر لینا چشتیہ سلسلہ کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ دہلی ایسا اسلامی ہند کا قلب و جگر بن چکی تھی۔ وہ تمام عناصر جو آئندہ صدی میں مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی زندگی پر اثر انداز ہونے والے تھے، یہاں موجود تھے۔ ان ہی میں سے

[۵] سیر الاولیا۔ ص ۵۴

چشتیہ سلسلہ کی تحریک کو کامیاب بنانے کا سامان فراہم کرنا تھا۔ قطب صاحب رح نے دارالسلطنت کے مہلک اثرات سے اپنا دامن بچا لیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہاں کے حالات سے پورا فائدہ اٹھایا اور تصوف کے خیالات ہر طبقہ کے کانوں تک پہنچا دئے یہاں تک کہ "خلقی عالم از صدور و آئیمہ بدعا گوئی روئے نہادند"[۵۱]

قطب صاحب رح کے خلفاء | تذکروں میں قطب صاحب رح کے مندرجہ ذیل خلفاء و مریدین کے نام ملتے ہیں :-

(۱) شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر رح	اجودھن
(۲) شیخ بدر الدین غزنوی رح	دہلی
(۳) خواجہ عماد الدین رح[۵۲]	بلگرام
(۴) خواجہ سید محمد صغری رح[۵۳]	بلگرام
(۵) شیخ محمود رح	نہروالہ
(۶) شیخ معز الدین رح	دہلی۔
(۷) شیخ حامد الدین رح	نہروالہ
(۸) شیخ سعد رح	
(۹) قاضی عماد[۵۴]	

لیکن سلسلہ کی نشر و اشاعت کا کام صرف بابا فرید رح اور شیخ بدر الدین غزنوی رح ہی نے انجام دیا۔

---

[۵۱] اخبار الاخیار۔ ص ۲۶

[۵۲] ماثر الکرام - ص ۱۰-۹ ۔ مراۃ المبتدین میں سید شریف بلگرامی ان کے متعلق لکھتے ہیں "خواجہ عماد الدین بلگرامی قطب وقت صاحب ولایت بود۔ ہیچ کس را مرید و خلیفہ (بقیہ ص ۱۵۵ پر

شیخ بدرالدینؒ، غزنین[۵۱] کے باشندے تھے۔ وہاں سے لاہور تشریف لائے۔ پھر دہلی کا رُخ کیا اور حضرت قطب صاحبؒ کے حلقۂ مریدین میں شامل ہوگئے۔ اور جب تک پیر زندہ رہے اُن کی خدمت سے جُدا نہ ہوئے[۵۲]

شیخ بدرالدین غزنویؒ وعظ میں کمال رکھتے تھے، اُن کی مجالسِ تذکیر میں بابا فرید گنج شکرؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، قاضی منہاج السراج، سید نورالدین مبارک غزنویؒ، مولانا مجد الدین وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ میر خورد نے لکھا ہے کہ ان کا ایک دیوان بھی تھا، جواب دستیاب نہیں ہوتا۔

شیخ بدرالدینؒ نہایت ذی مرتبہ بزرگ تھے، لیکن قطب صاحبؒ کے وصال کے بعد وہ دارالسلطنت کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کا زیادہ وقت دعوتوں اور امراء کی صحبتوں میں صرف ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے ہاتھوں سلسلہ کا نشوونما

(بسلسلہ صفحہ ۱۵۲) نہ گرفت و خود را پنہاں می داشت ..... چوں مابین بلگرام و قنوج دریائے گنگ است بہ لباس طالب علمی از بلگرام بہ قنوج وقت سحر کہ کسے خبردار نہ شود برو ئے آب می رفت و سبق می خواند و شام می آمد، و ہیچ کدام ازاں اطلاعے نہ داشت"۔ میرے خیال میں خواجہ صاحب نے اس طرح قنوج میں ہندوؤں کے علوم حاصل کئے ہوں گے

۵۳۔ ماثرالکرام ص ۱۱۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :- "در اعلائے کلمۂ دین و احیائے سنت و اماتت بدعت قدمے راسخ داشت و با سلطان شمس الدین بسر می برد"۔

۵۴۔ آخری پانچ نام گلزار ابرار میں ہیں اور مختصر حال بھی درج ہے (اردو ترجمہ ص ۴۳-۴۲)

---

۵۱ شیخ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ فوائد الفواد، سیر الاولیا، روضۃ الاقطاب، مرآۃ الاسرار وغیرہ

۵۲ سیر الاولیا ص ۱۶۵

نہ ہوسکا، بلکہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے سجادۂ مشیخت پر جلوہ افروز ہونے تک، دہلی میں چشتیہ سلسلہ کا چراغ مدہم پڑ گیا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے ایک دن دبے الفاظ میں شیخ بدر الدین غزنویؒ کے متعلق فرمایا:-

"شیخ بدر الدین سخت بزرگ بود فاما ہر گاہکہ در شہر درآمد و بخلق مشغول شد کار او چگونہ پیش رود"[۵۱]

التمش کے انتقال کے بعد جب دہلی کے حالات ابتر ہونے لگے تو شیخ بدر الدین غزنویؒ ملک نظام الدین خریطہ دار سے وابستہ ہوگئے۔ اور اس کی بنائی ہوئی خانقاہ میں رہنے لگے۔ جب ملک نظام الدین پر تباہی آئی تو شیخ غزنویؒ بھی نہ بچ سکے۔ پریشانی کی حالت میں اُنھوں نے بابا فریدؒ سے دُعا کی درخواست کی تو اُنھوں نے جواب میں فرمایا:

"ہر کہ بر سیرت و سنت پیران خود نرود ہم چنیں باشد"[۵۲]

شیخ بدر الدین غزنویؒ کے ذریعے چشتیہ سلسلہ کا نظام زیادہ ترقی نہیں کرسکا۔ اُن کے خلفاء میں شیخ امام الدین ابدالؒ (م ۶۶۱ھ) کا نام تذکروں میں ملتا ہے[۵۳] شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے اُن کے تعلقات بہت شگفتہ تھے، اور وہ ان کی محفل سماع میں اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ شیخ امام الدین ابدالؒ کے بعد اُن کے فرزند شیخ شہاب الدین عاشق خدا

---

۵۱ سیر الاولیاء ص ۱۶۵ ۵۲ فوائد الفواد۔ ص ۱۶۶

۵۳ شیخ امام الدین ابدالؒ کا مختصر حال مراۃ الاسرار (قلمی نسخہ مملوکہ خاکسار ص ۵۲۶) روضۃ الاقطاب، محمد بولاق چشتی۔ ص ۸۳، ۸۲، گلزار ابرار (اردو ترجمہ) ص ۲۷ میں ملتا ہے

۵۴ ملاحظہ ہو، گلزار ابرار (اردو ترجمہ) ص ۴۲، مراۃ الاسرار (قلمی) ص ۵۲۶، روضۃ الاقطاب ص ۸۳

اُن کے خلیفہ ہوئے۔ اُن کے بعد شیخ عماد الدین رحؒ [۵۱] سجادۂ مشیخت پر بیٹھے۔ اُن کے ایک خاص مرید اور خلیفہ شیخ تاج الدین امام رحؒ تھے۔ ان کا ایک رسالہ موسوم بہ "رسالہ حال خانوادۂ چشت" خاکسار کے پاس ہے۔ اس کا سنہ کتابت ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء ہے اور سرورق پر "امجد علی شاہ" کے کتب خانہ کی مہریں ہیں۔ اس رسالہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شیخ بدر الدین غزنوی رحؒ سے لے کر شیخ عماد الدین رحؒ تک کے حالات ایک ایسے بزرگ کے مرتب کئے ہوئے ہیں جو خود اس خاص سلسلہ سے تعلق رکھتا تھا۔

شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر رحؒ اور پنجاب میں چشتیہ سلسلہ کی اشاعت

حضرت قطب صاحب رحؒ سے جب بابا فرید رحؒ کی آخری ملاقات ہوئی تو مصلےٰ خاص اور عصا عنایت فرمایا [۵۲] اور کہا:

"من امانت شمارا یعنی سجادہ و خرقہ و دستار و نعلین بقاضی حمید الدین ناگوری خواہم داد بعد از پنج روز بشما خواہد رسانید آنرا گرد آرید، مقام ما مقام شما است [۵۳]"

میں تمھاری امانت یعنی سجادہ اور خرقہ اور دستار اور کھڑاویں قاضی حمید الدین ناگوری کو دے جاؤں گا۔ وہ پانچ روز کے بعد تمھیں پہنچا دیں گے۔ تم انھیں حفاظت سے رکھنا، ہمارا مقام حقیقت میں تمھارا ہی مقام ہے۔"

جس رات کو قطب صاحب رحؒ نے وصال فرمایا اسی رات کو بابا فرید رحؒ نے انھیں خواب

---

۵۱ ملاحظہ ہو گلزار ابرار (اردو ترجمہ) ص ۱۲۴

۵۲ سیر الاولیاء۔ ص ۷۳

۵۳ سیر الاولیاء۔ ص ۷۳

میں دیکھا کہ اپنے دربار میں بلا رہے ہیں صبح ہوتے ہی اُنھوں نے دہلی کا رُخ کیا۔ ہانسی سے دہلی پہنچنے میں چار دن لگے۔ قاضی حمید الدین ناگوری رحؒ نے امانت اُن کے حوالے کر دی بابا صاحب رحؒ نے خرقہ زیب تن فرمایا، اور قطب صاحب رحؒ کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔ ابھی تین ہی دن ہوئے تھے کہ ایک شخص سرہنگا نامی ہانسی سے دہلی آیا دو تین مرتبہ بابا صاحب رحؒ کی خدمت میں حاضری کی کوشش کی۔ دربان نے اندر اُسے جانے کی اجازت نہ دی۔ ایک دن بابا فرید رحؒ گھر سے باہر نکلے تو سرہنگا موقع پا کر پاؤں پر گر پڑا اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہنے لگا:

شما در ہانسی بودید من شمارا آسان میدیدم، این ساعت دیدن شما دشوار شدہ است [۵۱]	جب آپ ہانسی میں تھے تو میں آسانی سے آپ کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ اب آپ کا دیکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

بابا فرید رحؒ نے سرہنگا کی آواز کو غیب کی تنبیہہ سمجھا اور اُن کی دور بین نظر نے یہ محسوس کر لیا کہ دہلی میں رہ کر عوام سے تعلق نہ صرف کم ہو جائے گا بلکہ دارالسلطنت کا ماحول سلسلہ کی تبلیغ و ترویج میں حائل رہے گا۔ فوراً ہانسی کی طرف روانہ ہو گئے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کے پیر و مرشد نے یہی مقام آپ کو دیا ہے تو فرمایا میرے پیر نے جو نعمت مجھے عطا فرمائی ہے وہ محدود نہیں ہے۔ شہر میں بھی وہی ہے اور جنگل و بیابان میں بھی وہی [۵۲]

بابا فرید رحؒ کا دہلی قیام نہ کرنا چشتیہ سلسلہ کے حق میں اتنا ہی مفید ہوا، جتنا قطب صاحب رحؒ کا دہلی میں قیام کرنا۔ التمش کی وفات کے بعد عرصہ تک دہلی کے حالات خراب رہے۔ اور علما و صوفیہ سب نے مل کر خوب سیاست میں حصہ لیا۔ شیخ بدر الدین غزنوی رحؒ قاضی منہاج السراج، مولانا نور ترک، شیخ الاسلام سید قطب الدین رحؒ وغیرہ وغیرہ

[۵۱] سیر الاولیاء ص ۷۳، [۵۲] سیر الاولیاء ص ۷۳

سینکڑوں بزرگوں نے اپنے مخصوص دائرۂ عمل کو چھوڑکر سیاست کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا
ممکن تھا کہ بابا صاحب رح بھی ان حالات میں رہ کر سلسلہ کا کام انجام دینے سے قاصر
رہتے ۔ ہانسی اور بعد کو اجودھن میں رہ کر ان کو سلسلہ کا کام کرنے کا اچھا موقع مل
گیا۔ اُن کے اثرات پنجاب تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ شمالی ہندوستان کے گوشہ
گوشہ میں پہنچے ، اور دور دور سے عقیدت منداُن کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔
دہلی میں اُن کے تقدس کی اتنی شہرت ہوئی کہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ اُن کے نادیدہ
عاشق ہو گئے [۵۱] مولانا وحیدالدین نبیسۂ خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے اجمیر سے
آکر آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی [۵۲] ناگور سے ایک عورت کے اُن کی خدمت
میں تحائف بھیجنے کا ذکر فوائدالفواد میں ہے [۵۳] اوچ اور ملتان کے لوگ تو بڑی کثرت
سے اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے [۵۴] ۔ ایک مرتبہ ناصرالدین محمود کا لشکر اجودھن
سے گزرا تو لشکریوں نے جس عقیدت کا اظہار کیا وہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی
زبانی سننے کے قابل ہے ۔

"درآنچہ سلطان ناصرالدین جانب	جن دنوں سلطان ناصرالدین اوچہ
اوچہ و ملتان رواں شد درمیان	اور ملتان کی طرف روانہ ہوا تو اجودھن
اجودھن رفت ۔ جملہ لشکر روئے بزیارت	پہنچ کر سارا لشکر شیخ کی زیارت کے لئے
شیخ نہادند تاآں مقام کہ بود از	روانہ ہوا۔ شیخ اتنا انبوہ دیکھ کر

[۵۱] فوائدالفواد ۔ ص ۱۴۹ (نولکشور ۱۳۰۲ھ)

[۵۲] فوائدالفواد ص ۲۳۸

[۵۳] فوائدالفواد ص ۱۸۹ - ۱۸۸

[۵۴] فوائدالفواد ص ۲۱۵

ابنوہے حیران شد، آں گاہ آستین
شیخ از بالے جانب کوچہ بیاویختند
خلق می آمد و می بوسید و می رفت
تاہم پارہ پارہ شد۔ آن گاہ در
مسجد آمدہ و مریداں را گفت
شما گرد برگرد من باشید تا خلق
درون نیایند۔ ہم از دور سلام
کنند و باز گردند، مریداں ہمچناں
کردند۔ تلیکے فراشے پیرے بیامد
از مریداں کہ گرد برگرد ایستادہ
بودند بگذشت، در پاے شیخ
افتاد و پاے مبارک بگرفت و
بکشید تا ببوسد، شیخ را دشوار
آمد۔ آں فراش گفت شیخ المشایخ
حضرت شیخ فریدالدین تنگ می آئی۔
شکر نعمت خداے تعالیٰ بہ ازیں
بگذار، چو آں فراش ایں سخن بگفت
شیخ نعرہ بزد، آں فراش را
بنواخت و بسیار معذرت کرد[۵۱]

حیراں ہوگئے۔ شیخ کی آستین گلی
کی طرف لٹکائی گئی۔ لوگ آکر بوسہ دیتے
اور چلے جاتے۔ وہ آستیں بھی ٹکڑے
ٹکڑے ہوگئی۔ پھر مسجد میں آکر مریدوں
کو حکم دیا کہ میرے گرداگرد حلقہ
باندھو تاکہ کوئی شخص اندر نہ آسکے
دور ہی سے سلام کرکے چلے جائیں۔ مریدوں
نے ویسا ہی کیا۔ ایک بوڑھا فراش
آکر مریدوں کے حلقہ سے گذر، شیخ کے
قدموں پر گر پڑا اور پائے مبارک بوسہ
دینے کے لئے کھینچا۔ شیخ کو یہ بات
اچھی نہ معلوم ہوئی۔ اس فراش نے
کہا شیخ المشائخ حضرت شیخ فریدالدین
آپ کیوں تنگ آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
کی نعمت کا اس سے بھی اچھا شکر
ادا کرو۔ جب فراش نے یہ کہا
تو شیخ نے نعرہ مارا، فراش کے
حال پر نوازش فرمائی اور اس
سے معافی مانگی

---

۵۱ فوائد الفواد ص ۱۴۶ - ۱۴۵

حضرت باباصاحبؒ کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی تھی کہ ہر وقت عقیدت مند پروانوں کی طرح سے اُن کے گرد جمع رہتے تھے۔ آدھی رات تک اُن کی خانقاہ کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ ہر قسم کے لوگ خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ کا بیان ہے:

"بخدمت شیخ الاسلام فریدالدینؒ از ہر جنس درویش وغیرآں برسیدے[۵۱]"

ہندو جوگی بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے[۵۲] باباصاحبؒ ہر شخص سے اس کی صلاحیت اور سمجھ کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔ امیر و غریب کا اُن کے یہاں کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہر نئے آنے والے سے اس طرح ملتے تھے گویا برسوں کا آشنا ہے۔ ظاہر و باطن کی ہم آہنگی حیرت انگیز تھی۔ شیخ بدرالدین اسحاقؒ جو خلوت و جلوت میں اُن کے ساتھ رہے تھے۔ فرمایا کرتے تھے:

من خادم محرم بودم وہر چہ بودے با من بگفتے و بہر کارے مرا برراہ کردے، در خلا و ملاء یک سخن بودے، ہیچ وقت مرا در خلا سخن نگفت یعنی ظاہر و باطن یک روش داشت و ایں از عجائب روزگار است[۵۳]	میں اُن کا خاص خادم تھا۔ جو کچھ کام ہوتا وہ مجھ سے کہتے تھے۔ خلوت میں اور جلوت میں ایک ہی بات کہتے اور کرتے تھے۔ مجھ سے کبھی علیحدگی میں ایسی بات نہیں کہی جو ظاہر میں نہ کہہ سکتے ہوں یعنی ظاہر و باطن میں اُن کی روش ایک۔ اور یہ بات عجائب روزگار سے ہے۔

۵۱۔ فوائد الفواد۔ ص ۵

۵۲۔ فوائد الفواد۔ ص ۸۴

۵۳۔ فوائد الفواد۔ ص ۷۴

خسروؔ نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

نیک و بد در آدمی پنہاں نمی ماند چناں کہ
نافہ در جیب ملوک و بادہ در جامِ بلور

بابا فریدؒ کے کردار کی یہ خوبیاں عالم میں مشہور ہو گئیں۔ لوگ اُن سے خود بخود محبت کرنے لگے اور اُن کی صحبت میں ایک کشش سی پیدا ہو گئی۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ نے ان کے وصال کے بعد نہایت حسرت کے ساتھ اُن کے "اوصافِ پسندیدہ" کو یاد کیا اور فرمانے لگے:

"مرا اوصافِ پسندیدہ از اوصافِ شیخ و کمالِ بزرگی و غایت فضل و لطافت ایشاں یاد آمد"۔ [۵۱]

بابا فریدؒ نے عبادت و ریاضت میں جو کوششیں کی تھیں وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ چلہ معکوس، مسلسل روزوں، اور کریلے اور پیلو کی غذا نے اُن کے جسم کو لاغر و ناتواں بنا دیا تھا۔ آخری عمر میں ایک مرتبہ فرمانے لگے

"چالیس برس تک جو کچھ خدائے تعالیٰ نے فرمایا، بندۂ مسعود نے وہی کیا، اب چند سال سے جو کچھ مسعود کے دل میں خطرہ ہوتا ہے یا اُسے مانگتا ہے پاتا ہے۔" [۵۲]

حقیقت یہ ہے کہ بابا فریدؒ نے اپنی روحانی عظمت، کردار کی بلندی اور دردمندیِ خلق سے چشتیہ سلسلہ کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ اُن کے زمانے میں سلسلہ کے اثرات کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اُس کے نظامِ اصلاح و تربیت نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی اور

---

[۵۱] فوائد الفواد۔ ص ۹۶

[۵۲] خیر المجالس (اردو ترجمہ) ص ۱۳۸ - ۱۳۷

مریدین کا ایک ایسا طبقہ تیار ہو گیا جس نے ملک کے گوشہ گوشہ میں چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں قائم کرا دیں۔

بابا فرید گنج شکرؒ کے خلفاء اور ان کی اولاد | حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے خلفاء میں مندرجہ ذیل بزرگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :-

(۱) شیخ جمال الدین ہانسویؒ
(۲) شیخ بدرالدین اسحاقؒ
(۳) شیخ نظام الدین اولیاءؒ
(۴) شیخ علی احمد صابرؒ
(۵) شیخ عارفؒ

شیخ جمال الدین ہانسویؒ[۵] بابا فریدؒ کے بہت عزیز خلیفہ تھے۔ اُن کی محبت میں بابا صاحبؒ ۱۲ سال تک ہانسی میں مقیم رہے[۶]۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جمال حقیقت میں ہمارا جمال ہے[۷]۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے ایک مرتبہ بابا صاحب

---

۵ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو :

سیر الاولیاء۔ ص ۱۷۸۔ ۱۸۴ — اخبار الاخیار ص ۶۷ - ۶۸
گلزار ابرار (اردو) ص ۵۴ — مراۃ الاسرار (قلمی) ص ۵۸۵ - ۵۸۶
معارج الولایت (قلمی) جلد اوّل ص ۲۵۰ - ۲۵۲۔

شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا دیوان اپسالہ یونیورسٹی میں ہے۔ مضامین کی فہرست کے لئے ملاحظہ ہو ISLAMIC RESEARCH ASSOCIATION MISCELLANY VOL I (1948) PP 167-174۔ شیخ کی ایک عربی تصنیف ملہمات ہے جو ۱۳۰۵ھ میں اور ۱۸۹۱ء میں دہلی سے چھپی تھی

۶،۷ سیر الاولیاء۔ ص ۱۷۸

کو لکھا کہ میرے تمام مریدوں اور خلفار کو لے لو اور جمال الدین کو مجھے دیدو اور مروّت کی بات یہ ہے کہ سودا درہم برہم نہ کیا جاوے۔ بابا صاحبؒ نے جواب میں لکھا: جمال میرا جمال ہے۔ معاوضہ مال میں ہوسکتا ہے نہ کہ جمال میں [۵۱] بابا فریدؒ کا یہ دستور تھا کہ جسے خلافت نامہ دیتے، فرماتے کہ جمال الدین سے اس پر دستخط کرالینا [۵۲] شیخ جمال الدینؒ کا انتقال بابا صاحبؒ کی حیات ہی میں ہوگیا تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے مجذوب تھے۔ چھوٹے جن کا نام مولانا برہان الدین صوفیؒ تھا باپ کے انتقال کے وقت خورد سال تھے۔ شیخ جمال الدینؒ کی ایک خادمہ جو بڑی عابدہ اور صالحہ ہونے کی وجہ سے ام المومنین کہلاتی تھیں، ان کو بابا فریدؒ کی خدمت میں لے گئیں۔ بابا صاحبؒ نے اُن پر بڑا التفات وکرم فرمایا اور خلافت سے نوازا۔ ام المومنین نے ہندی زبان میں عرض کیا، خوجا برہان الدین بالا ہے۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا۔ پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے یعنی چودھویں رات کا چاند بھی پہلی شب کو چھوٹا ہی ہوتا ہے۔ تدریجاً کمال کو پہنچتا ہے [۵۲]۔ بابا فریدؒ کی ہدایت کے مطابق مولانا برہان الدین اکثر شیخ نظام الدین اولیارؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور اُن سے اتنی عقیدت رکھتے تھے کہ کسی کو مرید نہ کرتے۔ بلکہ کہتے کہ شیخ نظام الدینؒ کے ہوتے ہوئے مجھے جائز نہیں کہ کسی کو کلاہِ ارادت دوں۔ شیخ قطب الدین منورؒ جو شیخ نظام الدین اولیارؒ کے خاص خلفار میں تھے۔ اُن ہی کے صاحبزادے تھے جمالیہ سلسلہ نے زیادہ ترقی نہیں کی۔ آگے چل کر یہ نظامیہ سلسلہ میں مدغم ہوگیا۔

---

[۵۱] گلزار ابرار (اردو) ص ۷۲
[۵۲] سیر الاولیار۔ ص ۱۷۹ - ۱۷۸
[۵۳] سیر الاولیار۔ ص ۱۸۳

شیخ بدرالدین اسحاق رح[1] باباصاحب رح کے داماد، خلیفہ اور خادم تھے۔ ابتدائی زمانہ میں علومِ ظاہری کی طرف بہت راغب تھے۔ کچھ مشکلات کو حل کرنے کے لئے بخارا تک گئے۔ لیکن تشفی نہ ہوئی۔ پھر باباصاحب رح کی خدمت میں حاضر ہوئے اور[2]

من کہ در ہیچ مقامے نزدم خیمۂ عشق
پیش تو رخت بیفگندم و سر بنہادم

پھر اُن ہی کے ہو گئے۔ شیخ نے خلافت سے سرفراز کیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء رح کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ جب تک وہ زندہ رہے، شیخ نظام الدین اولیاء رح نے اُن کی عزت اور احترام کی وجہ سے کسی شخص سے بیعت نہیں لی[3]۔ باباصاحب رح کی وفات کے بعد شیخ بدرالدین اسحاق رح کے تعلقات شیخ بدرالدین سلیمان رح (فرزند و جانشین بابا فرید رح) سے اچھے نہیں رہے اور اس بنا پر وہ پاک پٹن کی جامع مسجد میں منتقل ہو گئے۔ اور آخر عمر تک اسی مسجد میں رہے۔ وصال کے بعد اس مسجد کے قریب سپردِ خاک کئے گئے۔ شیخ بدرالدین اسحاق رح اپنے پیر و مرشد کے تعلیمی اثرات

---

[1] مولانا بدرالدین اسحاق رح کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو:

سیرالاولیاء۔ ص ۱۶۸ - ۱۶۹

اخبارالاخیار ص ۶۷ - ۶۶

معارج الولایت (قلمی) جلد اول۔ ص ۲۵۵ - ۲۵۲

کتاب اسرارالاولیاء، جو شیخ بدرالدین اسحاق رح کی طرف منسوب کی جاتی ہے ان کی تصنیف نہیں ہے اور نہ اس میں بابا فرید رح کے ملفوظات ہیں۔ شیخ بدرالدین اسحاق رح کی ایک کتاب تصریف بدرا کا ذکر سیرالاولیاء میں ہے، لیکن وہ اب دستیاب نہیں ہوتی۔

[2] سیرالاولیاء۔ ص ۱۷۳ - ۱۷۲

کا بہترین نمونہ تھے۔ بابا فرید رح کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہونے کے بعد اُن کا وہ علمی غرور اور کج کلاہی جو انھیں بخارا تک لے گیا تھا، کافور ہو گیا۔ محبتِ الٰہی کا جذبہ اس شدت سے پیدا ہو گیا تھا کہ کبھی آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی نہ رہتی تھیں[۵۱] چاشت کی نماز میں مشغول ہوتے تو اس قدر روتے کہ سجدہ کی جگہ آنسوؤں سے تر ہو جاتی[۵۲] پیہم اشکباری نے بینائی پر اثر ڈالا۔ ایک دن میر خورد کی دادی نے (جو بابا فرید رح سے بیعت تھیں) اُن سے کہا کہ اے بھائی اگر ایک ساعت آپ اپنے آنسوؤں کو تھامے رکھیں تو میں ان کا علاج سرمہ سے کروں۔ مولانا بدر الدین رح یہ سُن کر رو دیے اور فرمایا: "اے میری بہن میں کیا کروں کہ آنسو میرے قبضہ میں نہیں ہیں"[۵۲]
شیخ بدر الدین اسحاق رح نے چشتیہ سلسلہ کو پھیلانے کے سلسلہ میں زیادہ کام نہیں کیا، لیکن اپنی جگہ وہ چشتیہ سلسلہ کا ایک عظیم الشان ستون تھے۔ انھوں نے اپنے مرشد کی روایات کو پوری طرح جذب کر لیا تھا اور جہاں تک عبادت و ریاضت کا تعلق تھا اُن کو دیکھ کر بابا فرید رح کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔
شیخ بدر الدین اسحاق رح کے دو بیٹے تھے۔ خواجہ محمد امام رح اور خواجہ محمد موسیٰ[۵۳] شیخ بدر الدین کی وفات کے بعد شیخ نظام الدین اولیاء رح نے اُن کی اہلیہ اور دونوں بیٹوں کو دہلی بلا لیا تھا۔ اور ان دونوں لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ فرمائی تھی خواجہ محمد امام کو شیخ نظام الدین اولیاء نے خلافت عطا فرمائی تھی اور وہ شیخ کی زندگی میں خلقِ خدا سے بیعت لیتے تھے[۵۴]

---

۵۱ سیر الاولیاء۔ ص ۱۷۱ ۵۲ سیر الاولیاء ص ۱۷۱

۵۳ دونوں کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو سیر الاولیاء۔ ص ۲۲۶ - ۲۲۴

۵۴ خواجہ محمد امام رح نے سلطان المشایخ رح کے ملفوظات انوار المجالس نام سے جمع کئے تھے افسوس ہے کہ انوار المجالس کا قلمی نسخہ کہیں دستیاب نہیں ہوتا

شیخ عارفؒ - بابا فریدؒ نے اُن کو خلافت دے کر سیوستان میں بھیج دیا تھا۔ تفصیلی حالات کسی تذکرہ میں درج نہیں۔ سیر الاولیاء میں مختصراً ان کا ذکر کیا گیا ہے [۵۱]

بابا فرید گنج شکرؒ کا سلسلہ حقیقت میں اُن کے دو مریدوں (۱) شیخ نظام الدین اولیاءؒ اور (۲) شیخ علی احمد صابرؒ سے چلا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے زمانہ میں چشتیہ سلسلہ کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا۔ انھوں نے ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں سلسلہ کی خانقاہیں قائم کرائیں اور اصلاح و تربیت کا کام عظیم الشان طریقہ پر انجام دیا۔ شیخ علی احمد صابرؒ خود سلسلہ کی ترقی کے لئے کچھ نہ کر سکے، لیکن اُن کے بعد اُن کے سلسلہ کے لوگوں نے اس کو فروغ دینے میں بڑی جدو جہد کی۔ شیخ علی احمد صابرؒ کے حالات سے معاصر تذکرے اور تاریخیں یک سر خالی ہیں [۵۲] اس بنا پر اُن کے کام کی نوعیت کا صحیح اندازہ لگانا قطعاً ناممکن ہے۔ چشتیہ سلسلہ کی تاریخ کے دور ثانی میں اُن کے سلسلہ کے مشایخ کافی نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس لئے صابریہ سلسلہ کی تاریخ ہم نے دور ثانی ہی میں بیان کی ہے۔

بابا فریدؒ کے خلفاء کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اُن کی اولاد کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔

---

۵۱ سیر الاولیاء۔ ص ۱۸۵ - ۱۸۴

۵۲ سیر الاولیاء (ص ۱۸۵) میں صرف چند سطریں لکھی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

"ذکر او خالی از غرابت نیست" (اخبار الاخیار ص ۶۹)

حضرت بابا فریدؒ کے پانچ لڑکے تھے اور تین لڑکیاں تھیں۔ شیخ نصیر الدین نصر اللہ، شیخ شہاب الدین، شیخ بدر الدین سلیمان، خواجہ نظام الدین۔ شیخ یعقوب بی بی مستورہ، بی بی شریفہ، بی بی فاطمہ۔

شیخ نصر الدین نصر اللہؒ بابا فریدؒ کے سب سے بڑے فرزند تھے زمانۂ دراز تک زراعت کا پیشہ کرتے رہے تھے[1] اُن کے ایک لڑکے تھے، شیخ بایزید۔ وہ بھی درویش صفت تھے۔ مالوہ کے مشہور بزرگ اور شیخ نظام الدین اولیارؒ کے عزیز خلیفہ شیخ کمال الدین ان ہی کے فرزند تھے مالوہ میں چشتیہ سلسلہ کی نشر و اشاعت اُن کے ذریعے سے ہوئی۔

شیخ شہاب الدینؒ۔ اُن کا نام بابا فریدؒ کی صاحبِ عوارف المعارف سے عقیدت کا آئینہ دار ہے شیخ نظام الدین اولیار میں اور ان میں بڑی محبت تھی[2] اُن کے چھ لڑکے تھے۔ شیخ حسام الدین، شیخ عبد الحمید، شیخ مسعود، شیخ علی شیر، شیخ محمد اور شیخ جمشید۔ مزید تفصیل جواہر فریدی میں[3] دیکھنی چاہئے

شیخ بدر الدین سلیمانؒ بابا فریدؒ کے تیسرے بیٹے تھے۔ باپ کے بعد سجادہ پر بیٹھے تھے۔ اُن کے فرزند و سجادہ نشین شیخ علار الدین اجودھنی اپنے تقدس اور اتقار کی بنا پر مشہور تھے۔ سلطان محمد تغلق اُن کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گیا تھا[4] برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں اُن کے متعلق لکھا ہے۔

---

[1] سیر الاولیا۔ ص ۱۸۶ [2] سیر الاولیار ص ۱۸۶

[3] جواہر فریدی (قلمی نسخہ) باب ۲ فصل پنجم

[4] سیر الاولیار۔ ص ۱۹۶ نیز عجائب الاسفار از ابن بطوطہ ص ۴۸۔۴۹۔ ابن بطوطہ نے ان کا نام غلطی سے فرید الدین لکھ دیا ہے۔

"در تفسیر نوشتہ اند کہ بعضے ملئکہ مقدس بہ محض عبادت خدائے جل و علا مجبول اند و از آفرینش جز تعبد ہیچ مشغولی ندارند۔ شیخ علاء الدین نیز ہم ازاں قبیل آفریدہ شدہ بود" [۵۱]

شیخ علاء الدینؒ کے دو بیٹے تھے۔ شیخ معز الدینؒ اور شیخ علم الدینؒ۔ شیخ معز الدین کو محمد بن تغلق نے گجرات بھیج دیا تھا اور وہیں انھوں نے وصال فرمایا [۵۲]۔ شیخ علم الدینؒ کو محمد بن تغلق نے شیخ الاسلام بنا دیا تھا۔ اور بقول میر خورد "جمیع مشایخ روزگار منقاد و محکوم او گشتند" [۵۳]

شیخ معز الدینؒ کے ایک صاحبزادے افضل الدین فضیل تھے۔ شیخ علم الدین کے صاحبزادے کا نام منظہر الدین تھا۔ مؤخر الذکر کو اُن کے والد کے بعد شیخ الاسلامی کے عہدے پر مامور کیا گیا تھا [۵۴]

خواجہ نظام الدینؒ۔ بابا فرید اپنے سب فرزندوں میں انھیں سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے [۵۵]۔ بلبن کی فوج میں ملازم تھے۔ اُن کے ایک فرزند تھے جن کا نام خواجہ ابراہیم تھا۔ اُن کے فرزند خواجہ عزیز الدین، شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید اور خلیفہ تھے [۵۶]

شیخ یعقوبؒ۔ بابا فریدؒ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ امروہہ کے نواح میں قیام فرما لیا تھا [۵۷] اُن کے دو بیٹے تھے۔ خواجہ معز الدین اور

---

[۵۱] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۴۷

[۵۲] سیر الاولیاء (ص ۱۹۶) میں لکھا ہے: "از دست ظالمان و باغیان بدرجہ شہادت رسید"

[۵۳] سیر الاولیاء۔ ص ۱۹۶

[۵۴] سیر الاولیاء۔ ص ۱۹۷

[۵۵] سیر الاولیاء ص ۱۸۹

[۵۶] سیر الاولیاء۔

[۵۷] سیر الاولیاء (ص ۱۹۱) میں لکھا ہے "در اثنائے راہ قصبہ انبر وہہ آں بزرگ زادہ را مردیان (بقیہ صفحہ پر)

خواجہ قاضی اول الذکر نے دیوگیر کو اپنا مستقر بنایا۔ مؤخر الذکر نے دہلی میں رحلت فرمائی۔

بی بی مستورہ کے فرزند خواجہ عزیز صوفی رح، حضرت محبوب الٰہی رح کے مرید تھے۔ انھوں نے اپنے شیخ کے مناقب میں ایک کتاب تحفۃ الابرار فی کرامت الاخیار مرتب کی تھی جو اب دستیاب نہیں ہوتی۔ اُن کے فرزند خواجہ قطب الدین حسن، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح کے خلیفہ تھے [۵۱]

بی بی فاطمہ کے دو فرزند خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے شیخ نظام الدین اولیاء رح کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے۔

بابا فرید رح کے خلفاء اور اُن کی اولاد کے مندرجہ بالا حالات پر انفرادی یا مجموعی کسی حیثیت سے غور کیا جائے، ایک حقیقت ضرور واضح ہو جائے گی۔ اور وہ یہ کہ کسی نہ کسی منزل پر پہنچ کر یہ سب شاخیں نظامیہ سلسلہ میں مدغم ہو گئیں بابا فرید رح کے خلفاء میں حضرت محبوب الٰہی رح کے علاوہ کوئی بزرگ اپنے سلسلے کے نظام کو [۵۲] قائم رکھنے اور چلانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو محبوب الٰہی رح کے دامنِ تربیت سے وابستہ کر لیا۔ جو باقی بچے انھوں نے حکومتِ وقت کی ملازمت اختیار کر لی۔ شیخ جمال الدین ہانسوی رح، شیخ بدر الدین اسحاق رح، شیخ نصر الدین رح اور خواجہ نظام الدین رح کی اولاد نے حضرت شیخ محبوب الٰہی رح کو اپنا روحانی رہبر تسلیم کر لیا۔ شیخ بدر الدین سلیمان رح کے فرزند شیخ علاء الدین

(بسلسلہ صد ۱۶۹) غیب بر بودند و غایب کردند"

[۵۱] گلزار ابرار (اردو) ص ۵۲

[۵۲] یہاں صابریہ سلسلہ زیر غور نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس دور میں یہ سلسلہ پوری طرح وجود ہی میں نہیں آیا تھا۔

نے تو اپنے مشائخ اور اپنے سلسلہ کی روایات کو زندہ رکھا۔ لیکن اُن کے بیٹوں نے محمد بن تغلق کی ملازمت اختیار کرلی اور سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کا کام مدھم پڑ گیا۔

شیخ نظام الدین اولیاء اور چشتیہ سلسلہ کا دورِ عروج | ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی داغ بیل حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے ہاتوں پڑی۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے اسے منظم کیا اور حضرت شیخ نظام الدین اولیا نے اُسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا، نصف صدی سے زیادہ دہلی میں ان کی خانقاہ، ارشاد و تلقین کا مرکز اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنی رہی۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے لوگ پروانوں کی طرح وہاں جمع ہوتے تھے۔ اور عشقِ الٰہی کی تپش اور خدمتِ خلق کا جذبہ لے کر واپس جاتے تھے۔ امیر خسروؒ نے ایک قصیدہ کا عنوان لکھا ہے:۔

"مدح شیخ الطریقہ نظام الحق والحقیقہ محمدی کہ عیسیٰؑ آخر الزمانش فرستاد تا دم جان بخش او اسلام محمدی را از سر زندہ گرداند و عمر جاوید بخشید"۔[۵۱]

ابتدائی زمانہ میں حضرت محبوب الٰہیؒ لوگوں کے ہجوم سے بہت گھبراتے تھے۔ جب غیاث پور میں آکر مقیم ہوئے اور وہاں کیقباد کے زمانے میں خلقت کی کثرت ہوئی تو چاہا کہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ ایک دن ایک شخص نے آکر کہا ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

امروز کہ زلفت دل خلقے بربود
در گوشہ نشست نمی دارد سود[۵۲]

آپ نے غیاث پور ہی میں قیام کا فیصلہ کر لیا۔ یہ زمانہ انتہائی عسرت اور تنگی میں بسر ہوا۔ بعض مرتبہ تین تین دن کے فاقے کرنے پڑے[۵۳] لیکن استغنا کا یہ عالم رہا

---

۵۱ مجنوں لیلیٰ۔ ص ۱۳ (علی گڑھ ۱۹۱۷)

۵۲ سیر الاولیاء ص ۱۱۱

۵۳ سیر الاولیاء ۱۳۰ - ۱۱۲ ابتدائی زمانہ کا حال مفصل درج ہے۔

کہ سلطان جلال الدین خلجی نے گاؤں پیش کرنے کی اجازت چاہی تو فرما دیا " مجھے اور میرے خدمت گاروں کو تمہارے گاؤں کی چنداں ضرورت نہیں، میرا اور ان کا، خدا کارساز اور بیر سامان ہے "[۵۱] بعد کو جب فتوح کا دروازہ کھل گیا[۵۲] اور ہزاروں آدمی ان کے لنگر سے کھانا کھانے لگے، اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ مسلسل روزے رکھتے تھے اور سحری کے وقت اس لئے کھانا نہ کھاتے تھے کہ شہر میں کچھ لوگ بھوکے سو رہے ہوں گے[۵۳] خلق کی یہی درد مندی نے انھیں اقلیم دل کا حکمراں بنا دیا۔ کوئی شخص اپنی لڑکیوں کے رشتہ کی وجہ سے پریشان ہوتا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ کوئی سلطان کی بے التفاتی سے رنجیدہ خاطر ہوتا تو اُن سے عرض حال کرتا۔ دل میں کوئی خلش ہوتی بے اختیار غیاث پور کی طرف قدم اُٹھنے لگتے، حضرت محبوب الٰہیؒ ہر ایک کا درد و غم سنتے اس کے زخموں پر مرہم لگاتے اور پھر بارگاہِ خداوندی میں ایک ایک تکلیف اپنے اوپر طاری کر کر دعا فرماتے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

چیست انسانی تپیدن در غمِ ہمسائیگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن
خوار دیدن خویش را از خواریِ ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنتِ زنداں شدن
آتش قحطے کہ در کنعاں بسوزد باغ و کشت
بر فرازِ تختِ مصر از تابِ آں بریاں شدن

---

۵۱ سیر الاولیاء ۱۳۰-۱۱۲ ابتدائی زمانہ کا حال مفصل درج ہے

۵۲ خیر المجالس (مجلس ۸۷) میں لکھا ہے کہ فتوحات کا ایسا سلسلہ تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جمنا کا رُخ ان کی خانقاہ کی طرف کر دیا گیا ہے۔ ۵۳ سیر الاولیاء ص

بابا فرید گنج شکرؒ نے ان کے لئے دُعا کی تھی کہ تو ایک ایسا درخت ہو جس کے سایہ میں ایک خلقِ کثیر آسائش و راحت سے رہے[۵۱] تقریباً ۵۰ سال تک انسانی دلوں نے اس طرح ان کی خانقاہ میں راحت و سکون حاصل کیا جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر تمازتِ آفتاب سے خستہ جان، ٹھنڈے اور سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر فرحت و اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔[۵۲] امیر و غریب، عارف و عامی، شہری اور دیہاتی، بوڑھے اور بچے سب ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے[۵۳]۔ امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

در نظرِ او زِ گدا و ملوک — دُر شدہ بے جادۂ مسلکِ سلوک

بر در او ہر کہ ارادت نمود — زندہ جاوید شد ار مردہ بود

جو شخص جس وقت آپ سے ملنے کے لئے حاضر ہوتا، اسی وقت باریابی کی اجازت دی جاتی[۵۴] ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی، حضرت محبوب الٰہیؒ کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے، شیخ کے اثرات کے متعلق لکھتے ہیں:

"اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت عام کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ وہ گناہگاروں کو خرقہ پہناتے تھے اور اُن سے توبہ کراتے تھے اور خود اپنے ارادے سے قبول کرتے تھے۔ ہر شخص کو خواہ خاص ہو یا عام، مالدار ہو یا

---

۵۱ سیر الاولیاء
۵۲ سیر الاولیاء
۵۳ تاریخ فیروز شاہی۔ برنی۔ ص ۳۴۳
۵۴ سیر الاولیاء

غریب، بادشاہ ہو یا متعلم، جاہل ہو یا شریف، بازاری ہو یا شہری، آزاد ہو یا
غلام، ہر ایک کو طاقیہ عطا فرماتے، مسواک دیتے اور توبہ کراتے تھے اور سب
لوگ چونکہ اپنے آپ کو حضرت کا مرید اور خدمت گار سمجھتے تھے اس لئے بہت سی
ناکردنی باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ اور اگر حضرت کے یہاں آنے والوں میں سے
کسی سے لغزش ہو جاتی تھی تو وہ بیعت کی تجدید کر کے توبہ کا خرقہ لے لیتا تھا۔ اور حضرت
سے مرید ہونے کی شرم بہت سے لوگوں کو کھلم کھلا یا چھپے چوری بہت سے
منکرات کے ارتکاب سے بچاتی تھی۔ اور خلقِ خدا عام طور پر تقلیداً اور اعتقاداً
طاعت اور عبادت کی طرف رغبت رکھتی تھی۔ خواص اور عوام کے دلوں
میں نیکی اور نکوکاری نے جگہ پکڑ لی تھی۔ مرد عورت، بوڑھے، جوان، بازاری عامی
غلام اور نوکر سب نماز ادا کرتے تھے۔ زیادہ تر مرید چاشت واشراق کے پابند
ہو گئے تھے .... شہر سے غیاث پور تک مختلف مقامات پر چبوترے
بنائے گئے تھے، چھپر ڈال دیئے گئے تھے۔ کنوئیں کھدوائے گئے تھے۔ پانی
سے بھرے ہوئے مٹکے اور مٹی کے لوٹے رکھے رہتے تھے۔ چٹائیاں بچھی رہتی
تھیں۔ ہر چبوترہ اور ہر چھپر میں ایک حافظ اور ایک خادم مقرر کر دیا گیا تھا
تاکہ مریدوں، توبہ کرنے والوں اور نیک لوگوں کو شیخ کے آستانہ تک آنے جانے
میں نماز کے وقت وضو کرنے میں کوئی تردد نہ ہو[۵۱]"

برنی نے کئی صفحات میں اس کی تفصیل دی ہے اور پھر لکھا ہے:

"حاصل کلام یہ کہ خداوند تعالیٰ نے شیخ نظام الدینؒ کو پچھلی صدیوں میں شیخ جنیدؒ
اور شیخ بایزیدؒ کے مثل پیدا کیا تھا" [۵۲]

۵۱ تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۴۳-۴۴ ۵۲ تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۴۶

پروفیسر محمد حبیب صاحب نے غالباً حضرت محبوب الٰہیؒ کے ان ہی عظیم الشان اور دور رس اثرات کے پیش نظر ان کو ہندوستان کا سب سے بڑا مسلمان بزرگ بتایا ہے[۵۱]۔ علامہ اقبالؒ نے اُن کو خضر و مسیحا سے بھی اونچا مقام دیا ہے[۵۲] فرماتے ہیں:

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

شیخ نظام الدین اولیاؒ کے خلفاء	حضرت محبوب الٰہیؒ کی کوششوں سے چشتیہ

سلسلہ کے اثرات ہندوستان کے ہر ہر حصہ میں پہنچ گئے۔ صاحب گلزار ابرار نے لکھا ہے:

"ان ایام میں زمین ہند کو عجیب زمانہ حاصل تھا۔ کیونکہ آپ کی بارگاہِ خلافت سے وقتاً فوقتاً جو نئے نئے خلیفہ روانہ ہوتے تھے، اُن کی فیض پاشی سے ہند کا ہر مکان اور ہر قطعہ زمین ہدایت آباد تھا۔ ایک روایت ہے کہ آپ نے بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے مرتبے اور بڑی کرامتوں والے سات سو خلیفہ ایسے روانہ کئے تھے کہ ہر شخص کے سینے سے گویا عرفان کا آفتاب طلوع کرتا تھا[۵۳]

---

[۵۱] ملاحظہ ہو (ص ۱۲۹) ISLAMIC CULTURE, APRIL 1946.

[۵۲] امیر خسرو نے جگہ جگہ اپنے شیخ کو خضر و مسیح سے تشبیہہ دی ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

وجودِ خواجہ نہ از آب و گل گشتہ مرتب
کہ جان خضر و مسیحا بہم شد مرکب (سیر الاولیاء)

دولرانی خضر خاں میں کہتے ہیں (ص ۱۵) ع بصدر خضر و عیسیٰ مسند آرائے"

[۵۳] گلزار ابرار (اردو) ص ۸۵ - ۸۶

ضیاء الدین برنی اور سید محمد کرمانی المدعو بہ میر خورد نے شیخ کے اثرات کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس کے پیش نظر، سات سو کی تعداد، ناقابل اعتبار نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ شیخ کے بہت کم خلفاء کے حالات معاصر تذکروں میں ملتے ہیں۔ فوائد الفواد، سیر الاولیاء، خیر المجالس اور احسن الاقوال کی بنیاد پر شیخ کے مندرجہ ذیل خلفاء کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

(۱) مولانا شمس الدین یحییٰ رح
(۲) شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رح
(۳) شیخ قطب الدین منور رح
(۴) مولانا حسام الدین ملتانی رح
(۵) مولانا فخر الدین زرادی رح
(۶) مولانا علاء الدین نیلی رح
(۷) مولانا وجیہہ الدین یوسف رح
(۸) مولانا سراج الدین عثمان رح
(۹) مولانا شہاب الدین امام رح
(۱۰) شیخ برہان الدین غریب رح
(۱۱) قاضی محی الدین کاشانی رح
(۱۲) خواجہ محمد امام رح

جن بزرگوں نے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں رہ کر کام کیا اور وہاں چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں قایم کیں ان کا ذکر ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔ یہاں صرف اُن خلفاء کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے جنھوں نے چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام سے وابستہ رہ کر دہلی میں کام کیا۔

مولانا شمس الدین یحییٰؒ۔ جید عالم تھے۔ امیر خورد کا بیان ہے :

"جملہ اہل عصر از علماء و مشائخ منقاد و معتقد او بودند"[51]

مولانا آزاد بلگرامی، جب علماء ہند کے مخصوص زمرہ میں اُن کے کمالات کا جائزہ لیتے ہیں تو بے اختیار زبانِ قلم سے نکل جاتا ہے :-

آفتابے است مفیض انوار دانش و عالی جناب است مفید انواع بنیش[52]

شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کو اُن سے تلمذ تھا، ایک قصیدے میں فرماتے ہیں

سالت العلم من احیاک حقا

فقال العلم شمس الدین یحییٰ[53]

مولانا نے مشارق الانوار کی ایک شرح بھی لکھی تھی[54] جو اب دستیاب نہیں ہوتی۔ لوگوں کو مُرید کرنے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگر خلافت نامہ پر حضرت شیخ کے دستخط نہ ہوتے تو اس کو اپنے پاس تک نہ رکھتا[55] گو چشتیہ سلسلہ کی اشاعت کا کام شیخ یحییٰ رحؒ کے ذریعے بہت کم ہوا لیکن ان کی وجہ سے سلسلہ کا علمی رعب اور وقار قائم رہا۔ اور یہ ایک ایسی بڑی خدمت تھی کہ جس کی بنا پر ان کو سلسلہ کی تاریخ میں ایک امتیازی جگہ ملنی چاہیئے محمد بن تغلق نے اُن کو جبراً کشمیر بھیجنا چاہا تھا[56] اور اس سلسلہ میں ان پر سختی بھی کی تھی۔ لیکن جب

---

[51] سیر الاولیاء۔ ص ۲۲۵

[52] ماثر الکرام ۔ ص ۱۸۲

[53] اخبار الاخیار ص ۹۷ ۔ ماثر الکرام ۔ص ۱۸۲

[54] اخبار الاخیار ص ۹۶

[55] سیر الاولیاء۔ ص ۲۲۵

[56] سیر الاولیاء۔ ص ۲۲۸

روانگی کا وقت آیا تو ان کے سینے پر پھوڑا نکل آیا اور اسی تکلیف میں انھوں نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

شیخ حسام الدین ملتانیؒ ۔ علم زہد اور تقویٰ کی وجہ سے مشہور تھے علم فقہ میں خاص دلچسپی تھی۔ ہدایہ نوک زبان پر تھی۔ تصوف میں قوت القلوب اور احیاء العلوم ازبر تھیں[۵۱] محبوب الٰہیؒ نے جب خلافت سے نوازا تو عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو شہر میں نہ رہوں بلکہ جاری پانی کے کنارے سکونت اختیار کروں۔ فرمایا نہیں شہر میں ہی رہو۔ کن کاحد من الناس[۵۲] اور اس طرح رہو جیسے اور لوگ رہتے ہیں۔ شیخ حسام الدینؒ چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام سے تعلق رکھتے تھے۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس کے متعلق فرمایا تھا ــــ "شہر دہلی در حمایت اوست"[۵۳] (دہلی اس کی حمایت میں ہے) لیکن جب محمد بن تغلق نے علماء و مشائخ کو دہلی سے نکال کر ملک کے دور دراز حصوں میں بھیجنا شروع کیا، تو شیخ حسام الدینؒ گجرات چلے گئے اور وہیں وصال فرمایا[۵۴]

مولانا فخر الدین زرادیؒ جید عالم تھے شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:-

"در امر دین صلابت تمام داشت و عظمتے وافر"[۵۵]

سماع کی اباحت میں دو رسالے تصنیف کئے تھے[۵۶] محبوب الٰہیؒ سے عشق تھا۔ اُن کے

---

۵۱ سیر الاولیاء ص ۲۰۵ میں لکھا ہے: "در فقہ ہر دو جلد ہدایہ یاد داشت، و در علم سلوک قوت القلوب و احیاء العلوم تحت اللسان بود"

۵۲ سیر الاولیاء۔ ص ۲۶۱

۵۳ سیر الاولیاء۔ ص ۲۵۷

۵۴ سیر الاولیاء۔ ص ۲۶۲

۵۵ اخبار الاخیار ص ۹۱ - ۹۰

۵۶ ایک رسالہ اصول السماع، ۱۳۱۱ھ میں مولانا غلام احمد خاں بریاں نے مسلم پریس جھجر سے شائع کیا تھا۔

وصال کے بعد دائمی روزہ رکھنے لگے تھے[۵۱] محمد بن تغلق کی تحریکِ دکن کے سلسلے میں ان کو دہلی چھوڑ کر دیو گیر جانا پڑا تھا۔ وہاں سے وہ حج کے لئے چلے گئے۔ واپسی میں جہاز ڈوب گیا اور مولانا بھی غرق ہو گئے[۵۲]

مولانا علاء الدین نیلیؒ ۔ اودھ کے مشاہیر علما میں تھے۔ کشاف و مفتاح کے غوامض بیان کرنے میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے[۵۳] محبوبِ الٰہی نے انھیں خلافت عطا فرمائی تھی لیکن انھوں نے ایک شخص کو بھی مرید نہیں کیا[۵۴]۔ اپنے مرشد سے انھیں عشق تھا۔ اُن کے ملفوظات فوائد الفواد (مرتبہ حسن سنجریؒ) اپنے قلم سے لکھ کر رکھ لئے تھے اور اکثر انھیں کے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا آپ کے پاس ہر فن کی معتبر کتابیں موجود ہیں، ان ملفوظات کے علاوہ کسی اور کتاب کو کیوں نہیں پڑھتے! جواب دیا، میری نجات اسی سے متعلق ہے[۵۵]۔

مرا نسیم تو باید صبا کجا است کہ نیست
کجاست زلف تو مشک خطا کجا است کہ نیست

مولانا شہاب الدین امامؒ محبوب الٰہی کے امام تھے آواز ایسی دلکش پائی تھی کہ۔

پرند درہوا و جنبندہ برزمیں بالحان	پرندے ہوا میں اور چلنے والے زمین پر
خوش او مست و مدہوش می گشتند[۵۶]	مست و مدہوش ہو جاتے تھے۔

---

[۵۱] سیر الاولیاء۔ ص ۲۶۶ [۵۲] سیر الاولیاء، ص ۲۷۵

[۵۳] سیر الاولیاء (ص ۲۷۵) میں لکھا ہے: "در کشف غوامض کشاف و مفتاح مثل نداشت"

[۵۴] سیر الاولیاء، ص ۲۷۶۔ اخبار الاخیار، ص ۹۳

[۵۵] سیر الاولیاء، ص ۲۷۸۔ اخبار الاخیار، ص ۹۳

[۵۶] سیر الاولیاء، ص ۲۹۲ - ۲۹۰

امیر خسروؒ نے اُن کے متعلق لکھا ہے ؎

او چو ابرِ کرم بفرق جہاں — زیر کان چوں صدف کشادہ دہاں
شمع من یافتہ ضیا از وے — مسِ من گشتہ کیمیا از وے

دیگر مشایخ وقت کی طرح آپ بھی دکن چلے گئے تھے ۔ غالباً محمد بن تغلق کے اصرار پر ہی آپ نے دہلی کو چھوڑا ۔ پھر کچھ دنوں بعد جب سلطان نے لوگوں کو واپسی کی اجازت دیدی تو آپ بھی دہلی واپس آگئے [۱]

قاضی محی الدین کاشانیؒ ۔ اودھ کے ایک ذی اثر قاضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وظیفے کے فرمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور فقر و مجاہدہ کی زندگی اختیار کرلی [۲] پیر و مرشد کی حیات ہی میں وفات پائی

ان بزرگوں کے علاوہ (جنھوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے باضابطہ خلافت پائی تھی) کچھ مریدین ایسے بھی تھے جن کو خلافت تو عطا نہیں کی گئی تھی لیکن انھوں نے دہلی میں رہ کر سلسلہ کی اخلاقی اور علمی بنیادوں کو استوار کیا ۔ **مولانا وجیہہ الدین پائلیؒ** جید عالم تھے ۔ میر خورد نے لکھا ہے "بوقت سبق گفتن نحول علما بزانوے ادب بخدمت ادی نشستندے [۳] **مولانا فخر الدین مروزیؒ** ہمیشہ کتابتِ کلام پاک میں مصروف رہتے تھے اور بقول صاحب سیر الاولیاء "بجمالِ ورع و کمالِ تقویٰ آراستہ بود" [۴]

امیر خسروؒ جن کے متعلق خود شیخؒ نے فرمایا تھا ؎

خسرو کہ بنظم و نثر مثلش کم خاست — ملکیتِ ملکِ سخن آں خسرو راست
آں خسرو ماست ناصر خسرو نیست — زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست [۵]

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۲۹۲
[۲] سیر الاولیاء ص ۲۹۵
[۳] سیر الاولیاء ۔ص ۲۹۶
[۴] سیر الاولیاء ۔ص ۲۹۸
[۵] سیر الاولیاء ۔ص ۳۰۴

(بقیہ ص ۱۸۱ پر)

امیر حسن سجزی رح[۵۱] مرتب فوائد الفواد، **مولانا ضیاء الدین برنی** رح صاحب تاریخ فیروز شاہی۔ فتاویٰ جہاں داری، حسرت نامہ وغیرہ۔ ——— یہ اور چند اور بزرگ جن کا تذکرہ سیر الاولیاء میں ہے چشتیہ سلسلہ کے علمی ستون تھے۔ انھوں نے سلسلہ کا علمی وقار دوبالا کر دیا اور اپنی تصانیف اور درس کے ذریعے اس کے اثرات دور دور تک پھیلائے

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رح کے بعد چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام کو حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح نے سنبھالا۔ ان میں اپنے پیر و مرشد کی بہت سی خوبیاں تھیں۔ مصنف سیر الاولیاء رح کا بیان ہے

"بوئے کہ از مجلس سلطان المشائخ	جو خوشبو سلطان المشائخ کی مجلس
می آمد، آں بوئے از مجلس شیخ	میں آتی تھی، ویسی ہی خوشبو شیخ
نصیر الدین محمود رح بمشام جاں کاتب	نصیر الدین محمود رح کی مجلس سے کاتب حروف
حروف رسیدہ است[۵۲]	کے مشام جان تک پہنچی ہے۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح نے ابتدائے حال میں امیر خسرو رح کے ذریعہ پیر سے درخواست کی تھی کہ اُن کو کسی تنہائی کے مقام پر رہ کر عبادت کرنے کی اجازت دی دے

(بقیہ ص ۱۸۰) امیر خسرو رح کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو

امیر خسرو رح دہلوی' از پروفیسر محمد حبیب (علی گڑھ ۱۹۲۷ء)

امیر خسرو رح کے حالات و تصانیف ڈاکٹر وحید مرزا (کلکتہ ۱۹۳۵ء)

"حیات خسرو" مولانا سعید مارہروی لاہور ۱۹۰۹ء

[۵۱] امیر حسن رح کا انتقال دیوگیر میں ہوا۔ حالات کے لئے مقدمہ (دیوان حسن دہلوی۔ مرتبہ مولوی مسعود علی) نیز اخبار الاخیار، سیر الاولیاء، تاریخ فیروز شاہی وغیرہ

[۵۲] سیر الاولیاء۔ ص ۲۴۱

جائے۔ حضرت محبوب الٰہی نے جواب دیا:

اورا بگو ترا درمیان خلق می باید بود و جفا و قفائے خلق می باید کشید و مکافات آں ببذل وایثار وعطا می باید کرد[۵۱]

شیخ نصیر الدین سے کہدو کہ تمھیں خلق میں رہنا اور لوگوں کے جور وظلم کے مصائب جھیلنے چاہئیں اور ان کے عوض میں بذل وایثار اور سخاوت و بخشش کرنا چاہیے۔

پیر و مرشد کے اس فرمان پر وہ آخری دم تک عامل رہے۔ کوئی 'جفا' اور 'قفا' ایسی نہ تھی جس سے انھیں دو چار ہونا نہ پڑا ہو۔ لیکن اُن کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیا۔ اور اُن کے پائے ثبات میں کبھی لغزش پیدا نہ ہوئی

حضرت چراغ دہلوی کو اپنے سلسلہ کا کام انتہائی نامساعد حالات میں کرنا پڑا اب دہلی، علاء الدین خلجی کی دہلی نہ تھی جب بقول ان کے خوش حالی اور فارغ البالی کا یہ عالم تھا کہ ہر فقیر کے پاس، ایک چھوڑ دو دو لحاف ہوتے تھے[۵۲]۔ اب یہ بدقسمت شہر ایک مطلق العنان بادشاہ کے بدلتے ہوئے افکار و تصورات کا بازیچہ بنا ہوا تھا۔ ایسے بحرانی دور میں ایک کل ہند روحانی نظام کو چلانے کے لئے بڑی فکری اور عملی صلاحیتیں درکار تھیں۔ حضرت چراغ دہلوی ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے اور ہمت و استقلال کے ساتھ کام کرتے رہے۔ بادِ مخالف کے بہت سے تیز و تند جھونکے آئے اور سلطان وقت محمد بن تغلق نے انھیں طرح طرح سے پریشان بھی کیا[۵۳] لیکن انھوں

---

۵۱ سیر الاولیاء۔ ص ۲۳۷۔ اخبار الاخیار۔ ص ۸۰۔ ۵۲ خیر المجالس (قلمی نسخہ)

۵۳ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، خاکسار کا مضمون "محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات"، مطبوعہ "برہان" مارچ ۱۹۵۱ء (ص ۱۸۰-۱۵۴)

اپنے پیر کے حکم سے سر مو انحراف نہیں کیا۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

ان کی خانقاہ میں عقیدت مندوں کے ہجوم کا یہ حال رہتا تھا کہ ان کو سونے کا وقت تک نہ ملتا تھا۔ ایک دن خود فرمانے لگے

"اکنوں من بارے فرصت مشغولی و خلوت ندارم، ہمہ روز با خلق می باید بود، بلکہ قیلولہ نیز میسر نمی شود۔ بارہا قیلولہ می خواہم کہ بکنم بر می کنند کہ آئندہ آمدہ است بر خیزند"[۱]

اب مجھ کو فرصت مشغولی اور خلوت کی نہیں ہے دن بھر مخلوق کے ساتھ رہنا چاہیے۔ بلکہ قیلولہ بھی اکثر میسر نہیں ہوتا بارہا قیلولہ کرنا چاہتا ہوں، جگا دیتے ہیں کہ فلاں آیا ہے اٹھیے۔

پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے ملفوظات خیر المجالس کو پڑھتے وقت بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں[۲] اس میں شک نہیں کہ شیخ کے ایک ایک

---

[۱] خیر المجالس (قلمی نسخہ) مجلس ۱۲ ص ۳۷ - اردو ترجمہ ص ۷۱

[۲] ملاحظہ ہو پروفیسر محمد حبیب کا مضمون

"SHAIKH NASIR UDDIN CHIRAGH-I-DELHI AS A HISTORICAL PERSONALITY."

مطبوعہ اسلامک کلچر، اپریل ۱۹۴۶ء ص ۱۴۵

اس مضمون میں پروفیسر محمد حبیب صاحب نے حضرت چراغ دہلوی کی تصویر اپنے مخصوص انداز میں کھینچی ہے مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے حبیب صاحب سے پوچھا تھا کہ انھیں اپنی تصانیف میں کون سی تصنیف سب سے زیادہ پسند ہے، تو انھوں نے اسی مضمون کا نام لیا۔

حرف میں درد کی کیفیت پنہاں ہے۔ جہاں بظاہر شیخ کی آنکھوں میں آنسو نہیں معلوم ہوتے وہاں بھی ان کے الفاظ ایسے غم اور تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ غم کی یہ کیفیت کچھ ان کے حالات نے بھی پیدا کی تھی۔ اور یہ حالات بڑی حد تک محمد بن تغلق کی پالیسی کا نتیجہ تھے۔

حضرت چراغ دہلویؒ مہر و محبت کا مجسمہ تھے۔ اُن کے اخلاق کی بلندی کا اندازہ لگانے کے لئے صرف ایک واقعہ بیان کر دینا کافی ہے۔ تکملہ خیر المجالس میں لکھا ہے:

"روزے بعد ادائے نماز ظہر از جماعت خانہ توجہ بحجرۂ خاص فرمودند۔ حضرت ایشاں را دربان بنودے۔ خادم خاص ایشاں خواہرزادہ شیخ زین الدین علی بود، او نیز در خلوت گاہے حاضر بودے گاہے بنودے۔ درعین مشغولی قلندرے بے باک تراب نام در خلوتِ ایشاں درآمد کاردے درمیاں داشت دبر ایشاں کارد زدن گرفت۔ یازدہ زخم بر وجود پاک ایشاں بزد۔ حضرت ایشاں در استغراق بودند، ایشاں تجاوز نفرمودند، درآں ناؤ دانے بود، خون مبارک ایشاں از ناودانے بیروں آمد۔ بعضے مریداں آں حال را	ایک دن ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد آپ جماعت خانہ سے حجرۂ خاص میں تشریف لے گئے۔ حضرت کوئی دربان نہیں رکھا کرتے تھے۔ ان کے خادم خاص ان کے بھانجے شیخ زین الدین علی تھے۔ وہ بھی کبھی خلوت میں موجود ہوتے تھے کبھی نہ ہوتے تھے شیخ مشغولی کی حالت میں تھے کہ ایک بیباک قلندر تراب نام خلوت میں آپہنچا۔ اُس کے پاس ایک چاقو تھا شیخ پر چاقو سے وار کرنے شروع کئے اور ان کے جسم مبارک پر یارہ زخم کئے۔ حضرت استغراق کی حالت میں تھے مطلقاً بچاؤ نہیں کیا وہاں ایک نالی تھی، خون مبارک اس نالی سے باہر نکلنا شروع ہو گیا۔ کچھ مریدوں نے دیکھا تو اندر آئے۔ کیا

دیدہ اندروں آمدند، چہ بینند کہ آں
قلندرے بے باک زخم ہائے کارد
می زند، حضرت ایشاں دم نمی زنند
مریداں خواستند کہ آں بدبخت را ایذائے
عظیم رسانند حضرت شیخ نگذاشتند
کہ ہیچ کس بہ ہیچ وجہ مزاحم او گردد و
خدمت عبدالمقتدر تھانیسری راکہ
از مریداں خاص ایشاں بودند و خدمت
شیخ صدر الدین طبیب را و خدمت
شیخ زین الدین علی را بحضور خود
سوگند دادند کہ مبادا کسے بضرر قلندر
ملتفت گردد و بیست تنکہ سفید
اورا انعام فرمودند کہ شاید در وقت
کارد زدن آزارے بدست دے
رسیدہ باشد۔ سبحان اللہ، اہل بصیرت
را حسن سیرت ایشاں معلوم گردد
کہ در صدر حیات در تسلیم و رضا چہ
رتبہ داشتند[51]"

دیکھتے ہیں کہ وہ بے باک قلندر
چاقو کے وار کر رہا ہے اور حضرت
جنبش تک نہیں کرتے۔ مریدوں نے
چاہا کہ اس بدبخت کو سخت ایذا
پہنچائیں۔ حضرت نے گوارا نہ کیا۔
اور اسے نہ چھوڑا۔ مبادا کوئی کسی
طرح سے اسے کوئی تکلیف پہنچائے
عبدالمقتدر تھانیسری کو کہ مریدان خاص
میں تھے اور شیخ صدر الدین طبیب
اور شیخ زین الدین علی کو اپنے پاس
بلایا اور قسم دی کہ کوئی قلندر کو ضرر
نہ پہنچائے اور بیس تنکہ اس کو انعام
دیا اور فرمایا کہ شاید چاقو مارنے میں
ہاتھ میں کچھ تکلیف پہنچی ہو۔ سبحان اللہ
اہل بصیرت کو ان کی حسن
سیرت معلوم ہو کہ زندگی میں تسلیم و
رضا کا کیا درجہ رکھتے تھے

..

اس حادثہ کے تین سال بعد ١٨ ر رمضان المبارک ٧٥٧ھ مطابق ١٣٥٦ء کو

---

٥١ تکملہ خیر المجالس ۔ ص ٣١٥ - ٣١٤

حضرت چراغ دہلوی نے وصال فرمایا۔ ان کا وصال حقیقت میں چشتیہ سلسلہ کے دورِ اول کا خاتمہ تھا۔ مطہر نے اُن کے مرثیہ میں صحیح لکھا تھا ؂

جہاں بماتم خواجہ نصیر دین محمود — ہزار گونہ کرد نوحہ وزاری
بقیہ سلف و یادگارِ اہل کرم — کہ کرد ختم خلافت بملک دین داری[۱]

چشتیہ سلسلہ کے دور اول کا خاتمہ اور اس کے اسباب

چشتیہ سلسلہ کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح سے شروع ہوا تھا شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح پر ختم ہوگیا۔ اس دور کی خصوصیات یہ تھیں

(۱) چشتیہ سلسلہ کا ایک مرکزی نظام تھا۔ اسی مرکز سے تمام متعلقین سلسلہ کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح و تربیت ہوتی تھی۔ خواجہ اجمیری رح، قطب صاحب رح، بابا فرید رح اور حضرت محبوب الٰہی رح کے خلفاء اور مریدین ملک کے دور و دراز علاقوں میں کام کرتے تھے۔ لیکن ان کی نگاہیں ہمیشہ اجمیر، دہلی یا اجودھن کی طرف لگی رہتی تھیں وہ اپنے آپ کو ایک مرکزی نظام کے ماتحت تصور کرتے تھے۔

(۲) امراء و سلاطین سے کسی قسم کا تعلق رکھنا روحانی سعادت کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ "درویش دیہہ دار" ہونا اخلاق اور مذہب دونوں کی توہین تھی۔ گذر اوقات کے لئے یا تو افتادہ زمین کا کوئی حصہ کاشت کرنے لگتے، یا بغیر مانگے جو کوئی چیز مل جاتی اس پر قناعت کر لیتے۔ حکومت کی ملازمت کی طرف اگر کسی خلیفہ کا ذرا بھی رجحان پاتے تو فوراً خلافت نامہ واپس لے لیتے۔

حضرت چراغ دہلوی رح کے بعد سلسلہ کے یہ دو بنیادی اصول، ماضی کی داستان بن کر رہ گئے۔ مرکزی نظام تباہ و برباد ہوگیا۔ مرکز سے علیحدہ صوبوں میں خانقاہیں

[۱] اخبار الاخیار۔ ص ۸۵

قائم ہوگئیں۔

سلسلہ کے بہت سے نو عمر افراد نے حکومت وقت سے تعلق پیدا کر لیا اور اپنا بیشتر وقت اسی میں صرف کرنے لگے۔ بابا فریدؒ نے برسوں پہلے تنبیہ کی تھی۔

لو اردتم بلوغ درجۃ الکبار	اگر تم اپنے روحانی مراتب میں بلندی
فعلیکم بعدم الالتفات	چاہو تو سلاطین کی اولاد کی طرف
الی ابناء الملوک۔ [۵۱]	توجہ نہ کرنا۔

ان نصیحتوں کو فراموش کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ کے ستون ہل گئے اور اس کے نظام میں ابتری پیدا ہوگئی۔

حضرت چراغ دہلویؒ کی دور بین نگاہ نے مستقبل کے حالات کا مکمل طور پر جائزہ لے لیا تھا اور غالباً اسی بنا پر انھوں نے کسی کو اپنا جانشین بنانا مناسب نہیں سمجھا۔ [۵۲] شیخ زین الدینؒ نے ایک دن عرض کیا۔

"مخدوم بیشترے مریدان شما صاحب	مخدوم آپ کے بہت سے مرید صاحب حال
حال و اہلِ کمال اند۔ ازیں جملہ	اور اہل کمال ہیں، ان میں سے کسی ایک کے لئے اشارہ
یکے را اشارت شود کہ بجائے شما نشستہ	ہو جائے تو آپ کی جگہ پر بیٹھ جائے کہیں ایسا
باشد کہ ایں سلسلہ بکلی گسستہ نگردد۔ [۵۳]	نہ ہو کہ سلسلہ بالکل ہی ختم ہو جائے۔

۵۱۔ سیر الاولیاء۔ ص ۷۵

۵۲۔ جہاں تک مریدین کا تعلق ہے۔ حضرت چراغ دہلویؒ کے حلقۂ ارادت میں بعض جید عالم اور فاضل شامل تھے۔ سید محمد بن جعفر مکی حسینیؒ جن کی کتاب بحر المعانی اسرار معرفت کا خزانہ ہے۔ مولانا خواجگیؒ استاد قاضی شہاب الدین دولت آبادی۔ قاضی عبد المقتدر، مولانا احمد تھانیسریؒ، شیخ صدر الدین حکیمؒ وغیرہ اپنے اپنے فن میں وحید عصر و یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے، ملاحظہ ہو اخبار الاخیار، مآثر الکلام، و تذکرہ علمائے ہند۔ ۵۳۔ تکملہ خیر المجالس ص ۲۱۵

تو فرمایا تین درویشوں کو تم اہل سمجھتے ہو اُن کے نام لکھ لاؤ مولانا زین الدین نے تین فہرستیں تیار کیں۔ اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ۔ شیخ نے مطالعہ کے بعد فرمایا۔

"شیخ زین الدین ایشاں را بگو کہ غم	شیخ زین الدین! ان لوگوں سے کہو
ایمان خود بخورند چہ جائے آنکہ بار دیگر	کہ اپنے ہی ایمان کا فکر کریں، دوسروں کا
بردارند"[۱]	بوجھ سر پر لینے سے کیا حاصل۔

حضرت چراغ دہلوی نے محسوس کر لیا تھا کہ ان حالات گرد و پیش میں کوئی شخص ایک کل ہند نظام کا بار گراں نہ سنبھال سکے گا۔ چنانچہ انھوں نے وصیت فرمائی کہ مشائخ سلسلہ کے سب تبرکات اُن کے ساتھ دفن کر دئے جائیں۔ جب زمین نے اس آفتاب علم و ارشاد کو آغوش میں لیا تو چشتیہ سلسلہ کا ایک تابناک دور ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اسلامی ہند کی تاریخ کا یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جس وقت چشتیہ سلسلہ کا دور اول ختم ہوا، اسی وقت سلطنت دہلی نے بھی دم توڑا۔ اگر ایک طرف حضرت چراغ دہلوی کے وصال کے بعد چشتیہ سلسلہ کا مرکزی نظام ختم ہو گیا، تو دوسری طرف فیروز شاہ کے انتقال (۱۳۸۸ء) کے بعد سلطنت دہلی کی مرکزی حیثیت بھی فنا ہو گئی۔ صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں اور دہلی کی امتیازی شان جاتی رہی۔ جس طرح فیروز شاہ کے بعد ہماری سیاسی توجہ کا مرکز جون پور، گجرات، دکن، بنگال، مالوہ کی حکومتیں بن جاتی ہیں اسی طرح ہماری مذہبی تاریخ کی دلچسپیاں دہلی سے ہٹ کر صوبوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ کچھ عجیب توارد ہے کہ جس وقت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر میں اسلام کا روحانی مرکز قائم کرنے میں مصروف تھے اسی زمانے میں قطب الدین ایبک

---

[۱] تکملہ خیر المجالس (قلمی)، نیز سیر العارفین (مطبع رضوی، دہلی) ص ۹۷

اور شمس الدین التمش کی فتوحات قاہرہ دہلی میں سلطنت کی تعمیر و تشکیل کا کام انجام دے رہی تھیں۔ ایک طرف روحانی تسخیر ہو رہی تھی، دوسری طرف سیاسی فتوحات کا ہنگامہ برپا تھا۔ مسلمانوں کے یہ دونوں نظام تقریباً دو صدی تک متوازی چلتے رہے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں سلطنت دہلی اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اور اسی زمانے میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے چشتیہ سلسلہ کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ معاصر مورخ ضیاء الدین برنی اس توارد کو محسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"سبحان اللہ! عجیب دن اور عجیب زمانہ تھا جو علاء الدین خلجی کی حکومت کے آخری دس سال میں نظر آیا۔ یعنی ایک طرف سلطان نے اپنے ملک کی فلاح اور بہبودی و اصلاح کے لئے تمام نشہ آور چیزیں ممنوعات اور فسق و فجور کے تمام اسباب ان سب کو جبر و قہر اور تشدد اور سخت گیری کے ذریعے روک دیا تھا اور دوسری طرف انھیں دنوں میں شیخ الاسلام نظام الدینؒ نے عام بیعت کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ گنہگاروں کو خرقہ و توبہ عطا فرماتے تھے اور خود اپنے ارادے سے قبول کرتے تھے۔"[۵۱]

پھر کچھ عرصہ کے بعد اگر سیاسی دنیا میں محمد بن تغلق یہ اعلان کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

ملک مامریض گشت[۵۲]

تو روحانی حلقوں میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے یہ حسرت ناک الفاظ کانوں میں پڑتے ہیں۔

امروز خود ایں کار (شیخی) بازی بچگاں شد[۵۳]

---

۵۱ تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۴۳

۵۲ تاریخ فیروز شاہی (برنی)، ص ۵۲۱

۵۳ اخبار الاخیار۔ ص ۸۲

پھر اگر ایک طرف آنکھوں کے سامنے وہ سماں پھرتا ہے جب حضرت چراغ دہلوی کی وصیت کے مطابق مشایخ چشت کے تبرکات ان کی قبر میں رکھے جا رہے ہیں[۵۱] اور سلسلہ کی تاریخ کا ایک باب ختم کیا جا رہا ہے، تو دوسری طرف وہ نظارہ بھی تصور سے محو نہیں ہوتا کہ فیروز شاہ کا آخری زمانہ ہے۔ ایک بزرگ فجر کی نماز کا وضو کر رہے ہیں کہ یک لخت کوشک سلطان کی طرف نظر اٹھتی ہے اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:۔

"بلا ہائے جملہ عالم زیر پائے اوست۔ آں روز کہ او از یں جہاں برود معلوم جہانیاں شود"[۵۲]

پھر یہ بات بھی اس وقت کیوں نظر انداز کر دی جائے کہ شہاب الدین محمد غوری کی فتح کی بشارت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے دی تھی[۵۳] اور فیروز شاہ کو تخت پر بٹھلانے والوں میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ بھی شامل تھے[۵۴]

اگر کوئی شخص ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالے کہ مشایخ چشت، سلاطینِ دہلی کے ہم نوا اور شریکِ کار تھے اور اسی بنا پر اُن کے عروج و زوال کی داستانیں اس قدر پہلو بہ پہلو چلتی ہیں تو یہ تاریخی حقائق کے خلاف ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ مشایخ چشت (بالخصوص دورِ اول کے بزرگ) ہمیشہ سلاطین اور سیاست سے علیحدہ رہے، اور انھوں نے درباداری کو ہمیشہ اخلاق اور مذہب دونوں کی توہین سمجھا

---

[۵۱] سیر العارفین۔ ص ۱۰۷
[۵۲] تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج عفیف) ص ۲۲-۲۱

[۵۳] سیر الاولیاء۔ ص ۴۷
[۵۴] تاریخ فیروز شاہی (عفیف) ص ۲۹ نیز تاریخ فیروز شاہی (برنی)

خواجہ اجمیری نے جن حالات میں یہ بشارت دی تھی اور حضرت چراغ دہلویؒ نے جن حالات میں فیروز شاہ فیروز کو تخت پر بٹھایا تھا وہ غیر معمولی تھے۔ انھیں مجبوراً ایسا کرنا پڑا تھا۔ ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون EARLY INDO-MUSLIM MYSTICS AND THIER ATTITUDE TOWARDS THE STATE (مطبوعہ اسلامک کلچر ۱۹۴۹-۱۹۵۰)

جس تواردکی طرف اوپر اشارہ کیا گیا اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی نظام (یعنی سلطنت دہلی) کی مضبوطی کا انحصار مسلم سوسائٹی کے ضبط و نظم پر تھا۔ اور مسلم سوسائٹی کی شیرازہ بندی کا دار و مدار مشائخ کی کوششوں پر۔ وہ قوم کا اخلاقی مزاج درست رکھنے اور صحتمند عناصر کو اُبھارنے اور ترقی دینے کے لئے کوشاں رہتے تھے جب حضرت محبوب الٰہیؒ کے زمانے میں تصوف کی تحریک عوامی تحریک بن گئی اور جاہل اور عالم، شہری اور دیہاتی امیر اور غریب عورت اور مرد، بوڑھے اور جوان، آزاد اور غلام سب ہی اُن کے دامن تربیت سے وابستہ ہونے لگے تو ایک مضبوط ہم رنگ اور صحت مند معاشرہ خود بخود اُبھر آیا۔ ناممکن تھا کہ یہ معاشرہ، سیاسی نظام کو تقویت نہ پہنچائے۔ ——— ایک مضبوط معاشرہ ہی ایک مضبوط سیاسی نظام کی تشکیل کا سامان مہیا کر سکتا ہے۔ علاء الدین خلجی کو خوش قسمتی سے یہ مضبوط معاشرہ ملا اور اس نے اس کی مدد سے ایک زبردست سیاسی نظام ترتیب دیا ——— پھر کچھ عرصہ بعد جب چشتیہ سلسلہ کا نظام بگڑنا شروع ہوا تو سماج کا اخلاقی توازن بھی صحیح نہ رہ سکا۔ جو طبقہ خیر کی طرف بلاتا اور شر سے روکتا تھا جب وہی منتشر ہوگیا تو پھر سوسائٹی کے اجزا میں انتشار پیدا ہو جانا ناگزیر تھا[1]۔ اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی نظام کا متاثر ہونا بھی

---

[1] ہکسلے (HUXLEY) کا کہنا ہے کہ متفکرین کی ایک اقلیت کا سوسائٹی میں موجود ہونا اس سماج کی صحت کے لئے ضروری ہے۔

"...... THE EXISTENCE OF AT LEAST A MINORITY OF CONTEMPLATIVES IS NECESSARY FOR THE WELL-BEING OF THE SOCIETY."

ملاحظہ ہو مہندرناتھ سرکار کا خطبہ صدارت ص ۱۸ (فلسفہ کانگریس بائیسواں اجلاس)

جہاں یہ "اقلیت" دعوت و اصلاح کا کام بھی انجام دیتی ہو، سماج کے لئے اس کی ضرورت اور اہمیت بدرجہا بڑھ جاتی ہے!

یقینی تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چشتیہ سلسلہ کا نظام کیوں بگڑا ؟

اس کی ذمہ داری ایک حد تک سلطان محمد تغلق پر عاید ہوتی ہے ۔

سلطان محمد بن تغلق اپنے زمانے کا جید عالم تھا ۔ شاید ہی علم و ہنر کا کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر اس کو کامل عبور نہ ہو ۔ اس کا تابناک تخیل نئی نئی اسکیمیں تیار کرتا تھا ایسی اسکیمیں جن کی افادیت سے انکار کرنا ناانصافی ہوگی ۔ لیکن ان کو عملی جامہ پہنانے میں وہ اتنی جلدی کرتا تھا کہ سوسائٹی کے مختلف طبقے ان کو سمجھنے سے قاصر رہتے تھے اور اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس کی ہر معقول اسکیم، عوام کی ناراضگی کا باعث بن جاتی تھی ۔

محمد بن تغلق نے جب ہندوستان کے نقشے پر نظر ڈالی تو اُسے محسوس ہوا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی کم ہے وہاں سیاسی نظام کی بنیادیں بھی کمزور ہیں ۔ دکن کے حالات کا تجزیہ کیا تو یہی بنیادی سبب نظر آیا ۔ اس کے پیش رو باوجود بے پناہ طاقت اور قوت رکھنے کے دکن پر محض اس وجہ سے براہِ راست حکومت نہ کر سکے تھے کہ وہاں مسلمانوں کی کافی آبادی نہ تھی ۔ ان حالات میں اس نے فیصلہ کیا کہ دکن میں اسلامی تہذیب و تمدن پھیلا کر مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کیا جائے تاکہ جنوبی ہندوستان میں ایک مضبوط سیاسی نظام تیار ہو سکے ۔ تبلیغ و اشاعت کے کام کے لئے اس کی نظر مشایخ پر گئی ۔ حضرت محبوب الہی ؒ نے چشتیہ سلسلہ کا نظام دور دور پھیلا دیا تھا، لیکن پھر بھی دہلی میں بعض ایسے مشایخ موجود تھے جن کو ملک کے دوسرے علاقوں میں بھیج کر دعوت و اصلاح کا کام لیا جا سکتا تھا ۔ چنانچہ سلطان نے ایک دربارِ عام کیا جس میں مولانا فخر الدین زرادی ؒ ۔ مولانا شمس الدین یحییٰ ؒ ۔ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی ؒ وغیرہ کو بلایا ۔ اور ان لوگوں کو تلقین کی کہ دکن جا کر تبلیغ اسلام کریں[۵۹]

[۵۹] تفصیل کے لئے سیر الاولیاء کا مطالعہ ضروری ہے ۔

سلطان محمد بن تغلق کی نیت درست لیکن مطالبہ غلط تھا۔ وہ الدین والملک
[illegible]امان[۵۴] کا قائل تھا اور اس بنا پر چاہتا تھا کہ صوفیہ اس کے احکامات کا احترام کرتے
ہوئے ملک کے مختلف گوشوں میں چلے جائیں۔ یہ چیز مشائخ کے بنیادی مسلک سے
ٹکراتی تھی۔ وہ سلطان کے مطالبہ کو جن وجوہات کی بنا پر پورا کرنے سے قاصر تھے۔
وہ یہ تھے۔

(۱) اُن کے نزدیک حکومتِ وقت سے تعلق رکھنا، روحانی موت کے مترادف تھا
(۲) اُن کا دائرۂ عمل اور جائے قیام شیخ کا طے کیا ہوا تھا۔ وہ قطعاً اس مقام
کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جہاں ان کے شیخ نے انھیں بٹھا دیا تھا۔
(۳) مشائخ چشت نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ خود سیاسی معاملات میں
قطعاً دخل نہیں دیں گے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عہد کر لیا تھا کہ وہ اپنی خانقاہوں
کا پُرسکون ماحول، شاہانِ وقت کو خراب نہ کرنے دیں گے۔ چنانچہ حضرت
نظام الدین اولیاء کی خانقاہ دہلی کے اندر ہوتے ہوئے بھی سلطنت دہلی کا حصہ
نہ تھی۔ ان کے خلفاء مریدین وہی صورت قائم رکھنا چاہتے تھے۔
(۴) ان بنیادی اصولوں کے پیشِ نظر کام کی نوعیت کا خیال ان کے لئے بالکل
بے معنی تھا۔ اچھا یا برا کوئی کام ہو سلطانِ وقت سے تعلق کسی طرح جائز نہ تھا۔ شیخ
کمال الدین زاہد (اُستاد شیخ نظام الدین اولیاء) کا واقعہ اس اصول کا بہترین
آئینہ دار ہے۔ جب بلبن نے اُن سے شاہی امامت قبول کرنے کی درخواست کی تو انھوں
نے جواب دیا "ہمارے پاس سوائے نماز کے اور کیا ہے۔ کیا بادشاہ یہ چاہتا ہے کہ وہ
بھی جاتی رہے"[۵۵]

---

۵۴ سیر الاولیاء ص ۲۰۲ - (اردو مطبوعہ، دہلی
۵۵ سیر الاولیاء ص ۱۰۶ (فارسی)

سلطان نے جب ان بزرگوں کے دائرۂ عمل میں دخل دیا تو انھوں نے پوری قوت کے ساتھ اس کی اس کوشش کی مخالفت کی۔ یہ مخالفت حقیقت میں ایک اصول کی محافظت تھی۔ محمد بن تغلق نے اس کو ذاتی مخالفت سے تعبیر کیا اور مشائخ سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ شیخ شمس الدین یحییٰ کو (جن کے تبحر علمی کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے) اس نے مجبور کیا کہ وہ کشمیر جاکر تبلیغ دین کریں۔ سیر الاولیاء میں لکھا ہے:

"سلطان محمد .... پیش خود

طلبید چوں خدمت مولانا پیش او	سلطان محمد نے مولانا کو طلب
رفت سلطان گفت ہمچو تو دانش مندے	کیا اور کہا تجھ جیسا دانش مند
ایں جا چہ کند تو در کشمیر برو در بت خانہ	رہ کر یہاں کیا کر رہا ہے، تو کشمیر جا
ہائے آں دیار بنشیں و خلق خدائے	اور وہاں کے بت خانوں میں بیٹھ کر
را با سلام دعوت کن چوں ایں چنیں	خلق خدا کو اسلام کی دعوت دے
فرمانے شد کسان تعین شدند کہ ایں	اس فرمان کے بعد چند آدمی مقرر کیے گئے
بزرگ را رواں کنند	کہ اس بزرگ کو کشمیر روانہ کر دیں۔

اتفاقاً مولانا کے سینے پر پھوڑا نکل آیا اور جانے سے قاصر رہے تو سلطان کو ان کی بیماری کا یقین تک نہ آیا اور سمجھا کہ انھوں نے بہانہ بنا لیا ہے۔ چنانچہ ان کو تکلیف کی شدت میں محل شاہی میں بلا کر دیکھا گیا اور جب ان کی بیماری کا یقین ہو گیا۔ تو ان کو دہلی میں آخری سانس لینے کی اجازت دی گئی۔

مولانا فخر الدین زرادی، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، شیخ قطب الدین منور اور دیگر بزرگان سلسلہ چشتیہ سے سلطان کے سخت برتاؤ کی تفصیل کے لئے سیر الاولیاء کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

سلطان محمد بن تغلق سے مشائخ کی اس کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بزرگوں

وہ قیمتی وقت جو سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت میں صرف ہونا چاہئے تھا۔ اپنی مدافعت میں ضائع ہو گیا۔ ان کا ذہنی سکون جاتا رہا۔ رات دن دربارِ شاہی کے سفیر خانقاہوں میں نئے نئے احکامات لئے کھڑے رہتے تھے۔ ان احکامات کی تعمیل مشکل تھی، خلاف ورزی اُس سے زیادہ مشکل۔ ایک طرف مشائخ متقدمین کی وہ روایات تھیں جو انھوں نے خونِ جگر سے تعمیر کی تھیں، دوسری طرف سلطان کا جبروتشدد تھا۔ ابھی یہ کشمکش چل ہی رہی تھی کہ سلطان نے حکم دیا کہ دہلی کی ساری مسلمان آبادی دیوگیر چلی جائے۔ اس حکم کے بعد مشائخ بھی بے بس ہو گئے۔ اور انھیں مجبوراً دہلی کو خیرباد کہنا پڑا ——— دہلی حضرت محبوب الٰہیؒ کی کوششوں سے چشتیہ سلسلہ کا قلب و جگر بن چکی تھی۔ اس کی تباہی کیا ہوئی کہ سلسلہ کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ وہ دہلی جو کبھی "رشک بغداد، غیرت مصر، ہمسر قسطنطنیہ موازیِ بیت المقدس تھی[1] جہاں چپہ چپہ پر خانقاہیں اور قدم قدم پر مدرسے تھے[2]۔ ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ دور دور خاک اُڑنے لگی۔ علمی و مذہبی محفلیں سرد پڑ گئیں، گھر کے گھر بے نور و بے چراغ ہو گئے ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں　　نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

چشتیہ سلسلہ کا مرکزی نظام بھی اسی تباہی کی نذر ہو گیا۔ کچھ مشائخِ سلسلہ جن کا

---

[1] تاریخ فیروز شاہی (ضیاء الدین برنی) ص ۲۴۱

[2] شہاب الدین العمری (مصنف مسالک الابصار) کا بیان ہے کہ صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے، دو ہزار خانقاہیں اور شفا خانے تھے۔ (انگریزی ترجمہ ص ۲۴) نیز ملاحظہ ہو صبح الاعشیٰ (قلقشندی) انگریزی ترجمہ ص ۲۹۔

دہلی میں قیام، مرکزی قیام کی مضبوطی کے لئے ضروری تھا، منتشر ہو گئے، کچھ نوعمر افرادِ سلسلہ نے حکومتِ وقت کے آگے ہتھیار ڈال دئے اور شاہی ملازمتیں قبول کرلیں جو دہن میں بابا فرید رح کے پوتوں نے سب سے پہلے اپنے دادا کے اصولوں کو خیرباد کہا اور شیخ الاسلامی کے چکر میں پڑ گئے۔ دہلی میں بھی کرمانی خاندان کے کچھ نوعمر افراد نے حکومتِ وقت سے تعلق پیدا کرلیا۔[۱]

اگر حالاتِ گرد و پیش کا تجزیہ بے تعصبی کے ساتھ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ محمد بن تغلق بڑی حد تک چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام کی تباہی کا ذمہ دار تھا۔ دہلی کی تباہی کے بعد چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں تو بہت جگہ قائم ہوئیں لیکن اس کا کل ہند مرکزی نظام کسی جگہ قائم نہ ہو سکا۔ سلسلہ کے جو مشائخ اس طوفان سے بچ رہے تھے انھوں نے صوبوں میں خانقاہیں قائم کرلیں اور سلسلہ کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ صوبائی علاقوں میں کام کرنے والے یہ بزرگ سیاست سے نہ بچ سکے۔ اس طرح دورِ اول کی دونوں خصوصیات (مرکزی نظام اور سیاست سے علیحدگی) ختم ہو گئیں۔

چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں

چشتیہ سلسلہ کے دورِ ثانی کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے (جب سلطنت دہلی کا مرکزی نظام تباہ ہوا تو بنگال، دکن مالوہ، جونپور اور گجرات میں خود مختار سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ اسی طرح جب چشتیہ سلسلہ

---

[۱] تفصیل کے لئے سیر الاولیاء کا مطالعہ ضروری ہے۔

کا مرکزی نظام درہم برہم ہوا تو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مرکز سے غیر متعلق خانقاہیں قائم ہوئیں۔ اس لامرکزیت سے بعض شدید نقصانات ضرور ہوئے لیکن ایک ایسا زبردست فائدہ بھی ہوا جس نے ان سب نقصانات کی تلافی کردی۔ اور وہ یہ کہ ان علاقوں میں اسلامی تہذیب تمدن کی سرگرمیاں بڑھ گئیں اور اس سے قبل جو تمدنی عظمت صرف دہلی کو حاصل تھی وہ اب پنڈوہ لکھنوتی، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، زین آباد، مانڈو، احمد آباد کو بھی حاصل ہوگئی، اور اسلامی ہند کا بہت سا بہترین لٹریچر ان ہی علاقوں میں پیدا ہوا

ان آزاد صوبائی حکومتوں کے کارناموں سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے لیکن یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان حکومتوں کے وجود میں آنے سے قبل چشتیہ سلسلہ کے مشائخ نے ان علاقوں میں ایک زبردست تمدنی انقلاب پیدا کردیا تھا۔ شاید یہ حکومتیں کبھی وجود میں نہ آسکتیں اگر اولیاء کرام ان علاقوں میں بس کر مختلف تمدنی عناصر کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ بنگال، گجرات، مالوہ، دکن وغیرہ میں جو آزاد سلطنتیں قائم ہوئیں اُن کے پیچھے ایک مضبوط معاشرہ نظر آتا ہے یہ معاشرہ کس طرح وجود میں آیا؟ اگر تاریخ کے اشاروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سماجی نظام مشائخ چشت کی کوششوں کا مرہونِ منت تھا۔ انھوں نے ان علاقوں میں بسنے والے مختلف الخیال اور مختلف المذاہب لوگوں میں اتحادِ عمل اور اتحادِ فکر پیدا کیا۔ اور ان منتشر طبقوں کو ایک ایسے سماجی رنگ میں رنگ دیا جس نے ایک مضبوط معاشرہ کی شکل اختیار کرلی۔

ان بزرگوں کی خانقاہوں میں ہندو اور مسلمان سب ہی جمع ہوتے تھے۔ اِن مشائخ نے اختلافات کے پردوں کو ہٹا کر ان میں ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی۔ اور ایسا عمدہ سماجی ماحول پیدا کردیا کہ ہر صوبے کا یہ سماجی نظام اپنے مضبوط معاشرہ کو ایک مضبوط سیاسی نظام کی شکل میں ظاہر کرسکا۔

۱۔ بنگال | بنگال کو مسلمانوں نے فتح تو ۱۱۹۷-۹۸ء میں کر لیا تھا لیکن عرصہ
تک اس کی حالت بقول ابن بطوطہ "جہنم پُر از نعمت کی سی رہی۔ پھر ایک زمانہ آیا
کہ یہی بنگال علم و فن کا ایک زبردست مرکز بن گیا۔ اس کے گوشہ گوشہ میں مدرسے
اور خانقاہیں قائم ہوئیں۔ بنگال کا بحری سلسلہ عرب کے سواحل اور عجم کے بندرگاہوں
سے متصل ہو گیا[1] اور شیراز تک سے یہ آواز بلند ہونے لگی ؎

حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطان غیاث الدین
خامش مشو کہ کارِ تو از نالہ می رود

اس تبدیلی کو سمجھنے کے لئے بنگال کے تمدنی انقلاب پر غور کرنا چاہیے۔

تیرھویں صدی کے آخری یا چودھویں صدی کے ابتدائی سال تھے کہ لکھنوتی
سے ایک عقیدت مند سراج الدین نامی حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر
ہوا۔ علم سے تہی دست لیکن یقین کی دولت سے مالا مال۔ عرصہ تک اس طرح شیخ
کی خدمت میں رہا کہ جب سال تمام ہو جاتا تو اپنی والدہ سے ملنے کے لئے لکھنوتی
کا سفر کرتا۔ پھر واپس آ جاتا اور شیخ کی ملازمت کو اپنے لئے سعادتِ دارین سمجھتا۔
جب حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے مریدین کو خلافت سے سرفراز فرمانے لگے تو لوگوں
نے اس کا نام بھی پیش کیا۔ شیخ نے فرمایا :- "اس کام میں سب سے پہلا درجہ
علم کا ہے"[2] اس شخص کے خلوص لیکن محرومی کو دیکھ کر مولانا فخر الدین زرادیؒ
کو رحم آ گیا اور انھوں نے چھ مہینے کے اندر اس کو عالمِ متبحر بنانے کا دعویٰ کیا اور
ایسا کر دکھایا۔ تحصیلِ علم کے بعد جب اُنھیں شیخ کی خدمت میں پیش کیا گیا، تو

---

[1] تفصیل کے لئے، ملاحظہ ہو، "ریاض السلاطین" غلام حسین سلیم، (۱۸۹۰ء)

[2] سیر الاولیاء۔ ص ۲۲۸

ھوں نے "آئینہ ہند" کا خطاب دے کر خلافت سے سرفراز فرمایا۔ صاحب روضتہ الاقطاب نے صحیح لکھا ہے :-

الحق کہ دے آئینہ ہند بود کہ تمام ہندا زوے رونقِ ارشاد و ہدایت بیفزود و طریق معرفت و ولایت روئے نمود، اگرچہ جمیع خلفاءِ سلطان المشائخ صاحب مقامات عالی بودند، امّا ازاں ہا شیخ نصیر الدین محمود کہ چراغ دہلی و شیخ سراج الدین کہ آئینہ ہند است چاشنی دیگر داشتند، وازیں دو بزرگ بسے مرداں صاحب تکمیل و ارشاد پیدا آمدند"[۵۱]

سچ تو یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے لئے آئینہ کی مانند تھے۔ تمام ہندوستان میں اُن سے ارشاد و ہدایت کی رونق بڑھ گئی اور معرفت و ولایت کے طریقوں کا انکشاف ہوا۔ اگرچہ سلطان المشائخ کے سب خلفاء اعلیٰ مقامات کے حامل تھے، لیکن شیخ نصیر الدین محمودؒ جن کو چراغ دہلی کہا جاتا ہے اور شیخ سراج الدین جو آئینہ ہند ہیں، کچھ اور ہی چاشنی رکھتے تھے۔ ان دونوں بزرگو ں سے بہت سے صاحب ارشاد پیدا ہوئے۔

شیخ سراج الدین المعروف بہ اخی سراج، اپنے شیخ کے وصال کے بعد کچھ عرصہ تک دہلی ہی میں مقیم رہے۔ جب محمد بن تغلق نے مشائخ کو جبراً دیوگیر بھیجنا شروع کیا، تو وہ اپنے وطن لکھنوتی کو چلے گئے اور کچھ کتابیں محبوب الٰہیؒ کے کتب خانے سے "بجہت مطالعہ و بحث"[۵۲] ساتھ لے گئے ـــــــ شیخ اخی سراجؒ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے سرزمین بنگال پر چشتیہ سلسلہ کی تنظیم کی اور یہ چھوٹا سا

---

۵۱ روضتہ الاقطاب ص ۷۹ - ۸۰ (مطبع محب ہند، دہلی)

۵۲ سیر الاولیار ص ۲۸۹

کتب خانہ بنگال میں چشتیہ سلسلہ کا پہلا کتب خانہ تھا۔

بنگال میں چشتیہ سلسلہ کی نشر و اشاعت اور اسلامی تہذیب و تمدن کی ترویج و تبلیغ حضرت اخی سراج رح اور اُن کے مریدین کے ذریعے سے ہوئی۔ امیر خورد رح کا بیان ہے :-

"و آں دیار را بجمالِ ولایت خود بیاراست و خلقِ خدائے را دست بیعت دادن گرفت، چنانکہ بادشاہاں آں ملک داخل مریدان او آمدند .... روضۂ او قبلۂ ہندوستان است، و خلفائے او تا ایں غایت در آں دیار خلق خدا را دست می دہند"[۵۱]	اور اس مقام کو اپنے جمالِ ولایت سے سجادیا۔ اور خلقِ خدا اُن سے بیعت ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس ملک کے فرماں روا بھی اُن کے حلقۂ مریدین میں شامل ہوگئے .... اُن کا روضہ قبلۂ ہندوستان ہے۔ اور ان کے خلفاء اب تک اس علاقہ میں خلقِ خدا کی رہنمائی کرتے ہیں

حضرت اخی سراج رح کے سب سے زیادہ مشہور خلیفہ شیخ علاء الحق والدین بن اسعد بنگالی رح[۵۲] تھے وہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت اخی سراج کی صحبت سے ایسے متاثر ہوئے کہ فقر کی زندگی اختیار کرلی اور پنڈوہ میں ایسی

---

[۵۱] سیر الاولیاء۔ ص ۲۸۹ - ۲۹۰

[۵۲] اُن کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔

اخبار الاخیار ص ۱۴۰ - ۱۴۱   گلزار ابرار ۔ ص ۱۰۴

معارج الولایت (قلمی نسخہ)   مراۃ الاسرار (قلمی)

روضۃ الاقطاب ۔ ص ۸۴

عظیم الشان خانقاہ قائم کی کہ دور دور سے لوگ کھنچ کر وہاں جمع ہونے لگے۔ شیخ علاء الحق رح کے بعد ان کے خلفاء حضرت نور قطب عالم رح[51] اور میر سید اشرف جہانگیر سمنانی رح[52] نے سلسلہ کو مقبول عام بنانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ حضرت نور قطب عالم رح شیخ علاء الحق رح کے فرزند رشید تھے۔ جس زمانے میں وہ مسند ارشاد پر جلوہ افروز تھے، بنگال کی سیاست بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی۔ راجہ کنس (جو بٹھوریہ، ضلع راج شاہی، کا جاگیردار تھا) بنگال کے تخت پر قابض ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی قوت کا خاتمہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ حضرت نور قطب عالم رح نے براہ راست اور سید اشرف جہانگیر سمنانی رح کی وساطت سے سلطان ابراہیم شرقی کو بنگال پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ سید اشرف جہانگیر رح کے مجموعہ مکتوبات[53] میں وہ دلچسپ خطوط خاص طور سے مطالعہ

---

۵۱ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو:

اخبار الاخیار۔ ص ۱۵۱-۱۴۹ گلزار ابرار ص ۱۰۵-۱۰۴

مراۃ الاسرار (قلمی) روضۃ الاقطاب۔ ص ۸۴

۵۲ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو:۔

اخبار الاخیار۔ ص ۱۶۳-۱۶۱ گلزار ابرار۔ص ۱۴۶-۱۴۵

مراۃ الاسرار (قلمی)

نیز لطائف اشرفی مرتبہ مولانا نظام الدین یمنی المعروف بہ نظام حاجی غریب الیمنی۔

(نصرت المطابع دہلی ۱۲۹۵ھ)

۵۳ مکتوبات سید اشرف جہانگیر رح کا ایک مکمل اور صاف نسخہ، سبحان اللہ اور فیضل لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔ (فہرست صفحہ ۱۹ ۲۹۷/۱۴) اس کا سن کتابت ۱۲۳۲ھ

قابل ہیں جن میں اس سیاسی کش مکش کی تفصیل درج ہے[۵۱] سید اشرف جہانگیرؒ نے جو خط حضرت نور قطب عالمؒ کے مکتوب کے جواب میں لکھا تھا۔ وہ بنگال میں صوفیۂ کرام کے کارناموں پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ یہاں ان مباحث کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ انشاء اللہ مشائخ چشت کی جلد دوم میں پیش کئے جائیں گے۔

ان سیاسی کارناموں سے قطع نظر حضرت نور قطب عالمؒ نے بعض اہم علمی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ اُن کے مکتوبات کا مجموعہ بڑا اہم ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ان مکتوبات کے متعلق فرماتے ہیں" بغایت شیریں و لطیف بزبان اہل درد و محبت" اگر ان مکتوبات میں سے شیخ نور قطب عالمؒ کے مذہبی فکر کے بنیادی اصول نکال کر اُن کا چیتنیا[۵۲]، روپا، سناتن، جیوا گو سوامی کی تعلیمات سے مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مشائخ چشت نے بھگتی کی تحریک کو کس درجہ متاثر کیا تھا اور وہ کس حد تک بنگال کی ان اصلاحی تحریکوں کے ذمہ دار تھے۔

۵۱۔ مکتوب ۴۰ (ص ۹۸ - ۹۷) سلطان ابراہیم شرقی کے نام ہے۔ نیز ملاحظہ ہو مکتوب ۴۵ (ص ۹۷، ۹۸) (قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری)

۵۲ چیتنیا (پیدائش ۱۴۸۵ء) نے ذات پات کی مخالفت کی اور اخوتِ انسانی کا درس دیا۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔

CHAITANYA'S LIFE AND TEACHINGS: J.N. SARKAR (CALCUTTA 1912)

CHAITANYA'S PILGRIM AGES AND TEACHINGS. J.N. SARKAR (CALCUTTA)

حضرت نور قطب عالمؒ کے ایک مشہور مرید اور خلیفہ مولانا حسام الدین مانک پوریؒ تھے[51] شیخ محدثؒ اُن کے متعلق فرماتے ہیں :-

از اعیانِ مشایخ وقت خود بود ، عالم بود بعلم شریعت و طریقت"[52]

ان کے ملفوظات رفیق العارفین کے نام سے جمع کئے گئے ہیں - کہا جاتا ہے کہ کہ اُن کے ایک سو بیس خلفاء تھے[53] جن میں (۱) سید حامد شاہ ابن سید راجہ شاہ مانک پوری (۲) سید مسعود ابن سید ظہیر الدین فتح پوری (۳) سید محمد امیر بدہا (۴) مولانا کمال الدین عز اللہ (۵) مولانا شہر اللہ ابو القاسم ملتانی (۶) شیخ نصیر الدین ملتانی ابن شہر اللہ (۷) مولانا فرید الدین سالار عراقی ، (۸) شیخ احمد قنوجی (۹) معین الاسلام اودھی (۱۰) مولانا منہاج الدین بہاری (۱۱) مولانا جمال الدین حسن (۱۲) شیخ ضیاء الدین یوسف داؤد کردی (۱۳) مولانا سوندھو کردی (۱۴) مولانا محمد علاء الدین کردی (۱۵) شیخ شہاب مانک پوری المعروف بہ ارزانی شاہ ، خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔

(بہ سلسلہ صفحہ ۲۰۲) ؎۵۰ روپا ، سناتن اور جیوا گو سوامی ، چیتنیا سے متاثر تھے - اور اُنھوں نے اس تحریک کو جاری رکھا ۔ اور بنگال میں اپنے خیالات کی ترویج کی -

---

۵۱ ان کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو

اخبار الاخیار ص ۱۷۳ - ۱۷۱ گلزار ابرار - ص - ۱۰۷ - ۱۰۶

مراۃ الاسرار (قلمی) روضۃ الاقطاب - ص ۴۸ - ۴۷

۵۲ اخبار الاخیار ص ۱۷۱

۵۳ گلزار ابرار - ص ۱۰۶

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت نور قطب عالمؒ کی کوششوں سے چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں بنگال، بہار، جونپور وغیرہ میں قائم ہوگئیں۔

۲۔ دکن: بہمنی سلطنت جس نے دکن کو سیاسی، تمدنی اور سماجی ترقی کی راہیں دکھائی تھیں ۱۳۴۷ء میں علاء الدین بہمن شاہ کی کوششوں سے وجود میں آئی تھی۔ اس کی بنیاد پڑنے سے تقریباً بیس سال قبل، سلطان محمد بن تغلق نے دہلی کے علماء و مشائخ کو جبراً ان علاقوں میں تبلیغ و اشاعت کے لئے بھیج دیا تھا۔ اِن مشائخ میں کثیر تعداد چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کی تھی۔ ان بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علاقہ جہاں کبھی سلطنت دہلی کا کامیاب تسلّط نہ ہو سکا تھا، ایک ایسی سلطنت کا گہوارہ بن گیا، جس نے جنوبی ہندوستان میں عرصہ تک اسلامی علوم و فنون کی شمع روشن رکھی۔

کہا جاتا ہے کہ علاء الدین حسن بہمنی، صاحبِ اقتدار ہونے سے قبل ایک دن حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا اس سے پہلے محمد بن تغلق جو ان دنوں شہزادہ تھا۔ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوکر واپس ہوا تھا علاء الدین حسن ابھی دروازے ہی پر تھا کہ شیخ نے ایک ملازم کو اُسے اندر لانے کے لئے بھیجا اور فرمایا :-

"سلطانے رفت و سلطانے آمد"

پھر علاء الدین پر خاص التفات و کرم فرمایا اور ایک روٹی جو اپنے افطار کے لئے رکھی تھی، اُنگلی پر رکھ کر اس کو اس بشارت کے ساتھ دی

"ایں چتر شاہی ست کہ پس از مدّتے دراز و محنت در دکن روزے نصیب تو خواہد شد" [1]

[1] تاریخ فرشتہ - جلد دوم - ص ۲۷۴ (نول کشور)

بقیہ ص ۲۰۵ پر)

مورخوں کا بیان ہے کہ جب علاء الدین حسن بہمنی تخت پر بیٹھا تو سب سے پہلا حکم اس نے یہ دیا کہ پانچ من سونا اور دس من چاندی، شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کے طور پر، شیخ برہان الدین غریبؒ کے ذریعے فقراء و مساکین میں تقسیم کرا دیا جائے۔[۵۱] اس طرح گویا بہمنی سلطنت خود مشائخ چشت کی دعاؤں کا نتیجہ تھی۔

پہلے چشتی بزرگ جنھوں نے سرزمین دکن پر قدم رکھا۔ شیخ برہان الدین غریبؒ[۵۲] تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے وصال کے بعد وہ دیوگیر چلے گئے اور وہاں ارشاد و تلقین کا کام شروع کر دیا۔ دکن میں آپ کی خانقاہ مرجع خاص و عام بن گئی اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔ اُن کی صحبت میں بڑی کشش اور الفاظ میں بڑی تاثیر تھی۔ سیر الاولیاء میں لکھا ہے۔

(بہ سلسلہ ص ۲۰۴) دکن کی تاریخ کے لئے فرشتہ سے زیادہ مستند کوئی مورخ نہیں ہے خافی خاں نے لکھا ہے:۔

"اکثر در ذکر سلاطین دکن کلام او (نظام الدین صاحب طبقات اکبری) محل اعتماد و انشاید۔ سوائے قول محمد قاسم فرشتہ ہیچ مورخے بذکر سلاطین دکن نپرداختہ کہ در صحت کلام اعتبار داشتہ باشد۔"

منتخب اللباب۔ ج ۱ ص ۲۳۷

۵۱ فرشتہ۔ ج ۲۔ ص ۲۷۷

۵۲ تفصیلی حالات کے لئے، ملاحظہ ہو

سیر الاولیاء۔ ص — مراۃ الاسرار (قلمی نسخہ)

معارج الولایت (قلمی) — اخبار الاخیار۔ ص

"ہرکہ یک ساعت بخدمت ایں بزرگ بودے از ذوقِ کلام عشق آمیز او وصفائی محاورہ دلفریب او عاشقِ جمال او گشتے، و بندگان خدائے را در اعتقاد و محبت پیر راہ نمونے بہتر از و کسے بنود"[۵۱]

شیخ برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات حماد بن عماد کاشانی نے احسن الاقوال[۵۲] کے نام سے جمع کئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف خاص توجہ فرمایا کرتے تھے۔

شیخ برہان الدین غریبؒ کے ایک مشہور خلیفہ شیخ زین الدینؒ تھے۔ علاء الدین حسین شاہ نے اُن کے دستِ حق پرست پر بیعت کرلی تھی۔ عصامی نے لکھا ہے کہ

ازاں خرقہ دارد نصیبے تمام
شہ شیر دل خسروِ نیک نام

شیخ زین الدینؒ کے ذریعے چشتیہ سلسلہ کی کافی اشاعت ہوئی۔ اسی زمانے میں چشتیہ سلسلہ کے ایک اور بزرگ حضرت سید محمد گیسو دراز[۵۳] دکن پہنچے۔

---

[۵۱] سیر الاولیاء ص ۲۷۵

[۵۲] احسن الاقوال، ۲۹ اقوال پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف عنوانات کے ماتحت شیخ کے ملفوظات کو جمع کیا گیا ہے۔ مثلاً آداب مجلس، آداب مرید بخدمت پیر، حسن معاملہ، مذمت طمع وغیرہ، راقم السطور کے پیش نظر پروفیسر محمد حبیب کا نسخہ ہے جو کافی قدیم ہے۔

[۵۳] سید محمد گیسو درازؒ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو:

اخبار الاخیار ص ۱۲۹ - ۱۳۲ - گلزار ابرار - ص ۱۳۹

سیر محمدی - مصنفہ مولانا شاہ محمد علی مرید حضرت سید محمد گیسو دراز (مطبوعہ لونانی دواخانہ پریس الٰہ آباد)

نیز جوامع الکلم - ملفوظات حضرت گیسو دراز، مرتبہ سید محمد اکبر حسینی (مطبوعہ انتظامی پریس عثمان گنج)

سلطان فیروز شاہ بہمنی نے علماء و مشائخ اور لشکرِ شاہی کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کیا[1] حضرت گیسو دراز رحؒ نے گلبرگہ میں چشتیہ سلسلہ کی ایک عظیم الشان خانقاہ قائم کی۔ شیخ محدّث لکھتے ہیں :-

"بعد از رحلتِ شیخ بدیار دکن رفت و قبولی عظیم یافت ، اہل ایں دیار ہمہ منقاد و مطیع او گشتند۔"[2]

اُن کے خلفاء کی تعداد بہت کثیر تھی جن میں شاہ یداللہ رحؒ ، شیخ علاء الدین گوالیاریؒ شیخ ابوالفتح قریشی رحؒ ۔ سید صدر الدین اودہی رحؒ ، شیخ فخر الدین بغدادی رحؒ ، شیخ محمد اکبر حسینی رحؒ ، سید یوسف حسینی رحؒ ، شیخ زادہ شہاب الدینؒ ، قاضی محمد سلیمان رحؒ وغیرہ خاص طور سے مشہور ہیں ۔ ان خلفاء نے سلسلہ کی اشاعت میں بڑی سرگرمی سے کام کیا ۔ خود حضرت گیسو دراز رحؒ نے اپنی تصانیف[3] کے ذریعے تصوف کے خیالات کو عوام و خواص تک پہنچا دیا۔

---

[1] برہان المآثر، مولفہ سید علی طباطبا (مطبوعہ حیدر آباد) ص ۴۴ - ۴۳ نیز ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ (جلد دوم)

[2] اخبار الاخیار ص ۱۳۰۔

[3] سید محمد گیسو دراز رحؒ کثیر التصانیف بزرگ تھے ۔ تصوف کی اعلیٰ کتابوں مثلاً عوارف المعارف فصوص الحکم ، رسالہ قشیریہ ، تمہیدات عین القضاۃ ، قوت القلوب پر حاشیہ لکھے تھے اور بعض کو فارسی زبان میں منتقل کیا تھا ۔ قرآن پاک کی تفسیر صوفیانہ رنگ میں لکھی تھی مشارق الانوار کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا ، اور اس کی شرح لکھی تھی کچھ کتابیں (شرح آداب المریدین ، اسماء الاسرار وغیرہ) حیدر آباد سے شائع بھی ہوگئی ہیں ۔ بعض کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اُن ہی کی تصنیف ہیں یا غلط طور پر منسوب کردی گئی ہیں۔

دکن میں چشتیہ سلسلہ کی نشر و اشاعت کا کام شیخ برہان الدین غریبؒ اور حضرت سید محمد گیسو درازؒ اور اُن کے خلفا نے انجام دیا۔ ان کی خانقاہیں جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت کا مرکز تھیں۔ اور شاہ و گدا سب وہاں جمع ہوتے تھے۔

۴۔ **گجرات** سرزمین گجرات سے چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام کا تعلق حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے زمانے میں قائم ہوا۔ قطب صاحبؒ کے دو مرید شیخ محمود اور شیخ حامد الدین احمدؒ، نہروالہ کے باشندے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے تفصیلی حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔ گلزار ابرار میں صرف چند سطریں ان کے متعلق لکھی گئی ہیں[۵۱]

گجرات میں چشتیہ سلسلہ کو پوری طرح روشناس کرنے کا کام حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مندرجہ ذیل خلفاء نے انجام دیا۔

(۱) شیخ سید حسینؒ
(۲) شیخ حسام الدین ملتانیؒ
(۳) شاہ بارک اللہ

شیخ سید حسینؒ صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے۔ ہدایہ پر حاشیہ لکھا تھا[۵۲]۔ ایک روحانی اشارہ پر حضرت محبوب الٰہیؒ سے بیعت ہو گئے۔ شیخ نے خرقۂ خلافت عطا فرما کر گجراتیوں کی ہدایت کے لئے روانہ فرما دیا۔ نہروالہ میں ایک تالاب کے کنارے آپ کا مزار ہے[۵۳] شیخ حسام الدین ملتانیؒ کو پیر نے دہلی سپرد کیا تھا۔

---

۵۱ گلزار ابرار۔ (اردو ترجمہ) ص ۴۴ - ۴۳

۵۲ گلزار ابرار۔ ص ۱۱۷

۵۳ گلزار ابرار ص ۱۱۶

محمد بن تغلق کے عہد میں وہ مجبوراً نہروالہ چلے گئے۔ وہیں ان کا مزار ہے[۵۱] شاہ یارک اللہؒ کے متعلق مراۃ احمدی میں لکھا ہے:-

مرید و خلیفہ حضرت سلطان المشائخ سلطان الاولیاء اند، مقبرہ ایشاں بیرون دروازہ ابدر نزدیک پارہ حاجی پور واقعست[۵۲]

گجرات میں چشتیہ سلسلہ کی باقاعدہ تنظیم اور نشر و اشاعت کا کام علامہ کمال الدین شیخ یعقوبؒ، شیخ کبیر الدین ناگوریؒ اور سید کمال الدین قزوینیؒ نے انجام دیا۔

علامہ کمال الدینؒ (المتوفی ۷۵۶ھ)، حضرت چراغ دہلویؒ کے خلیفہ اور بھانجے تھے۔ علم و فضل میں ممتاز تھے۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے:-

"تا ابتدائے جوانی از فنونِ علمی بہرہ یاب گشتہ و علم را مرور ایام تمام و کمال ساختہ، ہیچ علمے از وباقی نماندہ بود کہ درو کمالے بہم نرسانیدہ، و در علم تفسیر و فقہ و حدیث حظے وافر داشت۔ درمیان علماء مفسران و فقہاء و محدثان وغیرہ کہ دراں زماں علم علمی افراشتہ بودند بعلامہ شہرت یافتہ[۵۳]

اُن کی اولاد میں برابر ایسے بزرگ پیدا ہوتے رہے جنھوں نے چشتیہ سلسلہ کو گجرات میں قایم رکھا۔ علامہ کمال الدینؒ کے بعد اُن کے فرزند ارجمند شیخ سراج الدینؒ سجادہ مشیخت پر بیٹھے۔ اُنھوں نے مولانا احمد تھانیسریؒ۔ مولانا عالم پانی پتیؒ اور مولانا عالم سنگریزہؒ سے علومِ ظاہری حاصل کئے تھے[۵۴] فیروز شاہ بہمنیؒ نے انھیں

---

۵۱ سیر الاولیاء،

۵۲ خاتمہ مراۃ احمدی مصنفہ مرزا محمد حسن (کلکتہ ۱۹۳۰ء) ص ۷۳

۵۳ شجرۃ الانوار (قلمی) حالات کے لئے ملاحظہ ہو، حدائق الحنفیہ۔ ص ۲۸۸

۵۴ تکملہ سیر الاولیاء ص ۲۶

دکن بلایا تو انکار کر دیا اور فرمایا "حق تعالیٰ مرا در گجرات ہر چہ ضرورت است عطا می فرماید[۵۱]"

۸۱۷ھ میں وصال ہوا۔ ایک شاگرد، مولانا ہمزہ ناگوریؒ نے مرثیہ لکھا:

امروز رفت علم ازیں شہر چوں عیاں
امروز نیست آنکہ کند بزودی بیاں
مفتاح وہم مطالع وتوضیح وہم بدیع
آں کیست کو بگوید در درس می تواں

شیخ سراج الدینؒ کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ علم الحق سجادہ نشین ہوئے
شجرۃ الانوار کے مصنف نے ان کی ایک کرامت کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

"حضرت شیخ را کرامتے بود ہر کہ از کافراں وفاسقاں ومنکراں یک بار در صحبت او .... نشستے وازو کلام شنیدے وبا ہم کلام گشتے از افعال مذموم خود متنبہ گشتہ وتوبہ نمودہ مرید او شدے[۵۲]"

حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑی کوئی کرامت ہی نہیں کہ ایک مرتبہ جو ہم کلام ہو جائے وہ اتنا بدل جائے کہ اس میں طاقتِ گناہ ہی نہ رہے!

شیخ علم الحق کے بعد اُن کے صاحبزادے شیخ محمود المعروف بہ شیخ راجن سجادہ پر بیٹھے۔ پھر علی الترتیب شیخ جمال الدین جمنؒ، شیخ حسن محمدؒ اور حضرت یحییٰ مدنی سجادہ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی سب سے زیادہ اہم اور مرکزی کڑی وہی ہے جو حضرت کمال الدین علامہؒ کے ذریعے شیخ یحییٰ مدنیؒ تک

---

۵۱ تکملۂ سیر الاولیاء ص ۲۶
۵۲ شجرۃ الانوار (قلمی)

پہنچتی ہے۔ حضرت یحییٰ مدنیؒ کے خلیفہ شاہ کلیم اللہؒ نے گجرات سے سلسلہ کا پودا لے جاکر دہلی میں نصب کیا اور اپنی مسلسل جدوجہد سے اُسے ایسا پروان چڑھایا کہ پھر ایک بار دورِ اوّل کی رونق آنکھوں کے سامنے آگئی۔

شیخ یعقوبؒ[۵۱] (المتوفی ۸۹۰ھ) مولانا خواجگیؒ[۵۲] کے فرزند رشید اور شیخ زین الدین دولت آبادیؒ کے خلیفہ تھے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف پر بڑا عبور تھا۔ فصوص الحکم کا درس بڑی کیفیت کے ساتھ دیتے تھے۔ انتقال بھی درس ہی کی حالت میں ہوا۔ آپ کی خانقاہ نہروالہ میں رشد و ہدایت کا سرچشمہ تھی۔

شیخ کبیر الدین ناگوریؒ[۵۳] (المتوفی ۸۵۵ھ)، شیخ حمید الدین صوفی سوالیؒ کے پوتے تھے۔ ناگور کے حالات ناساعد پائے تو احمد آباد آکر اقامت گزین ہوگئے[۵۴] ان کے ذریعے سلسلہ کی تعلیم عوام و خواص تک پہنچی۔ علم و فضل کی وجہ سے بھی مشہور تھے۔ مصباح النحو کی شرح لکھی تھی۔

سید کمال الدین قزوینیؒ (المتوفی ۸۸۰ھ)، حضرت گیسو درازؒ کے سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بھروچ میں خانقاہ تھی، جہاں ہزاروں گمراہانِ بادیۂ ضلالت روشنی حاصل کرتے تھے۔

---

۵۱ گلزار ابرار ص ۱۲۲ - ۱۲۱

۵۲ مولانا خواجگیؒ، چراغ دہلویؒ کے خلیفہ اور اپنے عہد کے مشہور فاضل تھے۔ حالات کے لئے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۱۴۲-۱۴۱۔ گلزار ابرار ص ۲۶۰-۲۵۹، ماثر الکرام ص ۱۸۶-۱۸۵

۵۳ اخبار الاخیار ص ۱۷۷

۵۴ "بجہت تفرقہ کہ در ناگور از دست کفاراں دیار واقع شدہ بود بجانب گجرات رفتہ" اخبار الاخیار ص ۱۷۷

ان بزرگوں کے علاوہ جو چشتیہ سلسلہ کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ذریعے ہندوستان پہنچی تھی، گجرات میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جنھوں نے براہِ راست مشائخ چشت سے خلافت حاصل کی تھی۔ شیخ رکن الدین مودود بابا فریدؒ کی اولاد میں تھے[1] چشتیہ سلسلہ میں شیخ محمد زاہدؒ[2] سے بیعت تھے۔ تجرید و تفرید میں لاثانی تھے۔ ان کے ایک عزیز مرید اور خلیفہ شیخ عزیز اللہ المتوکل علی اللہؒ تھے۔ جن کا حال شیخ محدثؒ نے اخبار الاخیار، محمد غوثی نے گلزار ابرار اور مرزا محمد حسن نے خاتمہ مرآۃ احمدی میں لکھا ہے۔ اُن کے فرزند شیخ رحمت اللہ سے سلطان محمود بیگڑہ بیعت تھا۔

ان بزرگوں نے گجرات میں چشتیہ سلسلے کو اس قدر مقبول بنا دیا کہ عارف و عامی سب ہی اس سے وابستہ ہو گئے۔ شیخ علی متقیؒ[3] جن کے علم و فضل کا سکہ عرب و عجم میں ہر جگہ تسلیم کیا گیا تھا، چشتیہ سلسلہ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ چشتیہ سلسلے کا مرکزی نظام تباہ ہو جانے کے بعد صوبوں میں جو خانقاہیں قائم ہوئیں اُن میں گجرات کی خانقاہ

ص ۱۳۸

[1] رکن الدین بن علم الدین بن علاء الدین بن بدر الدین سلیمان بن فرید الدین مسعود گنج شکر گلزار ابرار

[2] شیخ محمد زاہد بن شیخ یوسف بن شیخ احمد بن شیخ محمد بن خواجہ علی بن خواجہ احمد بن خواجہ مودود چشتی۔ گلزار ابرار ص ۱۳۸

[3] حالات کے لئے، اخبار الاخیار۔ ص ۲۴۱ - ۲۴۹
تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۴۷ - ۱۴۶
گلزار ابرار۔ ص ۴۰۳ - ۴۰۴
مآثر کرام۔ ص ۱۹۴ - ۱۹۲

کو ایک امتیازی شان حاصل ہے۔ وہاں کے خانقہی نظام میں مرکز کی کچھ خوبیاں باقی رہیں اور غالباً یہ ہی وجہ تھی کہ شاہانِ مغلیہ کے آخری دور میں دہلی کے ایک نوعمر عالم اور درویش نے وہاں جاکر سلسلہ کی روایات کو اخذ کیا اور پھر دہلی میں آکر رواج دیا۔

۴۔ مالوہ مالوہ اور اس کے نواح میں چشتیہ سلسلہ کی اشاعت شیخ نظام الدین اولیاء کے مندرجہ ذیل خلفاء کے ذریعے ہوئی۔

(۱) شیخ وجیہہ الدین یوسف رح

(۲) شیخ کمال الدین رح

(۳) مولانا مغیث الدین رح

شیخ وجیہہ الدین یوسف رح حضرت محبوب الٰہی رح کے نہایت ہی مقرب اور مقبول خلفاء میں تھے۔ شیخ نے ایک بار اُن کے متعلق فرمایا تھا۔

"در روش درویشی کسے ہمتائے مولانا یوسف نباشد، دریں راہ چوں سالکان ثابت قدم می رود" [۱]	درویشی کی روش میں کوئی شخص مولانا یوسف کی نظیر نہیں ہے۔ وہ اس راہ میں سالکان ثابت قدم کی طرح چلتے ہیں۔

سیر الاولیاء میں لکھا ہے کہ عہد علائی میں ایک شخص چندیری کی فتح کے لئے سلطان کی طرف سے متعین کیا گیا۔ وہ حضرت محبوب الٰہی رح کا معتقد تھا۔ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"مرا بادشاہ برائے مقامے قلب نامزد کردہ است اگر یارے از حضرت سلطان المشائخ نیز برما نامزد شود ما در پناہ او برویم و اُمید فتح آں مقام واثق باشد" [۲]

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۲۸۶ [۲] سیر الاولیاء ص ۲۸۷

حضرت محبوب الٰہیؒ نے شیخ وجیہہ الدین کو چندیری روانہ کر دیا۔ اُنھوں نے وہاں سلسلہ کی ایک بڑی خانقاہ قائم کی، حضرت محبوب الٰہی کا یہ قاعدہ تھا کہ چندیری کا کوئی شخص بیعت کے لئے آتا تو شیخ وجیہہ الدین کے پاس بھیج دیتے اور فرماتے "ہم چنیں تصور کنید گوئے بریں فقیر پیوستید"۔ [۵۱]

شیخ کمال الدینؒ [۵۲]، شیخ نصر اللہ بن بابا فریدؒ کے پوتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوگئے تھے۔ شیخ نے انھیں ایک چنبیلی کا پھول دیا اور کہا تم مالوہ میں جاکر رہو، پیر کے فرمان کے بموجب اُنھوں نے مالوہ کا رُخ کیا اور وہاں ارشاد و تلقین میں مصروف ہوگئے۔ سلاطین مالوہ کو اُن کے سلسلہ کے لوگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ سلطان محمود خلجی (م ۱۴۶۹ء) نے شیخ کی قبر پر گنبد اور متعلقین سلسلہ کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی۔

مولانا مغیث الدینؒ [۵۳] ۷۲۰ھ میں پیر و مرشد کی اجازت سے مالوہ گئے اور اُجین میں دریا کے کنارے اقامت اختیار کرلی۔ وصال کے بعد وہیں مزار بنا دیا گیا۔

ان تین بزرگوں نے چودھویں صدی عیسوی میں چشتیہ سلسلہ کو مالوہ میں روشناس کرایا۔ بعد کو چشتیہ سلسلہ کے کچھ اور بزرگ مثلاً قاضی اسحٰقؒ [۵۴] جو جید عالم تھے اور سلطان علاء الدین محمود (م ۱۴۶۹ء) کے پیر تھے وہاں جاکر تبلیغ و اشاعت کے کام میں مصروف ہوگئے۔

---

۵۱ سیر الاولیاء ص ۲۸۷

۵۲ حالات کے لئے ملاحظہ ہو سیر الاولیاء ص ۱۹۸-۱۹۷۔ گلزار ابرار ص ۵۸۲-۵۸۱

۵۳ گلزار ابرار ص ۱۱۱

۵۴ گلزار ابرار ص ۱۲۷

صابریہ سلسلہ صابریہ سلسلہ کے ابتدائی حالات لکھتے وقت تاریخ کے ایک طالب علم کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اول تو بانیِ سلسلہ کے حالات کسی مرید یا عقیدت مند کے لکھے ہوئے نہیں ملتے، دوسرے تمام معاصر تذکرے اور تاریخیں اُن کے معاملہ میں بالکل خاموش ہیں۔ سیر الاولیاء میں[۵۱] جو چند سطریں ایک بزرگ علی صابرؒ کے حال میں درج ہیں۔ ان کے متعلق بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان ہی کے متعلق ہیں یا کسی اور کے[۵۲] سترویں اور اٹھارویں صدی کے مذہبی تذکروں میں ان کے حالات بڑی تفصیل سے درج ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تذکروں[۵۳] نے کہاں سے یہ حالات فراہم کئے ہیں ان کے ماخذ کیا ہیں اور ان کی تاریخی افادیت کس حد تک ہے؟ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے تذکروں کی بنیاد یا تو کشف پر ہے یا محض سُنی سنائی روایات پر۔ دونوں صورتوں میں ان پر اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ ہم نے ان تذکروں کے استعمال میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

شیخ علاء الدین احمد صابرؒ کے خلیفہ اور سجادہ نشین، شیخ شمس الدین ترکؒ

---

۵۱ سیر الاولیاء ۔ ص ۱۸۵

۵۲ اخبار الاخیار ص ۶۹

۵۳ مثلاً سیر الاقطاب ۔ شیخ اللہ دیا چشتی، تالیف ۱۰۳۶ھ

مرآۃ الاسرار ۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتی تالیف ۱۰۶۵ھ

معارج الولایت ۔ مؤلفہ غلام معین الدین عبداللہ ملقب بالخلیفہ خویشگی چشتی تالیف ۱۰۹۴ھ ۔ زمانہ حال کی کتابوں میں زمزمۂ صابری (مؤلفہ تسلیم احمد امروہی، مطبوعہ مطبع حقانی، امروہہ ۱۹۰۶ء) خاص طور سے توجہ کی مستحق ہے۔ اس میں اصل ماخذ کی بنا پر حالات ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

خواجہ احمد یسوی رحؒ[۵۱] کی اولاد میں تھے مرشد کامل کی تلاش میں ترکستان کو چھوڑ کر ہندوستان آئے اور یہاں صابر صاحبؒ کے دامن سے وابستہ ہو گئے[۵۲] بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ کچھ عرصے تک سلطان غیاث الدین بلبن کی فوج میں بھی رہے تھے۔ مرشد نے پانی پت میں قیام کی ہدایت فرمائی۔ مدت العمر وہاں تلقین و ارشاد میں مصروف رہے ۷۱۸ھ میں وصال فرمایا[۵۳]

شیخ شمس الدین ترکؒ کے بعد جمال الدین پانی پتی[۵۴] مسند ارشاد پر بیٹھے ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ معارج الولایت میں لکھا ہے۔

"مردماں از ہر جانب روئے بادی آوردند و نذر و فتوح بے شمار آوردند"[۵۴]

اُن کے چالیس[۴۰] خلفاء تھے، جن میں شیخ احمد عبدالحقؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اُن کے زمانے میں صابریہ سلسلے کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ شیخ محدثؒ نے اُن کے متعلق لکھا ہے:۔

"جذبے قوی داشت و نظرے موثر و تصرفے غالب"[۵۵]

---

۵۱ خواجہ احمد یسویؒ (المتوفی ۵۶۲ھ) سلسلہ خواجگاں کے مشہور بزرگ تھے۔ آتا یسوی کے نام سے مشہور تھے آتا ترکی زبان میں باپ کو کہتے ہیں۔ رشحات میں لکھا ہے:۔ "آتارا کہ بہ ترکی پدر است بمشایخ بزرگ اطلاق کنند" اُن کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ رشحات نیز نفحات الانس

۵۲ گلزار ابرار (ص ۵۸۶) میں لکھا ہے کہ اُن کے حالات تذکرہ مولانا علی کابلی گل بہاری میں مطالعہ کرنے چاہئیں۔ یہ تذکرہ راقم السطور کی نظر سے نہیں گذرا۔

۵۳ حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ مراۃ الاسرار (قلمی) سیر الاقطاب (قلمی) نیز مطبوعہ نولکشور لکھنؤ گلزار ابرار ص ۵۳۸

۵۴ معارج الولایت (قلمی)　　۵۵ اخبار الاخیار ص ۱۸۲

چشتیہ صابریہ سلسلہ کا سب سے پہلا مرکز جس کو ہم تاریخ کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں ردولی (ضلع بارہ بنکی) ہے۔ شیخ احمد عبدالحق رح نے ایسے زمانے میں وہاں اپنی خانقاہ قایم کی تھی جب چشتیہ سلسلہ کا مرکزی نظام ختم ہو چکا تھا۔ نظامیہ سلسلہ کے بزرگ گجرات، دکن، مالوہ، بنگال وغیرہ میں اپنی خانقاہیں قائم کر رہے تھے۔ دہلی اور اس کے اردگرد کا تمام علاقہ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں سے تقریباً خالی تھا۔ شیخ احمد عبدالحق نے سیاحت کے دوران میں نظامیہ سلسلہ کی بعض خانقاہوں کو دیکھا تھا[۵۱] اور حالات کا جائزہ لیا تھا۔ ردولی میں اُن کی خانقاہ رشد و ہدایت کا بڑا اہم مرکز بن گئی اور شمالی ہندوستان کے لوگ کثرت سے حاضر ہونے لگے۔ شیخ کے ملفوظات و حالات انوارالعیون[۵۲] کے نام سے شیخ عبدالقدوس گنگوہی رح نے مرتب کئے تھے۔

شیخ احمد عبدالحق رح نے ۸۳۷ھ میں وصال فرمایا۔ اُن کے بعد اُن کے بیٹے شیخ عارف رح سجادہ نشین ہوئے۔ اُن کے اخلاق سے ہر ملنے والا متاثر ہوتا تھا[۵۳] شیخ عبدالقدوس گنگوہی رح، انوارالعیون میں فرماتے ہیں کہ اس فقیر نے مدت العمر کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سُنا کہ شیخ عارف رح سے مجھے محبت نہیں یا میرے اوپر

---

۵۱ مثلاً پنڈوہ میں اُن کی ملاقات حضرت نور قطب عالم رح سے ہوئی تھی۔
ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۱۸۳

۵۲ انوارالعیون کا ایک اچھا قلمی نسخہ ذخیرہ عبدالسلام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔ انوارالعیون کا اُردو ترجمہ درمکنون کے نام سے دہلی سے شایع ہوا تھا۔

۵۳ شیخ محدث رح اُن کے متعلق لکھتے ہیں "باہر طائفہ سرے داشت وہمہ کس ازو راضی بودند" اخبار الاخیار ص ۱۸۶

وہ شفقت نہیں فرماتے[۵۱]۔ شیخ عارف کے بعد اُن کے صاحبزادے شیخ محمد سجّادۂ مشیخت پر بیٹھے ان کو اللہ تعالےٰ نے ایک ایسا مرید اور خلیفہ عطا فرمایا جس نے صابریہ سلسلے کو شمالی ہندوستان میں بڑی ترقی دی اور اس کے اثرات دور دور تک پہنچائے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، شیخ محمد ردولویؒ کے عزیزترین مرید اور خلیفہ تھے۔ وہ صابریہ سلسلہ کے پہلے بزرگ ہیں جن کے حالات معاصر تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں۔ جو شہرت اور عظمت ان کو حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے صابریہ سلسلہ کے کسی بزرگ کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔

شیخ عبدالقدوسؒ ابتدائے حال میں ردولی میں مقیم رہے[۵۲] ۱۴۹۰-۹۱ء میں ردولی کے حالات خراب ہوئے اور وہ[۵۳] ترکِ وطن کر کر شاہ آباد آگئے۔ جہاں ۳۸ سال تک انھوں نے ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا رکھا۔ آخری عمر میں گنگوہ (ضلع سہارنپور) تشریف لے آئے اور وہیں ۱۵۳۷ء میں وفات پائی۔

جن حالات و گردوپیش میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت

---

۵۱ انوار العیون (قلمی)

۵۲ مختصر حالات کیلئے ملاحظہ ہو گلزار ابرار ص ۵۸۳-۵۸۲، نیز سیر الاقطاب وغیرہ۔ گلزار ابرار میں ان کے ایک مکتوب کا اقتباس نقل کیا گیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں ان کے مکتوبات بھی دستیاب ہوتے تھے۔

۵۳ لطائف قدوسی میں لکھا ہے: "طرف ہندوستان غلبۂ کافراں بود، در پرگنۂ ردولی عمل کافراں شد، شعار اسلام مندرس شدند، در بازار گوشت خوک فروختہ می شد حضرت قطبی دل گیر شدہ بیروں آمدند" ص ۳۱ (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ء)

کا کام کرنا پڑا۔ وہ بڑے ہوش ربا تھے۔ ہندوستان کی سیاسی فضا غیر یقینی تھی۔ مستحکم مرکزی نظام ختم ہو چکا تھا سلطنت دہلی سانس توڑ رہی تھی۔ اس کا سیاسی اور سماجی ڈھانچہ بے جان ہو چکا تھا۔ صوبوں میں خود مختار حکومتیں تھیں۔ اور دارالسلطنت کے چاروں طرف ہنگامہ آرائی اور فتنہ فساد، ہندوستان کی ان تمام سیاسی طاقتوں میں جو اس وقت اپنا تسلّط قائم کرنے کے لئے کوشاں تھیں۔ راجپوت سب سے زیادہ منظم اور سیاسی بصیرت رکھنے والے تھے۔ پروفیسر رشبورک ولیمس نے لکھا ہے کہ اگر بابر ہندوستان نہ آتا تو راجپوت یقیناً اپنا اقتدار قائم کر لیتے [۱] چندیری، ناگور، اجمیر، ردولی وغیرہ مقامات پر حالات ایسے نازک ہو گئے تھے کہ مسلمان ان علاقوں کو خیرباد کہہ کر دوسری جگہ بسنے لگے تھے

ان حالات گرد و پیش میں سانس لینے والے بزرگ کا سیاست سے علیحدہ رہنا ممکن نہ تھا۔ سیاست اور سلاطین سے علیحدہ بھی اسی وقت رہا جا سکتا ہے جب کم از کم سماجی توازن تو درست ہو۔ سماجی انتشار کی صورت میں سیاست سے بچنا تقریباً ناممکن تھا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی۔ ابتدائے حال میں مشایخ چشت کے قدیم اصول کے مطابق سیاست و سلطان سے علیحدہ رہتے تھے۔ چنانچہ لطائف قدوسی میں ایک واقعہ لکھا ہے۔

"قاضی محمود تھانیسری داروغہ ردولی بود، چوں بجہت ملاقات می آید حضرت قطبی گریختہ در ویرانے می رفتند کہ تبرّی از اہل دنیا بر کمال بود،"

---

[۱] ملاحظہ ہو:۔ AN EMPIRE BILDER OF INDIA IN THE SIXTEENTH CENTURY: R, WILLIAMS. باب اول

اختلاط بالیشان زہر قاتل میدانستند دمی فرمودند کہ از اہل دنیا بوئے کریہ می آید لاچار می گریزم "۔[۵۱]

لیکن بعد کو انھیں سیاست میں حصہ لینا پڑا اور سلاطین سے ربط پیدا کرنا پڑا[۵۲] ایک طویل مکتوب[۵۳] میں انھوں نے سکندر لودی کو غم خواریِ خلق بالخصوص ائمہ اور علمار کی تیمارداری پر خاص طور سے توجہ دلائی ہے، اور بتایا ہے کہ حالات کی بہت کچھ درستگی اُن کے ذریعے ممکن ہے، کچھ عرصہ بعد جب بابر کا تسلط ہوگیا تو انھوں نے مغل شہنشاہ کو بھی خط لکھا اور ہدایت کی۔

"باید دانست کہ برائے شکر نعمت منعم سایہ عدل بر عالمیان چناں کشند ہیچ کس بر ہیچ کس ظلم نکند وہمہ خلق وہمہ سپاہ باوامر ونواہی شرع مستقیم ومستدیم بوند نماز بجماعت بگذارند وعلم علمار را دوست دارند و در بازار ہر شہرے محتسبان بگردند تا شہر و بازار را بجمال عدل شرع محمدی بیارایند و روشن ومنور گردانند...... چنانکہ در عہدِ سلف وخلفار راشدین با جمیع شرائط بے شبہ بود"[۵۴]

---

۵۱ لطائف قدوسی۔ ص ۱۹-۱۸

۵۲ آئین اکبری (ص ۲۱۴ مرتبہ سر سید احمد خاں) میں لکھا ہے: "دانش صوری ومعنوی اندوخت و در ایزدی شناس والا پایہ شد، فراواں حقائق از و برگویند، جنت آشیانی با برخی کام اکہاں بنا دیہ او ورشد رسے وانجمن آگہی گرمے پذیرفتے"۔

نیز ملاحظہ ہو گلزار ابرار ص ۲۴۳

۵۳ مکتوبات قدوسی (مطبوعہ، مطبع احمدی، دہلی) مکتوب ۱۷۱ ص ۴۴-۴۶

۵۴ مکتوبات قدوسی ص ۳۳۷

افغانوں اور مغلوں سے اُن کے تعلقات پر تفصیلی بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے تفصیل کے لئے معاصر تذکروں، ملفوظات اور تاریخوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔[له]
شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ صاحب علم وفضل بزرگ تھے۔ اُن کی تصانیف سے اُن کے مطالعہ کی وسعت اور نگاہ کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے عوارف کی شرح لکھی تھی[سٰه]۔ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی مشہور تصنیف فصوص الحکم پر حاشیہ تیار کیا تھا[سٰه] ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں :-
رسالہ قدسیہ، غرائب الفوائد[ٰله]، رشد نامہ، مظہر العجائب، مکتوبات قدوسیہ۔
انھوں نے اپنی تصانیف میں وحدت الوجود پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ رشد نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوی پر اچھا عبور رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف میں ہندوی دوہرے بہت کثرت سے ملتے ہیں۔

اتباعِ شریعت وسنت کا ان کو خاص خیال رہتا تھا۔ شیخ رکن الدینؒ نے رشد نامہ[شه] کے حاشیہ میں لکھا ہے :-

---

له اس سلسلہ میں لطائف قدوسی کا مطالعہ خاص طور پر مفید ثابت ہوگا۔

سٰه لطائف قدوسی میں لکھا ہے :- "اما علم لدنی وفیض الٰہی چنداں استعداد بود کہ در ہر علمے بجتہا وغریب کردند وتصانیف بسیار کردند ومی فرمودند کہ در ابتدا رحال نسخہ عوارف بجہت برکت در حجرہ حامی بود، دراں نسخہ چنداں دخل بنود عاقبت الامر کار تا بجدے رسید کہ نسخہ عوارف را شرح عربی کردند ونکات واسرار غریب نبشتند چنانچہ مشہور ومعروف است" ص ۸

سٰه گلزار ابرار ص ۲۳۹ ٰله مختصر رسالہ ہے مولوی غلام احمد خاں بریانی مسلم پریس جھجر سے شائع کیا تھا

شه رشد نامہ شیخ عبدالقدوسؒ کے ابتدائی زمانہ کی تصنیف ہے۔ شیخ رکن الدین پسر شیخ نے اس پر ایک حاشیہ لکھا تھا، اس میں لکھتے ہیں :- "در ابتدار حال تصنیف کردہ بودند" خاکسار کے پیش نظر رشد نامہ کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہے جس پر شیخ رکن الدین کا حاشیہ بھی موجود ہے۔

حضرت ایشاں چناں در شرع محمدی و در عقیدہ اہل سنت وجماعت
راسخ القدم بودند کہ ذرّہ از شرع تجاوز نبود"۔

اُن کے مکتوبات میں بھی اس جذبہ کا جگہ جگہ اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے بعض امراء کو خاص طور سے اتباعِ شریعت کی تلقین کی ہے۔ خواص خاں ہیبت خاں شیروانی، ابراہیم خاں شیروانی، تردی بیگ، وغیرہ کے نام ان کے مکتوبات بہت اہم ہیں[۵]۔ اور اس زمانے کے حالات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

جہاں تک صابریہ سلسلہ کا تعلق ہے اس کے نظام کو ترتیب دینا اور پھیلانا شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ہی کا کام تھا۔ مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف اُن کی خاص توجہ تھی۔ مریدوں کے نام اُن کے خطوط یہ بتاتے ہیں کہ وہ اُن کی روحانی تعلیم کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی حال میں ان کی طرف سے غفلت نہ برتی جائے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے تین فرزند تھے۔ شیخ حمیدالدین، شیخ عبدالمجید اور شیخ رکن الدین۔ شیخ رکن الدین کے بیٹے شیخ احمد تھے، اور اُن کے بیٹے شیخ عبدالنبی جو اکبر کے صدر الصدور بھی رہے تھے۔

حکومت وقت سے تعلق صوفیہ کے لئے ہمیشہ مہلک رہا ہے۔ غالباً اسی بناء پر مشائخ متقدمین نے ہمیشہ اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کی ہے۔ اگر کوئی بزرگ کسی ضرورت اور مصلحتِ وقت سے مجبور ہو کر حکومت سے ذرا سا بھی رابطہ پیدا کر لیتا ہے۔ تو اس کے بعد اس کے متعلقین اس ہی میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور شیخ رکن الدین ملتانیؒ نے حکومت سے وابستگی رکھی لیکن

[۵] شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور دیگر مشائخ ہند کے مکتوبات کو میں نے ایک علیحدہ کتاب "مشائخ کے خطوط امراء و سلاطین کے نام" میں مع حواشی کے ترتیب دیا ہے۔

اپنے روحانی پروگرام کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی مثال سے اُن کی اولاد نے غلط فائدہ اٹھایا اور سہرورد یہ سلسلہ کا سارا نظام درہم برہم کر دیا۔ یہی حال حضرت گنگوہیؒ کی اولاد کا ہوا۔ شیخ عبد القدوسؒ نے اصلاح و تربیت کی خاطر حکومت سے رابطہ پیدا کیا تھا۔ اُن کی اولاد نے حُبِ جاہ و زر کی خاطر شاہانِ مغلیہ کے آستانوں پر اپنی جبینوں کو جھکا دیا۔ شیخ عبد النبی کے حالات عہد اکبری کی تاریخوں میں تفصیل سے درج ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حُبِ جاہ و زر نے اُن کے دینی جذبے کو بالکل ختم کر دیا تھا اور وہ مشایخ سلسلہ کے اصولوں کا قطعاً احترام نہ کرتے تھے۔ [۵۱]

حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبد القدوسؒ کی اولاد اُن کے کام کو جاری نہ رکھ سکی۔ مگر اُن کے کچھ خلفاء ایسے عظیم المرتبت اور عالی حوصلہ تھے کہ انھوں نے سلسلہ کی نشر و اشاعت کی طرف خاص توجہ کی۔ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ[۵۲] شیخ عبد الغفور اعظم پوریؒ[۵۳] شیخ عبد العزیز کیرانویؒ۔ شیخ عبد الستار سہارنپوری۔ شیخ عبد الاحد پدر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ارشاد و تلقین کو اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد قرار دے کر سلسلے کے اثرات کو دور دور پھیلا دیا۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو:۔
منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے تذکرہ میں اس کو تفصیل سے نقل کیا ہے (تذکرہ: نیا ایڈیشن ص ۳۷-۳۵)

۵۲ اخبار الاخیار ص ۲۷۸ - ۲۷۷

۵۳ شیخ محدثؒ لکھتے ہیں: "و از جملہ خلفائے وے شیخ عبد الغفور اعظم پوری بود بزرگ بود و صاحب واقعات" اخبار الاخیار ص ۲۱۶

چشتیہ سلسلہ سولھویں اور سترھویں صدی میں

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں چشتیہ سلسلہ کی تاریخ ایک نظام کی تاریخ نہیں رہتی بلکہ ممتاز شخصیتوں کی سوانح بن کر رہ جاتی ہے، وہ نظم و ضبط اور باقاعدگی جو دورِ اوّل کے مرکزی نظام کی خصوصیت تھی۔ اب بالکل ختم ہوگئی۔ جہاں جس کو موقع ملا۔ اس نے اپنی حیثیت، صلاحیت اور حالات کے مطابق کام کر لیا۔ اس دور میں چشتیہ سلسلہ کی عام حالت کا اندازہ لگانے کے لئے چند بزرگوں کا مختصر حال پیش کر دینا کافی ہے۔

شیخ جلال الدین تھانیسریرح (المتوفی ۹۸۹ھ) حضرت شیخ عبد القدوس کے خلیفہ تھے۔ شیخ محدثؒ اُن کے متعلق فرماتے ہیں۔

"از مشاہیر مشائخ وقت بود عالم بود و عامل مستقیم و شیخے کامل۔
از اوّل عمر تا آخر بطاعت و عبادت و درس و وعظ ذکر و سماع و
ذوق و حالت گزرانیدند۔ سن طویل یافتہ بود۔ بر حفظ آدابِ نوافل
و رعایتِ اوراد و اوقات تا آخرِ حیات مستقیم بود"[۵]

درس و تدریس کا خاص شوق تھا۔ اکثر کتب متداولہ پر حاشیے لکھے تھے۔ ان کی ایک مشہور تصنیف ارشاد الطالبین ہے، جس میں ۳۷ ابواب میں تصوف کے مختلف عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اکبر کے زمانے میں زمینوں کے متعلق کچھ احکامات جاری ہوئے لوگوں نے ان کو آگرہ چلنے کی تکلیف دی تاکہ بادشاہ سے اُن کے معاملات پر گفتگو کریں۔ بدایونی نے لکھا ہے:۔

۵ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۷

"بہ مہم سازی وشفاعت ائمہ تھانیسر تشریف بردہ بود" [۱]

اس مسئلہ پر انھوں نے ایک رسالہ تحقیق اراضی الہند بھی لکھا تھا [۲]۔ بادشاہ کی نظر میں اُن کی عزت تھی، لیکن انھوں نے درس وتدریس اور ارشاد وتلقین سے کنارہ کش ہوکر درباداری کی زندگی کو اختیار کرنا پسند نہیں کیا۔

شیخ جلال الدین تھانیسری کے خلفاء میں خواجہ نظام الدین تھانیسریؒ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے خلفاء کثیر تعداد میں تھے۔ شیخ ابوسعید گنگوہیؒ شیخ حسن بہوریؒ، شیخ عبدالکریم لاہوریؒ، شیخ عبدالرحمٰن کشمیریؒ، شیخ محمد صادق برہان پوریؒ نے خاص شہرت حاصل کی۔

شیخ ابوسعید گنگوہیؒ (المتوفی ۱۰۴۹ھ) نے صابریہ سلسلہ کی اشاعت میں کافی سرگرمی کا ثبوت دیا۔ اُن کے سب سے زیادہ مشہور خلیفہ شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ (المتوفی ۱۰۵۸ھ) تھے۔ شیخ اکبرؒ کی تصانیف پر بڑا عبور تھا۔ فصوص الحکم کی کئی شرحیں لکھی تھیں۔ شاہ جہاں نے ایک مرتبہ خط لکھا۔

عرفان آگاہ معارف جلوہ گاہ شیخ محب اللہ سلمہٗ فرمان اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ نیک تصور نمودہ بیاید کو شوق فوق الحد است

"والدعا فوق المدعا"

جواب میں فرمایا:۔

"امر اولی الامر رسید، اثر محبت مفہوم گردید، لیکن شخصے کہ ازمرتبہ

---

[۱] منتخب التواریخ جلد سوم۔ ص ۴

[۲] اس کا ایک قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کتب خانہ میں بھی ہے

اولیٰ و ثانی بر آمده باشد بمرتبہ ثالث چگونہ رسد"۔[51]

دارا شکوہ نے الہ آباد قیام کے دوران میں اُن سے استفادہ کیا تھا[52]۔ اورنگ زیبؒ کی اُن کے متعلق رائے اچھی نہیں تھی۔ اُس نے اُن کے رسالہ تسویہ کو جلا دینے کا حکم دیا تھا۔

شیخ عبدالعزیز چشتی دہلویؒ۔ شیخ حسن طاہر کے فرزند ارجمند تھے ۸۹۸ھ میں جونپور میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ دہلی آ گئے، پھر وفات تک (۹۷۵ھ) یہیں رہے۔ شیخ محدثؒ نے اُن کے متعلق لکھا ہے:۔

"در زمان خود یادگار مشایخ چشت بود، در دہلی بوجود او سلسلہ ارشاد و مشیخت برپا بود"۔[53]

شیخ محدث ہی کا قطعہ ہے ؎

شیخ کامل عارف دوران خود عبدالعزیز
آنکہ می داد اہل دل را مجلس یاد از بہشت

---

[51] یہ مکتوبات بچھراؤں (ضلع مراد آباد) کے ایک قلمی کتب خانہ میں نظر سے گذرے تھے۔

[52] شہزادہ دارا شکوہ نے شیخ کو متعدد مکتوب بھی لکھے تھے جن کا انھوں نے مفصل جواب دیا تھا۔ ایک خط میں دارا شکوہ لکھتا ہے:۔

"از گرفتن صوبہ الہ آباد بیشتر خوش حالی از وجود شریف است"۔

ایک خط میں شاہ صاحبؒ دارا شکوہ کو نصیحت فرماتے ہیں:

"فقیر کجا و نصیحت کجا، حق آنست کہ اندیشۂ رفاہیت خلق خدا دامن گیر خاطر حکام باشد، چہ مومن و چہ کافر کہ خلق خدا پیدائش خدا است"۔

[53] اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۵

ہرچہ از اوصاف اہل اللہ در عالم بود
حق تعالیٰ ز اوّل فطرت بذاتِ او سرشت
یادگارِ اہلِ چشت او بود در دورانِ خود
گشت ازاں تاریخ فوتش یادگارِ اہلِ چشت

اُن کے تقدس، حلم اور تواضع نے ان کو ہر دل عزیز بنا دیا تھا چشتیہ سلسلہ کی دیرینہ روایات اس تاریک دور میں پھر ایک بار ان کے ذریعے زندہ ہونے لگی تھیں۔ عوام و خواص سب ہی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ بیرم خاں خانخاناں خاص طور پر ان کا معتقد تھا۔

شیخ عبدالعزیزؒ کے فرزند رشید شیخ قطب عالمؒ بھی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ شیخ محدثؒ نے اُن کے متعلق لکھا ہے۔

"عالم و فاضل و صاحبِ اخلاق حمیدہ و صفاتِ پسندیدہ، قدمِ صدق و استقامت بر سجادہ پدر نہادہ"[۵۱]

شیخ عبدالعزیزؒ کے خلفاء میں شیخ جائیلدہ اور شیخ عبدالغنی بداؤنی کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔

شیخ سلیم چشتیؒ۔ بابا فرید گنج شکرؒ کی اولاد میں تھے ۸۹۷ھ میں پیدا ہوئے۔ عرصہ تک ممالک اسلامی حجاز، روم، بغداد، شام و نجف[۵۲] میں سرگرم سیاحت رہے۔ پھر سیکری میں آکر اقامت اختیار کرلی۔ جہاں گیر کا بیان ہے

"مردم آں نواحی بہ شیخ اعتقاد تمام داشتند۔"[۵۳]

---

۵۱ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۵

۵۲ منتخب التواریخ۔ عبدالقادر بدایونی جلد سوم ص ۱۱

۵۳ تزک جہاں گیری (مرتبہ سرسید احمد خاں) ص ۱

ابتدائی زمانے میں شیخ نے ریاضاتِ شاقہ کی تھیں اور عسرت میں زندگی گزاری تھی جب شہنشاہ اکبر ان کا معتقد ہو گیا تو حالات بدل گئے۔ اور انھوں نے فراغت کی زندگی اختیار کر لی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے:

"بمرور ایام جمعیتے بظاہر احوال ایشاں نیز راہ یافت و عمارتہا و باغہا و چاہا ساخت و در مقام مشیخت متمکن گشت .... و بعضے عادات مخالف شریعت کہ متعارف عوام باشد تغیر رو داد"[51]

زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ اُن کے مزاج میں بھی جمعیت پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے عمارتیں، باغ اور کنوئیں بنائے اور سجادۂ مشیخت پر بیٹھے .... اور بعض عادتیں جو شریعت کے منافی ہیں اور عوام میں متعارف ہیں ان میں پیدا ہو گئیں۔

ان حالات میں سلسلہ کی نشر و اشاعت کا کام مدھم پڑ گیا۔ اُن کے خلفا[52] شیخ کمال الوری، شیخ پیارہ بنگالی، شیخ فتح اللہ ترین سنبلی، شیخ رکن الدین اجودھنی اور حاجی حسین نے اپنی صلاحیتوں اور حالات کے مطابق سلسلہ کا کچھ کام ضرور انجام دیا۔ لیکن اُن کی اولاد میں اس مرتبہ کا کوئی شخص پیدا نہ ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اولاد

---

51 اخبار الاخیار ص ۲۷۶

اس کے برخلاف بدایونی نے لکھا ہے:۔

سنین عمر شریفش بہ نود و پنج سال رسیدہ قدم بر جادۂ شریعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نہادہ، ریاضات شاقہ و مجاہدات صعب طریق معمول او بود" ج ۳ ص ۱۱

غالباً یہ ابتدائی زمانے کے متعلق ہے۔

52 منتخب التواریخ۔ ج ۳ ص ۱۲

مشایخ سے زیادہ امرا کے زمرہ میں شامل کرنے کے قابل ہے۔ شیخ علاء الدین نبیرہ شیخ سلیمؒ کو جہاں گیر نے اسلام خاں کا خطاب اور دو ہزاری منصب عطا فرمایا تھا[۵۱] شیخ کی اولاد میں سے کئی افراد میوات اور بنگال میں سرکاری عہدوں پر کام کرتے رہے تھے[۵۲]

شیخ عبدالعزیز دہلویؒ اور شیخ سلیم چشتیؒ سے قبل چشتیہ سلسلہ کے ایک مرتاض بزرگ حضرت شاہ بہاء الدین المعروف بہ بابا فریدیؒ نے رجب پور (ضلع مرادآباد) میں اپنا مسکن بنایا تھا۔ روحانی تربیت کا جو کام انھوں نے شروع کیا اس سے گرد و نواح کے صدہا گم گشتگان راہِ طریقت کو فائدہ پہنچا۔ افسوس ہے کہ اُن کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے[۵۳]

اس دور کے چند مشہور چشتی بزرگوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) شیخ دانیال چشتیؒ[۵۴]

(۲) سید علاء الدین مجذوبؒ[۵۵]

(۳) شیخ نظام الدین انبیٹھی والؒ[۵۶]

---

۵۱ تزک جہانگیری ص ۱۳

۵۲ ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر بینی پرشاد کی تاریخ جہانگیر (انگریزی) ص ۱۳۵ ، ۲۰۹

۵۳ رجب پور میں اُن کے سلسلے کے کچھ افراد موجود ہیں۔ آج کل جناب معین الدین صاحب فریدی سجادہ نشین ہیں۔

۵۴ اخبار الاخیار

۵۵ اخبار الاخیار ص ۲۸۱ - ۲۸۰

۵۶ ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۲۴ - ۱۵

(۴) شیخ ادہن جونپوری[1]

(۵) سید ابن امروہوی[2]

[1] منتخب التواریخ ج سوم ص ۴۲ — ۴۱

[2] امروہہ (ضلع مرادآباد) میں ان کا مزار ہے۔ بدایونی نے اُن کے متعلق لکھا ہے:۔

"سالک مجذوب بود دقیقہ از دقائق شریعت مطہرہ باوجود آں حالت ازو فوت نشدے" ج ۳ ص ۳۹۔

ان کا مختصر حال اخبار الاخیار، گلزار ابرار اور دیگر تذکروں میں ملتا ہے۔

چشتیہ سلسلہ کا نشاۃ ثانیہ

(اٹھارویں صدی)

اٹھارویں صدی صدی میں جب کہ مسلمانان ہند کا سیاسی نظام نہایت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہا تھا اور ہر طرف اخلاقی ابتری اور زبوں حالی پھیلی ہوئی تھی، چشتیہ سلسلے کا دور تجدید و احیاء شروع ہوا۔ اس نشاۃ ثانیہ کا سہرا تمام تر حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی رح کے سر ہے۔

تقریباً دو سو سال سے چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام پر جمود کا عالم طاری تھا۔ روحانی اصلاح و تربیت کا کام سست پڑ گیا تھا۔ اور مشائخ متقدمین کی روایات بالکل بھلائی جا چکی تھیں۔ شاہ صاحب رح نے اپنی پُر خلوص جد و جہد سے سلسلے کے عروقِ مردہ میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ اور اصلاح و تربیت کا ایسا نظام قائم کیا کہ دورِ اول کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ خود شاہ صاحب رح دہلی میں رہتے تھے، لیکن ان کا اصلاحی ہاتھ دکن تک کام کرتا تھا۔ وہ اپنے مریدوں کی زندگی کے ہر ہر گوشے پر نظر رکھتے تھے اور بات بات پر ان کو ہدائتیں دیتے تھے اُن کے خلیفہ شاہ نظام الدین اورنگ آبادی رح نے دکن میں سلسلہ کی نشر و اشاعت میں بے پناہ جد و جہد کی۔ اُن کی خانقاہ میں ہزاروں گم گشتگانِ راہ طریقت جمع ہوتے تھے اور اپنی روحانی پیاس بجھا کر نکلتے تھے۔ شاہ نظام الدین اورنگ آبادی رح کے مرید اور فرزند شاہ فخر الدین رح نے دکن کو خیرباد کہا اور دہلی آکر اپنی خانقاہ قائم کی۔

اُن کے زمانے میں چشتیہ سلسلہ کو بے حد عروج حاصل ہوا اور دور دور تک اس کی خانقاہیں قائم ہوگئیں۔ اُن کے ایک عزیز مرید اور خلیفہ شاہ نور محمد مہاروی نے پنجاب میں جگہ جگہ چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں قائم کرادیں۔ تونسہ، چاچڑاں، کوٹ مٹھن احمد پور، ملتان وغیرہ روحانی اصلاح و تربیت کے مشہور مرکز بن گئے۔ شاہ فخرالدین رح کے ایک اور خلیفہ شاہ نیاز احمد بریلوی رح نے روہیل کھنڈ میں اپنی خانقاہ بنائی اور دور دور سے لوگ اُن سے مستفیض ہونے کے لئے وہاں جمع ہونے لگے۔ شاہ کلیم اللہ دہلوی رح اور اُن کے خلفاء و مریدین ہماری اس جلد کا موضوع ہیں۔ اُن کے کارنامے آئندہ صفحات میں تفصیل سے نظر سے گذریں گے۔ یہاں ضروری ہے کہ اُن کے معاصر مشائخ سلسلہ صابریہ کے متعلق بھی کچھ عرض کردیا جائے۔

صابریہ سلسلہ کا مرکز اس دور میں امروہہ بنا۔ وہاں حضرت شاہ عضدالدین رح[۵۱] (المتوفی سنہ ۱۱۷۲ھ) حضرت شاہ عبدالہادی رح[۵۲] (المتوفی سنہ ۱۱۹۰ھ) اور حضرت شاہ عبدالباری رح[۵۳] (المتوفی سنہ ۱۲۲۶ھ) نے تزکیۂ نفس اور تجلیۂ باطن کی وہ محفلیں گرم

---

۵۱ شاہ عضدالدین صاحب رح، شیخ محب اللہ الہ آبادی رح کے خلیفہ سید شاہ محمدی رح کے مرید تھے۔ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضری اور بیعت ہونے کا حال مقاصد العارفین میں لکھا ہے۔ تذکرہ حاجی رفیع الدین مرادآبادی میں لکھا ہے کہ وہ علوم شریعت کے جامع تھے۔ زہد و ورع میں یکتا تھے۔ حکام نے وظیفہ مقرر کرنا چاہا تو قبول نہ کیا۔

۵۲ شاہ عبدالہادی صاحب رح، شاہ عضدالدین رح کے خلیفہ تھے۔ حالات کے لئے مفتاح الخزائن (شیخ نزہت علی) انوار العارفین (حافظ محمد حسین) اور انوار العاشقین (مولانا مشتاق احمد) ملاحظہ کیجئے۔

۵۳ شاہ عبدالہادی صاحب رح کے پوتے اور خلیفہ تھے۔

لیں کہ فضائیں تک جگمگا اٹھیں ۔ شاہ عبدالباری ؒ کے خلیفہ حاجی سید عبدالرحیم فاطمی ؒ (۱۲۴۶ھ) شیخ کی مجلس سے دین کا ایسا درد لے کر اٹھے کہ جب تک زندہ رہے احیاءِ سنت کے لئے کوشاں رہے ۔ جب حضرت سید احمد شہید ؒ نے جہاد کی تیاری کی تو ان کے ساتھ ہوگئے اور بالاکوٹ کے میدان میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے ۔[۵] ان کے خلیفہ میاں جی نور محمد جھنجانوی ؒ (المتوفی ۱۲۵۹ھ) کے دامن تربیت سے ایک ایسا شخص اٹھا جس نے صابریہ سلسلہ کو عروج کی انتہائی منزل پر پہنچا دیا ۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ کے فیوض ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہے ، دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی ان کے اثرات پہنچے ۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ؒ (۱۲۳۲ھ) میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے ۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد حجاز چلے گئے ، وہاں سے واپس آئے تو ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا کر دیا ۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دل و دماغ کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا ۔ وہ انیسویں صدی کی تین عظیم الشان تحریکوں کا منبع و مخرج تھے ۔

(۱) مسلمانوں کی دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے جو تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی جس نے بالآخر دیوبند کی شکل اختیار کی ، اُن ہی کے خلفاء و مریدین کی پُرخلوص جدوجہد کا نتیجہ تھی ۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) مولانا محمد یعقوب نانوتوی ؒ اور حاجی محمد عابد صاحب ؒ اُن کے خلفاء تھے ۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن ؒ ، مولانا محمد قاسم ؒ کے جانشین تھے ۔ ان ہی بزرگوں کی کوششوں سے دینی تعلیم کا چرچا ہوا ۔

(۲) باطنی اصلاح و تربیت کے لئے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی

---

[۵] ملاحظہ ہو سوانح احمدی مصنفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری ص ۱۴۱ ۔ ۱۴۰

کے شروع میں دو بزرگوں کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح، حاجی صاحب رح کے خلیفہ تھے۔ نصف صدی سے زیادہ انھوں نے ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے گوشہ میں بیٹھ کر مسلمانوں کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاح کا کام کیا۔ لیکن مولانا تھانوی رح کی تحریک میں وہ وسعت اور گیرائی نہ پیدا ہو سکی جو مولانا محمد الیاس رح کی دینی تحریک کو حاصل ہوئی۔

مولانا محمد الیاس رح، مولانا رشید احمد گنگوہی رح کے مرید تھے جو دینی بصیرت اور جذبہ اللہ نے انھیں عنایت فرمایا تھا۔ اس کی مثال اس عہد میں مشکل سے ملے گی گذشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاس رح نے کیا تھا۔

(۳) انیسویں صدی کی تیسری اہم تحریک، آزادی وطن کی تھی۔ اس سلسلہ میں خود حاجی صاحب اور ان کے منسلکین نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ ہندوستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ غدر کے زمانے میں تھانہ بھون کا انتظام حاجی صاحب رح نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور خود دیوانی اور فوجداری کے مقدمات فیصل فرماتے تھے۔ آزادی وطن کے جس جذبے نے حاجی صاحب رح کے قلب وجگر کو گرمایا تھا وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح کے پہلو میں ایک شعلہ بن گیا تھا وہ اور ان کے رفقاء اور تلامذہ نے ہندوستان سے انگریزی حکومت کا اقتدار ختم کرنے کے لئے جن مصائب کا سامنا کیا، تاریخ ہند کا کوئی دیانت دار مورخ ان کو بھلا نہ سکے گا۔

ان صفحات میں ہمارا مقصد ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کے نشوونما پر ایک سرسری نظر ڈالنا تھا بہت سے ایسے عنوانات اور مباحث جن کو تفصیل سے بیان کرنے کو جی چاہتا تھا، قلم انداز کرتے پڑے۔ انشاء اللہ اس اجمال کی تفصیل اس سلسلہ کی دوسری جلدوں میں بیان کی جائے گی، اس باب کو ختم کرتے وقت

ہماری زبان پر بے اختیار چودھری خوشی محمد ناظر کے یہ اشعار آجاتے ہیں ۵

ہیں خاکِ ہند میں کچھ نقشِ پا اُن رہ نوردوں کے
ادب سے چومتے جن کو ہیں دشت و کوہسار اب تک
کوئی تھا گنج بخش اُن میں کوئی گنجِ شکر اُن میں
خزانے معرفت کے ہیں نہاں زیرِ مزار اب تک
ہوا ہندوستاں جنت نشاں جن کی فضاؤں سے،
نہ آئی جا کے ان باغوں میں پھر فصلِ بہار اب تک

(۴) مشایخ چشت کا نظامِ اصلاح و تربیت

مشایخِ چشت کے کارناموں کا سب سے اہم پہلو ان کے نظامِ اصلاح و تربیت سے وابستہ ہے۔ انھوں نے سماج کے فاسد عناصر کی اصلاح اور انسانیت کی اخلاقی سطح بلند کرنے کے لیے جو موثر طریقہ کار اختیار کیا، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی ترقیات پر بہت بڑا فخر و ناز ہے۔ اور یہ فخر و ناز بڑی حد تک حق بجانب ہے۔ انسان نے ایک طرف اگر قوائے فطرت کی تسخیر میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی ہیں تو دوسری طرف فطرتِ انسانی کے بہت سے اسرار کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ لیکن ان ترقیات کے باوجود عصرِ حاضر کے ماہرینِ نفسیات، انسانی دل و دماغ کے ان گوشوں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوئے جہاں یہ مشایخ اشاروں ہی اشاروں میں انقلاب پیدا کر دیتے تھے۔ اسباب کی تلاش ہو تو غور سے سنئے، آج بھی اُن کی پاک روحیں یہ کہتی ہوئی سنائی دیں گی ؎

عصرِ حاضر را خرد زنجیرِ پاست
جان بے تابے کہ من دارم کجاست
بچشمِ عشق نگر تا سراغ خود گیری
جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است

اُن کی نفسیاتی بصیرت کا چشمہ ایمان و عمل کی قوت سے اُبلتا تھا۔ اور ان کی نگاہ میں ایسی تاثیر پیدا کر دیتا تھا کہ جس کی طرف دیکھ لیتے، اس کی زندگی میں معصیت کے

سوتے خشک ہو جاتے۔ افسوس کی بات ہے کہ ان بزرگوں کے حالات میں اب تک ہندوستان میں جو لٹریچر شائع ہوا ہے اس میں ان کی زندگی کے اس پہلو کو نظر انداز کر کے، کرامات اور خرق عادات کی داستانوں کو مرکزی حیثیت دے دی گئی ہے۔ حالانکہ ان مشائخ نے اظہارِ کرامات کی نہ صرف جگہ جگہ مذمت کی ہے بلکہ اس کو 'حیض الرجال' سے تعبیر کیا ہے۔ ہم نے ان کی پاک زندگیوں کی کشش اُن کی اصلاحی اور دینی جدو جہد میں محسوس کی ہے۔ اس لئے اس باب میں ذرا تفصیل سے اُن کے نظام تعلیم و تربیت اور اندازِ تبلیغ و اشاعت پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں

(ا)

بیعت کا مقصد

بیعت کے معنی ہیں :-

دست بر دست یک دیگر نہادن و عہد بستن "[1]

کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرنا

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ط یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ٥

جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے اے محمد! وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے سو جو عہد شکنی کرتا ہے تو اپنی ذات کی مضرت پر عہد توڑتا ہے اور جس نے پورا کیا وہ عہد جو اللہ سے کیا تھا، اُن کو عنقریب اجر عظیم ملے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں سے مختلف مقاصد کے لئے بیعت لی تھی کسی سے جہاد کے لئے، کسی سے ہجرت کے لئے، کسی سے ارکان اسلام کی پابندی کے لئے، اور کسی سے سنّتِ نبوی کے تمسک پر، بعض احادیث میں ہے کہ حضور نے

---

[1] سبع سنابل، میر عبدالواحد بلگرامی (مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۹ھ) ص ۳۷

انصار عورتوں سے نوحہ نہ کرنے پر بیعت لی تھی - ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ محتاج مہاجرین سے اس پر بیعت لی کہ وہ کسی کے آگے دست سوال نہ پھیلائیں بعد کو ان لوگوں کا حال یہ ہوگیا تھا کہ کسی کا کوڑا ہاتھ سے گر جاتا تو خود گھوڑے سے اتر کر اُٹھاتا تھا ، اور کسی سے کوڑا اُٹھانے تک کا سوال نہ کرتا تھا ——

بہر حال احادیثِ نبوی سے ثابت ہے کہ بیعت کسی بھی مقصد کے لئے لی جا سکتی ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں کیا 'حکمت' تھی اور مشائخِ چشت کس مقصد کے لئے بیعت لیتے تھے ؟

شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ ، بیعت کی حکمت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

.... فاعلم ان اللّٰہ	معلوم کرکہ سنت اللہ یوں جاری
تعالیٰ اجریٰ سُنَّتَہٗ اَنْ	ہے کہ امور خفیہ جو نفوس میں پوشیدہ
یَّضبِطَ الامور الخفیّۃ	ہیں اُن کا ضبط افعال اور اقوالِ
المضمرۃ فی النفوس بافعالٍ	ظاہری سے ہو اور افعال و اقوال
واقوالٍ ظاھرۃٍ وینصبھا	قائم مقام ہوں امورِ قلبیہ کے ۔ چنانچہ
مَقامَھا کما اَنَّ التصدیقَ	تصدیق اللہ اور اس کے رسول اور
باللّٰہِ ورسولِہٖ وَالیَوْمِ	قیامت کی امر مخفی ہے تو اقرار
الآخِرِ خفیٌ فاقیم الاقرارُ	ایمان کا بجائے تصدیق قلبی کے قائم
مَقامَہٗ وکما اَنَّ رضی	کیا گیا ۔ اور جیسے کہ رضا مندی
المتعاقدینَ ببذل الثمن	بائع اور مشتری کی قیمت اور
والمبیع امرٌ خفیٌ مُضمرٌ	مبیع کے دینے میں امر مخفی پوشیدہ
فاقیم الایجاب والقبولُ	ہے تو ایجاب اور قبول کو قائم مقام
مَقامَہٗ فکذٰلِکَ التوبۃ	رضائے مخفی کے کردیا ۔ سو اسی

وَالعزیمۃ علی ترک المعاصی	طرح توبہ اور عزم کرنا ترک معاصی
والتمسک بحبل التقوی	کا اور تقوی کی رسی کو مضبوط پکڑنا
خفیٌ مضمرٌ فاقیمت البیعۃ	امر مخفی اور پوشیدہ ہے تو بیعت کو
مقامہا۔	اس کے قائم مقام کر دیا۔[۵۱]

حقیقت یہ ہے کہ بیعت میں ایک نفسیاتی مصلحت پوشیدہ ہے۔ جب انسان اپنے ماضی کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتا ہے تو بہت سی باتیں اس کو اخلاق و مذہب کے خلاف نظر آتی ہیں۔ اس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی معصیتوں سے توبہ کرتا ہے۔ لیکن اُسے اطمینان نہیں ہوتا۔ اس سے قلب میں ایک بے چینی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ماضی کا تصور اس کے لئے سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ اس کی توبہ اس تصور پر غالب نہیں آتی ——— اب وہ ایک پاک باطن، نیک نفس انسان کے ہاتھ پر ترکِ معاصی اور تقوے کا عہد کرتا ہے۔ شیخ یقین دلاتا ہے کہ:۔ "تائب با متقی برابر است"[۵۲] اس کے دل کے زخموں پر ایک پھایہ سا لگ جاتا ہے۔ تکلیف وہ ماضی سے اس کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کو نئی اُمیدوں، محکم یقین اور بیدار احساس کے ساتھ سنوارنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

---

۵۱ قول الجمیل شاہ ولی اللہ دہلوی (مع حواشی شاہ عبد العزیز رح و اردو ترجمہ مولوی خرم علی (مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ) - ص ۱۳۔

۵۲ فوائد الفواد - ص ۳ - ۲

حدیث نبوی ہے:۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ

(ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ)

مشائخ چشت جس مقصد کے لئے بیعت لیتے تھے، اس کا اندازہ شیخ نظام الدین اولیاؒ کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

چوں کسے بخدمت شیخ شیوخ العالم فریدالحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز بیامدے بہ نیت ارادت، اول فرمودے فاتحہ و اخلاص بخوانید، بعدہٗ امن الرسول بخواندے، بعدہٗ شہد اللہ تا ان الدین عند اللہ الاسلام خواندے، بعدہٗ فرمودے کہ بیعت کردی بریں ضعیف و خواجہ ایں ضعیف و خواجگان ما و پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و با حضرت عزت عہد کردی کہ دست و پائے و چشم نگاہ داری و بر نہجِ شرع باشی[1]

جب کوئی شخص شیخ شیوخ العالم فریدالحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں ارادت کی نیت سے آتا تو اول آپ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھنے کا حکم فرماتے، بعدہٗ امن الرسول پڑھتے۔ اس کے بعد شہد اللہ سے ان الدین عند اللہ الاسلام تک پڑھتے۔ پھر فرماتے کہ (کہو) تونے اس ضعیف اور اس کے خواجہ خواجگان اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور خدائے تعالیٰ سے اس بات پر عہد کیا کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ پر نگاہ رکھے گا اور شرع کے طریقے پر چلے گا۔

[1] سیر الاولیا ص ۲۲۳ "و چشم نگاہ داری" میں جو مصلحت پوشیدہ ہے، اس پر حافظ ابن القیمؒ کی یہ تشریح بہت اہم ہے، فرماتے ہیں "نگاہ شہوت کی قاصد اور پیامبر ہوتی ہے اور نگاہ کی حفاظت دراصل شرم گاہ اور شہوت کی جگہ کی حفاظت ہے جس نے نظر کو آزاد کر دیا، اس نے اس کو ہلاکت میں ڈال دیا .... اور نظر ہی ان تمام آفتوں کی بنیاد ہے۔ جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے کیونکہ نظر کھٹک پیدا کرتی ہے۔ پھر کھٹک فکر کو وجود بخشتی ہے اور فکر شہوت کو ابھارتی ہے شہوت ارادہ کو جنم دیتی ہے ارادہ قوی ہو کر عزیمت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور عزیمت میں مزید پختگی ہو کر فعل واقع ہوتا ہے (الجواب الکافی۔ ص ۲۰۴)

انسان کو اخلاقی عیوب سے بچانا اور اس کو راہِ شریعت دکھانا، مشائخ چشت کی کوششوں کا محور تھا۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر مریدین کو خلافت دی جاتی تھی، خوش قسمتی سے حضرت محبوب الٰہیؒ کا وہ خلافت نامہ جو انھوں نے اپنے ایک عزیز مرید شیخ شمس الدین یحییٰؒ کو عنایت فرمایا تھا۔ سیر الاولیاء میں ہمیں مل جاتا ہے، مشائخ چشت کے مقاصد کے تعین اور اُن کے لائحہ عمل کی وضاحت کے لئے اس سے زیادہ اہم کوئی دستاویز ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کر دیا جائے :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم	بسم اللہ الرحمن الرحیم
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ سَمَتْ ھِمَم	"تمام حمد و ثنا اس خدا کو ثابت ہے
اولیائہٖ عَنْ الرکوانِ الی الا	جس نے اپنے دوستوں کے ارادوں
کوانِ عاراً واعتلقتہ ھُمُومُھم	کو عالم اور اہلِ عالم کی طرف میل کرنے
بالواحدِ الحنّانِ بارًّا فدارت	کی طرف کر دیئے اور اُن کے دلی قصدوں
عَلَیْھِمْ بکرۃً وعشیاً کاءسُ	کو خدائے واحد و حنّان کے ساتھ نیکوکاری
المحبّۃ مِنْ کوثر محبوبھم دارًا	کی رو سے وابستہ کیا۔ پس صبح و شام خدا کے
کُلَّمَا جَنَّ عَلَیْھِمُ اللَّیْلُ تشتعلُ	دوستوں پر محبوب کے دریائے محبت
قُلُوْبُھُمْ مِنَ الشَّوْقِ نَارًا	کی شراب کا پیالہ ہمیشہ اور بلا زوال دور
وَتَفِیْضُ اَعْیُنُھُمْ مِنَ الدمع	کرتا رہتا ہے۔ جب ان پر رات کا اندھیرا
مدرارًا ویتمتعون	چھا جاتا ہے تو ذوق و شوق سے ان کے
بمناجاۃِ الحبیب اسرارًا و	دل مشتعل ہو جاتے اور آنکھیں بارش کی
یطوفون بسرِ اوقات العزّ	طرح آنسو بہاتی ہیں وہ دوست کے ساتھ
افکارًا الا یزال منھم فی کلّ	راز کہنے کی وجہ سے برخورداری حاصل

یمان من ھم علی مکنونۃ نضارۃ
العرفان فیظھر فی الاقطار
اثارہ ویزھو فی الافاق انوارہ
لسانہ ناطق بالحق وھو
داعی اللہ فی الخلق لیخرجھم
من الظلمات الی النور ویقربھم
الی الرب الغفور ثم الصلوۃ
علی صاحب الشریعۃ الغراء
والطریقۃ الزھراء رسول
الرحمۃ المخصوص بخلافۃ
ربہ فی مقام البیعۃ وعلی
خلفائہ الراشدین الذین
فازوا بکل مقام علی وعلی آلہ
الذین یدعون ربھم بالغداۃ
والعشی اما بعد فان الدعوۃ
الی الواحد العلام من ارفع
دعائم الاسلام واوثق عروۃ
فی الایمان علی ما ورد فی
الخبر عنہ علیہ السلام والذی
نفس محمد بیدہ لئن شئتم
لا قسمن لکم ان احب عباد اللہ

کرتے اور وہ سراپردۂ حق کے گرد فکر سے
گھومتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے
ہوتے ہیں جو ہر زمانے میں عرفان کی تازگی
کے لباس سے آراستہ رہتے ہیں۔ پھر
اطرافِ عالم میں اُن کی نشانیاں ظاہر ہوتی
اور عالم میں اُن کے انوار روشن واضح ہوتے
ہیں۔ ولی کی زبان حق کے ساتھ گویا ہوتی
ہے۔ اور وہ خلق میں خدا کا داعی ہوتا ہے
تاکہ خلق کو گمراہی کی تاریکی سے ہدایت کی
روشنی کی طرف نکالے اور انھیں ربِ غفور
کی طرف نزدیک کرے۔ حمد وثنا کے بعد
روشن شریعت اور تابان طریقت کے صاحب
یعنی رسول رحمت ان پر خدا کی کامل نازل
ہو جو مقام بیعت میں اپنے پروردگار کے
خلیفہ ہونے کے ساتھ مخصوص ہیں اور
جناب پیغمبر صلعم کے اُن خلفا پر بھی خدا
کی رحمتِ کاملہ نازل ہو جو راہِ راست دکھانے
والے اور ہر برتر مقام پر پہنچنے والے ہیں
اور پیغمبر کی آل پاک پر بھی خدا کی رحمت نازل
ہو جو اپنے رب کو ہر صبح شام یاد کرتے ہیں
حمد وصلوۃ کے بعد واضح ہو کہ خدائے واحد

الی اللہ الذین یحبون اللہ
الی عباد اللہ یحببون عباد اللہ
الی اللہ ویمشون فی الارض
بالنصیحۃ والاہم ومامدح
اللہ عبادہ الذین یقولون
ربنا ھب لنا من ازواجنا
وذریتنا قرۃ اعین واجعلنا
للمتقین اماما وقد اوجبھا
اللہ تعالیٰ علی وخفقہ لاتباع
سید المرسلین وقائد الغر
المحجلین بقولہ عز وجل
قل ھذہ سبیلی ادعوا الی
اللہ علی بصیرۃ انا ومن
اتبعنی واتباعہ انما یکون
برعایۃ اقوالہ والاقتداء
بہ فی اعمالہ وتنزیہ السر
عن کل ما سوا اللہ فی الوجود
والانقطاع الی المعبود ثم ان
الولد الاعز التقی والعالم
المرضی المتوجہ الی رب
العالمین شمس الملت

علام کی طرف بلاتا تھا ارکان اسلام
کا ایک اعلیٰ وارفع رکن اور ایمان کا نہایت
مضبوط کڑا ہے جیسا کہ پیغمبر علیہ السلام
کی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ مجھے اس
پاک ذات کی قسم ہے جس کے قبضۂ
قدرت میں محمد کی جان ہے سارے مسلمانو!
اگر تم چاہو تو میں تمہارے وثوق و تیقن
کے لئے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بندگانِ خدا
میں سب سے زیادہ خدا کے دوست وہ
لوگ ہیں جو خدا کو دوست رکھتے ہیں
اس کے بندوں کی طرف اور بندگانِ خدا
کو دوست رکھتے ہیں خدا کی طرف یعنی
خدا کی محبت اور عشق کا طریقہ سکھتے ہیں
نیز بری باتوں سے باز رکھنے اور اچھی باتوں
کا حکم کرنے کے لئے زمین پر چلتے ہیں اسی
بنا پر خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کی مدح
سرائی ان الفاظ میں کی ہے کہ
الذین یقولون الخ
یعنی رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو کہتے
ہیں الٰہی! ہمیں ہماری بی بیوں اور اولاد
میں سے آنکھوں کی خنکی عطا فرما اور ہمیں

وَالدِّیْن مُحَمَّدُ بْنُ یَحْیٰی اَفَاضَ
اللّٰہُ الْوَاحِدُ اَنْوَارَہٗ عَلٰی
اَہْلِ الْیَقِیْنِ وَالتَّقْوٰی لَمَّا
صَحَّ قَصْدُہٗ اِلَیْنَا وَلَبِسَ خِرْقَۃَ
الْاِرَادَۃِ مِنَّا وَاسْتَوْفَی الْحَظَّ
مِنْ صُحْبَتِنَا اَجَزْتُ لَہٗ اِذَا
اِسْتَقَامَ عَلٰی اِتِّبَاعِ سَیِّدِ الْکَائِنَاتِ
وَاِسْتَغْرَقَ الْاَوْقَاتَ بِالطَّاعَاتِ
وَرَافَتِ الْقَلْبَ عَنْ
ہَوَاجِسِ النَّفْسِ وَالْخَطَرَاتِ
وَاَعْرَضَ عَنِ الدُّنْیَا وَاَسْبَابِہَا
وَلَمْ یَرْکَنْ اِلٰی اَبْنَائِہَا وَاَکْنَابِہَا
وَانْقَطَعَ اِلَی اللّٰہِ بِالْکُلِّیَّۃِ
وَاَشْرَقَتْ فِیْ قَلْبِہِ الْاَنْوَارُ
الْقُدُسِیَّۃُ وَالْاَسْرَارُ الْمَلَکُوْتِیَّۃُ
وَانْفَتَحَ بَابُ الْفَہْمِ لِتَعْرِیْفَاتِ
الْاِلٰہِیَّۃِ اَنْ یَلْبِسَ الْخِرْقَۃَ
لِلْمُرِیْدِیْنَ وَیُرْشِدُہُمْ اِلٰی
مَقَامَاتِ الْمُوْقِنِیْنَ کَمَا
اَجَازَنِیْ بَعْدَ مَا لَاحَظَنِیْ بِنَظْرَۃِ
الْمَخَاصِ وَاَلْبَسَنِیْ خِرْقَۃً ....؁

پرہیزگاروں کا امام قرار دے اور تحقیق
خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اس حدیث
کی استواری اور موافقت کے لحاظ سے
اس بہترین پیغمبر کی پیروی لازم و واجب
کی ہے جو اپنی اُمت کے لوگوں کو بہشت
کی طرف کھینچ لے جانے والا ہے جن کے
اعضا وضو روشن و درخشاں ہوں گے
جیسا کہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ محمد آپ
فرما دیجئے کہ یہ میری راہ اور میرا دین ہے
اور اے میری اُمت میں تمہیں خدا کی طرف
اس بینائی کی رو سے بلاتا ہوں جس پر میں
ہوں اور جو لوگ میری پیروی کرتے ہیں اور
پیغمبر کی پیروی بجز آپ کے اقوال کی
رعایت و نگاہ داشت کرنے اور اعمال
میں آپ کی اقتدا کرنے اور ان تمام چیزوں
سے سر کو پاک کرنے کے جو وجود و پیدائش
میں خدا کے سوا ہیں اور تمام خلائق سے
قطع تعلق کر کے معبود کی طرف ملنے کے
ہرگز حاصل نہیں ہوتی، پھر جاننا چاہیے کہ
فرزند عزیز پرہیزگار اور خدا کی صفات
وحدانیت کا عالم اور خدا کا پسندیدہ

اور رب العالمین کی طرف توجہ کرنے والا یعنی شمس الملت والدین محمد بن یحییٰ نے (خدائے واحد اس کے انوار کو اہل یقین اور صاحب تقویٰ پر فائز کرے) جب اپنا قصد و ارادہ ہماری طرف درست کیا اور ارادت کا خرقہ ہماری طرف سے زیب جسم کیا اور ہماری صحبت کا کافی و وافی حصہ حاصل کیا تو میں نے اُسے اجازت و رخصت دی جبکہ میں نے تجربہ کر لیا کہ وہ جناب سید کائنات کی پیروی و اتباع پر ثابت قدم و مستقیم ہے اور اس نے اپنے تمام اوقات، طاعاتِ الٰہی میں مستغرق کر دیئے ہیں اور غلباتِ نفس اور خطرات کے ہجوم سے اپنے دل کو محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا اور اسبابِ دنیا سے روگرداں ہے اور ابنائے دنیا اور اربابِ دنیا کی طرف میل کرنے سے بری ہے۔ اس نے تمام علائق کو قطع کر دیا ہے اور ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہے۔ اس کے دل میں عالم قدس کے انوار تاباں و درخشاں ہیں اور عالم ملکوت کے اسرار چمک رہے ہیں۔ اس کے لئے خدائے تعالیٰ کی معرفت کے دریافت کرنے کا دروازہ کھل گیا ہے اور محبت کا ذوق و شوق دل میں بھرا ہوا ہے میں نے اسے اس بات کی اجازت دی کہ مریدین کو خرقہ پہنائے اور انھیں اعلیٰ مقامات کی طرف راہ دکھلائے۔ میں نے شمس الدین یحییٰ کو ویسی ہی اجازت دی جیسے مجھے میرے شیخ نے اپنی نظر خاص سے ملاحظہ کرنے اور خرقۂ اختصاص کے پہنانے کے بعد اجازت دی تھی۔

اس خلافت نامے کے مطالعہ کے بعد اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ مشائخ چشت کی جدوجہد کا بنیادی مقصد، اخلاقی احساس و شعور کو بیدار کر کے اصلاح و تربیت کا سامان فراہم کرنا تھا۔

معلم اخلاق کا کردار اور خصوصیات ہدایت و اصلاح کی کامیابی کا انحصار ہادی یا مصلح کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ کسی شخص سے نصیحت کے چند جملے

کہہ دینا کوئی مشکل کام نہیں، لیکن اس نصیحت کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کا سانچہ بدل دینا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس کے لئے کردار کی بہت سی خوبیاں درکار ہیں۔

(۱) ایک معلمِ اخلاق کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود اُن اخلاقی اقدار کا حامل ہو، جن کی تبلیغ وہ دوسروں کو کرتا ہے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے :-

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ

(بقرہ ۵)

کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

بے عمل انسان کے الفاظ، کسی کی لوحِ دل پر نقش نہیں بنا سکتے۔ وہ زبان سے نکل کر کانوں پر ٹکراتے اور فضاؤں میں گم ہو جاتے ہیں۔ دل تک تو صرف اس شخص کی آواز پہنچتی ہے جس کے الفاظ کے پیچھے عمل کی بے پناہ قوت ہوتی ہے، کسی نے کہا ہے

واعظ کا ہر ایک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

یہ "سرورِ عشق" اور "نورِ یقین" عمل کی پیداوار ہیں۔ ان میں ایک ایسی قوت کارفرما ہوتی ہے جو انسانی قلوب کے ساتھ وہی عمل کرتی ہے جو مقناطیس لوہے کے ساتھ۔

مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے علمی غرور کا یہ عالم تھا کہ کسی کو نظر میں نہ لاتے تھے، لیکن جب حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو

"شاہے دید کہ سینۂ مصفیٰ و تقریر	دیکھا کہ ایک بادشاہ ہے جو اپنے سینۂ
دلکشائے او از ضمیر آئندہ حکایت	صافی اور دل کشا تقریر سے آنے والوں کے
می کند و دل از دست می بردے[۵]	دل کا بھید بیان کرتا اور اُن کے دلوں کو اُچک لیتا ہے

---

[۵] سیر الاولیاء ص ۱۷۰

مناقب فخریہ کا مصنف جب پہلی بار شاہ فخر الدین دہلوی رح کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایسا محسوس کرنے لگا

"گویا شرابے بود کہ در جامِ دلِ من ریختند و آتشے بود کہ در سینۂ من انداختند"[51]

گویا ایک شراب تھی جو جام دل میں ڈال دی گئی، یا ایک آگ تھی جو میرے سینے میں بھر دی گئی۔

نظر کی یہ تاثیر عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ مشائخ چشت نے معلم اخلاق کی کامیابی کا یہ راز پیغمبر اسلام کی پاک سیرت سے سیکھا تھا، سیر الاولیا میں لکھا ہے:۔

"سلطان المشائخ فرمود، بنگرید کمال نبوت پیغمبر علیہ السلام والصلوٰۃ کارے بغیر خواست فرمود اوّل خود کرد تا دیگراں کنند و در آں انقیاد نمایند، از دیگرے ایں معنی چگونہ تصور تواں کرد کہ خود نکند و بغیرے فرماید و آں معمول شود، امیر خسرو خوش گوید آں گفت مذکر نکند خلق کہ او را گفتار بسے یابی و کردار نیابی"[52]

سلطان المشائخ نے فرمایا کہ پیغمبر علیہ السلام والصلوٰۃ کا کمال دیکھو کہ جس کام کی اوروں سے درخواست کی پہلے خود عمل میں لائے تاکہ دوسرے لوگ عملی طور پر اس کا اظہار کریں اور اس میں آپ کی فرماں برداری کریں۔ ایسے شخص سے یہ بات کیوں کر متصور ہو سکتی ہے کہ خود نہ کرے اور غیر کو کرنے کا حکم دے۔ امیر خسرو نے کیا خوب کہا ہے کہ جو واعظ اور نصیحت گو ایسی بات کی لوگوں کو نصیحت کرے کہ خود اس پر عامل نہ ہو تو خلق اسے شمار میں نہیں لاتی۔

---

۵۱ مناقب فخریہ (قلمی نسخہ)

۵۲ سیر الاولیاء ص ۳۲۳ (بقیہ ص ۲۴۹ پر)

(۲) ایک معلمِ اخلاق کو پورے طور پر قوم کی اجتماعی اور انفرادی نفسیات سے واقف ہونا چاہیے کسی انسان کے فکر و عمل میں اس وقت تک تبدیلی پیدا نہیں کی جا سکتی جب تک اس کے ذہنی محرکات، قلبی کیفیات اور طبعی رجحانات کا صحیح اندازہ نہ ہو۔ جس صلاحیت کو حضرت شیخ نظام الدین اولیا نے "نفس گیرا" سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقت میں یہ ہی چیز ہے کہ شیخ کی نظر، وجدان یا احساس اتنا تیز ہو کہ وہ دل کی گہرائیوں کا پتہ لگالے۔

اگر ایک مرتبہ انسان کے ان افکار و جذبات کا علم ہو جائے، جو وہ سماج یا قانون یا کسی اور ڈر سے اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے تو اس کی اصلاح و تربیت کا کام بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ انسانی فطرت سے ناواقفیت، اصلاحی کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس میں انسان کے تجربے کو بھی بڑا دخل ہے عوام سے جتنا گہرا تعلق ہوگا اتنا ہی نفسیاتی تجربہ وسیع ہوگا۔ غالباً اسی مصلحت کے پیش نظر مشائخ چشت اپنے خلفار کو خلق میں رہ کر لوگوں کی جفا و قفا برداشت کرنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے، اُن کا یقین تھا کہ جو نفسیاتی بصیرت تجربے کی راہ سے آئے گی وہ زیادہ صحیح اور موثر ہوگی۔

موجودہ زمانے میں ماہرین نفسیات نے تجزیاتِ ذہنی (PSYCHO—ANALYSIS) میں بڑی ترقی کی ہے۔ لیکن عملی طور پر وہ مشائخ کرام سے بہتر نتائج پیدا نہیں کر سکے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کے تجربات محدود ہیں

(بقیہ نوٹ ص ۲۴۸) حضرت عائشہ رضؓ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ آں حضرت کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا "کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا: کان خلقہ القرآن جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے۔ وہی حالِ قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا۔

نھوں نے اس سطح اور اس وسیع پیمانے پر فطرتِ انسانی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس پر ان مشائخ نے کی تھی، بھوکے آدمی کی نفسیات پر وہ شخص کیا کام کر سکتا ہے جس نے عمر میں ایک وقت بھی فاقہ کی زحمت نہ اُٹھائی ہو! صحیح نفسیاتی علم حاصل کرنے کے لئے بڑا خون جگر پینا پڑتا ہے۔ اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو عام لوگوں سے اُن کی زندگی کے ہر شعبہ میں ربط ضبط رکھتا ہو۔ فرائڈ (FREUD) کا شمار بہترین ماہرین نفسیات میں ہوتا ہے۔ اس کے تجربات کی نوعیت یہ تھی کہ وہ چند مقرر شدہ گھنٹوں کے علاوہ لوگوں سے نہیں ملتا تھا اور کہتا تھا کہ اس کا طریقۂ علاج صرف امراء اور رؤسا پر کامیاب ہوتا ہے! ——— مشائخ چشت کی خانقاہیں ہر وقت کھلی رہتی تھیں اور زبانِ حال سے حافظ کا یہ شعر پڑھتی تھیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
گیر دار و حاجبِ درباں ایں درگاہ نیست

ہر قسم کے آدمی ان مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ ہر ایک کے دل کو سکون و اطمینان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔

(۳) ایک معلمِ اخلاق کو مہر و محبت کا مجسمہ ہونا چاہیئے۔ درشت خو آدمی کی بات سننے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ حد یہ ہے کہ مریض کڑوی دوا کو یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ یہ ازالہ مرض کرے گی پینے سے گریز کرتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ	اور (محمد) اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔
(آل عمران ۷)	

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ	تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان نہیں لاتا جب تک میں اس کے باپ اور بچوں سے زیادہ اس کو محبوب نہ ہو جاؤں۔

جو معلم اخلاق، اپنی محبت سے قلوب انسانی پر قبضہ کرلیتا ہے، اس کو اپنا پیغام دل کے کانوں میں پہنچانے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

اصلاح وتربیت کے طریقے | (۱) علم نفسیات میں انسان کی تین کیفیات سے بحث کی جاتی ہے۔ ادراک۔ احساس اور عمل (KNOWING FEELING WILLING) ہر انسانی فعل، ادراک و احساس کی منزل سے گزرتا ہے ——— سماج اور حکومت، عمل پر مواخذہ کرتے ہیں۔ قانون تعزیرات کی کوئی دفعہ، ادراک و احساس کی منزل پر جرائم کا احتساب نہیں کرسکتی۔ مشائخ کی اصلاح کا بنیادی طریقہ اور اصول یہ تھا کہ انسان کا عمل درست کرنے کے لئے ادراک و احساس کو درست کیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ برا فعل برا ہے۔ لیکن برا خیال اس سے بھی برا ہے، جسم کی جنابت پانی سے دور ہو جاتی ہے۔ لیکن دل کی جنابت دور کرنے کے لئے یہ پانی کافی نہیں۔ وہ آنکھوں کے پانی سے دھلتی ہے۔ اور نالہ ہائے نیم شبی سے اس کے اثرات محو ہوتے ہیں۔ انسان کی صحیح تربیت وہ ہے جو اس کے ادراک، احساس اور عمل کو درست کرے، وہ صرف برے عمل ہی سے پرہیز نہ کرے، بلکہ برے خیالات اور برے احساسات سے بھی بچے۔ صرف اس کی گردن سے زنار ہی نہ دور کر دیا جائے بلکہ اس کی پیشانی میں چھپے ہوئے سجدہ ہائے صنم بھی نکال دئے جائیں۔ ایک دن حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا:-

"اول خطرہ است یعنی اول چیزے	اول خطرہ ہے یعنی وہ چیز جو دل میں

در دل بگذرد، بعد ازاں عزیمت است یعنی برآں اندیشہ دل می بندد، و بعد ازاں فعل است یعنی آں عزیمت را بفعل رساند بعد ازاں فرمود کہ عوام را تا فعل نکنند نگیرند اما خواص را ہم در خطرہ مواخذہ باشد" [۵۱]	گذرے اور بعد ازاں عزیمت ہے، یعنی اسی اندیشے پر دل لگے۔ اور پھر فعل ہے یعنی وہ ارادہ فعل میں بدلتا ہے۔ بعد ازاں فرمایا کہ عوام سے جب تک فعل سرزد نہ ہو مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ لیکن خواص سے خطرہ کی صورت ہی میں مواخذہ کر لیتے ہیں

پھر اس کی مزید توضیح کے لئے انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ایک حکایت بیان فرمائی کہ شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو خیال میرے دل میں گزرا اُس کے فعل کی مجھ پر تہمت لگی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک درویش آپ کی خانقاہ میں آیا۔ شیخ نے اس کا خاص احترام کیا اور اپنی لڑکی سے کہا کہ پانی لاکر اس کے سامنے پیش کرے۔ لڑکی نے نہایت ادب و عزت سے پانی پیش کیا۔ شیخ ابوسعیدؒ کو لڑکی کا ادب بہت پسند آیا۔ دل میں خیال کیا کہ وہ کیسا نیک بخت ہوگا جس کی منکوحہ یہ لڑکی بنے گی۔ تھوڑی ہی دیر بعد حسن موذن نے آکر شیخ کو بتایا کہ بازار میں لوگ یہ کہہ رہے تھے۔ کہ

"شیخ ابوسعید می خواہد کہ دختر خود را در حبالۂ خود آرد"

شیخ ابوسعید یہ سُن کر ہنس پڑے اور کہا:۔

"ہم آں خطرہ مرا بر من مواخذہ کردند" [۵۲]

---

[۵۱] فوائد الفواد۔ ص ۱۸

[۵۲] فوائد الفواد ص ۱۹

(۲) یہ اصول تسلیم کر لینے کے بعد کہ انسانی اعمال کی درستگی کے لئے ادراک و احساس کی اصلاح ضروری ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے کون سے ذرائع استعمال کرنے چاہئیں۔

انسان کی جن دو قوتوں کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح نے بہیمی اور ملکوتی کا لقب دیا ہے[۵۱] "ان کو حضرت محبوب الٰہی رح نفس اور قلب سے تعبیر کرتے ہیں۔ نفس میں دشمنی، غوغا اور فتنہ ہے۔ قلب میں سکوت، رضا اور نرمی[۵۲] ایک کا رجحان برائی کی طرف ہے دوسرے کا بھلائی کی جانب۔ برائی کا سدِّباب نفس کو کچلنے سے نہیں۔ بلکہ قلب کو بیدار کرنے سے ہو سکتا ہے۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ انسان کی کسی فکری یا ذہنی کیفیت کو زبردستی دور نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کا جسم زنجیروں سے جکڑا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ذہن پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ بعض صورتوں میں ایسا محسوس ضرور ہوتا ہے کہ زبردستی جو کیفیت دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ کامیاب ہو گئی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ جس ذہنی کیفیت کو ایک جگہ دبا دیا جاتا ہے وہ دوسری جگہ ایک ضغطۂ دماغی (COMPLEX) کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ اور اس طرح خود بہت سی ذہنی کشیدگیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا صحیح فکری مزاج قائم نہیں رہتا اس میں قنوطیت، بے عملی، پست ہمتی اور خوف کی مختلف کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

برائی کو دور کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ قلب کو بیدار کرنا ہے۔ جب

---

۵۱ ملاحظہ ہو، شاہ ولی اللہ دہلوی رح کا وصیت نامہ اور حجۃ اللہ البالغہ

۵۲ فوائد الفواد ص ۱۲۴

لب قوت حاصل کرلیتا ہے۔ تو نفس کے تقاضے خود بخود خاموش ہو جاتے ہیں
نسان کی بہیمی قوت کم زور پڑ جاتی ہے اور وہ شیخ نظام الدین اولیاؒ کی اس نصیحت
پر کہ ـــــــ "از سر شہوات باید گذشت"[۵۱] عمل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

قلب صوفیہ کے نزدیک کیا چیز ہے؟[۵۲] اور کس طرح بیدار ہو سکتا ہے؟ ـــــــ
جمالاً اس ضمن میں صوفیہ کے خیالات یہ تھے۔

(۱) دِل انوارِ ربّانی کا محل ہے۔ معرفتِ حق اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ انسان کے جسدِ خاکی میں یہی وہ حصہ ہے جو اس کو مبدءِ فیاض سے ملاتا ہے، ـــــــ کی راہیں دکھاتا اور مضرابِ حیات کو نظامِ ربوبیت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کو اپنا دار الملک بتایا ہے اور کہا ہے قلوب احبائی دار ملکی۔ (روح الارواح)

---

۵۱ فوائد الفواد ص ۱۱

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہاں نفسانی خواہشات کو کچلنے کی نہیں بلکہ اُن پر سے گزر جانے کی نصیحت کی ہے۔

۵۲ یہ ایک ایسا عنوان ہے جس پر صوفیہ نے تفصیل سے لکھا ہے۔ روح الارواح، احیاء العلوم، عوارف المعارف وغیرہ میں اس پر کافی معلومات درج ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی دو مشہور کتابیں دل کے فائدے، (فوائد الفواد) اور دل کی غذا (قوت القلوب) کے نام سے مرتب کی گئی تھیں۔ خاکسار کے خیال میں اس عنوان پر سب سے زیادہ دلچسپ اور مکمل کتاب رسالہ مطلوب فی عشق المحبوب ہے جو فیروز شاہ تغلق کے عہد میں محمد امیر نے تصنیف کی تھی۔ یہ رسالہ ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے اور غالباً اب تک شائع نہیں ہوا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ خاکسار کے پاس ہے۔ اس میں چار باب ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں (۱) در بیان عشق۔ در بیان دل۔ در بیان حجاب ہائے دل۔ در بیان وصول الی اللہ۔

میں رسول پاک ؐ کی ایک حدیث درج ہے کہ القلب بیت اللّٰہ۔

(۲) لیکن ہر انسان کا دل انوارِ ربانی کا محل نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کی مثال آئینہ کی سی ہے۔ جب اس پر حجابات پڑ جاتے ہیں تو وہ نظارۂ جمال کے قابل نہیں رہتا پیکرِ انسانی میں دو قوتیں کام کر رہی ہیں بہیمی اور ملکوتی۔ ایک انسان کو نیچے کی طرف کھینچتی ہے۔ دوسری اوپر کی طرف، جو قوت زور پکڑ جاتی ہے اسی سے قلب متاثر ہو جاتا ہے۔ مصباح الہدایت میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"دل نتیجۂ روح و نفس است، درمیان نفس و روح تجاذب و تطارد واقع۔ روح خواہد کہ نفس را بعالمِ خود کشد و نفس خواہد کہ روح را بعالمِ خود کشد۔ و ہمیشہ دریں تنازع و تجاذب باشند۔ گاہ روح غالب می شود و نفس را از مرکزِ سفلی بمقام علوی می کشد۔ و گاہ نفس غالب می گردد و روح را از اوجِ کمال بحضیضِ نقصان می کشد و دل پیوستہ تابع آں طرف بود کہ غالب گردد۔"[۵]

مختصر یہ ہے کہ جب نفس یا بہیمی قوت غالب آجاتی ہے تو آئینۂ دِل غبار آلود ہو جاتا ہے۔ اس میں انوارِ ربانی کو کھینچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ حضرت چراغ دہلوی ؒ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث:

الا ان فی الجسد لمضغۃ	معلوم ہونا چاہیے کہ انسان کے جسم میں
اذا صلحت صلح الجسد کلہ	گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جس پر انسان کی
و اذا فسدت فسد الجسد	اچھائی برائی کا مدار ہے وہ جب ٹھیک ہوتا
کلہ الا وھی القلب	ہے تو انسان ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ بگڑ
	جاتا ہے تو انسان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے
	اور وہ اس کا دل ہے۔

[۵] مصباح الہدایت (مطبع نولکشور) ص ۲۷ - ۷۲

پڑھ کر دل کی بیماریوں کا حال بیان فرمایا کرتے تھے۔

جب بہیمیت کا پورا تسلط اور غلبہ ہو جاتا ہے تو انسان کے کان کسی بھلائی کی بات سننے اور اس کا دل کسی ہدایت کو سمجھنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے: خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ

(۳) انسان میں بہیمی یا ملکوتی قوت کے غالب آنے کے کیا اسباب ہوتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک پورا باب:-

فی اسباب الخواطر الباعثۃ علی الاعمال[۵]

(ان ارادوں کے اسباب میں جو کاموں کے باعث ہوتے ہیں)

قائم کیا ہے اور اس پر بحث کی ہے۔ مجموعی طور پر اگر حجۃ اللہ البالغہ کی روشنی میں ان اسباب کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے جو اعمالِ انسانی کے اصل محرک ہوتے ہیں تو ہم مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچیں گے۔

(ا) انسان کا پیدائشی مزاج

(ب) معاشی حالات

(س) ماحول

(ش) غذا

اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

"انھیں اسباب میں سے آدمی کا پیدائشی مزاج ہے جو خورونوش وغیرہ کی محیط تدابیر سے متغیر رہتا ہے۔ مثلاً گرسنہ کھانے کو طلب کرتا ہے، اور

۵؎ حجۃ اللہ البالغہ (حمایت الاسلام پریس لاہور) جلد اول ص ۸۴ - ۷۴

اور تشنہ پانی کو لو خواہش نفسانی والا عورتوں کی جانب مائل ہوتا ہے۔ اکثر لوگ مقوی باہ غذاؤں کا استعمال کرتے ہیں تو اُن کا عورتوں کی طرف میلان ہو جاتا ہے۔ ان کے دلوں میں ایسے ہی ایسے خیالات اور وسوسے گذرتے ہیں جن کو عورتوں سے تعلق ہوتا ہے .... اکثر لوگ سخت غذاؤں کا استعمال کرتے ہیں، اُن سے وہ سنگ دل ہو جاتے ہیں۔ قتل کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ایسے ایسے موقعوں پر غصہ ظاہر کرتے ہیں جہاں اوروں کو غصہ نہیں آتا۔" لہ

(۴) قلب کی صحیح کیفیت قائم رکھنے اور ملکوتی قوتوں کو اُبھارنے کے لیے عبادات کی ضرورت ہے۔ ارکانِ دین کے علاوہ تصوف کے اعمال و اشغال کا مقصد بھی یہی ہے کہ قلب کو اس طرح بیدار کر دیا جائے کہ اس پر ملکوتی رنگ غالب آجائے۔

نماز اگر صحیح اور مکمل طور پر ادا کی جائے تو یہ اچھے اخلاق پیدا کرتی ہے۔ اور برائی سے بچاتی ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ "جس شخص کی نماز اس کو بُرائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے۔" جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نماز کا مقصد اچھے اخلاق پیدا کرنا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں " میں کہتا ہوں نماز میں دونوں باتیں موجود ہیں۔ تزکیۂ نفس اور اخبات اور اس کی وجہ سے نفس کہ پاک ہو کر عالمِ ملکوت تک رسائی ہو جاتی ہے۔" تلاوتِ کلامِ پاک کے فوائد بیان کرتے

لہ حجۃ اللہ البالغہ ص ۸۴ - ۷۴ ۵۲ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۲۷۹

ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس سے نفس آسمانی اثرات قبول کرنے کے قابل ہوجاتا ہے [۵۱] حدیث شریف میں آیا ہے :-

لِکُلِّ شَیْءٍ مصقلۃ و مصقلۃ القلب تلاوۃ

(ہر چیز کے لئے ایک خاص صیقل ہوا کرتی ہے اور دل کی صیقل قرآن کی تلاوت کرنا ہے)

شاہ صاحبؒ نے ارکانِ دین کے اسرار بیان کرنے میں جن نفسیاتی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے، ان سے ہمارے اس خیال کی پوری تائید ہوتی ہے کہ ارکانِ دین کو صحیح جذبہ کے ساتھ ادا کیا جائے تو قلب کی ملکوتی کیفیت اُجاگر ہوجاتی ہے اور خود بخود اچھے اخلاق پیدا ہوجاتے ہیں۔ عبادات کے اس اہم پہلو کے مطالعہ کے لئے حجۃ اللہ البالغۃ کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

مشائخ کے اشغال و اعمال کا سب سے اہم پہلو یہی ہے کہ اُن کے ذریعے انسانی قلوب کی صفائی ہوجاتی ہے۔ اور بہیمی قوت کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ صرف مشائخ سلسلہ چشتیہ کے اشغال پر ہی غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں کیا کیا مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ ذکر خفی و جلی کا جو طریقہ چشتیہ سلسلہ میں رائج ہے اس سے ایک رگ جس کا نام کیاس ہے۔ خاص طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اس سے دل میں ایسی گرمی پیدا ہوتی ہے جس سے وسوسے خود بخود دفع ہوجاتے ہیں اور جمعیتِ خاطر پیدا ہوجاتی ہے۔ ذکر کا یہ فائدہ شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے اپنے بیٹے شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے بیان کیا تھا [۵۲]۔ شاہ کلیم اللہ دہلویؒ نے کشکول کلیمی میں ذکر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذکر، نفسیاتی خطرے اور شیطانی وسوسے سے

---

[۵۱] حجۃ اللہ البالغۃ ۔ جلد اول ص ۱۴۳

[۵۲] قول الجمیل ص ۸۴-۸۷ (مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ)

دل کی صفائی کرتا ہے اور باطن کو اس طرح بھرتا ہے کہ اگر کوئی خطرہ دل میں آنے کا ارادہ کرے تو ہرگز نہ آسکے[۵۱]

مراقبہ کے متعلق شاہ کلیم اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ یہ دل کا نگراں ہوتا ہے۔ تین چیزوں سے دل میں مرض پیدا ہوتا ہے۔" اول حدیث نفس ہے جو خلا و ملا میں قصد و اختیار سے دل میں آتی ہے۔ دوسرا خطرہ ہے جو دل میں بلا قصد و ارادہ کے آتا جاتا ہے تیسرا غیر کی طرف نظر ڈالنا ہے یعنی علم اشیا و متکثرہ[۵۲] ان امراض کا علاج مراقبہ سے ہو جاتا ہے۔ شیخ عزیز الدین نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں عزیز الدین تم روزے رکھا کرو۔ اور دل کے روزے رکھا کرو۔ شیخ عزیز الدینؒ نے حضرت چراغ دہلویؒ سے یہ خواب بیان کیا تو فرمایا کہ حضرت نے اس طرح تمھیں مراقبہ کا حکم دیا ہے[۵۳]

(۳) انسان میں اچھائیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی ہوتی ہیں برائیوں کو دور کرنے کے لئے، انسان کی اچھائیوں کو اچھالنا چاہئے۔ اس کا ایک نفسیاتی اثر انسان کی طبیعت پر مرتب ہوتا ہے اور وہ خود بخود برائیوں سے گریز کرنے لگتا ہے۔ موجودہ زمانے میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے مشائخ چشت کے اس اصلاحی اصول کو خوب اچھی طرح سمجھا تھا اور وہ اس پر عامل بھی تھے۔ آخری علالت کے زمانے میں انھوں نے ہدایت فرمائی تھی :-

"یاد رکھو کہ مسلمانوں کی برائیوں کا انسداد اُن کی برائیوں کی برائی بیان کرنے سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ چاہئے کہ ان میں جو ایک آدھ بھی اچھائی موجود

۵۱، ۵۲ کشکول کلیمی (قلمی نسخہ)

۵۳ سیر الاولیاء۔ ص ۱۰۴

ہواس کی تسخیر کی جائے، برائیاں خود بخود دور ہو جائیں گی [1]

(۴) جس انسان کی اصلاح و تربیت مقصود ہو، اس کو ہمدردانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مصلح کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس انسان کی اصلاح کرنا چاہتا ہو، پہلے اس کی اندرونی کش مکش اور خلش کا پتہ لگائے۔ پھر ایسے دبے پاؤں جاکر اس کے دل کی دنیا کا جائزہ لے کہ وہ افشاء راز پر گھبرا نہ جائے اُس کا پردہ فاش نہ ہو، لیکن اس کی اصلاح کا سامان مہیا ہو جائے۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا ایک واقعہ اس اصول کی بہترین وضاحت کرتا ہے۔

شعبان (۷۱۹ھ) کی ۲۱ تاریخ تھی اور ہفتہ کا دن۔ ایک عالم نے آکر حضرت محبوب الٰہیؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور عرض کیا کہ مرید ہونے کے ارادے سے آیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک دفعہ افغان پور میں دریا کے کنارے شام کی نماز میں مشغول تھا کہ جناب کی صورتِ پاک دیکھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ پہلے اس صورت سے آشنا نہ تھا۔ الغرض جب جناب کا دیدار ہوا تو نماز ہی میں درہم برہم ہونا چاہا۔ آخر جب نماز سے فارغ ہوا تو دل میں کہا کہ مجھے مخدوم عالمیان کی خدمت میں جاکر مرید ہونا چاہیئے۔ اب میں اسی مقصد سے آیا ہوں۔ جوں ہی اس عالم نے یہ حکایت ختم کی، محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ایک مرتبہ کوئی شخص دہلی سے اس نیت سے روانہ ہوا کہ بابا فریدؒ کی خدمت میں پہنچ کر توبہ کرے۔ اثنا راہ میں ایک مطربہ اس کے ساتھ ہوگئی اور اس کوشش میں رہی کہ کسی نہ کسی طرح اس شخص سے تعلق پیدا کرلے۔ اس شخص کی نیت صاف تھی۔ اس عورت کی طرف راغب نہ ہوا۔ آخرکار ایک منزل میں وہ دونوں اتنے قریب آگئے، کہ ان میں کوئی حجاب نہ رہا۔ ایسی حالت

---

[1] حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۱۵۵

ہیں اس کا دل بھی عورت کی طرف راغب ہو گیا۔ اُس سے بات کی یا ہاتھ بڑھایا۔ اسی وقت ایک آدمی کو دیکھا جس نے آکر اس مرد کے چہرے پر تھپڑ مارا اور کہا تو تو فلاں شخص کی خدمت میں توبہ کی نیت کر کر جا رہا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ اسی وقت متنبہ ہوا۔ اور پھر اس عورت کی طرف نہ دیکھا۔ جب وہ شخص بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے سب سے پہلے یہی فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے تجھے اس روز بہت بچایا[۵]

بظاہر حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا بیان کیا ہوا۔ یہ قصہ بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے۔ آنے والے نے کچھ بات کہی اور اُنھوں نے کچھ۔ لیکن حقیقت میں یہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے اندازِ اصلاح و تربیت کا بہترین آئینہ دار ہے۔ حضرت میں "نفس گیرا" بدرجہ اتم تھا۔ انھوں نے اس عالم کی ذہنی کش مکش اور تکلیف کا پتہ لگا لیا تھا۔ وہ بھی غالباً کسی جنسی بے چینی اور خلش میں مبتلا تھا جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ شیخ نے اس کی حالت کا جائزہ لے لیا اور پھر مناسب حال بابا فریدؒ کا ایک واقعہ بیان کر دیا۔ جس کو دوسرے حاضرینِ مجلس نے غالباً بابا صاحبؒ کی کرامت کی حیثیت سے سُنا، لیکن آنے والے نے اس میں اپنے درد کا علاج پایا۔

(۵) اگر کوئی انسان کسی برائی کا شکار رہے تو اس سے یہ کہنا کہ تم اُسے چھوڑ دو سود مند نہیں ہو سکتا۔ اس مطالبہ کے بعد اس میں ایک ایسی کش مکش پیدا ہو جائے گی جو اس کی خواہشات کو تحت الشعور میں اُتار کر بہت سی ذہنی الجھنوں کو اُبھار دے گی۔ اس کے برخلاف اگر کسی خیال کو چھوڑ دینے کا تقاضا کرنے کے

---

[۵] فوائد الفواد ص ۲۲۰ - ۲۱۹

بجائے کوئی اور دلچسپی (COUNTER ATTRACTION) پیدا کرا دی جائے تو غیر محسوس طریقے پر وہ خیال اس کے ذہن سے نکل جائے گا۔ مثلاً ایک ایسے شخص سے جس پر جنسی جذبات کا غلبہ ہے، یہ کہنے کے بجائے کہ تم ان جذبات سے باز آجاؤ۔ یہ کہا جائے کہ تم ہر اس موقع پر جب کسی غیر مناسب جذبے کا شکار ہو اپنے شیخ کا تصور کر لیا کرو، تو اس پر بہت اچھا اثر پڑے گا، اور وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کے قابل ہو جائے گا۔

قرآن کے اس ارشاد میں کہ

اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ

(بے شک نیکیاں، برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔)

ایک زبردست نفسیاتی حقیقت پوشیدہ ہے۔ مشائخ چشت نے اس حقیقت کو خوب سمجھا تھا۔ اسی بنا پر وہ کسی برائی کو دور کرنے کے لئے کسی غیر متعلق نیکی کو ابھارنے کی کوشش کرتے تھے۔

(۷) انسان کی اصلاح و تربیت میں تبدیلیِ ماحول سے زیادہ موثر کوئی چیز نہیں ہے۔ مشائخِ چشت کا خیال تھا کہ انسان کے بہت سے رجحانات، افکار اور احساسات ماحول ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر ماحول میں مناسب ردّوبدل کر دیا جائے تو انسان کی بہت سی خرابیوں کی اصلاح ہو جائے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک دن صحبت پر گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا:

"صحبت را اثرِ قویست" [۵۷]

حضرت محبوب الٰہیؒ کا صحبتِ صالح پر بڑا زور تھا۔ وہ اپنے مریدوں سے اکثر ان

---

[۵۷] فوائد الفواد۔ ص ۱۲

کی صحبت کے متعلق دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن امیر حسن سنجری رح سے پوچھا "مصاحبت بیشتر با کہ میکنی"۔ پھر ہدایت فرمائی:۔

باعاشقاں نشیں و غم عاشقی گزیں — باہر کہ نیست عاشق کم کن از و قرین[۵]

سلطان قطب الدین مبارک خلجی کی عیش پرستی کی تفصیل برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں درج ہے۔ حضرت محبوب الٰہی رح سے اس کے تعلقات بہت خراب تھے۔ ایک مرتبہ شیخ سے اس کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے یہ حدیث نبوی اس کو پڑھ کر سنائی:۔

مامن صاحب یصحب صاحبۃ ولو ساعۃ من لیل او نہار الا یسال اللہ عن صحبتہ ھل ادیت فیھا حق اللہ ام لا

(جو شخص کسی صالح آدمی کی صحبت میں بیٹھے گا اگر ایک ساعت ہی بیٹھا ہو تو خدا تعالےٰ اس صالح سے سوال کرے گا کہ تو نے اپنی صحبت کا حق ادا کیا یا نہیں۔)

"از من و تو برائے ایں صحبت خواہند پرسید کہ بچہ نیت بود و حقوق صحبت چگونہ رعایت یافت"۔[۶]

(قیامت کے دن) تجھ سے اور مجھ سے اس صحبت کی بابت پوچھا جائیگا کہ کس نیت سے تھی اور حقوق صحبت کو کس طرح ادا کیا

شاہ کلیم اللہ دہلوی رح اور شاہ محمد سلیمان تونسوی رح نے اپنے اصلاحی پروگرام میں ماحول کی تبدیلی پر بڑا زور دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ماحول تبدیل نہ ہونے کی صورت میں اصلاح باطن کی ساری کوششیں کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق رہتی ہیں۔ شاہ کلیم اللہ رح اپنے مریدین کو برابر خطوط لکھتے رہتے تھے اور اُن سے ان کے ماحول کے متعلق دریافت فرمایا کرتے تھے۔ اُن کی ہدایت تھی کہ کوئی ایسا شخص جس کو تمھاری دینی جدوجہد میں دلچسپی نہ ہو تمھارا مصاحب نہیں بننا چاہئے۔ شاہ سلیمان تونسوی بری صحبت کے اثرات کے سلسلے میں عوارف المعارف کی ایک عبارت نقل کیا کرتے تھے کہ ایک

---

۵ فوائد الفواد۔ ص ۲۲ — ۶ سیر الاولیاء۔ ص ۵۵۸

سانپ ایسا ہوتا ہے کہ جس پر اس کی نظر پڑ جاتی ہے وہ جل جاتا ہے۔ جب حیوانات کے یہ اثرات ہیں تو پھر برے انسانوں کی صحبت کے اثرات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے

(۷) مصباح الھدایت میں لکھا ہے :۔

" سبب خلاص نفس از مہالکِ ذنوب توبہ است "[۵۲]

مشائخ کے اصلاحی طریقۂ کار میں توبہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ترکِ معصیت میں کوئی چیز اتنی ممدو معاون نہیں ہوتی جتنی توبہ۔ توبہ کے بعد انسان دوبارہ جنم لیتا ہے ماضی سے اس کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ توبہ انسان کی زندگی میں ایک ایسا موڑ ہے جہاں سے وہ ایک نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ یہ موڑ انسان کی زندگی میں جتنی جلد آجائے اچھا ہے۔ ورنہ بڑھاپے میں تو اس کے علاوہ چارہ کار ہی نہیں ہوتا حضرت محبوب الٰہیؒ کا قول ہے :۔

" توبہ دانایت در حال جوانی نیکو می آید، در پیری چہ کند کہ تائب نہ شود "[۵۳]

مشائخ چشت نے توبہ کی تین قسمیں کی ہیں :۔

توبہ حال - توبہ ماضی - توبہ مستقبل

توبہ حال یہ ہے کہ انسان کئے ہوئے گناہ پر پشیمان ہو۔ توبہ ماضی یہ ہے کہ جن لوگوں کے حقوق ہیں اُن کو پورا کرے۔ اگر کسی کو برا بھلا کہا ہے تو اس سے معافی مانگے کسی سے قرض لیا ہے تو وہ قرض ادا کرے۔ اگر کسی کی منکوحہ یا لونڈی سے زنا کیا تھا،

---

۵۱ نافع السالکین ص ۵۲

۵۲ (مطبوعہ ایران) ص ۳۶۶

۵۳ فوائد الفواد۔ ص ۲۱۹

نہ مانگے بلکہ اللہ کی پناہ تلاش کرے۔ اگر شراب پیتا تھا تو توبہ کرکر لوگوں کو
ربت اور ٹھنڈا پانی پلائے۔ توبہ مستقبل یہ ہے کہ نیت کرے کہ آیندہ ارتکاب
ں کرے گا۔[۵۱]

صلاح و تربیت میں خانقاہ کی اہمیت | مشایخ چشت کی اصلاحی جدوجہد
ان کی خانقاہیں تھیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نوعیت
ربیت پر یہاں غور کرلیا جائے

خانقاہ کے لفظی معنی پر بڑا اختلاف ہے۔ مصباح الہدایت کے ایرانی مصحح
جلال الدین ہمائی اُستاد دانش گاہ کا خیال ہے کہ یہ لفظ خوانگاہ کا معرب
ں کے معنی ہیں کھانے کی جگہ[۵۲] شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح کا خیال ہے کہ
خان اور قاہ سے مرکب ہے۔ خان بمعنی خانہ، قاہ بمعنی عبادت یا دعا
بادت کا گھر[۵۳] حضرت چراغ دہلوی رح کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔
تاسیس خانقاہ کے مقاصد اور فوائد یہ تھے:۔

، شیخ کو ایک علیحدہ اور مخصوص مقام پر اپنے مزاج اور اصولوں کے مطابق لوگوں کی اصلاح
، کا موقع مل جاتا تھا۔

۱، مصباح الہدایت کے مصنف نے لکھا ہے:۔

"بناء خانقاہ بر صنعتے کہ اصل وضع اوست نیتے ست از زینتہائے
ملتِ اسلام" [۵۴]

فوائد الفواد

مصباح الہدایت۔ ص ۱۵۴

خیر المجالس۔ مجلس ۷۵

، مصباح الہدایت (مطبوعہ ایران) ص ۱۵۳

اور یہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں خانقاہیں اسلامی تہذیب و تمدن کا بہترین مرکز تھیں۔

(۳) جن دین دار لوگوں کا کوئی مسکن وماویٰ نہ ہوتا تھا، وہ خانقاہوں میں قیام کر لیتے۔ اور اپنے آپ کو دینی جد و جہد کے لئے وقف کر دیتے۔

(۴) مختلف طبائع اور مختلف مقامات کے افراد ایک جگہ مِل جُل کر رہتے اور اس طرح بہت کچھ ایک دوسرے سے حاصل کرتے۔ ان میں رابطہ محبّت قائم ہو جاتا، اور اس طرح "قلوب و نفوس و ارواح و اشباح شان از پرتوِ انوار یک دیگر متعاکس مقتبس شوند"۔[1]

(۵) یہ خانقاہ ایک ایسی تربیت گاہ ہوتی تھی، جہاں پہنچ کر بڑے سے بڑے گنہگار کی ذہنی آب و ہوا بدل جاتی تھی۔ تقویٰ، دین داری، خلوص اور توکل کا یہ ماحولِ انسانی قلوب پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ بہت سے ناواقف لوگ مشایخ سے بحث کرنے کی نیت سے خانقاہ میں آتے، لیکن وہاں کی دینی فضا دیکھ کر ایسے مرعوب ہو جاتے کہ پھر اس در کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوتے۔

(۶) مشایخ چشت کی خانقاہیں صرف تزکیۂ باطن اور تہذیبِ نفس ہی کے لئے مخصوص نہ تھیں، بلکہ وہاں دینی تعلیم کا بھی بندوبست ہوتا تھا۔

---

[1] مصباح الہدایت (نولکشور) ص ۱۱۸

(۲)

دینی تربیت | مشایخ چشت کی اصلاحی جدو جہد کا آغاز دینی تربیت سے ہوتا تھا ارکانِ اسلام کی پابندی پر وہ خاص زور دیتے تھے، اور چاہتے تھے کہ اُن کے خلفاء اس معاملے میں سختی سے کام لیں۔ ان کا عقیدۂ راسخ یہ تھا کہ ارکان اسلام کی پابندی کے بغیر کوئی روحانی ترقی ممکن نہیں۔ راہِ سلوک کی پہلی منزل یہی ہے جو یہاں بھٹک گیا، وہ ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت میں گر گیا۔

(۱) نماز۔ مشایخ چشت، نہ صرف خود نماز بجماعت کی پابندی کرتے تھے، بلکہ تمام متعلقین پر اس معاملہ میں سختی برتتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے متعلق لکھا ہے:

"دراں باب نیکو غلو فرمود"[۱]

حضرت چراغ دہلویؒ جس سوزِ دل کے ساتھ نماز بجاعت کی تلقین فرماتے تھے اس کا احساس خیر المجالس کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے[۲] شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ان کے سلسلہ کے مشایخ نے اس معاملہ میں جو سختی برتی۔ اس کی تفصیل آیندہ صفحات میں ملے گی۔

---

[۱] فوائد الفواد۔ ص ۱۰۶

سیر الاولیاء میں ایک طویل نکتہ "نماز کی اہمیت پر ہے (ص ۳۹۵۔ ۳۹۱)

[۲] خصوصاً ملاحظہ ہو، مجلس ۶،

(۲) روزہ۔ سلطان المشایخؒ کا قول ہے کہ روزہ بدکار کے لئے ڈھال اور نیک کار کے لئے جنت ہے[۵] شاہ سلیمان تونسویؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ رمضان کے روزے اس عذر سے چھوڑتے ہیں کہ ان سے خشکی ہوتی ہے وہ گمراہیٔ نفس کا شکار ہیں[۵]

(۳) زکوٰۃ۔ حضرت محبوب الٰہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہیں[۵] جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اس کی نماز بھی قبول نہیں ہوتی۔ امیر خورد نے محبوب الٰہی کے قلم سے لکھی ہوئی یہ عبارت دیکھی تھی۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ جو قوم زکوٰۃ
ما منع قوم من الزکوٰۃ الا	ادا کرنے سے باز رہتی ہے خدا تعالےٰ
حبس اللہ عنھم المطر ولولا	اُن سے بارش روک لیتا ہے اور اگر
البھائم لم تمطر[۵]	بہائم نہ ہوتے تو کبھی مینہ نہ برسایا جاتا۔

(۴) حج۔ صاحب استطاعت پر فرض ہے۔ بہت سے لوگ یا تو سیر و تفریح یا نمود کی خاطر حج کرنے کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس چیز کی مشایخ چشت نے مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ مکان کے بجائے مکین کو تلاش کیا جائے تو بہتر ہے۔ حج کے سلسلے میں مشایخ چشت کے رویے کی وضاحت کے لئے سیر الاولیاء، اور مکتوبات شیخ الاسلام میں مولانا حسین احمد مدنی کا وہ خط جو انھوں نے ایک مرید کے نام حج کے سلسلے میں لکھا ہے وہ مطالعہ کرنا چاہیے۔

(۵) اتباعِ شریعت۔ مشایخ چشت، خود زندگی کے ہر شعبہ میں اتباعِ شریعت و سنت

---

۵ سیر الاولیاء میں روزہ کی فضیلت پر تفصیلی بحث ہے۔ ص ۴۰۲ - ۳۹۹ -

۵ نافع السالکین ص ۱۰۹

۵ سیر الاولیاء - ص ۴۰۷ - ۴۰۲ -

۵ سیر الاولیاء

ہتمام کرتے تھے اور متعلقین سے اس کے فوائد بیان کرتے تھے۔ شاہ کلیم اللہ رح
نے خلفاء کو ہدایت فرماتے ہیں۔

"ہمہ داخلان طریقت را تاکید نمایند کہ ظاہر شریعت آراستہ دارند
و باطن بعشق مولے پیراستہ سازند"[۵]

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح نے اپنی ایک تصنیف السنۃ الجلیہ
فی الچشتیہ العلیہ میں[۵۲] بڑی محنت سے متعدد ملفوظات اور تذکروں کی مدد سے
مشایخ چشت کا اتباع سنت و شریعت میں
انہماک دکھایا ہے

تعلیم اخلاق | مشایخ چشت کے اصلاحی پروگرام کا مرکزی نقطہ اور محور تعلیم
اخلاق تھا۔ وہ اس کو کار نبوی سمجھتے تھے اور دن رات اسی کوشش میں رہتے
کہ انسان کے اخلاقِ ذمیمہ کو دور کر کے اس کی شخصیت کو جلا دی جائے۔

مکتوبات کلیمی۔ ص ۹۵ مکتوب ۱۲۹

یہ کتاب بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے، لیکن اس میں ایک شدید نقص ہے اور وہ یہ کہ
موضوع ملفوظات کو بڑی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ عرصہ ہوا راقم السطور نے
مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے اس بارے میں استفسار کیا تھا تو انھوں نے لکھا
مولانا تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے شہرتِ عام کی بناء پر ان کو قبول کیا ہے۔ مولانا تھانوی رح
جیسے عالم کا جعلی ملفوظات کو محض شہرت عام کی بنا پر استعمال کرنا تعجب خیز ہے۔
ان ملفوظات کے غیر معتبر اور جعلی ہونے کے متعلق ملاحظہ ہو۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب
کا مضمون "CHISHTI MYSTIC RECORDS OF THT SUTTANATE PERIOD.
مطبوعہ MEDIEVAL INDIA QUARTERLY اکتوبر ۱۹۵۰ء

بابا فرید فرمایا کرتے تھے کہ پیر مشاطہ کی مانند ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح مشاطہ، دلہن کو بناتی اور سنوارتی ہے۔ اسی طرح پیر اپنے مرید کے اخلاق و عادات کو سنوارتا ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے حسنِ اخلاق کا کمال حضرت علیؓ کی بیان کی ہوئی اِن تین چیزوں میں پایا تھا

(۱) لوگوں سے خندہ پیشانی کا برتاؤ۔

(۲) کسبِ حلال

(۳) بندگانِ خدا پر توسع [۵۱]

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تین چیزیں زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہیں۔ اُن کا خیال رکھنے سے زندگی کا ہر شعبہ سنور سکتا ہے۔

تعلیمِ اخلاق کے سلسلہ میں مشائخِ چشت کا اصرار جن چیزوں پر خصوصیت کے ساتھ تھا وہ یہ ہیں۔

(۱) اصلاحِ نیت۔ نیت کی درستگی، مشائخ کی نظر میں، سب سے زیادہ اہم تھی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ فرمایا کرتے تھے:۔

"اصل نیت صالح می باید، زیرا انچہ نظر خلق بر عمل است اما خدائے تعالےٰ را نظر بر نیت است۔" [۵۲]

(۲) استقامت۔ مشائخ کا کہنا تھا کہ بغیر استقامت انسان کچھ حاصل نہیں کر سکتا "یک در گیر و محکم گیر" [۵۳] انسانی زندگی کا اصول ہونا چاہئے۔

---

۵۱ سیر الاولیاء۔ ص ۵۶۰

۵۲ فوائد الفواد۔ ص ۲۷، نیز ملاحظہ ہو سیر الاولیاء۔

۵۳ فوائد الفواد۔ ۲۹

(۳) توکل :- فوائد الفواد[51]، تحفۃ النصائح[52]، سیر الاولیا[53] اور مشائخِ چشت کی دیگر کتابوں میں توکل کی اہمیت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے ——

"اعتماد بر حق باید کرد و نظر بر ہیچ کس نباید داشت[54]

توکل کے معنی مشائخ کی نظر میں یہ نہ تھے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ چراغ دہلویؒ فرماتے ہیں :

"کسب کرنا مانع توکل کا نہیں ہے۔ اگر کوئی عیال دار کچھ کسب کرے اور نظر اُس کے دل کی اس کسب پر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو وہ متوکل ہے۔"[55]

(۴) عفو :- سیر الاولیاء میں لکھا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ غصہ کے پی جانے سے معاف کر دینا بہت بہتر ہے، کیونکہ جو شخص غصّہ پی جاوے اور معاف نہ کرے تو ممکن ہے کہ اس کے دل میں کینہ جڑ پکڑ جائے۔"[56]

(۵) ایثار :- چراغ دہلویؒ قرآن پاک کی یہ آیت پڑھ کر

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

(پسند کرتے ہیں غیروں کو اپنی جانوں پر، اگرچہ خود حاجت مند ہوں)

---

[51] ص ۱۰۱

[52] تحفۃ النصائح۔ شیخ یوسف گدا (مطبع نور، لاہور) ص ۷۴

[53] باب دہم ص ۲ - ۵۵۱

[54] فوائد الفواد۔ ص ۱۰۱

[55] خیر المجالس۔ مجلس ۱۱۔

[56] حلم و عفو پر سیر الاولیاء (ص ۵۵۶ - ۵۵۲) کے صفحات مطالعہ کے قابل ہیں۔

ایثار کی تلقین فرمایا کرتے تھے[۵۱] اس سلسلے میں اُن کی بیان کی ہوئی بعض حکایتیں[۵۲] پڑھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

(۶) دیانت داری:۔ خیر المجالس، فوائد الفواد، سرور الصدور، نافع السالکین، میں متعدد جگہ حاضرین مجلس کے ذہنوں پر یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے، کہ معاملات میں دیانت داری، فارغ البالی اور مسرت کی ضمانت ہے۔ فوائد الفواد میں بتایا گیا ہے کہ ایک مرتبہ لاہور صرف اس وجہ سے تباہ ہوا تھا کہ وہاں کے تجار نے گجرات میں اپنے مال کی زیادہ قیمت وصول کی تھی[۵۳]۔ سرور الصدور میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اس نیت سے غلّہ کو جمع کرتے ہیں کہ جب قیمت بڑھ جائے تب فروخت کریں[۵۴]

(۷) عیب جوئی سے پرہیز[۵۵]۔ ملفوظات میں جگہ جگہ اس مذموم عادت کو چھوڑنے کی تلقین کی گئی ہے۔ عیب جوئی کی عادت انسان کو بے کار کر دیتی ہے۔ اس کی تعمیری اور عملی صلاحیتیں، تخریبی اور تنقیدی کاموں میں الجھنے سے فنا ہو جاتی ہیں۔

(۸) تحمل:۔ تحمل کو "کارِ صدیقان"[۵۶] بتا کر اس کی تلقین کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں مشائخ چشت نے اپنے مریدین و متعلقین کو اسلامی آداب سکھانے کی بڑی کوشش کی۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے صدہا سننِ نبوی کو زندہ کیا۔ تفصیل کی تلاش ہو تو سیر الاولیاء کے باب ہفتم[۵۷] کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

---

۵۱ خیر المجالس۔ مجلس ۲۶
۵۲ خیر المجالس۔ مجلس ۸۹
۵۳ فوائد الفواد ص ۱۱۶
۵۴ سرور الصدور (قلمی)
۵۵ فوائد الفواد۔ ص ۲۲۷ - ۲۲۶
۵۶ فوائد الفواد ص ۲۳۷
۵۷ سیر الاولیاء۔ ص ۴۰۷ - ۴۲۰

(۳)

مشایخِ کرام کی خدمت میں مختلف قسم کے لوگ حاضر ہوتے تھے، اُن کی ذہنی صلاحیتیں، ضروریات اور مقاصد مختلف ہوتے تھے۔ چنانچہ مشایخ کو اُن کی اصلاح و تربیت کے لئے مختلف طریقے اور تدابیر اختیار کرنی پڑتی تھیں۔ آنے والوں میں عموماً چار طرح کے لوگ ہوتے تھے۔

(۱) خلفاء

(۲) مخصوص مریدین (یعنی وہ لوگ جن کو خلافت سے تو نہیں نوازا جاتا تھا لیکن اُن کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کی جاتی تھی اور وہ اکثر و بیشتر شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔)

(۳) عام مریدین (جو بیعت کرنے کے بعد عموماً شیخ سے جُدا ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔)

(۴) عوام (وہ لوگ جو مختلف دینی یا دنیوی مقاصد کے لئے آتے تھے۔)

خلفاء کی تربیت | جن مریدوں کو مشایخ خرقۂ ولایت[۵] دینا چاہتے تھے۔ ان کی اِصلاح و تربیت کی طرف خاص طور سے توجہ فرماتے تھے۔

---

[۵] مصباح الہدایت میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے :- (بقیہ ص ۲۷۴ پر)

ان خلفاء پر سلسلہ کی آیندہ ترقی کا انحصار ہوتا تھا، اس بنا پر ان کی شخصیت کی تعمیر میں بڑی محنت کی جاتی تھی۔ اور ان کی ظاہری اور باطنی زندگی کے ہر ہر گوشہ کو پرکھا جاتا تھا۔ شیخ کی یہ اصلاحی جدوجہد اس وقت تک جاری رہتی تھی جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اب خلیفہ میں سلسلہ کے نظام کو سنبھالنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے دریافت کیا کہ خلافت کے لئے کن اوصاف کی ضرورت ہے تو شیخ نے فرمایا:۔

"اوصاف ایں کار بسیار است فاما در آں ایام کہ خواجہ من مرا بدولت خلافت خود رسانید، روزے مرا گفت باری تعالےٰ ترا علم و عقل و عشق دادہ است و ہر کہ بدیں سہ صفت موصوف باشد از و خلافت مشائخ نیکو آید"۔[۵]

اس کام کے لئے بہت سے اوصاف درکار ہیں۔ لیکن جس زمانہ میں کہ خواجہ نے مجھے دولتِ خلافت عنایت فرمائی تھی، ایک دن مجھ سے یوں فرمایا تھا کہ خدا تعالےٰ نے تجھے علم، عشق، عقل تینوں چیزیں عنایت فرمائی ہیں۔ اور جو شخص ان تینوں چیزوں کے ساتھ موصوف ہو، اُسے مشائخ کی خلافت سزاوار ہے۔

(بسلسلہ صفحہ ۲۷۳) "و آں آنست کہ چوں شیخ در مرید آثارِ ولایت و علامتِ وصول بدرجۂ تکمیل و تربیت مشاہدہ کند و خواہد کہ او را بنیابت و خلافت خود نصب کردہ بطرفے فرستد و او را در تصرف و تربیت خلق ماذون گرداند، وے را خلعتِ ولایت و تشریف عنایت خود بپوشاند تا مدد نفاذ امراؤ و موجب سرعت مطاوعت خلق گردد (مطبوعہ ایران ص ۱۵۰)۔ —— [۵] سیر الاولیا ص ۳۴۵

حقیقت یہ ہے کہ مشائخ کرام خلیفہ کی ان ہی تین صلاحیتوں ـــــ علم، عقل، عشق ـــــ کو صیقل کرنے کی کوشش فرمایا کرتے ہیں۔ ان کی اصلاحی جد و جہد کا مقصد ان قوتوں اور صلاحیتوں کو اس طرح پر اُبھارنا ہوتا تھا کہ اُن کے ذریعے دوسروں کی باطنی زندگی کو سدھارنے کا کام لیا جا سکے۔ خلیفہ کے لئے صرف یہ ہی ضروری نہ تھا کہ اس میں ذاتی کردار کی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہوں بلکہ یہ بھی ناگزیر تھا کہ وہ دوسروں کو پوری طرح پر متاثر کرنے کی قوت رکھتا ہو۔

(۱) **علم**۔ خلافت کے لئے جو لوگ منتخب کئے جاتے تھے وہ علومِ ظاہری میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ چشتیہ سلسلہ کے مشائخ کا یہ ایک محکم اصول تھا کہ وہ کبھی ایسے شخص کو خلافت نہ دیتے تھے جس نے علومِ ظاہری کی تکمیل نہ کر لی ہو[۵۱] اس پابندی میں بہت سی دینی مصلحتیں تھیں۔ ایک بے علم انسان نہ تو خود تصوف کے اسرار کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک حاذق طبیب کی طرح امراضِ ملت کی صحیح تشخیص اور علاج کر سکتا ہے۔ شاہ کلیم اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف اہلِ علم کو خلافت دینے کی یہ وجہ بتائی ہے کہ

در صحبت او ضلالت رواج نخواہد گرفت [۵۲]

(اس کی صحبت میں گمراہی رواج نہیں پائے گی)

---

۵۱ بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی ایسے شخص کو خلافت نہیں دی جو صاحبِ علم نہ ہو (ملاحظہ ہو سیر الاولیاء)۔ اخی سراج رحمۃ اللہ علیہ محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز ترین مریدین میں تھے۔ لیکن شیخ نے اُن کو اس وقت تک خلافت عطا نہ فرمائی جب تک اُنھوں نے علومِ ظاہری کی تکمیل نہ کر لی۔

۵۲ مکتوباتِ کلیمی۔ ص ۵۸۔ مکتوب ۴۴، ۶۹، ۷۰، ۹۸ میں اُنھوں نے خلافت کے لئے علم کے ضروری ہونے پر گفتگو کی ہے۔

لیکن یہ علم خلفاء کے لئے کافی نہ ہوتا تھا، اس لئے مشایخ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کو کچھ اہم مذہبی کتابوں کا درس اپنے طریقے پر دے دیا جائے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ نے ان کے پیرنے قرآن پاک، عوارف المعارف اور تمہید ابوشکور سالمی کا درس دیا تھا۔[۵۱] بعد کو چشتیہ سلسلہ کے بزرگ اپنے خلفاء کو بہت سی دیگر کتابوں کا بھی درس دینے لگے تھے۔ مثلاً احادیث نبویؐ، احیاء العلوم، قوت القلوب۔ مکتوبات عین القضاۃ۔ فصوص الحکم۔ فتوحات مکیہ، کشف المحجوب۔ رسالہ قشیری۔ کیمیائے سعادت، مثنوی مولانا رومؒ وغیرہ[۵۲]
اس تعلیم کا مقصد صحیح مذہبی وجدان کو بیدار کرنا ہوتا تھا۔ اور ان کتابوں کے انتخاب میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور پیش نظر ہوتی تھی۔ امام غزالی کی کتابیں مذہبی مسائل میں اعلیٰ بصیرت پیدا کرنے کے لئے ضروری تھیں۔ سرور الصدور میں لکھا ہے کہ ایک دن شیخ حمید الدین ناگوریؒ کیمیائے سعادت کا مطالعہ کر رہے تھے جب فارغ ہوئے تو بے اختیار پکار اٹھے:۔ شاد باش اے شیخ محمد غزالی! شاد باش اے شیخ محمد غزالی! پھر فرمایا:۔

بابا پیوستہ ایں را در نظر باید داشت
بابا اس کو ہمیشہ زیر مطالعہ رکھنا چاہیئے

کیونکہ اس کے مطالعہ سے خلق کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔[۵۳]
عوارف کے مطالعہ سے خلیفہ کو ان تمام اصولوں سے واقفیت ہوجاتی تھی

---

۵۱ سیر الاولیاء ص ۱۰۶
۵۲ ملاحظہ ہو، تاریخ فیروز شاہی برنی (ص ۳۴۵-۳۴۶) مکتوبات کلیمی، سرور الصدور وغیرہ
۵۳ سرور الصدور (قلمی) ص ۳۱-۳۰

جن پر سلسلہ کے نظام کی عمارت تعمیر کی جاتی تھی۔ حضرت امام اکبرؒ کی تصانیف تصوف کے اعلیٰ خیالات سے روشناس کرانے کے لئے ضروری تھیں۔ لیکن اُن کے درس میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ بعض مشائخ تو اس کا درس دیتے وقت حجرہ کو بند کرا دیتے تھے۔ مثنوی کا مطالعہ اگر ایک طرف عشقِ حقیقی کی آگ کو تیز تر کرنے کے لئے ضروری تھا تو دوسری طرف تصوف کے نازک خیالات کی بزم تک صرف اسی کی مدد سے رسائی ممکن تھی

تصوف کی دیگر کتابیں بھی کچھ نہ کچھ افادیت رکھتی تھیں۔ مشائخ متقدمین کی روایات سے واقفیت کے لئے ان کا مطالعہ ازبس ضروری تھا ——— ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد خلفاء کا دینی احساس و شعور بیدار ہو جاتا تھا۔ اُن میں تصوف کے تاریخی اور علمی پہلوؤں سے پوری واقفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور خانقھی نظام کے چلانے کے لئے جس تنظیمی قابلیت کی ضرورت ہوتی تھی وہ بھی حاصل ہو جاتی تھی۔

(۲) ترکِ دُنیا۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد شیخ کا سب سے اہم کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے خلیفہ کے دل کو مادی آلائشوں سے پاک صاف کر دے تاکہ توکل و استغنا کی دولت سے وہ ایسا مالا مال ہو جائے کہ مادی دنیا کی کوئی کشش اُن کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے جاہ و حشم کی خواہش اور مال و زر کی تمنا سے وہ نہ صرف بے نیاز ہو جائے بلکہ متنفر۔

ترکِ دنیا کا مفہوم جو اُن کے ذہن میں تھا اس کی وضاحت بھی ضروری ہے حضرت محبوب الٰہیؒ نے جب مولانا حسام الدین ملتانیؒ کو خلافت عطا فرمائی تو شہادت کی انگلی اٹھا کر دو مرتبہ فرمایا :۔ دُنیا کو ترک کر۔ دنیا کو ترک کر

مولانا نے عرض کیا، اگر حکم ہو تو شہر میں نہ رہوں۔ فرمایا :۔ نہیں شہر ہی میں رہو۔ اور اسی طرح رہو، جیسے اور لوگ رہتے ہیں [1]

ایک دن فرمایا :-

"ترکِ دنیا کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنے آپ کو ننگا کرے اور لنگوٹہ باندھ کر بیٹھ جائے بلکہ ترکِ دنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے اور کھائے بھی۔ لیکن جو کچھ اسے ملے اس کی طرف راغب نہ ہو اور اس سے دل نہ لگائے۔" [۵۱]

ترکِ دنیا کے سلسلے میں خلفاء سے چار چیزوں کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔

(۱) فتوح [۵۲] کو جمع کرکے نہ رکھیں گے۔

(۲) امراء و سلاطین کی صحبت سے پرہیز کریں گے۔

(۳) وظائف و ادرار قبول نہ کریں گے۔

(۴) ملازمتِ شاہی سے بچیں گے۔

فتوح کے قبول کرنے اور صرف کرنے کے باقاعدہ اصول تھے [۵۳]۔ خلیفہ کے لئے لازمی تھا کہ اگر وہ ایک ہاتھ سے قبول کرے تو دوسرے ہاتھ سے حاجت مندوں میں تقسیم کردے۔ امراء و سلاطین کی صحبت سے پرہیز اس لئے ضروری تھا کہ درباداری اور دینی جدوجہد دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی انفاس العارفین میں نقل کرتے ہیں :-

در بعض ملفوظات خواجگان چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد، نام او از	خواجگان سلسلہ چشتیہ کے بعض ملفوظات میں ہے کہ ہر وہ شخص جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھا گیا۔ اس کا نام حق سبحانہ

[۵۱] فوائد الفواد۔ ص ۹

[۵۲] فتوح سے مراد وہ روپیہ یا تحائف تھے جو عقیدت مند شیخ کی خدمت میں بلا طلب پیش کرتے تھے۔ سیر الاولیاء میں اس کی نوعیت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو، باب دہم)

[۵۳] ملاحظہ ہو، سیر الاولیاء، فوائد الفواد، احسن الاقوال وغیرہ

دیوانِ حق سبحانہٗ برمی آرند[۵۱] کے دفتر سے نکال دیتے ہیں۔

بابا فریدؒ فرمایا کرتے تھے :۔

"ہر درویشے کہ درِ اختلاط با ملوک و امرا بکشاید عاقبت او وخیم گردد[۵۲] ہر وہ درویش جو بادشاہوں اور امیروں سے اختلاط کا دروازہ کھولتا ہے۔ اس کی عاقبت خراب ہو جاتی ہے۔

اگر شیخ کو کبھی اس بات کا ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ خلیفہ شغل کی طرف مائل ہے تو اس سے خلافت نامہ واپس لے لیا جاتا تھا۔ قاضی محی الدین کاشانیؒ کو علاء الدین خلجی نے اودھ کی قضا دینی چاہی۔ اُنھوں نے قبول کرنے سے پہلے شیخ کی اجازت لینی ضروری سمجھی اور دہلی تشریف لائے۔ شیخ سے عرض کیا: حضور جیسا حکم فرمائیں ویسا ہی کروں حضرت محبوب الٰہیؒ نے کبیدہ خاطر ہو کر فرمایا :۔ پہلے یہ خطرہ تمھارے دل میں گزرا ہوگا پھر کہیں یہ حکم صادر ہوا ہوگا۔ اس کے بعد اُنھوں نے خلافت نامہ واپس لے لیا اور سال بھر تک اُن کی طرف التفات نہ فرمایا[۵۳]

شغل سے پرہیز کی شرط صرف خلفاء کے لئے تھی۔ ورنہ عام مریدین پر کوئی پابندی نہ تھی۔ امیر خسروؒ، امیر حسن سنجریؒ، ضیاء الدین برنیؒ وغیرہ شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مخصوص مریدین میں تھے، لیکن خلفاء نہ تھے، اس لئے شیخ کو اُن کی ملازمت پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ شیخ کو امیر خسروؒ سے جو محبت تھی وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ لیکن اُنھوں نے اس محبت کو سلسلہ کے اصولوں یا نظام میں خلل انداز نہیں ہونے دیا اور جہاں تک اُن کے نظامِ تربیت کے اصولوں کا تعلق تھا، اُن کے ساتھ کسی

---

۵۱ انفاس العارفین۔ ص ۶۹

۵۲ تاریخ فیروز شاہی۔ برنی۔ ص ۲۰۷

۵۳ سیر الاولیاء۔ ص ۲۹۵۔

طرح کی رعایت نہیں کی۔ ایک مرتبہ سماع کے موقع پر امیر خسروؒ نے رقص کرنے کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو شیخ نے فوراً اُنھیں ٹوک دیا۔ اور فرمایا۔ تمھارا تعلق دنیا سے ہے تمھیں اس کی اجازت نہیں[۵۱]۔ عام مریدین اور خلفاء کے جو حدود تھے اُن کا مشائخ بڑی سختی سے خیال رکھتے تھے۔

خلفاء کو اجازت نہ تھی کہ وہ کسی طرح کا وظیفہ یا جاگیر قبول کریں۔ 'درویش دیں دار' دین کی توہین تھی۔ علاوہ ازیں ان چیزوں میں اُلجھ جانے کے بعد دینی جدو جہد، ذہنی یکسوئی کے ساتھ کس طرح ممکن ہو سکتی تھی اور جب صورت یہ ہو کہ

شاہ مارا دہ دہد منت نہد
رازقِ ما رزق بے منت دہد

تو پھر کسی کا احسان لینا بے کار تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ خلافت نامہ دیتے وقت ہدایت فرمایا کرتے تھے:۔

"می باید کہ تارک دنیا باشی۔ بسوئے دنیا و ارباب دُنیا مائل نشوی و دیہہ قبول نہ کُنی۔ و صلہ بادشاہاں نگیری"[۵۲]	چاہیئے کہ تارک دنیا ہو جاؤ۔ دنیا اور اہل دنیا کی طرف میلان نہ رکھو اور گاؤں جاگیر قبول نہ کرو، اور بادشاہوں سے صلہ نہ لو۔

دنیوی عزت و عظمت کی خواہش خلفاء کے دل سے نکالنے میں مشائخ اپنی نفسیاتی بصیرت کو کام میں لاتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا واقعہ اس سلسلہ میں بڑا دلچسپ ہے۔

---

۵۱ سیر الاولیاء۔ ص ۵۰۶

۵۲ سیر الاولیاء۔ ص ۲۹۵۔

شیخ نظام الدین اولیارح طالب علمی کے زمانے میں اپنی ذہانت کی وجہ سے مشہور تھے، دوستوں کا خیال تھا کہ وہ تکمیل کے بعد کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچیں گے اس کے برخلاف شیخ نے بابا فریدرح سے بیعت کرکے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنی شروع کردی۔ ایک دن اجودھن میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے پھر رہے تھے کہ اتفاقاً ایک پرانا ساتھی مل گیا۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر سخت متعجب ہوا اور کہنے لگا ،۔ مولانا نظام الدین! تمھاری یہ کیا حالت ہوگئی ؟ اگر تم شہر میں رہ کر لوگوں کو تعلیم ہی دیتے تو مجتہدِ زمانہ کہلاتے ، اور تمھاری حالت بہتر ہوتی شیخ نظام الدینؒ نے کچھ جواب نہ دیا۔ جب بابا فریدرح کی خدمت میں آئے تو انھوں نے ذہنی حالت کا پتہ لگا لیا اور کہا کہ باورچی خانے میں سے کھانے کا ایک خوان لو اور سر پر رکھ کر اپنے دوست کے پاس لے جاؤ، اور اس کی بات کا یہ جواب دو ؎

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر و برو

ترا سعادت بادا مرا نگوں ساری[1]

دنیا کی طرف ذرا سی بھی رغبت جو نظام الدین اولیارح کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی ۔اس نفسیاتی تدبیر سے ختم ہوگئی۔ شیخ اولیارح نے محسوس کرلیا کہ ان کی اور ان کے دوست کی راہیں مختلف ہیں ۔ وہ جس دنیا میں رہتے ہیں اس کے انداز اور طریقے مختلف ہیں ؎

مجو بہ محلِ شاہی کہ در ولایتِ عشق

گدا بہ تخت نشانند و پادشہ گیرند!

دماغ کو تصوف کے خیالات سے بھر دینے اور دل کو دنیا کی آلائشوں سے

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۳۹

خالی کردینے کے بعد خلیفہ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر توجہ کی جاتی تھی۔ جہاں اصلاح تربیت کی ضرورت ہوتی۔ شیخ اپنے حسنِ تدبیر سے کام لیتا۔ کہیں اشاروں سے کام لیا جاتا۔ غرض جس طرح سے ممکن ہوتا۔ خلیفہ کی ظاہری و باطنی زندگی کو سنوارا جاتا۔ شیخ برہان الدین غریبؒ کا واقعہ اس سلسلہ میں بڑا سبق آموز ہے۔

مولانا برہان الدینؒ کبر سنی اور ضعف کی وجہ سے اپنی کملی کی دو تہہ کرکر اس پر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دن کچھ لوگوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے کہا کہ مولینا برہان الدینؒ سجادہ مشیخت پر بیٹھ کر اپنے آپ کو افضل و برتر سمجھتے ہیں سلطان المشایخ یہ سُن کر بے حد رنجیدہ ہوئے اور جب مولانا برہان الدینؒ اُن سے ملاقات کے لئے آئے تو اُن سے نہ بولے۔ مولانا قدم بوسی کے بعد جماعت خانے میں آبیٹھے۔ فوراً اقبال (خادم خاص) نے آکر کہا کہ شیخ کا فرمان ہے کہ تم فوراً لوٹ جاؤ اور اپنے گھر چلے جاؤ۔ یہ فرمان سُن کر مولانا کے پیروں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ گھر جا کر گریہ وزاری کرنے لگے۔ اس درد سے روتے تھے کہ جو ملنے جاتا وہ بھی رونے لگتا۔ امیر خسروؒ ان کے دوست تھے۔ اُن سے یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ شیخ کی خدمت میں عرض کیا:-

مولانا برہان الدین آپ کے مرید صادق ہیں۔ اب اس درجہ ضعیف ہوگئے ہیں کہ بوریے پر نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کے دونوں پاؤں میں سخت درد رہتا ہے۔ اور اس زحمت کو دور کرنے کے لئے ناچار اپنی کملی نیچے ڈال لیتے ہیں۔ ہر چند امیر خسروؒ نے سفارش کی، شیخ نے قبول نہ فرمائی۔ آخر کار ایک دن امیر خسرو نے اپنی گردن میں دستار ڈالی اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور مؤدب کھڑے ہوگئے۔ شیخ نے پوچھا:- ترک کیا چاہتے ہو؟ عرض کیا:- مولانا برہان الدین کے جرم کی معافی شیخ نے مسکرا کر فرمایا:- اچھا اُنھیں بلاؤ۔ مولانا برہان الدین نے بھی آکر اسی طرح معافی مانگی۔ شیخ نے معاف کردینے کے بعد اُنھیں دوبارہ بیعت کیا۔[1]

[1] سیر الاولیاء ص ۲۸۰ - ۲۷۹

(۳) تعمیر شخصیت :- مشائخ اپنے خلفاء میں مکارمِ اخلاق پیدا کرنے کی بڑی کوشش فرماتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اُن کے خلفاء مہر و محبت عجز و انکسار، ہمدردی خلوص کی جیتی جاگتی تصویریں ہوں [۱]

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز
اُس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دل فریب اس کی نگاہ دلنواز

مصیبت زدہ غریب اس کی طرف دیکھے تو اس کے دل پر چھایہ سا لگ جائے۔ بات کرنے لگے تو ایسا محسوس ہو گویا پھولوں پر شبنم کی بارش ہو رہی ہے ——— لیکن اگر کسی جابر کا مقابلہ کرنا پڑے تو عجز و انکسار کا یہی مجسمہ پہاڑوں سے زیادہ مضبوط بن جائے۔ اور دُنیا کی کوئی طاقت اس کو خوف زدہ نہ کر سکے۔

خلفاء میں کردار کی یہ خوبیاں پیدا کرنے کے لئے، مشائخ، زبان سے نہیں، عمل سے کام لیتے تھے۔ دن رات خانقاہ میں رہنے والے خلفاء و مریدین اُن کے کردار کو دیکھتے تھے اور اُس سے متاثر ہوتے تھے۔

۱۵ محرم سنہ ۷۱۰ھ کو ایک شخص شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں آیا۔ اور اُن کو گالیاں دینے لگا۔ شیخ خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر اس کے سب مطالبات پورے کر دئے۔ جب وہ چلا گیا تو حاضرین کو بتایا کہ ایسا ہی ایک شخص ایک مرتبہ بابا فریدؒ کی خدمت میں آیا اور ان سے بے باکی کے ساتھ کہنے لگا :- تو بت بن کر بیٹھ گیا ہے تو بابا فریدؒ نے نرمی سے جواب دیا :- "من نہ ساختہ ام خدا تعالیٰ ساختہ است" [۱]

---

[۱] فوائد الفواد ص ۸۸

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیر کا کردار کس طرح خاموشی کے ساتھ خلفاء و مریدین کے افکار و اعمال کو متاثر کرتا تھا! ـــــ بے بس اور کمزور لوگوں کی گالیاں سُن لینے والے اس شخص نے سلطان مبارک خلجی[۵۱] اور سلطان غیاث الدین تغلق[۵۲] کی جابرانہ قوت و سطوت کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس کے مریدوں نے اس سے استقامت کا سبق لیا۔ ایک قلندر نے چراغ دہلوی کے جسم کو چھریوں سے لہو لہان کر دیا تو انھوں نے زبان سے اُف تک نہ کہا[۵۳] لیکن جب محمد بن تغلق نے غصہ سے بات کی تو جان کا خیال کئے بغیر پکار اُٹھے :۔ اس جانوروں کے غصہ سے باز آؤ![۵۴] ـــــ حقیقت یہ ہے کہ مشائخ چشت اپنے عمل سے خلفاء کو یہ تعلیم دیتے تھے۔

رکھ یہی روش دریا کی سی جو | ہلکے کو ترا بھاری کو ڈبو
عاجز کی کبھی تحقیر نہ کر | جابر کی کبھی تعظیم نہ کر
جھکنے سے سعادت ملتی ہے | کھچنے میں شقاوت ہے مضمر
سر سامنے ناحق کے نہ جھکا | توہین سرِ تسلیم نہ کر

اور اِن ہی اصولوں پر ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی تھی۔

(۴) اوقات کی پابندی :۔ انسان پابندیِ اوقات کے بغیر زندگی کا کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔ اسی بنا پر مشائخ، اپنے خلفاء سے پابندیِ اوقات کا مطالبہ

---

[۵۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، تاریخ فیروز شاہی (ضیاء الدین برنی) ص ۳۹۶، سیر العارفین، مطلوب الطالبین وغیرہ

[۵۲] ملاحظہ ہو، سیر العارفین، سیر الاولیا، تاریخ مبارک شاہی وغیرہ

[۵۳] سیر العارفین ص ۹۶-۹۷ نیز تکملہ خیر المجالس

[۵۴] "غضب سباعے کہ در طبیعتِ شما استقرار یافتہ است زائل گردانید" سیر العارفین ص ۹۷

کرتے تھے۔ خلفاء کو اپنے پاس رکھنے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اُن کے اوقات کی نگرانی کی جائے اور انھیں وقت کی قدر و قیمت سمجھائی جائے۔ اُن کا کہنا تھا کہ فقیر کے پاس اگر کوئی قیمتی چیز ہے تو وقت ہے۔ اگر وہ اُسے بھی ضائع کر دے تو یہ اس کی بدنصیبی ہے ؎

بر دست فقیر نیست نقدے جز وقت
آں نیز کہ از دست رود وائے برو

شاہ کلیم اللہؒ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"ضبط اوقات آنکہ ندارد، خسر الدنیا والآخرۃ است"[۵۱]

(جو اوقات کی پابندی نہیں کرتا وہ دُنیا اور آخرت دونوں میں نقصان میں رہتا ہے)

مصباح الہدایت میں شیخ کے فرائض کا ایک اہم جزیہ بتایا گیا ہے کہ وہ مرید سے اوقات کی پابندی کرائے۔[۵۲]

(۵) اظہارِ کرامت سے پرہیز:۔ مشائخ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے کہ اُن کے خلفاء میں اظہار کرامت کا جذبہ نہ پیدا ہو۔ اُن کا کہنا تھا کہ کشف و کرامات "حجاب راہ" ہیں[۵۳] اُن سے روحانی شخصیت ٹھٹر کر رہ جاتی ہے۔ ایک دن مولانا حسام الدینؒ نے اپنے پیر سے عرض کیا:۔ "مخدوم خلق، طالب کرامت ہے" فرمایا:۔ کرامت کے طالب نہ بنو۔ تم اپنے کام میں ثابت قدم رہو۔ استقامت ہی کرامت ہے۔[۵۴]

۵۱ مکتوبات کلیمی۔ ص ۲۶
۵۲ مصباح الہدایت (مطبوعہ ایران) ص ۲۳۳-۲۳۲
۵۳ فوائد الفواد۔ ص ۳۳
۵۴ سیر الاولیاء۔ ص ۲۶۲

(۵) قرض اور امانت سے پرہیز:- مشائخ چشت، اپنے خلفاء کو ہدایت فرماتے تھے کہ وہ قرض لینے سے بچیں۔ اور کسی کی امانت نہ رکھیں۔ شیخ برہان الدین رح کا قول ہے :-

"درویش را امانت کسے قبول نباید کرد و ضمان کسے نباید شد۔ و گواہی خود در قبالہ نباید نوشت" [1]

بابا فرید رح تو یہاں تک کہتے تھے کہ جس نے امانت قبول کی وہ میرا مرید نہیں رہا امانت رکھنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ مشائخ چشت یہ نہ چاہتے تھے کہ ان کے خلفاء ایسی ذمہ داریاں قبول کریں جن سے ان کی ذہنی یکسوئی میں خلل پڑے۔

مذکورہ بالا طریقہ پر خلفاء کی تربیت کرنے کے بعد، شیخ انھیں خرقۂ ولایت پہناتا اور ہدایت کرتا [2]

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر
در رہِ دیں سخت چوں الماس زی
دل برحق بربند و بے وسواس زی

خاص مریدین کی تربیت | خلفاء کے علاوہ کچھ بزرگ ایسے بھی ہوتے تھے جن کو خلافت تو کسی وجہ سے نہیں دی جاتی تھی، لیکن ان کے خلوص اور جذبے کے پیش نظر شیخ کو ان کی باطنی اِصلاح و تربیت میں خاص دلچسپی ہوتی تھی۔ ایسے لوگ عموماً شیخ کی ذات سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیتے تھے اور رات دن خدمت گزاری

---

[1] احسن الاقوال (قلمی)، ص ۱۲

[2] نافع السالکین ص ۱۲۵

میں بسر کرتے تھے۔ شیخ کی قربت سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھی اور اُن کی باطنی زندگی میں ایک جِلا پیدا ہو جاتی تھی۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے ایسے مخصوص مریدین میں خواجہ عزیز الدینؒ نبیرہ بابا فریدؒ، شیخ کبیر الدینؒ، خواجہ رفیع الدین ہارونؒ، خواجہ ابوبکرؒ مولانا قاسمؒ سید کمال الدین کرمانی وغیرہ شامل تھے۔ شیخ نے ان کو خلافت عطا نہیں فرمائی تھی۔ لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی طرف کافی توجہ کی تھی۔ شیخ کی صحبت سے اُن میں پاکیزہ اخلاق اور دینی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ خواجہ عزیز الدینؒ کے دینی جذبات بیان کرنے کے بعد صاحب سیر الاولیاء نے لکھا ہے:۔

ایں ہمہ از برکت آں بود کہ در نظر مبارک سلطان المشایخ پرورش می یافت [۵۱]	یہ سب کچھ سلطان المشایخ کی نگرانی میں پرورش پانے کی برکت کا نتیجہ تھا۔

سید کمال الدین کرمانیؒ کے فضائل و کرامات بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

ایں ہمہ فضائل ثمرہ آں بود کہ در نظر سلطان المشایخ پرورش یافتہ بود [۵۲]	یہ سب فضائل سلطان المشایخ کی نگرانی میں پرورش پلنے کا پھل تھے۔

ان بزرگوں کی تربیت اور روحانی ترقی میں جو چیز سب سے زیادہ ممد و معاون ہوتی تھی وہ شیخ کی صحبت تھی۔ وہ شیخ کی خلوت و جلوت کے شریک ہوتے تھے کوئی مصلےٰ برداری کا کام کرتا، کوئی وضو کراتا، کوئی سحری کا انتظام کرتا۔ شیخ موقع

---

۵۱ سیر الاولیاء۔ ص ۱۱۹

۵۲ سیر الاولیاء۔ ص ۲۱۳

(۵) قرض اور امانت سے پرہیز:- مشائخ چشت، اپنے خلفار کو ہدایت فرماتے تھے کہ وہ قرض لینے سے بچیں۔ اور کسی کی امانت نہ رکھیں۔ شیخ برہان الدین رح کا قول ہے :-

"درویش را امانت کسے قبول نباید کرد وضمان کسے نباید شد۔ و گواہی خود در قبالہ نباید نوشت "[۱]

بابا فرید رح تو یہاں تک کہتے تھے کہ جس نے امانت قبول کی وہ میرا مرید نہیں رہا امانت رکھنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ مشائخِ چشت یہ نہ چاہتے تھے کہ اُن کے خلفار ایسی ذمہ داریاں قبول کریں جن سے اُن کی ذہنی یکسوئی میں خلل پڑے۔

مذکورہ بالا طریقہ پر خلفار کی تربیت کرنے کے بعد، شیخ انھیں خرقۂ ولایت پہناتا اور ہدایت کرتا ہے

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر
در رہِ دیں سخت چوں الماس زی
دل برحق بربند و بے وسواس زی

خاص مریدین کی تربیت | خلفار کے علاوہ کچھ بزرگ ایسے بھی ہوتے تھے جن کو خلافت تو کسی وجہ سے نہیں دی جاتی تھی، لیکن اُن کے خلوص اور جذبے کے پیشِ نظر شیخ کو ان کی باطنی اصلاح و تربیت میں خاص دلچسپی ہوتی تھی۔ ایسے لوگ عموماً شیخ کی ذات سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیتے تھے اور رات دن خدمت گزاری

---

[۱] احسن الاقوال (قلمی) ص ۱۲

[۲] نافع السالکین ص ۱۲۵

میں بسر کرتے تھے۔ شیخ کی قربت سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھی اور اُن کی باطنی زندگی میں ایک جِلا پیدا ہو جاتی تھی۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے ایسے مخصوص مریدین میں خواجہ عزیز الدینؒ نبیرہ بابا فریدؒ، شیخ کبیر الدینؒ، خواجہ رفیع الدین ہارونؒ، خواجہ ابوبکرؒ، مولانا قاسمؒ سید کمال الدین کرمانی وغیرہ شامل تھے۔ شیخ نے ان کو خلافت عطا نہیں فرمائی تھی۔ لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی طرف کافی توجہ کی تھی۔ شیخ کی صحبت سے اُن میں پاکیزہ اخلاق اور دینی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ خواجہ عزیز الدینؒ کے دینی جذبات بیان کرنے کے بعد صاحب سیر الاولیاء نے لکھا ہے:۔

ایں ہمہ از برکت آں بود کہ در نظر مبارک سلطان المشائخ پرورش می یافت ۵۱	یہ سب کچھ سلطان المشائخ کی نگرانی میں پرورش پانے کی برکت کا نتیجہ تھا۔

سید کمال الدین کرمانیؒ کے فضائل و کرامات بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

ایں ہمہ فضائل ثمرہ آں بود کہ در نظر سلطان المشائخ پرورش یافتہ بود" ۵۲	یہ سب فضائل سلطان المشائخ کی نگرانی میں پرورش پانے کا پھل تھے۔

ان بزرگوں کی تربیت اور روحانی ترقی میں جو چیز سب سے زیادہ ممد و معاون ہوتی تھی وہ شیخ کی صحبت تھی۔ وہ شیخ کی خلوت و جلوت کے شریک ہوتے تھے کوئی مصلے برداری کا کام کرتا، کوئی وضو کراتا، کوئی سحری کا انتظام کرتا۔ شیخ موقع

---

۵۱ سیر الاولیاء۔ ص ۱۱۹

۵۲ سیر الاولیاء۔ ص ۲۱۴

اور مصلحت کے مطابق اُن کو نصیحتیں کرتے اور اُن کی زندگی کا جو گوشہ اصلاح طلب ہوتا اس کی طرف توجہ کرتے۔ سیر الاولیاء میں لکھا ہے:-

"بر آں جملہ کہ سلطان المشائخ بکمال عقل و حکمت و کرامت موصوف بود، ہر کسے را کارے فرمودے کہ شایان آں کار می دید، یکے را فرمود کہ لب بر بندی و در بر بندی و دوم را فرمود کہ در کثرت مریدکردن بکوشی و سیوم را فرمود کہ ترا در میان خلق می باید بود و جفا و قفاء خلق می باید کوشید[۵]"

چونکہ سلطان المشائخ عقل، حکمت اور کرامت بدرجہ اتم رکھتے تھے، اس لئے ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام کرنے کا حکم دیتے تھے کسی سے فرماتے کہ سکوت اختیار کرو اور دروازہ بند کر کے بیٹھو۔ کسی سے فرماتے کہ مریدوں کی تعداد بڑھانے میں جدو جہد کرو۔ کسی سے فرماتے کہ کہ خلق میں رہ کر اُن کی جفا اور قفا برداشت کرو۔

یہ ہی معاملہ ان خاص مریدین کے ساتھ ہوتا تھا۔ مشائخ ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرنے کے بعد مختلف کاموں پر متعین کرتے تھے۔

عام مریدین کی اصلاح و تربیت | عام مریدین کی اصلاح و تربیت کے سلسلہ میں شیخ کے کیا فرائض ہیں؟ ——— شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قول الجمیل کی تیسری فصل میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ شیخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مرید کے عقائد کو درست کرے۔ توحید کا صحیح تصور اس کے دماغ میں بٹھائے۔ نبوت کے متعلق صحیح اعتقادات قائم کرائے۔ گناہوں کی تفصیل بتائے۔ کبائر و صغائر

[۵] سیر الاولیاء۔ ص ۲۳۸

سے اجتناب کی تاکید کرے۔ پھر ارکانِ اسلام کی پابندی کی ہدایت کرے، اور ضرورتِ معاش سے آگاہ کرے[51]

شیخ محمود بن علی کاشانی رحؒ نے شیخ کے پندرہ فرائض بتائے ہیں[52] جن میں تخلیصِ نیت، توزیعِ اوقات، تہذیبِ نفس وغیرہ پر زور دیا ہے۔

یہ تفصیل اپنی جگہ درست ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیعت ہوتے ہوں، وہاں اصلاح و تربیت کا کیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے یا کیا گیا ہوگا؟ اس سلسلہ میں مولانا ضیاء الدین برنی رحؒ کا ایک بیان جو سیر الاولیاء میں نقل کیا گیا ہے۔ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

"مولانا ضیاء الدین برنی رحؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ سلطان المشایخ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اشراق کے وقت سے چاشت تک آپ کے جان بخش کلمات اور روح افزا گفتگو سننے میں مشغول رہا۔ اس روز بہت سے بندگانِ خدا سلطان المشایخ کی خدمت میں بیعت کی نیت سے حاضر ہوئے اور دولتِ ابدی سے مشرف ہوئے۔ اس وقت میرے دل میں خطرہ گذرا کہ مشائخِ سلف مرید کرنے میں نہایت احتیاط کرتے تھے اور خوب غور و تامل کے بعد کسی کو مرید کیا کرتے تھے۔ سلطان المشایخ انتہا درجہ کے کرم اور مہربانی کی وجہ سے عام و خاص کی دستگیری کرتے اور بغیر امتحان و امتیاز کے لوگوں سے بیعت لیتے ہیں۔ میرے دل میں آیا کہ آپ سے اس بارے میں دریافت کرنا چاہیے، لیکن چونکہ حضور مکاشفِ عالم تھے۔ فوراً میرے اس خطرہ سے واقف ہوگئے۔

---

[51] قول الجمیل۔ ص ۲۵ - ۳۴ (مطبع نظامی ۱۲۹۱ھ)

[52] مصباح الہدایت۔ (مطبوعہ ایران) ص ۲۲۳ - ۲۲۶

اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے: مولانا ضیاء الدین! تم ہر بات کو مجھ سے دریافت کرتے ہو۔ لیکن کبھی یہ نہیں پوچھتے کہ میں بغیر تحقیق کئے آنے والوں کو بیعت کے سلسلہ میں کیوں داخل کر لیتا ہوں اور بے تفتیش ہر شخص کے ہاتھ میں دستِ بیعت کیوں دے دیتا ہوں۔ سلطان المشائخ کی یہ بات سن کر میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔ اور حضور کے قدموں میں گر کر عرض کیا کہ عرصہ سے یہ مشکل اور دشواری مجھے درپیش تھی۔ آج بھی میرے دل میں یہ خطرہ گذرا تھا.......

فرمایا کہ سنو۔ خدا تعالےٰ نے ہر زمانے میں اپنی حکمتِ بالغہ کی ایک خاصیت پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے کے آدمیوں کا طریقہ اور رواج و رسم علیحدہ ہوتا ہے اور زمانے کی رفتار لوگوں میں اس درجہ اثر کرتی ہے کہ زمانۂ موجودہ کے لوگوں کے مزاج اور طبیعت گذشتہ لوگوں کے طبائع سے بالکل مشابہت نہیں رکھتے۔ البتہ بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعتیں پہلے لوگوں کی طبیعتوں سے ملتی جلتی ہیں اور آیات تجربات سے خوب واضح ہوتی ہے۔ جب اس قدر بات معلوم کر چکے تو یہ بھی معلوم کرو کہ مرید کی اصل ارادت یہ ہے کہ وہ غیر حق سے قطع تعلق کر کے مشغول بحق ہو جائے ...... سلف کا قاعدہ تھا کہ جب تک مرید میں کلی انقطاع نہ دیکھ لیتے تھے اس کے ہاتھ میں دستِ بیعت نہ دیتے تھے۔ لیکن شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کے زمانے سے شیخ سیف الدین باخرزیؒ کے عہد تک اور شیخ شیوخ العالم شہاب الدین سہروردیؒ کے عہد مبارک سے حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کے زمانے تک ایک اور ہی طریقہ نے جلوہ گری کی تھی۔ اِن اولوالعزم اور جلیل القدر بادشاہوں کے دروازوں پر جن کے علوِ درجات اور کرامات شرح سے مستغنی ہیں۔ ہر وقت ہجومِ خلائق

رہتا تھا۔ اور ہر چار طرف سے بادشاہ، امراء، مشاہیر اور دیگر لوگ جوق در جوق آتے تھے اور اخروی مہلکات کے خوف سے اپنے تئیں ان عاشقانِ خدا کی پناہ میں ڈال دیتے تھے۔ یہ مشائخ بغیر تحقیق و تفتیش کے عام و خاص سے برابر بیعت لیتے اور سلسلۂ ارادت میں داخل کرتے تھے۔ اور ہر ایک شخص کو حسب مراتب خرقہ توبہ یا خرقہ تبرک عنایت فرماتے تھے، کیونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ محبوبانِ خدا کا سا معاملہ ہر شخص کے ساتھ دوسروں پر قیاس کرکے برتا جاتا۔ پس شیخ ابوسعید ابوالخیر اور شیخ سیف الدین باخرزی اور شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ اسرارہم۔ لوگوں کو اسی طرح مرید کیا کرتے تھے جس طرح کہ میں کرتا ہوں اور اس زمانے کے موافق یہی ٹھیک بات ہے، کیونکہ اگر خدا تعالےٰ کا ایک محبوب اور پسندیدہ شخص ایک جہان کے گناہگاروں کو اپنے سایۂ حمایت میں لینا چاہیے، تو لے سکتا ہے۔ اب میں تمھارے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ سنو! میں جو مریدوں سے بیعت لینے میں زیادہ احتیاط اور تفتیش نہیں کرتا ہوں، اس کی چند وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ میں سنتا ہوں کہ بہت سے لوگ میری بیعت میں داخل ہونے سے معصیت و گناہ سے باز رہتے ہیں۔ نماز جماعت سے ادا کرتے ہیں اور اوراد و نوافل میں مشغول و مصروف ہوتے ہیں۔ اگر میں پہلے ہی سے ارادت کے شروط و قیود اُن سے بیان کروں اور ان شرائط کے بجا لانے پر مجبور کروں نیز خرقہ توبہ اور خرقہ تبرک جو خرقہ ارادت کے قائم مقام ہیں نہ دوں تو اس قدر بھلائیاں جو اُن سے ظہور میں آتی ہیں وہ اُن سے محروم و بے نصیب رہیں۔ دوسرے یہ کہ مجھے شیخ سے اس بات کی اجازت ہے کہ بغیر کسی سفارش یا التماس یا وسیلے کے بدون کسی تفتیش و کرید کے لوگوں سے بیعت لوں اور جب میں

دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان آدمی عجز و اضطراب اور مسکنت و بے چارگی کے ساتھ میرے پاس آتا اور بصد الحاح کہتا ہے کہ میں تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں تو مجھے اس سے بیعت لینے میں کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے، خاص کر جبکہ میری نیت میں اس کے صادق ہونے کا غالب احتمال ہوتا ہے۔ پس ایسی صورت میں مجھے اس سے بیعت لینا ضرور ہو جاتا ہے، قطع نظر اس کے کہ میں نے نہایت ثقہ اور راست باز لوگوں سے سنا ہے کہ جو لوگ میری ارادت و بیعت میں داخل ہوتے ہیں وہ تمام گناہوں سے الگ ہو جاتے ہیں۔[1]

تذکرے اور تاریخیں اس بات کی شاہد ہیں کہ مشائخ کرام کے دستِ حق پرست پر توبہ کرنے کے بعد اکثر لوگ معصیت سے پرہیز کرنے لگتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے متعلق تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ ہر طرح کے لوگ ان سے بیعت کرتے تھے اور یہ تمام لوگ چونکہ اپنے آپ کو شیخ کا مرید سمجھتے تھے، اس لئے بہت سے گناہوں سے باز رہتے تھے اور اگر شیخ کے کسی مرید سے کوئی لغزش ہو جاتی تو از سر نو بیعت کرتے اور توبہ کا خرقہ عطا فرماتے تھے، اور شیخ کی مریدی کی شرم تمام لوگوں کو بہت سی ظاہری اور باطنی برائیوں سے روک دیتی تھی۔[2]

قصبہ بوہر میں ایک شخص سراج الدین نامی رہتا تھا وہ اور اس کے متعلقین بابا فرید کے مرید تھے۔ ایک دن نظام الدین اولیاء اُس کے مکان میں ٹھہرے۔ اتفاقاً بوہر کے کچھ لوگوں سے اس کا جھگڑا ہوا۔ لوگوں نے اس کو برا بھلا کہا اور اس پر اتہام لگائے۔ اس کی بیوی نے جواب دیا:- جو کچھ اتہامات تم نے

---

[1] سیر الاولیاء۔ ص ۳۴۶ - ۳۴۷ (فارسی) ص ۷ - ۳۴۵ (اردو، دہلی ۱۳۲۳ھ)

[2] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۴۳ - ۳۴۲ -

ہم پر لگائے ہیں وہ بیعت سے پہلے تو صحیح تھے، بیعت کے بعد نہیں شیخ نظام الدین اولیا رحنے اس عورت کے جواب کو بہت پسند کیا [1]

آخر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایک شخص بیعت ہونے کے بعد گناہوں سے باز آجاتا تھا جب کہ اس کو عرصہ تک شیخ کی صحبت میں رہ کر باطنی اصلاح و تربیت کا موقع بھی نہیں ملتا تھا؟ ——— مشائخ کی روحانیت کے علاوہ، اس میں ایک زبردست نفسیاتی حقیقت بھی کام کرتی تھی۔

مشائخ کے پاس جو شخص بیعت ہونے کے لئے آتا تھا اس پر دو کیفیات طاری ہوتی تھیں۔ (۱) اپنے گناہوں کا شدید احساس، اور ان سے مستقبل میں پرہیز کرنے کا جذبہ۔ (۲) شیخ کے روحانی کمالات اور تہذیب نفس کی قابلیت پر کامل بھروسہ مشائخ ان ہی دو کیفیات کو ایک خاص نفسیاتی طریقہ پر استعمال کرکے مرید کے دل میں ایک ایسا محتسب پیدا کر دیتے تھے جو ہر قدم پر اس کو ٹوکتا تھا ——— تو گناہوں سے توبہ کر چکا ہے، توبہ کرنے کے بعد تائب اور متقی برابر ہو جاتے ہیں، اب تو بالکل پاک وصاف ہے، کیا تو پھر معصیت کی طرف لوٹ جائے گا؟ اگر تو نے ایسا کیا تو شیخ کی روحانی امداد و اعانت سے تو محروم ہو جائے گا

دل کی یہ آواز، اور ضمیر کا یہ احتساب اپنی جگہ بڑا اہم ہوتا تھا۔ اور اسی کی وجہ سے لوگ معصیت سے بچنے لگتے تھے۔

بیعت کرنے کے بعد عام مریدین کو مشائخ چشت چار نصیحتیں فرمایا کرتے تھے

(۱) نماز بجماعت پڑھنا۔

---

[1] فوائد الفواد ۔ ص ۵۷

(۲) جمعہ فوت نہ کرنا۔

(۳) ایام بیض کے روزے لازم جاننا۔

(۴) جو کام خدا اور رسول نے منع کیا ہے اُسے نہ کرنا۔[1]

عوام | ان منسلکین کے علاوہ ہزارہا آدمی مختلف دینوی مقاصد کے لئے مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ بعض لوگ محض ملاقات کے لئے آتے، شیخ سے دو چار باتیں کرتے اور چلے جاتے۔ مشائخ ان سب باتوں سے فائدہ اُٹھاتے، اور ایک دو نصیحت کی بات ایسے پیرائے میں کہہ دیتے کہ سننے والے کے دل میں اُتر کر اپنا کام کر جاتی۔ آیئے مشائخ کی دو تین مجلسوں میں جا کر اُن کے طریقۂ کار کا جائزہ لیں۔

(۱) ایک بڑا امیر جو کچھ عرصہ پہلے اپنے منصب سے معزول ہو گیا تھا۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اس سے پہلے وہ دُعا کے لئے آیا تھا۔ اب یہ خوش خبری سنانے آیا ہے کہ شیخ کی دعا سے وہ خلاصی پا گیا ہے۔ شیخ دیکھ کر فرماتے ہیں :۔ "خوش آمدی مرحبا بنشیں"۔ وہ شیخ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"جب کوئی خار کسی کے پاؤں میں چُبھے یا چیونٹی کاٹے تو یہ سمجھے یہ میرے عمل کی جزا ہے، جیساکہ اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔

مَا اَصَابَکُم مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ۔[2]

(۲) شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی حاضرین مجلس میں سے ہر ایک کی پرسش احوال کر رہے ہیں، ایک شخص سے پوچھتے ہیں۔ تم کیا کام کرتے ہو، عرض کرتا ہے زراعت

---

[1] خیر المجالس (قلمی نسخہ)

[2] خیر المجالس (قلمی نسخہ)

کرتا ہوں - فرماتے ہیں :-

"لقمۂ زراعت اچھا لقمہ ہے اور بہت سے کاشتکار صاحبِ حال گزرے ہیں - حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کے زمانے میں ایک کاشتکار صاحبِ حال تھا ...... اُس کی بہت سی کرامتیں مشہور تھیں - جب دُعا کرتا پانی برستا جب موقوف ہونے کی دعا کرتا برسنا بند ہو جاتا ...... امام حجۃ الاسلام ...... اس کے پاس گئے - لوگوں نے اس بزرگ سے ان کی تعریف کی کہ یہ بڑے بزرگ عالمِ دین ہیں، اُن کا لقب حجۃ الاسلام ہے - وہ کاشتکار عامی مسلمان دیہاتی تھا - حجۃ الاسلام کو کیا سمجھے - اس وقت ٹوکری غلّہ کی بغل میں لئے ہوئے زمین میں تخم ریزی کر رہا تھا - اسی طرح بیج ڈالتا ہوا ، امام حجۃ الاسلام کے پاس باتیں کرنے کے لئے آیا - اس وقت ایک اور شخص نے کہا تم ان سے باتیں کرو، غلّہ مجھ کو دو - اتنی دیر میں تخم زمین میں ڈالوں گا - اس بزرگ نے ٹوکری نہ دی ...... (اصرار کیا تو) کہا میں تخم زمین میں دلِ شاکر اور زبانِ ذاکر سے ڈالتا ہوں - اور اُمیدوار رہتا ہوں کہ جو کھلئے اس کو نور و قوتِ عبادت حاصل ہو اور یادِ خدا میں صرف ہو - اگر یہ غلّہ اور کو دیدوں تو کیا معلوم وہ دل شاکر اور زبان ذاکر سے بوئے یا نہ بوئے" ڈرتا ہوں کہ بے برکتی واقع نہ ہو" ؎[۵]

(۳) ملتان سے ایک شخص چراغ دہلویؒ کی مجلس میں آیا ہے - شیخ اس سے دریافتِ حال کرتے ہیں - عرض کرتا ہے :- تجارت کرتا ہوں - فرماتے ہیں :- "لقمۂ تجارت اچھا لقمہ ہے ، اور پھر ایک تاجر خواجگی خجندی کا قصہ سُناتے ہیں جو حافظِ قرآن تھا

؎[۵] خیر المجالس - مجلس ۴۸ (قلمی نسخہ)

حلقہ میں بیٹھتا تھا، سستا مال بیچتا تھا اور زکوٰۃ دیتا تھا، جس کی وجہ سے ایک مرتبہ ڈوبا ہوا مال اُسے مل گیا تھا۔[۵۱]

(۴) حاجی محمد ایک شخص حج سے واپس آیا ہے۔ قاضی محی الدین کاشانی سے عرض کرتا ہے:۔ جب سے حج کر کے آیا ہوں، دل میں اطمینان اور قرار نہیں پاتا۔ سلطان المشائخ سے کوئی دعا پوچھ دیجئے تاکہ میرے دل کی بے قراری اور پریشانی دفع ہو۔

سلطان المشائخ اس کا حال سن کر فرماتے ہیں:

"ایسے شخص کو دو کام کرنے چاہئیں، یا تو کسب و حرفت میں مشغول ہونا چاہیئے جس سے وجہ معاش حاصل ہو یا عبادت و گوشہ نشینی میں کچھ زمانہ بسر کرنا چاہیئے۔"[۵۲]

(۵) محمد شہ غوری نامی ایک شخص اضطراب کی حالت میں بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ شیخ اُن کی پریشانی کا سبب پوچھتے ہیں۔ عرض کرتا ہے:۔ میرا بھائی سخت بیمار ہے۔ کیا عجب ہے کہ میرے یہاں آنے تک وہ مر چکا ہو۔ اس کی وجہ سے زیر و زبر ہوں۔ فرمایا:۔

"ہم چنیں کہ تو ایں ساعت ہستی من ہمہ عمر ہم چنیں ام، وے باکسے پیدا نکنم۔"[۵۳]

ان واقعات پر غور کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ عوام کی اصلاح و تربیت کے لئے ان بزرگوں نے کیا انداز اور طریقۂ کار اختیار کیا تھا۔

---

[۵۱] خیر المجالس

[۵۲] سیر الاولیاء

[۵۳] فوائد الفواد

(۴)

ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کا ایک اہم اصول یہ رہا ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ شگفتہ تعلقات رکھے جائیں۔ نافع السالکین میں لکھا ہے :-

"حضرت قبلہ من قدس سرہٗ فرمودند کہ در طریق ما ہست کہ با مسلمان و ہندو صلح باید داشت۔ و ایں بیت شاہد آوردند ؎	حضرت قبلہ قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے سلسلہ کا یہ اصول ہے کہ مسلمان اور ہندو دونوں سے صلح رکھنی چاہیے اور یہ بیت پڑھا کرتے تھے۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" [۱]

اُن کے نزدیک یہ تقاضا سماج اور سیاست کا نہ تھا بلکہ اخلاق و انسانیت کا مطالبہ تھا۔ وہ عملاً اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ کے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ عقائد و نظریات کے اختلافات انسانی برادری کے رشتہ پر نظر انداز نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ———

وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَاناً

اے خدا کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ (بخاری)

---

[۱] نافع السالکین۔ ص ۱۷۶

اُن کا ایمان تھا۔ وہ مہر و محبت ۔ خلوص و مروت ، ہمدردی و رواداری سے انسانی قلوب کو ایک رشتۂ الفت میں پرونے کی کوشش کرتے تھے
ایک شخص نے بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں قینچی پیش کی ۔ فرمایا ۔ مجھے تو سوئی دو میں کاٹتا نہیں ، جوڑتا ہوں [۵۱]

ہندو مذہب کی طرف مشایخ چشت کا جو رویہ تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے ۔ ایک دن صبح کے وقت شیخ نظام الدین اولیاءؒ، امیر خسروؒ کے ساتھ اپنے جماعت خانہ کی چھت پر چہل قدمی فرمارہے تھے ، دیکھا کہ پڑوس میں کچھ ہندو بتوں کی پوجا کررہے ہیں ۔ فرمایا :

" ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے " [۵۲]

یہ جملہ اُن کے افکار کا مکمل ترجمان اور چشتیہ سلسلہ کے اصولوں کا بہترین آئینہ دار ہے

مشایخ چشت کی وسعتِ نظر اور رواداری کا یہ حال تھا کہ ہندوؤں کی کوئی بات پسند آتی تو اس کی بے تکلف تعریف کرتے ۔ بابا فرید گنج شکرؒ کی خانقاہ میں جوگی اکثر حاضر ہوتے تھے ۔ دو مرتبہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی اُن سے وہاں گفتگو

---

۵۱ فوائد الفواد

۵۲ امیر خسرو نے فوراً ہی دوسرا مصرعہ کہا ۔

من قبلہ راست کردم جانب کج کلاہے

کہتے ہیں کہ اس وقت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے سر پر ٹوپی ٹیڑھی رکھی ہوئی تھی
ملاحظہ ہو انوار العیون (قلمی) نیز تزک جہانگیری ۔

ہوئی[51] ایک بار عالم علوی اور سفلی پر بات چیت چھڑ گئی۔ جوگی نے اپنے خیالات کی جو وضاحت کی تو شیخ نظام الدین رح پر بڑا اثر ہوا اور فرمایا :- مرا سخن او خوش آمد[52]
مذہبی معاملات میں خلوص اور استقامت کو مشایخ چشت بے حد پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غالب کی طرح انھوں نے یہ تو نہیں کہا ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

لیکن اس استواری کی ہمیشہ تعریف کی۔ ایک مرتبہ امیر حسن سجزی رح (جامع الفوائد) کو کچھ دنوں تک تنخواہ نہ ملی جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان ہوئے۔ شیخ نظام الدین اولیا رح کو اس کا علم ہوا تو فرمایا :-

"ایک شہر میں کوئی مال دار برہمن رہتا تھا۔ شاید اس پر شہر کے حاکم نے جرمانہ کیا اس کا سارا مال و اسباب لے لیا، بعد ازاں وہی برہمن مفلس اور مضطرب کسی راستے چل رہا تھا۔ سامنے سے اُسے ایک دوست ملا۔ پوچھنے لگا۔ کیا حال ہے؟ برہمن نے کہا اچھا اور بہت عمدہ ہے۔ اس نے کہا ساری چیزیں تو تجھ سے چھن گئیں، اب کیا خاک اچھا ہوگا۔ بولا۔ "زنار من با من است" (میرا جنیو تو میرے پاس ہے)"[53]

یہ حکایت سُن کر امیر حسن رح کے دل کو بڑی تسکین ہوئی۔ علامہ اقبال امیر خسرو کے اس شعر کو بہت پسند کرتے تھے کہ مذہبی رواداری اور بے تعصبی کے جذبات کا بہترین

---

[51] فوائد الفواد۔ ص ۸۵ - ۲۴۵

[52] فوائد الفواد۔ ص ۸۵

[53] فوائد الفواد ص ۵۶

آئینہ دار ہے۔

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری
ہم زوے آموز پرستش گری

اسلام اور اسلام کے اصولوں کی اشاعت کے لئے جو طریقۂ کار مشایخ چشت نے اختیار کیا تھا، وہ مروجہ طریقوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ زبان سے کسی اصول کی تبلیغ واشاعت کو بے سود و بے کار سمجھتے تھے وہ کہتے تھے کہ جب تک انسان کی زندگی خود ان اصولوں کی تفسیر نہ بن جائے، کسی کو اُن اصولوں سے دلچسپی پیدا نہیں کرائی جاسکتی۔ عمل میں ایک جاذبیت ہے اس کا اثر زیادہ گہرا اور زیادہ پائدار ہوتا ہے —— کارلائل (CORLYLE) نے رسول مقبول ؐ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ نور کے ایک بہتے ہوئے چشمے کی مانند تھے جو اُن کے نزدیک آجاتا، منور ہوجاتا۔ مشایخ کی بھی کوشش یہ ہی تھی کہ ان کے عمل کی کشش خود بخود لوگوں کو کھینچ لے، انھیں زبان سے نہ کہنا پڑے۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے:۔

"ہر چہ علماء بزبان دعوت کنند، مشایخ بعمل دعوت کنند"[۵۱] ایک دن ایک مسلمان، ایک ہندو کو لے کر شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: یہ میرا بھائی ہے۔ حضرت شیخ نے پوچھا:۔

"ایں برادر تو ہیچ میلے بمسلمانی دارد"[۵۲]
(تیرا یہ بھائی مسلمانی سے بھی کچھ رغبت رکھتا ہے)

---

[۵۱] سیر الاولیاء ص ۳۲۱

[۵۲] فوائد الفواد ص ۱۸۲

اس شخص نے عرض کیا :- میں اسی غرض سے اُسے یہاں لایا ہوں کہ جناب کی نظر التفات سے وہ مسلمان ہو جائے۔ شیخ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے فرمایا :- اس قوم پر کسی کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کسی صالح مرد کی صحبت میں آیا جایا کریں تو شاید اس کی برکت سے مسلمان ہو جائیں "۔ اس کے بعد انھوں نے ایک طویل حکایت بیان کی جو تبدیلی مذہب کے بنیادی اصولوں پر اُن کے خیالات کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی کو نہ تو تلوار کے زور سے مُسلمان بنایا جا سکتا ہے نہ زبانی تلقین سے۔ اچھا کردار، تلوار اور زبان سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ اس کی مقناطیسی قوت' اعتقاد و عمل میں انقلاب برپا کر سکتی ہے۔ دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے خود مسلمان بننا ضروری ہے۔ پھر تمھاری صحبت میں جو آئے گا خود مسلمان ہو جائے گا۔

مشایخ چشت ہدایت فرماتے تھے کہ اگر کوئی ہندو تمھاری صحبت سے گرویدگی یا عقیدت کی بنا پر تمھارے پاس آنے جانے لگے اور تم سے ذکر وغیرہ کے متعلق پوچھے تو فوراً بتا دو، اس فکر میں نہ رہو کہ وہ باقاعدہ مسلمان ہو جائے جب اُسے روحانی تعلیم دی جائے۔ شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"صلح با ہندو و مسلمان سازند و ہر کہ ازیں دو فرقہ کہ اعتقاد بشما داشتہ باشند، ذکر و فکر مراقبہ و تعلیم او بگویند کہ ذکر بخاصیت خود اورا برتقرّ اسلام خواہد کشید "[۱]

شیخ نظام الدین اولیاء کی ایک عبارت ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ فرماتے تھے کہ اگر بیعت کے شرائط و قواعد کو وہ پہلے ہی سے بیان کر دیں تو بہت سے لوگ محروم رہ جائیں۔

---

[۱] مکتوبات کلیمی۔ ص ۴۷

دینی معاملات میں سہولت پیدا کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کو بیک وقت بہت سے اصول و قواعد کی بندش میں جکڑنا اچھا نہیں۔ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکامات کا بوجھ ایک دفعہ ان پر ڈال دینا، نفسیاتی مصلحتوں کے خلاف ہے[۱]۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ (باب التیسیر)[۵۲] میں مذہبی آسانیوں پر مفصل گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ لوگوں کی طبیعت کی رغبتوں کو سامنے رکھ کر مذہبی اصولوں کے اتباع کی دعوت دینی چاہیئے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو تبلیغی کام کے لئے یمن روانہ کیا، تو ہدایت فرمائی۔

---

[۱] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ بن جبل کو یمن روانہ کرتے ہوئے ہدایت فرماتے ہیں

انک تاتی قوما من اھل الکتاب فادعھم الی شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ فان ھم اطاعوا لذالک فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم خمس صلوات فی کل یوم ولیلۃ فان ھم اطاعوا لذالک فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیاءھم وترد الی فقراءھم فان ھم اطاعوا لذالک فایاک وکرائم اموالھم واتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینھا وبین اللہ حجاب۔	تم اہل کتاب کے پاس جاتے ہو، پہلے اُن کو کلمہ توحید کی دعوت دو، اگر وہ اس کو قبول کرلیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے رات اور دن میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے اُن پر صدقہ فرض کیا ہے، جو ان کے امراء سے لے کر اُن کے غرباء پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اگر وہ اس کو بھی تسلیم کرلیں تو اُن کے بہترین مال سے احتراز کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ اس میں اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

[۵۲] حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد اول ص ۲۱۱

یسروا ولا تعسروا و بشروا ولا تنفروا وتطاوعا ولا تختلفا	(دین کو) آسان کرکے پیش کرنا، سخت بناکر نہیں۔ لوگوں کو خوش خبری سنانا، نفرت نہ دلانا اور باہم ہمیشہ موافق رہنا، اختلاف نہ کرنا

مشائخ چشت، اشاعتِ دین کے اسی اصول پر عامل تھے۔ اور اسی کو زیادہ موثر خیال کرتے تھے۔

ملفوظات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے زمانے سے لے کر شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کے زمانے تک مشائخ کو ایسے لوگوں کی اصلاح و تربیت کرنی پڑی ہے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن اپنے قبیلے کے ڈر سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ فوائد الفواد میں لکھا ہے :-

"یکے از حاضران پرسید کہ ہندوے کہ کلمہ می گوید وخدائے را بوحدانیت یاد می کند رسول را برسالت، اما ہمیں کہ مسلمان می آیند ساکت می شود عاقبت او چہ باشد"[۵۱]	حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ ایک ہندو کلمہ پڑھتا ہے، اللہ کی وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت پر اعتقاد رکھتا ہے، لیکن جوں ہی مسلمان آتے ہیں، خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کی عاقبت کیسی ہوگی۔

شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ایک خط میں شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کو لکھتے ہیں :-

"و دیگر مرقوم بود بہیہ دیارام و ہندوہائے دیگر بسیار در ربقۂ اسلام درآمدہ اند۔ اما بر مردم قبیلہ پوشیدہ می مانند"[۵۲]

شاہ کلیم اللہؒ اس چیز کو پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ آہستہ

---

[۵۱] فوائد الفواد ص ۱۳۵ [۵۲] مکتوبات کلیمی ص ۲۵

آہستہ تبدیلیِ مذہب کا اظہار بھی ہو جانا ضروری ہے[۵] حضرت نظام الدین اولیاء نے ایسے لوگوں کے متعلق صرف اتنا فرمایا تھا :۔

"معاملہ او بحق است ، تا حق چہ کند
ان شاء عفا و ان شاء عذب"

---

۵ مکتوبات کلیمی ص ۲۵

(۵)

اصلاح و تربیت سے متعلق اس بات کو ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چشتیہ سلسلہ کی ایک اہم رسم سماع کے متعلق یہاں کچھ عرض کر دیا جائے۔

سماع کے مسئلے پر علماء و مشائخ میں بڑا اختلاف رہا ہے۔ بعض مشائخ نے اس کو روحانی ترقی کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ کچھ علماء نے اس کو صریحاً حرام بتایا ہے بعض محتاط بزرگوں نے "نہ انکار می کنم نہ ایں کار می کنم" کہہ کر سکوت اختیار کر لیا ہے۔ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ کے لئے امام ابن تیمیہ کا رسالہ السماع والرقص[1] مولانا ابوالفرج ابن جوزی کی کتاب تلبیس ابلیس[2]، مولانا فخر الدین زرادی کا رسالہ اصول السماع امام غزالی کی کیمیائے سعادت۔ شیخ ہجویری کی کشف المحجوب اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا رسالہ قرع الاسماع باختلاف اقوال المشائخ و احوالہم فی السماع ملاحظہ کرنا چاہیئے۔

مولانا محمود کاشانی نے مشائخ کے لئے اس کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

---

[1] اردو ترجمہ "وجد و سماع" از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مطبوعہ الہلال بک ایجنسی
[2] مطبوعہ مصر ۱۹۲۸ء)

اصحابِ ریاضت و اربابِ مجاہدہ را از کثرتِ معاملات گاہ گاہ اتفاق افتد کہ کلالتے و ملالتے در قلوب و نفوس حادث شود، و قبض و یلسے کہ موجبِ فتورِ اعمال و تقصیرِ احوال بود طاری گردد و ایں مشائخ متاخر از برائے رفع ایں عارضہ و دفع ایں حادثہ ترکیبے روحانی از سماعِ صوتِ طیبہ و الحانِ متناسبہ و اشعارِ مہیجہ مشوقہ بر وجہے کہ مشروع بود نمودہ اند[1]

مشائخِ چشت، سماع کو روحانی غذا سے تعبیر کرتے تھے، لیکن اس کے آداب کا نہایت سختی سے خیال رکھتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے کہ سماع کی چار قسمیں ہیں۔ حلال، حرام، مکروہ اور مباح۔ اگر صاحبِ وجد کو حق کی طرف زیادہ میل ہے، تو سماع اس کے حق میں مباح ہے اگر اس کا میلان مجاز کی طرف زیادہ ہے تو سماع اس کے حق میں مکروہ ہے۔ لیکن جس کا دل بالکل مجاز ہی کی طرف ہو اس کے لئے سماع حرام ہے۔ جب میلان طبع بالکل حق کی طرف ہو تو حلال ہے[2]۔

سماع کے حلال ہونے کے لئے چار چیزوں کی ضرورت تھی

(۱) مُسمِع ‏ (۲) مُستمع ‏ (۳) مسموع ‏ (۴) آلۂ سماع

مُسمِع (یعنی گانے والا) مرد کامل ہو، لڑکا یا عورت نہ ہو۔ مُستمع (یعنی سننے والا) یادِ حق سے خالی نہ ہو۔ مسموع (یعنی جو چیز گائی جائے) فحش نہ ہو۔ آلۂ سماع (یعنی مزامیر) موجود نہ ہوں[3]۔ مشائخِ چشت کا خیال تھا کہ اگر ان میں سے ایک شرط بھی پوری نہ ہو تو سماع حرام ہے۔

رفتہ رفتہ ان شرائط کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ سماع کی روح ختم ہو گئی اور بقول شاہ کلیم اللہؒ، صرف "ہائے ہوئے سماع" رہ گیا۔ شاہ صاحب نے ان ہی حالات کے پیشِ نظر اعلان کیا کہ کثرتِ سماع ہم خوب ندارم، اور اس کی وجہ یہ بتائی۔

"امروز قدرِ راگ مشائخ نمی شناسند و آداب را رعایت نمی کنند[4]"

---

[1] مصباح الہدایت ص ۱۰۲ – ۱۰۰ آگے جلال الدین ہمائی نے سماع میں نہایت دلچسپ مکمل تشریحی نوٹ لکھا ہے
[2] سیر الاولیاء ص ۴۹۱
[3] سیر الاولیاء ص ۴۹۲ – ۴۹۱
[4] مکتوباتِ کلیمی۔ ص ۸۳

مشائخِ چشت

(سلسلۂ نظامیہ)

متاخرین

اٹھارویں اور انیسویں صدی کا ہندوستان

سیاست۔ اقتصادی حالات۔ معاشرہ اور مذہب

(۱)

سیاسی حالات

اٹھارویں صدی عیسوی، صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں بڑی اہم سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ کچھ ملک غلامی کی زنجیریں توڑنے میں مصروف تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کی گردنوں میں غلامی کے طوق ڈالنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ امریکہ کی جنگِ آزادی کامیاب طور پر لڑی جا چکی تھی۔ انقلابِ فرانس نے سارے یورپ میں آزادی کی تحریکوں کو ابھار دیا تھا۔ پرانا سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہو رہا تھا اور انگلستان کے مشہور شاعر ورڈسورتھ (WORDSWORTH) کو فرانس میں ایک نئی دنیا جنم لیتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن عالمِ اسلامی کی حالت بالکل مختلف تھی۔ وہاں عام رجحان پستی اور تنزل کی جانب تھا۔ ایک طرف دولتِ عثمانیہ کا آفتابِ اقبال تیزی کے ساتھ گہن میں آ رہا تھا۔ دوسری طرف ایران میں انتشار و ابتری کا دور دورہ تھا۔ ادھر سلطنتِ مغلیہ دم توڑ رہی تھی۔ نئی نئی قوتیں ابھر کر سیاسی فضا کو مکدر کر رہی تھیں اور

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں کی سیاست اور سماج کی ساری بنیادیں ہمیشہ کے لئے ہل جائیں گی۔

۳ مارچ ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ تقریباً نصف صدی تک وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کو درست کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ آخری وقت میں اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ وہ صلح اور خوش دِلی کے ساتھ سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کرلیں۔ یہ وصیت حالات کے گہرے مطالعہ اور اپنے بیٹوں کی صلاحیتوں کے صحیح جائزے پر مبنی تھی۔ عالمگیر کی دور بین نگاہوں نے اُن طاقتوں کو اُبھرتے ہوئے دیکھ لیا تھا جن کا استیصال ایک مرکز سے قطعاً ناممکن تھا۔ لیکن اس کے تنگ نظر اور خود غرض جانشینوں نے اس وصیت کی طرف توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طاقت جو تین مرکزوں میں تقسیم ہو کر مخالف قوتوں کو دبانے میں صرف کی جا سکتی تھی، آپس میں لڑ کر ختم ہو گئی۔

۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اگر ایک طرف جنگِ تخت نشینی نے سیاسی نظام کو متزلزل رکھا تو دوسری طرف بادشاہوں کی کوتاہ اندیشی، عیش پرستی اور پست ہمتی نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں باغیانہ قوتیں کام کرنے لگیں۔ اور ہر طرف لوٹ مار قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ ان حالات میں کچھ بوریہ نشینوں نے بادشاہ کو اس کے گہوارۂ عیش و عشرت میں بیدار کرنے کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بادشاہ، وزیر اور امراء کے نام دس کلمات کا ایک اعلان جاری کیا، جس میں مطالبہ کیا۔

"آنکہ بادشاہ اسلام و امرائے کبار بہ عیش حرام مشغول نشوند، از گذشتہ توبہ نصوح بجا آرند و آئندہ اجتناب نمایند"[1]

[1] "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات" مرتبہ خاکسار راقم الحروف ص ۴۳

شاہ فخرالدین صاحبؒ نے ہدایت کی ـــــــــــ

"پس اول مقدم ایں است کہ آں صاحب بذات خود مستعد محنت کشی وملک گیری شوند"[۱]

لیکن 'مے ورامش ورنگ و بو' کی اس دنیا میں مدرسوں اور خانقاہوں کی یہ آواز کہاں سنی جاسکتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ زوال وانحطاط کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی۔ مرکزی حکومت کا ڈھانچہ بے جان ہو کر گرنے لگا۔ صوبائی گورنروں، جاگیرداروں امرا اور حکام نے سیاسی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت بڑھانی شروع کر دی اور وہ سلطنت مغلیہ جس کا اقتدار کبھی کشمیر سے دکن اور بنگال سے کابل وقندہار تک تسلیم کیا جاتا تھا سمٹ کر قلعہ معلی کی چار دیواری میں آگئی۔

فرماں رواؤں کی غفلت اور عیش پسندی سے سب سے پہلے جو طبقہ فائدہ اٹھایا کرتا ہے وہ ہمیشہ امرا کا ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں ان امرا نے جو حالات پیدا کر دئے تھے وہ حد درجہ افسوسناک تھے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وہ ایک طرف گروہ بندی کرتے تھے۔ دوسری طرف بیرونی طاقتوں سے ساز باز۔ اس طرح سماج اور سیاست کا ہر ہر گوشہ ان کی شاطرانہ چالوں سے متاثر ہوتا تھا۔ جماعت بندی کے مسموم اثرات محلات سے لے کر جھونپڑوں تک پہنچتے تھے۔ اور سماجی زندگی کی تلخیوں میں اضافہ کرتے تھے۔ دربار میں دو مستقل پارٹیاں (ایرانی اور تورانی) تھیں۔ ہندوستان کی سیاست ان ہی دو پارٹیوں کے گرد گھومتی تھی تاریخ احمد شاہی کے مصنف نے ان حالات میں لکھا تھا ـــــــ

"یہ تمام فتنہ وفساد، ایرانی اور تورانی امرا کے آپس کے جھگڑوں

---

[۱] مناقب فخریہ۔ ص ۳۶ - ۳۵

کا نتیجہ ہے "۔ ؎۵۱

سیاسی حالات کا اُتار چڑھاؤ ان ہی امرار کی ابروئے چشم کے تابع تھا۔ سرجادو ناتھ سرکار کا خیال ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور کی تاریخ صرف ان ہی دو پارٹیوں کی بزورآزمائی کا نام ہے ؎۵۲

مرکز کو کمزور پاکر صوبائی حکومتوں کا اعلانِ خود مختاری کردینا بالکل فطری بات تھی، چنانچہ سعادت علی خاں نے اودھ میں، علی وردی خاں نے بنگال میں اور نظام الملک نے دکن میں اپنا اقتدار قائم کرلیا اور اس طرح سلطنت مغلیہ کا سیاسی اقتدار اور اقتصادی ذرائع ختم ہوگئے۔

جو علاقہ شاہانِ مغلیہ کے قبضہ میں تھا، وہاں جاگیرداری اور اجارہ داری کی رسمیں جاری تھیں اور اُن کے مذموم اثرات کاشتکار سے لے کر حکومتِ وقت تک کے لئے پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ بڑے جاگیردار ایک طرف حکومت کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرتے تھے۔ دوسری طرف غریب کاشتکاروں کا خون چوستے تھے اُن کا وجود حکومت کے لئے پریشان کن اور کاشتکاروں کے لئے ایک بلائے آسمانی کی مانند تھا۔ چھوٹے چھوٹے منصب داروں کی حالت مختلف تھی۔ انھیں کوئی لگان دینے پر ہی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مرکزی حکومت نے اپنا کام آسان کرنے کے لئے سارا ملک جاگیرداروں میں بانٹ رکھا تھا۔ جو علاقہ باقی رہ گیا تھا وہاں اجارہ داری کی رسم جاری کردی تھی۔ ان حالات میں ہر طبقہ پریشان اور اقتصادی بدحالی میں مبتلا تھا۔ بادشاہ کے ایک لاکھ ملازمین تھے۔ جن میں سے کچھ اہل نقدی تھے

؎۵۱ FALL OF THE MUGHAL EMPIRE VOL I P 439

؎۵۲ FALL OF THE MUGHAL EMPIRE VOL I P 13

اور کچھ اہل جاگیر۔ دونوں کی حالت بقول شاہ ولی اللہ یہ ہو گئی تھی کہ

کاسۂ گدائی در دست گرفتہ [۵۱]

ان حالات میں ناگزیر تھا کہ ملک کے وہ تمام عناصر جو تھوڑی سی بھی قوت جمع کر سکتے ہوں۔ قسمت آزمائی کے لئے تیار ہو جائیں۔ سکھ، مرہٹے، روہیلے، جاٹ سب نے اس ماحول میں ہنگامہ آرائی کی، اور حالات کو اس درجہ خراب کر دیا کہ امن و سکون ملک سے مستقل طور پر رخصت ہو گیا۔ فتنہ و فساد، منافرت و عداوت لوٹ مار اور غارت گری نے سماجی زندگی کا نام و نشان بھی باقی نہ چھوڑا۔

سیاسی انتشار، اخلاقی زبوں حالی اور معاشی بحران کے اس دور میں ایک بیرونی طاقت نے اپنے پنجے جمانے شروع کئے، اور رفتہ رفتہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے کچھ کوششیں بھی کی گئیں لیکن اس بیرونی طاقت کے پیچھے یورپ کا صنعتی انقلاب تھا، اور شہنشاہیت کا بے پناہ خمار۔ یہ کوششیں فوری طور پر بارآور نہ ہوئیں اور کچھ عرصہ کے لئے ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔

جن مشائخ کے حالات، آپ ان صفحات پر پڑھیں گے وہ اسی ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور اسی ماحول میں ان کو کام کرنا پڑا تھا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی بعض اہم سیاسی تحریکوں کا جائزہ لے کر ہم آگے بڑھیں۔

سکھ پندرویں صدی میں اسلام کے اثر سے ہندوؤں میں جو مذہبی رہنما پیدا ہوئے تھے۔ ان میں گرو نانک (۱۴۶۹ - ۱۵۳۸) کی شخصیت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ وہ بڑے وسیع مشرب انسان تھے۔ وحدانیت، اخلاقی زندگی اور سماجی مساوات پر اُن کا ایمان تھا۔ مسلمان بزرگوں اور صوفیہ کی صحبت سے

---

[۵۱] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات - ص ۵۱

وہ کافی مستفیض ہوئے تھے۔ پاک پٹن میں حضرت بابا فرید گنج شکر کے سجادہ نشینوں کی صحبت سے کافی فائدہ اُٹھایا تھا[۵۱] ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے لکھا ہے:

"بابا نانک انسانی دل کو سیاسی آزادی نہیں بلکہ روحانی آزادی دلانا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ اُن کے پیرو، خود غرضی، مذہبی تعصب اور روحانی جمود سے آزاد ہوں۔ گرو گوبند نے ان کی روحانی طاقت کو مادی کاموں میں لگا دیا۔ یہ ایک اچھی تحریک کا حسرت ناک انجام تھا۔"[۵۲]

جب تک سکھوں کی تحریک خالصتاً مذہبی رہی، مسلمان بادشاہوں نے اس کے رہنماؤں کے ساتھ بڑی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا، لیکن جب اُس نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا تو مغل بادشاہوں کے تعلقات کی نوعیت بھی بدل گئی۔ مشہور ہے کہ جب بابر ہندوستان آیا، تو گرو نانک کی خدمت میں عقیدت مندانہ حاضر ہوا۔ گرو نانک نے اُسے ہندوستان کی فتح اور سات پشتوں تک اس کی نسل کی حکمرانی کی دعا دی[۵۳]۔ اکبر نے گرو جی امرداس وغیرہ کی بڑی عزت کی۔ گرو ارجن کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہو گیا تھا کہ اُن کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ شہنشاہ تک اُن کے آگے جھکتا ہے[۵۴] جب اکبر چتوڑ پر حملہ آور ہوا تو بھگوان داس کو گرو امرداس کے پاس دعا کے لئے روانہ کیا[۵۵] کہتے ہیں کہ اکبر نے خود حاضر ہو کر اُن سے بارہ[۱۲] دیہات قبول کرنے کی درخواست کی تھی[۵۶] گرنتھ پر اہ شہرفیاں

---

۵۱ IRVINE: LETTER MUGHALS, VOL I P. 74.

۵۲ MODERN REVIEW, APRIL 1911.

۵۳ شمشیر خالصہ، از گیانی سنگھ گیانی و بابو راجندر سنگھ۔

۵۴ MACAULIFFE III P. 28

۵۵ تاریخ ہند، مولوی ذکاءاللہ مرحوم، جلد ۹ ص ۹۴

۵۶ " " ص ۹۴

چڑھائی تھیں۔ گرو ارجن کی سفارش پر پنجاب کا ایک سال کا لگان معاف کر دیا تھا[۵۱] امرتسر جس کا قدیم نام گرو چاک ہے، اکبر ہی نے سکھوں کو دیا تھا[۵۲] سر جیمس ڈوئی (SIR JAMES DOUIE) نے لکھا ہے کہ سکھوں کے ساتھ اکبر کے اس اچھے برتاؤ کا ایک سبب یہ تھا کہ اکبر کے آزادانہ مذہبی افکار بہت حد تک ان گروؤں کے اصولوں سے ہم آہنگ تھے۔[۵۳]

مغل بادشاہوں کے یہ تعلقات اس وقت تک رہے جب تک سکھوں کے رہنماؤں نے سیاست میں مداخلت نہیں کی۔ جوں ہی اس تحریک نے رنگ بدلا، شاہانِ مغلیہ کے رویہ میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ مسلمان بادشاہوں کی مخالفت کا سبب کوئی مذہبی عناد نہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ کلیتاً سیاسی تھی۔[۵۴] گرو ارجن نے ایک سیاسی نظام تیار کیا، اور امرتسر کو عسکری مرکز بنا کر کابل سے ڈھاکہ تک جہاں جہاں سکھ بستے تھے اُن سے محصول لینا شروع کیا۔ اس طرح بقول ڈاکٹر تارا چند ایک مذہبی برادری، ایک حکمراں طبقہ میں منتقل ہو گئی[۵۵] دولت کی ہوس اس قدر بڑھ گئی کہ خود سکھوں میں مشہور ہو گیا کہ دنیا کی دولت گرو نانک سے بارہ کوس کے فاصلہ پر تھی۔ گرو وانگد سے ۶ کوس پر گرو امرداس کے دروازہ پر، گرو امرداس کے قدموں میں اور گرو ارجن کے گھر میں[۵۶]

---

[۵۱] تاریخ ہند۔ جلد ۹ ص ۵۲

[۵۲] چاک ٹکرے کو کہتے ہیں۔ گرو چاک کے معنی ہوئے وہ ٹکڑا جو گرو کو پیش کیا جائے۔

[۵۳] THE PUNJAB, P. 175

[۵۴] SARKAR: HISTORY OF AURANGZEB VOL III, P. 305

[۵۵] HISTORY OF THE INDIAN PEOPLE, P269

نیز ملاحظہ ہو اردن: ج ا ص ۷۶

[۵۶] تاریخ ہند۔ مولوی ذکاء اللہ مرحوم۔ جلد ۹ ص ۵

سکھوں کا سب سے پہلا جھگڑا جہانگیر سے ہوا۔ گرو ارجن (۱۶۰۹ - ۱۵۸۱) نے شہزادہ خسرو کو جس نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی، پناہ دی۔ جہانگیر نے اس بات پر گرو کو دربار میں بلایا اور جرمانہ کیا۔ جب انھوں نے جرمانے کی ادائیگی سے انکار کیا تو ان کو سزا دی گئی۔ ڈاکٹر بینی پرشاد نے صحیح لکھا ہے کہ سزا صرف سیاسی اسباب کی بنا پر دی گئی تھی۔ اگر گرو ارجن ایک باغی شہزادے کی مدد نہ کرتے تو وہ بلا ضرر اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے دن گذار سکتے تھے[۱] سر جادو ناتھ سرکار کا بھی یہی خیال ہے کہ اس قتل میں کوئی مذہبی جذبہ شامل نہ تھا۔ یہ سزا وہی تھی جو معمولاً سیاسی مجرموں کو دی جاتی تھی۔[۲] واقعہ کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ اس قتل نے شاہان مغلیہ اور سکھوں کے درمیان ایک ابدی منافرت کا بیج بو دیا۔ اس کے بعد جب گرو ہرگوبند (۱۶۴۵ - ۱۶۰۶) نے سکھوں کی تنظیم بالکل سیاسی نہج پر شروع کر دی تو حکومت سے ان کا تصادم یقینی ہوگیا[۳] ڈاکٹر سنہا نے گرو گوبند کو سکھ عسکریت کا بانی بتایا ہے۔[۴]

گر دھر رائے (۱۶۶۱ - ۱۶۴۵) نے جنگ تخت نشینی کے دوران میں دارا شکوہ

---

[۱] HISTORY OF JAHNGIR, P. 130

[۲] تاریخ اورنگ زیب جلد سوم ص ۳۰۸ (انگریزی)

[۳] DOUIE: THE PUNJAB P. 175

ایک پیرانہ سال سکھ بھائی بدھا نے جب اُن کی سیاسی ہوس پر ان کو تنبیہہ کی تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھے روحانی اور مادی دونوں تلواریں دی گئی ہیں

ملاحظہ ہو MACANLIFFE, VOL IV, P. 4.5, 53.

[۴] N.K. SINHA RANJIT SINGH, P. 175

کو مدد دی [۵۱] اور اورنگ زیب سے اُن کے تعلقات خراب ہوگئے۔ پھر تیغ بہادر (۱۶۶۴-۱۶۷۵) نے کشمیر کے ہندوؤں میں بغاوت پھیلانی شروع کی تو اورنگ زیب نے ان کو قتل کرادیا [۵۲] گرو گوبند سنگھ (۱۶۷۵-۱۷۰۸) سے بھی اس کے تعلقات خراب رہے۔ ۱۶۷۶ء میں جب بادشاہ جامع مسجد سے نکل رہا تھا تو ایک سکھ نے بادشاہ پر اینٹیں پھینکیں [۵۳] اب سکھوں کی دشمنی صرف بادشاہوں تک ہی محدود نہ رہی عام مسلمانوں سے بھی مخالفت شروع ہوگئی۔ سکھ رہنماؤں نے حکم دیا کہ کوئی سکھ مسلمان بزرگوں کی قبروں پر نہ جائے۔ اگر جائے گا تو ۱۲۵ روپے جرمانہ کیا جائے گا [۵۴]

اورنگ زیب نے جب اُن کے سیاسی اقتدار کو بڑھتے ہوئے دیکھا اور سلطنت مغلیہ سے اُن کی دشمنی کا پورا یقین ہوگیا تو ان کے استیصال کی کوششیں شروع کردیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی اجتماعی وحدت کا خاتمہ ہوگیا نہ ان کا ایک مرکز رہا۔ نہ ایک رہنما۔ ان کی طاقت منتشر ہوگئی۔ سرجادوناتھ سرکار کا خیال ہے کہ اگر اورنگ زیب کے جانشیں لائق ہوتے تو سکھوں کا بھی وہی حشر ہوتا جو دہنو کی وانگ اور تانیتہ ٹوپی کا برطانوی عہد میں ہوا تھا [۵۵] اورنگ زیب کے کم زور جانشینوں نے ان کی لالچ کو اور بڑھا دیا۔ اور ان کی چیرہ دستیاں اور مظالم اس حد تک پہنچ گئے کہ

"زنہائے حاملہ را شکم دریدہ وجنین را کشیدہ می کشتند" [۵۶]

---

[۵۱] اروِن جلد اول۔ ص ۷۷ (انگریزی)

[۵۲] تاریخ اورنگ زیب۔ سرجادوناتھ سرکار۔ جلد سوم ص ۳۱۶

[۵۳] مآثر عالمگیری۔ ص ۱۵۴

[۵۴] تاریخ اورنگ زیب۔ جلد سوم۔ ص ۳۱۶

[۵۵] تاریخ اورنگ زیب۔ جلد سوم۔ ص ۳۲۰

[۵۶] سیر المتاخرین۔ ص ۴۰۲

باندا کے مظالم سے تمام شمالی ہندوستان گھبرا اُٹھا۔ سنہ ۱۷۱۰ء میں جب سرہند پر سکھوں کا حملہ ہوا تو بہت سے مسلمانوں نے ہندوؤں کے گھروں میں بھیس بدل کر پناہ لی[۵۱] اُن کے مظالم زندوں تک محدود نہ رہے۔ شاہ قمیص قادریؒ کا مزار خود اُن کی اولاد سے جبراً کھدوا یا گیا[۵۲] سہارنپور میں عورتیں سکھوں کے ڈر سے کنوؤں میں ڈوب کر مر گئیں[۵۳] بعض لوگوں نے قتل و غارت گری کے اس ہنگامہ میں اپنے نام بدل دئے۔[۵۴]

سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ اس کے بعد سکھوں کی طاقت اور ہمت میں اضافہ ہوگیا۔ ۱۷۳۹ء سے سنہ ۱۷۶۵ء تک متعدد بیرونی حملوں کی وجہ سے حالات خراب ہوگئے اور سکھوں کو ہنگامہ آرائی کا موقع ملا۔ انھوں نے سنہ ۱۷۶۴ء میں لاہور پر قبضہ کرلیا اور جہلم سے جمنا تک اپنا تسلط قائم کرلیا۔ سنہ ۱۷۶۵ء اور سنہ ۱۸۰۰ء کے درمیان ان کا اقتدار اور بڑھا۔ اٹک سے کرنال تک اور ملتان سے جموّں تک اُن کے قبضہ میں آگیا۔ اور انھوں نے دوآب اور روہیل کھنڈ پر بھی حملہ کرنے شروع کردئے۔ انیسویں صدی کے شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں اپنا اقتدار قائم کیا اور سکھوں کی طاقت اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی۔

روس کے ایک مشہور فاضل پروفیسر ای ایم ریسنر (E. M. REISNER) نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اٹھارویں صدی میں سکھوں کی تحریک بہت ترقی پسند

---

۵۱ اردن۔ جلد اول۔ ص ۹۶

۵۲ مرآت واردات۔ محمد شفیع وارد بحوالہ اردن جلد اول ص ۹۷

۵۳ اردن جلد اول۔ ص ۱۰۱۔ تاریخ ہند (مولوی ذکاء اللہ) جلد ۹ ص ۶

۵۴ دستور الانشاء۔ یار محمد ص ۸

تھی۔ وہ حقیقتاً (ANTI-FEUDEL) تھے[1] لیکن اٹھارویں صدی کی تاریخ اس خیال کی تائید نہیں کرتی۔ اٹھارویں صدی میں سکھوں نے جو حالات پیدا کر دئے تھے ان سے لوگوں کے مصائب میں بڑا اضافہ ہوگیا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ایک کل ہند سیاسی نظام قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

اٹھارویں صدی کے لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ سکھوں کے حملوں کی وجہ سے لوگ کس قدر پریشان رہتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے چچا کو لکھتے ہیں :۔

ایام بردانت فالقلب منجزع ‏ ‏ من قوم سکھہ وان الخوف معقول

سردیوں کا موسم آگیا اور دل پریشان ہے ‏ ‏ سکھ قوم سے، اور دل کا یہ اندیشہ معقول ہے

مرہٹے | اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے آخری ۲۶ سال دکن میں مرہٹوں سے جنگ کرنے میں صرف کئے تھے۔ ۲۵ر نومبر ۱۶۸۱ء کو وہ برہان پور پہنچا تھا اس کے بعد "ختم سفر" (۳ر مارچ ۱۷۰۷ء) تک وہ مرہٹوں سے برزآزما تھا۔ جغرافیائی حالات کی بنا پر مرہٹوں کا مکمل خاتمہ ناممکن ہوگیا تھا۔ لیکن تمام مشکلات کے باوجود اس نے مرہٹوں کے ایک مرکز اور اجتماعی قوت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کی اجتماعی طاقت کے منتشر ہونے کے بعد عالمگیر کو بجائے ایک جگہ کے، مختلف مقامات پر اُن کا مقابلہ کرنا پڑا اور اس طرح اس کا کام اور زیادہ مشکل ہوگیا، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر چند سال اورنگ زیب کے جانشین پوری طرح جدوجہد کرتے تو مرہٹوں کی سیاسی طاقت کا خاتمہ ہو جاتا۔

اورنگ زیب کے مرنے کے بعد مرہٹوں کی طاقت میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔

---

[1] MEDIEVAL INDIA QUARTERLY, P.71 - OCTOBER 1950

دکن اور گجرات کی صوبہ داری پر امرا آپس میں جھگڑتے تھے اور مرہٹوں کی طاقت بڑھتی تھی[۵۱] جب مرہٹوں کا طوفان شمال کی جانب اُمنڈتا تھا تو اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے حکومت کی طرف سے مرہٹوں کو مراعات دی جاتی تھیں، تاکہ وقتی طور پر وہ طوفان رُک جائے۔ ان مراعات نے مرہٹوں کی ہمت میں اضافہ کر دیا۔ جب فرخ سیر اور سید برادران میں کشمکش ہو رہی تھی تو سید حسین علی نے دکن میں مرہٹوں کو اپنا ساتھی اور مددگار بنانے کی نیت سے بالاجی وشوا ناتھ کو تمام دکن سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا حق دے دیا[۵۲] بادشاہ نے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو حسین علی فروری ۱۷۱۹ء کو مرہٹوں کی فوج کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہوا ۔۔۔۔۔ یہ واقعہ گو اس ماحول میں جو عالمگیر کے بعد پیدا ہو گیا تھا، کچھ غیر معمولی نہ تھا، لیکن جس دن حسین علی مرہٹوں کو اپنا مددگار بنا کر مغلوں کے دارالسلطنت میں لایا تھا۔ اسی دن مغلیہ سلطنت کے اقتدار کا جنازہ اُٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر سنہا نے لکھا ہے کہ مرہٹوں کا اس وقت دہلی آنا اُن کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ وہ اس وقت ملازمین کی حیثیت سے نہیں بلکہ مددگار کی حیثیت سے آئے تھے[۵۲] بالاجی وشوا ناتھ کے بعد اس کے بیٹے باجی راؤ (۱۷۲۰-۴۰) نے مالوہ اور گجرات سے خراج وصول کیا اور بندھیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۳۴ء میں مرہٹوں کا یہ حال تھا کہ گوالیار سے اجمیر تک ۲۲۰ میل کے فاصلے میں پھیل گئے تھے۔ راجہ جے سنگھ جو دہلی دروازہ سے نربدا کے کنارے تک کا حاکم تھا، باوجود ۳۰ ہزار فوج رکھنے کے کچھ نہ کر سکتا تھا۔ خود محمد شاہ کا یہ حال تھا کہ مرہٹوں کے حملہ کی خبر سُن کر جے سنگھ

---

۵۱ سر جادو ناتھ سرکار: "زوال سلطنتِ مغلیہ" جلد اول ص ۷۰

۵۱، ۵۲ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:-

H. N. SINHA: R SE OF THE PESHWAS.

کو بیس تیس لاکھ روپیہ دے کر مرہٹوں سے صلح خریدنے کے لئے بھیج دیتا تھا[۵۱]۔ بادشاہ کی ان حرکتوں سے مرہٹوں کو سلطنتِ مغلیہ کی کمزوری کا خوب اندازہ ہوگیا، اور ان کی دست درازیاں بڑھنے لگیں۔ بے حس اور خودغرض امراء کا یہ حال تھا کہ جب گجرات یا مالوہ پر مرہٹوں کے حملہ کی خبر بادشاہ کو پہنچتی تو اس کی پریشانی دور کرنے کے لئے شکار پر لے جاتے تھے[۵۲]۔ ۱۷۳۷ء میں مرہٹے دہلی پر حملہ آور ہوئے۔ تو مغل بادشاہ نے دریا میں کشتیاں ڈلوا دیں تاکہ محل شاہی کی دریچی سے نکل کر بھاگنے میں سہولت ہو[۵۳]۔ طارق کی روح نے پکار پکار کر کہا کہ اس کارزار ہستی میں عمل سے زندگی بنتی ہے۔ لیکن ہنگامہ ہائے عیش نشاط میں خلل انداز ہونے والی یہ صدائیں کون سنتا تھا!

بادشاہوں کی کمزوری اور امراء کی خودغرضی کے باعث مرہٹوں کو لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا موقع مل گیا۔ ان کے مظالم نے شاہ ولی اللہ دہلوی[۵۵]، مرزا مظہر جان جاناں[۵۶]، شاہ عبدالعزیز

---

۵۱ IRVIN: LATER MUGHALS VOL II P 227-8

۵۲ اردن۔ جلد دوم۔ ص ۲۷۸

۵۳ اردن۔ جلد دوم ص ۲۹۱

۵۴ اورنگ زیب تک کو ان امراء نے آخری عمر میں پریشان کیا تھا، سیر المتاخرین میں لکھا ہے:۔

"اما از تہاون بعض امراء رکاب کہ برائے اغراض خود انفصال ہنگامہ مرہٹہ نمی خواستند، استیصال مرہٹہ صورت نہ گرفت" ص ۹۲۳

۵۵ ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے سیاسی مکتوبات ص ۴۷ - ۴۶

۵۶ " " کلمات طیبات

۵۷ " " شاہ صاحب کے عربی منظوم خطوط بنام شاہ اہل اللہ رح وغیرہ

سلیم اللہ[۵۱] گنگا رام[۵۲]، وینشور و دیا لنکر[۵۳] اور بہت سے پرتگالیوں کے دل ہلادئے
بنگال کے مشہور شاعر گنگا رام نے لکھا ہے :

"برگیوں (مرہٹوں) نے دیہاتوں کو لوٹنا شروع کر دیا......... کچھ لوگوں کے انھوں نے ہاتھ، ناک اور کان کاٹ لئے۔ خوب صورت عورتوں کو وہ رسیوں میں باندھ کرلے گئے۔ جب ایک بارگی زنا کر چکتا تھا تو دوسرا کرتا تھا۔ عورتیں چیخیں مارتی تھیں .... انھوں نے گھروں کو آگ لگادی اور ہر طرف لوٹ مار کرتے ہوئے گھومے "[۵۴]

وینشور و دیا لنکر نے لکھا ہے کہ شاہو راجہ کی فوجیں، حاملہ عورتوں، بچوں، برہمنوں اور غریبوں کو بڑی بیدردی کے ساتھ قتل کرتی تھیں۔ وہ ہر طرح کے گناہ کا ارتکاب کرتے تھے اور جدھر سے گذر جاتے ایک قیامت برپا ہو جاتی"[۵۵]

ان حالات میں لوگوں کو اپنی زندگی وبال معلوم ہونے لگی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے مجبور ہو کر احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان آکر مرہٹوں کے تسلط سے خلاصی دلائے[۵۶] احمد شاہ ابدالی ہندوستان آیا اور پانی پت کے مقام

[۵۱تا۵۵] SARKAR: FALL OF THE MUGHAL EMPIRE VOL I P. 86 - 88

[۵۶] آنند رام مخلص نے شاعرانہ انداز میں بات کہی ہے

بردلِ ما تیرہ روزاں زاں صفِ مژگاں گذشت
آنچہ از فوج دکن بر مُلک ہندستاں گذشت
در چمن بر برگِ گلہا نگذرد صبح از نسیم
بر گریباں آنچہ از دستم شبِ ہجراں گذشت

(تصانیف آنند رام مخلص، قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڈھ)

پر مرہٹوں کی طاقت سے ٹکرایا۔ اس جنگ نے مرہٹوں کی طاقت کو پارہ پارہ کردیا اور بقول سرکار مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ دس سال تک مرہٹوں نے شمال کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے بعد دو تین بار انھوں نے اپنی طاقت کو مجتمع کرکے شمالی ہندوستان پر تسلط جمانے کی کوشش کی اور اس میں کچھ کامیابی بھی ہوئی، لیکن انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے مقابلہ میں اُن کو کوئی مستقل کامیابی حاصل ہونا ممکن نہ تھا

جاٹ | اورنگ زیب کے آخری عہد میں جاٹوں کو عروج حاصل ہوا۔ انھوں نے دہلی اور آگرہ کے گرد نواح میں اپنی گڑھیاں بنائیں اور تمام علاقہ میں لوٹ مار شروع کردی۔ حد یہ ہے کہ اکبر کے مقبرے میں سے اس کی ہڈیوں کو نکال کر جلا یا[۱]۔ یہ برتاؤ اس اکبر کے ساتھ تھا جس نے بندرہ بن اور متھرا میں جگل کشور، گوپی ناتھ کو بند دیو وغیرہ منادر اپنے صرفہ سے جاٹوں کے لئے بنوائے تھے[۲]۔

جاٹوں کی گڑھیاں، دار السلطنت سے اتنی قریب تھیں کہ حکومت کو اُن سے مستقل خطرہ رہتا تھا۔ مغل فوجوں کی آمد و رفت اکثر اسی علاقے سے ہوتی تھی اور ان کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بقول سرکار "دہلی اور آگرہ کی سڑک پر ایسا کانٹا برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا"[۳]

---

[۱] وقایع عالم گیری۔ چودھری نبی احمد سندیلوی۔ ص ۹۵ - ۹۸

SMITH: AKBAR, THE GREAT MUGHUL P.328 (N)

MANUCCI: VOL II P. 320

SARKAR: AURANGZEB, V P. 299

[۲] SMITH, P 446-446

[۳] SARKAR: FALL OF THE MUGHAL EMPIRE VOL I P. 369

جاٹوں کے مظالم سے دلی اور اردگرد کے باشندے سخت پریشان ہو گئے تھے۔ ہرچرن داس، مصنف چہار گلشن شجاعی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ "جب جاٹوں نے لوٹ مار شروع کی تو دلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، وہ دربدر، گلی بہ گلی مارے پھرتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو، پاگلوں کی طرح ہر شخص پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔"[۵۱] شاہ ولی اللہ دہلوی اور مرزا مظہر جان جاناں کے مکتوبات سے دلی کے باشندوں کی پریشانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ صاحب ایک خط میں حافظ جار اللہ کو لکھتے ہیں:-

وقد وقعت بالدهلی داهیة عظیمة فنهب الکفار من قوم جت ۔ البلدة القدیمة من الدهلی وعجزت الدولة عن دفعهم فنهبت الاموال وانتهکت وحرقت البیوت... وکانت الواقعة فی اوائل ذی الحجہ سنہ ۱۱۶۶ھ واستمرت الی اواخر شعبان[۵۲]	دہلی میں ایک حادثۂ عظیم واقع ہوا۔ قوم جاٹ نے دہلی کے شہر کہنہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی۔ انھوں نے مال لوٹے، عزت و ناموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی .... اور یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل رجب ۱۱۶۶ھ میں ہوا اور آخر شعبان تک باقی رہا

روہیلے | سترویں صدی میں افغانوں کے کچھ جتھے ہندوستان آکر مختلف مقامات پر

---

۵۱ قلمی نسخہ ۴/۱۵/۵۰

۵۲ "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات" ص ۸۹

بس گئے۔ بریلی۔ شاہ جہاں پور، فرخ آباد میں خاص طور سے اُن کی نوآبادیات قائم ہوئیں۔ فرخ آباد کے افغانوں نے محمد خاں بنگش کی قیادت میں بڑا عروج حاصل کیا۔ بریلی کے افغان قبائل روہیلوں کے نام سے مشہور ہوئے اور انھوں نے اتنی تیزی کے ساتھ تنظیم کی کہ اٹھارویں صدی کی سیاسی دنیا میں اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کر لی۔

اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی طبقہ اگر عیش و عشرت کی زندگی سے محفوظ تھا تو وہ صرف روہیلے تھے۔ ان میں عسکری صلاحیت اور سیاسی بصیرت کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہ مہلک امراض جنھوں نے سلطنتِ مغلیہ کے جسم کھوکھلا کر دیا۔ اُن کو چھو کر بھی نہ گزرے تھے۔ حکمران کی حیثیت سے بھی اُن کی شان امتیازی تھی۔ سر جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ اس معاملہ میں وہ مرہٹوں کے بالکل برعکس تھے۔ مرہٹے چوتھ وصول کرنے کے بعد کبھی یہ بھی نہ سوچتے تھے کہ ان علاقوں کی نگہہ داشت کی اخلاقی ذمہ داری ان پر عاید ہوتی ہے یا نہیں[1] روہیلوں نے جن علاقوں پر حکومت کی، اُن کے باشندوں کو اپنی انصاف پسندی سے فتح کر لیا۔ جارج فارسٹر ۱۷۸۳ء میں روہیلوں کے علاقہ سے گذرا تو اُن کے نظامِ حکومت سے بڑا متاثر ہوا وہ لکھتا ہے روہیلوں کے نام کی بھی اس علاقہ میں عزت کی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں فارغ البالی اور خوشحالی پھیلا دی ہے۔ گاؤں سرسبز و شاداب ہیں اور ہر طرف بحالی ہی بحالی ہے[2]

---

[1] FALL OF THE MUGHAL EMPIRE I. P 56.

[2] GEORGE FORSTER: A JOURNEY FROM BENGAL TO ENGLAND (LONDON 1793) VOL I P. 98. 99

روہیلوں میں مذہبی جذبہ بدرجہ اتم تھا[۵۱] لیکن مذہبی تعصب نام کو نہ تھا۔ اکثر روہیلے مرزا مظہر جانِ جاناں رح کے مُرید تھے اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے[۵۲] شاہ ولی اللہ اور نجیب الدولہ کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ شاہ صاحب اس کو رئیس الغزاۃ اور راس المجاہدین کے لقب سے پکارتے تھے[۵۳] روہیلوں نے ہندو دیوان کثرت سے ملازم رکھے تھے۔ نجیب الدولہ خاص طور پر ہندوؤں کے تہوار کے موقعوں پر اُن کا خیال رکھتا تھا[۵۴]

بیرونی حملے | اٹھارویں صدی میں ہندوستان پر متعدد بیرونی حملے ہوئے۔ ان حملوں نے ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات کو بد سے بدتر کر دیا اور باغیانہ قوتوں کو اُبھار کر ہر طرف انتشار و ابتری کا ماحول پیدا کر دیا۔

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ شمالی ہند کے باشندوں کو عموماً اور دہلی کے باشندوں کو خصوصاً جن ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اندازہ اس زمانے کے لٹریچر سے کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں میں خوف و ہراس، قنوطیت، پست ہمتی کا یہ حال ہو گیا کہ وہ خودکشی پر آمادہ ہو گئے۔ مغلوں کے خلاف ملک میں جتنی طاقتیں تھیں ان کو اپنی قوت اور ذرائع بڑھانے کا موقع مل گیا، سکھوں مرہٹوں اور جاٹوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی دلی پر حملے کرنے شروع کر دئے۔ شاہان مغلیہ کا اقتدار ختم ہو گیا۔ بے حساب دولت ہندوستان سے باہر چلی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی اقتدار کے ساتھ

---

۵۱ ملاحظہ ہوں، شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتوبات بنام نجیب الدولہ
شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ہے "نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود، ادنی پنج روپیہ و اعلیٰ پان صد ص ۸۱

۵۲ ملاحظہ ہو کلمات طیبات ص ۶۶، ۶۸ وغیرہ

۵۳ شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ص ۵۹، ۶۰، ۶۱ ۵۴ ایضاً ص ۲۰۳

ساتھ اقتصادی طمانیت بھی ختم ہوگئی ۔

پھر ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر نو حملے کئے
ان حملوں کی تفصیل "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات" میں بیان کی گئی ہے
اس کا چھٹا حملہ (۱۷۶۰-۱۷۶۱ء) ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت
رکھتا ہے۔ اس نے ہندوستان کی سیاست کا رُخ بدل دیا اور مرہٹوں کے بڑھتے
ہوئے اقتدار کو ختم کر دیا ۔

مجموعی طور پر اگر اٹھارویں صدی کے ان حملوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا
کہ انھوں نے ملک کی سیاسی اور سماجی فضا کو اس درجہ خراب اور ہندوستانیو
کو اس قدر پست ہمت کر دیا کہ جب یہاں برطانوی سامراج کا سیلاب آیا تو ملک
کے کسی گوشے میں بھی مضبوط بند نہ باندھے جا سکے !

انگریزوں کا تسلط ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط کس طرح قائم ہوا؟ اس
کی تفصیل دلچسپ اور عبرت انگیز ضرور ہے لیکن یہاں اس کے بیان کرنے کی
گنجائش نہیں ۔ ہندوستان کی غلامی کے اسباب مختلف نوعیت کے تھے ۔
اقتصادی ، سیاسی اور سماجی' ایک طرف اگر ہندوستان کا اقتصادی نظام
ابتر ہو چکا تھا تو دوسری طرف انگریزوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے
اس حصے پر قدم جمائے تھے جو اس ملک کا سب سے زیادہ خوش حال علاقہ تھا۔
اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا اقتصادی مرکزِ ثقل (CENTER OF
GRAVITY) بنگال کی طرف منتقل ہو گیا تھا ۔ اورنگ زیب تک کے اخراجات
آخری زمانہ میں بنگال کے محاصل سے چلتے تھے ۔ انگریزوں کے بنگال پر مسلط
ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی شہ رگ اُن کے قبضہ میں چلی گئی ۔
بادشاہوں اور امراء کی تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی کے باعث انگریزوں کو اپنا

اقتدار بڑھانے کے موقع ملے ۔ ۱۷۱۷ء میں فرخ سیر نے کمپنی کو بغیر محاصل اور چنگی کے ملک میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ پھر جعفر اور صادق جیسے ننگ وطن لوگوں نے ان کو اپنی طاقت بڑھانے میں مدد دی اور برطانوی سامراج کے مضبوط پنجے اس ملک میں جم گئے ۔

پانی پت کی تیسری جنگ (۱۷۶۱ء) کے بعد، کچھ بیدار مغز لوگوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے خطرہ کو محسوس کر لیا تھا ۔ اس زمانے میں احمد شاہ ابدالی اور اس کے ہم خیال امرا کی جو خط کتابت وینسی ٹارٹ (VANSITTART) سے ہوئی ہے وہ بہت غور سے مطالعہ کے قابل ہے ۔ احمد شاہ ابدالی نے انگریزوں کی نیت اور ارادوں کا پتہ لگایا ۔ اس بنا پر وہ چاہتا تھا کہ اپنی واپسی سے قبل شاہ عالم کی طاقت کا استحکام کر جائے لیکن شاہ عالم اس وقت دہلی نہ آیا اور حالات انگریزوں کے موافق ہو گئے ۔ فروری ۱۷۶۱ء کو نواب شجاع الدولہ نے جنرل بارکر کو اطلاع دی تھی کہ مرہٹے، روہیلہ اور افغان ایک معاہدہ کرنے والے ہیں[۱] گمان غالب یہ ہے کہ جب ہندوستان کے لوگوں نے غیر ملکی اختیار کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ اپنے اختلاف کو دور کر کر اس پر آمادہ ہو گئے کہ سب متحد ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کریں ۔ حد یہ ہے کہ حضرت مولانا سید احمد شہید رح جن کی تحریک عموماً صرف سکھوں کی مخالفت کے پس منظر میں دیکھی جاتی ہے، غیر ملکی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ہندوؤں سے تعاون اور اشتراکِ عمل کے کوشاں تھے ۔ راجہ ہندو رائے کو ایک خط لکھتے ہیں :-

---

[۱] CALEUDAR OF PERSIAN CORRESPOUDENCE III, 155-6, NO. 581

برراۓ عالی روشن و مبرہن است
کہ بیگانگاں بعید الوطن ملوک
زمین و زمن گردیدہ و تاجران
متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ
امرائے کبار و ریاست روسائے
عالی مقدار برباد نمودہ اند و
عزت اعتبار ایشاں بالکل ربودہ
چوں اہل ریاست و سیاست در
زاویۂ خمول نشستہ اند ناچار چندے
از اہل فقر و مسکنت کمر ہمت بستہ
ایں جماعت ضعفا محض ربنا خدمت
دین رب العالمین برجستند ہرگز ہرگز از
دنیا داران جاہ نیستند محض بنا بر خدمت
دین رب ذو الجلال برخاستہ اند
نہ بنا بر طمع مال و منال رفتے کہ
میدان ہندوستان از بیگانگاں
دشمناں خالی گردیدہ و نیز سعی
ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ آیند
مناصب ریاست و سیاست
بطالبین آں مسلم باد" ؎۱

جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر
پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاجلار
اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے
مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں
کی امارت اور بڑے بڑے اہل حکومت
کی حکومت اور اُن کی عزت و حرمت
کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے،
جو حکومت و سیاست کے مردِ میدان
تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے
ہیں، اس لئے مجبوراً چند غریب و
بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر
کھڑے ہو گئے اور محض اللہ کے دین کی
خدمت کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے
یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیا دار اور
جاہ طلب نہیں ہیں۔ محض اللہ کے دین
کی خدمت کے لئے اُٹھے ہیں مال
و دولت کی اُن کو ذرہ برابر طمع نہیں
جس وقت ہندوستان ان غیر ملکیوں سے
خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں
بارآور ہو گئیں، حکومت کے عہدے

؎۱ ملاحظہ ہو "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" (از مولانا سید ابوالحسن ندوی) ص ۲۷۴ - ۲۷۳۔

اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن
کو ان کی طلب ہوگی۔

انگریزوں نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ہندوستان کی ہر ایسی تحریک کا جو اُن کے مفاد کے خلاف کام کر سکتی تھی، رُخ بدل دیا۔ ۱۸۵۷ء میں پھر ایک بار غیر ملکی حکومت کو ختم کرنے کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر کوشش کی، لیکن تنظیم کی کمی، غداروں کی کثرت اور اقتصادی مشکلات کے باعث وہ تحریک بھی ناکام رہی۔

اس سیاسی ماحول میں مسلمانوں کی حالت اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ مسلمانوں کے درد و الم کی ایک طویل داستان ہے۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ اور مسلمانوں کی پریشانیوں کا ایک ایسا باب کھل گیا جو ۱۸۵۷ء کے بعد تک جاری رہا۔ ہر صبح ان کے لئے ایک نئے فتنے کا پیغام لاتی تھی[۱] اور رات کی خاموشی میں اُنھیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ

کانّ نجوماً او مضت فی الغیاھب
عیون الافاعی او رؤس العقارب

(تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناگوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے سر ہیں)

ان حالات میں صبر و استقلال کا قائم رکھنا آسان کام نہ تھا۔ جب نادر شاہ نے آگ اور خون کا ہنگامہ برپا کیا تو دہلی کے وہ باشندے جنھوں نے شاہ جہاں

---

[۱] "اما اختلالِ حال کہ شہر کہ روز فتنۂ تازہ گل می کند"
شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات۔ ص ۷۷
"از تشویشات ہر روزہ دہلی تنگ آمدہ ام"
مرزا مظہر جان جاناں۔ مکتوبات۔ ص ۶۶

اور اورنگ زیب کے عہد میں امن اور چین کے ساتھ زندگی بسر کی تھی، بدحواس ہوگئے۔ مایوسی، وحشت، کم ہمتی اور خود فراموشی نے اُن کے قوائے عمل کو ایسا شل کر دیا کہ خودکشی کے علاوہ انھیں کوئی راہ ہی نظر نہ آئی، اور انھوں نے آگ میں جل مرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہ ولی اللہ نے جب قوم کی پست ہمتی کا یہ عالم دیکھا تو حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور مصائب کے واقعات بیان کر کے اُن کی ڈھارس بندھائی اور ان کی قنوطیت کو دور کیا[۵] ۔۔۔ لیکن نادر شاہ کا قتل عام مسلمانوں کے مصائب کی انتہا نہ تھی، ابتدا تھی۔ ابھی موج خون سر سے نہ گزری تھی، نادر شاہ کے حملہ کے بعد تو ملک میں وہ ابتری اور انتشار پیدا ہو گیا کہ بقول ہر چرن داس لوگوں پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

مرہٹے، جاٹ، سکھ ۔۔۔ تینوں کی ہنگامہ آرائی نے زندگی کو ایک مُصیبت بنا دیا۔ پھر افغانوں کے حملوں نے تو جان ہی نکال لی۔ شاہ ولی اللہ نے کرب و بے چینی کے عالم میں نجیب الدولہ کو خط لکھا :-

مقدمہ مہم تر آں است کہ	ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانان ہندستان
مسلمانان ہندوستان چہ دہلی	نے خواہ وہ دہلی کے ہوں خواہ اس کے
وچہ غیر آں چندیں صدمات	علاوہ کسی اور جگہ کے ۔۔۔ کئی صدمات
دیدہ اند وچند بار نہب و غارت	دیکھے ہیں اور چند بار لوٹ مار کا شکار
آزمودہ، کارد بہ استخواں رسیدہ	ہوئے ہیں۔ چاقو ہڈی تک پہنچ گیا ہے
است، جائے ترحم است	رحم کا مقام ہے، خدا کا اور اس کے
برائے خدا و برائے رسول خدا تاکید	رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی

[۵] ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ (مطبوعہ میرٹھ)

بلیغ باید کرد کہ متعرض مال مسلمانے نشود[1]   مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں

ان حالات میں شاہ جہاں آباد ایسا اُجڑا کہ دور دور خاک اُڑنے لگی۔ گھر کے گھر بے نور دبے چراغ ہو گئے۔

میر تقی میر نے اسی زمانے میں لکھا تھا ؎

جس جا کہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں
واں ہم نے ان ہی آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں
یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

سرسری تم جہان سے گزرے   ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
اب خرابہ ہوا جہاں آباد   ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
بے زری کا نہ کر گلہ غافل   رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کے حملوں سے جب نجات ملی تو غیر ملکی حکومت کا تسلط سر پر پایا۔ مسلمان پانچ سو سال سے زیادہ تک حکمرانی کر چکے تھے اور ان ہی سے سیاسی اقتدار چھینا بھی گیا تھا۔ اس بنا پر انگریزی حکومت نے ان پر سختی کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں مسلمانوں کے جان، مال اور آبرو سب پر مصیبت آئی اور پوری قوم پر نکبت اور افسردگی کا عالم طاری ہو گیا۔

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات۔ ص ۶۲

(۲)

اِقتصادی حالت

اورنگ زیب نے تقریباً ۲۶ سال تک اپنی سلطنت کے سب ذرائع کا رُخ دکن کی جانب کر دیا تھا، ان لڑائیوں میں کروڑوں روپیہ صرف ہوا تھا لیکن عالمگیر کے تدبر، معاملہ فہمی، انتظامی قابلیت اور سیاسی بصیرت نے ملک کی اقتصادی حالت کو بگڑنے سے بچالیا تھا۔ اس نے ان تمام اخراجات کے باوجود چوبیس کروڑ روپیہ آگرہ کے قلعہ میں چھوڑا تھا[۱] اس کے نااہل جانشینوں نے یہ روپیہ آنکھ بند کرکے بہا یا۔ اُدھر ملک کے ذرائع محدود ہوتے چلے گئے، اور رفتہ رفتہ سارا اقتصادی نظام متزلزل ہوگیا۔ اور یہ سیاسی اور سماجی نظام کے گر جانے کا پیش خیمہ تھا۔

اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ حد سے زیادہ فیاض تھا[۲]۔ اس کی فیاضی نے سلطنت کی مالی حالت کو تباہ کر دیا۔ پھر جہاں دار شاہ نے

۱؎ IRVINE: LATER MUGHALS VOL I, P. 21

۲؎ LATER MUGHALS I, P. 139.

اپنی عیاشی میں بے دریغ دولت کو لٹایا۔ اس کی محبوبہ لعل کنور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا[1]۔ دربار میں عیش و طرب کی جو محفلیں سجتی تھیں۔ اُن میں اس کثرت سے چراغاں کیا جاتا تھا کہ دہلی میں تیل کی قلت ہوگئی تھی اور اس وجہ سے تیل کا نرخ بڑھ گیا تھا۔ گیہوں سات سیر فی روپیہ بکنے لگا تھا۔ فرخ سیر تخت پر بیٹھا تو حالات اور خراب ہوگئے۔ اس کو گھوڑوں کا شوق تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے اس کے اصطبل میں بے کار بندھے رہتے تھے، اور ہزاروں روپیہ روزانہ اُن پر خرچ ہوتا تھا[2]۔

اِس گرتے ہوئے مالی نظام پر نادر شاہ کے حملے نے ضربِ آخر کا کام کیا۔ وہ ستر کروڑ سے زیادہ روپیہ ہندوستان سے باہر لے گیا۔ اس کے بعد شاہی خزانے اور امرار کے محلات بالکل خالی نظر آنے لگے[3]۔

احمد شاہ کے زمانے میں شاہی خزانے کی یہ حالت تھی کہ دو دو ڈھائی ڈھائی سال تک محلات کے ملازمین کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ بادشاہ کی ساکھ اس قدر گرگئی تھی کہ مہاجن اور ساہوکار بھی قرض دینے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شہزادیوں کو تین تین دن کے فاقے کرنے پڑتے تھے[4]۔ سرسید احمد خاں لکھتے ہیں :-

اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے، مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا

---

[1] LATER MUGHALS I, P. 194

اعلان نے لعل کنور کے خراب اثرات کو تفصیل سے بیان کیا ہے ص ۱۹۲ تا ۱۹۶

[2] LETER MUGHALS VOL I P. 397

[3] LETER MUGHALS VOL II, P 370 - 71

[4] تاریخ عالمگیر ثانی (قلمی)، ص ۱۹۰ نیز

FALL OF THE MUGHALS EMPIRE II P. 36 - 37

شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی۔ تمام کارخانے ابتر ہو گئے تھے۔ شاہزادوں کو جو قلعے کے نیچے محلّے میں رہتے تھے۔ ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا اور چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکے مرتے ہیں، بھوکے مرتے ہیں۔"[۵۱]

پروفیسر اسپیر (P. SPEAR) نے حال ہی میں اپنی عالمانہ تصنیف: (TWILIGHT OF THE MUGHALS) شائع کی ہے۔ اس میں مغل شہزادوں کے دردناک مصائب کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ ان شہزادوں کو بھوک سے مرجانے دیا جاتا تھا، لیکن کوئی مزدوری یا ملازمت کرنے کی اجازت محض اس وجہ سے نہ ملتی تھی کہ یہ ان کے دونِ مرتبت تھا۔ اُن کی حالت جانوروں سے بدتر تھی۔

فضول خرچی کے مرض میں امرا بھی مبتلا تھے۔ راجہ جگل کشور کا واقعہ اس سلسلہ میں بڑا عبرت آموز ہے۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کنور آنند کشور کی شادی دہلی میں اس طرح کی کہ سارے شہر کو کھلانے پر بلایا، جس کے متعلق یہ خیال ہوا کہ شاید "صلائے عام" کو اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھ کر نہ آئے گا۔ اس کے گھر پر خود گیا اور ان الفاظ میں مدعو کیا:۔ "آپ کے بھتیجے کی شادی ہے۔ اگر آپ شریک نہ ہوئے تو محفل بے رونق رہے گی۔"[۵۲] کچھ ہی عرصہ بعد کا ذکر ہے کہ میر تقی میر اپنی عُسرت و پریشان حالی سے مجبور ہو کر اس کے پاس گئے تو شرما کر کہنے لگا "میرے پاس ایک پُرانی شال ہے، کچھ اور مقدرت ہوتی تو اس سے دریغ نہ کرتا"[۵۳]

---

[۵۱] سیرت فریدیہ ص ۲۲ - ۲۳

[۵۲] مجموعہ نغز (تذکرہ) حکیم سید ابوالقاسم عرف میر قدرت اللہ قادری دہلوی ص ۸۲ ۱ م (کریمی پریس لاہور ۱۹۳۳ء)

[۵۳] ذکر میر۔ ص ۷۸

یہ حال صرف جنگل کشور ہی کا نہ تھا۔ ملک کے اکثر و بیشتر امراء اپنی فضول خرچیوں کی وجہ سے اسی انقلاب کا شکار ہو رہے تھے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب میں اقتصادی تباہی کو سب سے اہم سمجھ کر اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں :۔

"اس زمانے میں ملک کی تباہی اور ویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں ۔ ایک بیت المال یعنی ملک کے خزانے پر تنگی ۔ وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ اس دعوے سے حاصل کریں کہ وہ سپاہی ہیں یا عالم ہیں جن کا حق اس خزانے کی آمدنی میں ہے ، یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بادشاہ خود انعام و اکرام دیا کرتے ہیں جیسے زہد پیشہ صوفی اور شاعر اور دوسرے گروہوں میں سے جو ملک و سلطنت کے کسی کام کے بغیر کسی نہ کسی ایسے طریقے سے روزی حاصل کرتے ہیں جو محنت کے بغیر ان کو ملتی ہے۔ یہ لوگ اُن کے اور دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کر دیتے ہیں ، اور ملک پر بوجھ ہیں ۔

دوسرا سبب کاشتکاروں ، بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا اور ان پر اس بارہ میں سختی کرنا ہے ۔ یہاں تک کہ جو بے چارے حکومت کے مطیع اور اس کے حکم کو مانتے ہیں وہ تباہ ہو رہے ہیں اور جو سرکش اور نادہند ہیں وہ اور سرکش ہو رہے ہیں اور حکومت کے محصول ادا نہیں کرتے حالانکہ ملک اور سلطنت کی آبادی سستے محصول اور فوج اور عہدہ داروں کے بقدر ضرورت تقرر پر ہے۔ چاہیئے کہ اس زمانے کے لوگ ہوشیار ہو کر سیاست کے اس راز کو سمجھیں "[1]

[1] حجۃ اللہ البالغہ ۔ باب سیاست المدنیہ ۔

شاہ صاحبؒ نے اپنے مکتوبات میں معاشی زندگی کے اور گوشوں پر بھی بحث کی ہے۔ ان کی نظر میں جاگیرداری اور اجارہ داری کی رسمیں ہی سب معاشی مصائب کا بنیادی سبب تھیں۔ ان کی وجہ سے معاشی زندگی کا توازن بگڑ گیا تھا۔ مغل شہنشاہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"موجب ضعف امور سلطنت کمی خالصہ وقلت خزانہ است۔" [۱]

سوداگروں اور صنعت پیشہ لوگوں کی حالت سب سے زیادہ تباہ تھی۔ شاہ ولی اللہؒ اہل حرفت کو ملک کی اقتصادیات کا مرکزی نقطہ سمجھتے تھے، اور ان کی تباہ حالی پر سخت پریشان تھے۔

جب انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا تو ہندوستان کے معاشی حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ اب تک ہندوستان کی دولت بجا یا بے جا طور پر ہندوستان ہی میں صرف ہوتی رہی تھی۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد اس کا رُخ انگلستان کی طرف ہوگیا۔ علاوہ ازیں انگریزوں نے عمداً ہندوستان کی دیسی صنعتوں کو ختم کیا۔ تاکہ انگلستان کے مال کی کھپت ہندوستان میں ہو سکے۔

[۱] "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات"۔ ص ۴۲

(۳)

معاشرہ اور تمدن

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے معاشرہ اور تمدن کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے لئے دہلی کے تہذیبی حالات پر ایک نظر ڈال لینی کافی ہوگی۔

دہلی، اسلامی ہند کی ابتدا سے تہذیب و تمدن کا ایک بڑا مرکز رہی ہے دجلہ و فرات سے علم و عرفان کی جو موجیں اُٹھی ہیں وہ جمنا ہی کے کناروں سے آکر ٹکرائی ہیں، بغداد و بخارا سے جو علمی و روحانی قافلے چلے ہیں وہ یہیں آکر ٹھیرے ہیں۔ کبھی اس کی رونق کا یہ عالم تھا کہ چپہ چپہ پر خانقاہیں تھیں، قدم قدم پر مدرسے تھے[۵۱] کوچہ کوچہ میں مسجدیں تھیں۔ تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے اور یہاں پہنچتے تھے۔ ہندوستان کا یہ دارالسلطنت "رشکِ بغداد و عزتِ مصر بنا ہوا تھا"[۵۲]

---

۵۱ ملاحظہ ہو مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ) ص ۲۹۔

۵۲ تاریخ فیروز شاہی۔ برنی۔ ص ۲۴۱۔

اٹھارویں صدی میں جب کہ سلطنتِ مغلیہ پر نزع کا عالم طاری ہوا تو یہ شہر بمنزلہ لعب صبیاں" [۵۱] ہو گیا۔ دکن سے جو طوفان اٹھتا وہ لال قلعہ سے ٹکراتا، پنجاب سے جو آندھی اٹھتی، اس کے زلزلے دہلی میں محسوس ہوتے جاٹوں کا جو ہنگامہ برپا ہوتا اس کی جولانگاہ یہی بدبخت شہر بنتا۔ لیکن ان تمام مصیبتوں کے باوجود بھی دہلی انتہائی بارونق تھی، ابھی کچھ نقوش باقی تھے جن سے "کاروانِ رفتہ" کی عظمت وشوکت کا اندازہ ہوتا تھا اس زمانے میں بھی اگر کسی نے یہاں کے علماء سے دہلی کی حالت کے متعلق سوال کرلیا تو بے اختیار کہہ اٹھے ؎

ان البلاد اماء وھی سیدۃ

وانھا درۃ والکل کالصدف [۵۲]

(دوسرے شہر لونڈیاں ہیں اور دلی ملکہ، یہ موتی ہے اور باقی سب سیپیاں)

اور اس میں واقعی کوئی مبالغہ بھی نہ تھا۔ یہاں اب بھی علم وعرفان کے ایسے چشمے ابل رہے تھے جن سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونِ ہند بھی مستفیض ہو رہا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ اسلامی ہند نے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانے میں دنیا کے مسلمانوں کو مشعلِ راہ دکھائی۔ ایک ایسے نازک دور میں جب کہ دنیائے اسلام حدیث وسنت کو بھول چکی تھی۔ دہلی ہی نے اس کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا جس کا اعتراف مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا نے اس

---

۵۱ شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ص ۵۲

۵۲ یہ شعر شاہ عبد العزیز صاحبؒ کا ہے۔ سر سیدؒ نے آثار الصنادید (ص ۴۷) میں نقل کیا ہے۔

طرح کیا تھا :-

ولولا عنایۃ اخواننا علماء الهند	ہمارے ہندوستانی بھائیوں
بعلوم الحدیث فی ھذا العصر	میں جو علماء ہیں اگر حدیث کے علوم
لقضی علیها بالزوال من	کی طرف اُن کی توجہ نہ ہوتی تو
من امصار الشرق فقد	مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا
ضعفت فی مصر والشام	ہوتا ، کیونکہ مصر ، شام ، عراق
والعراق والحجاز منذ القرن	حجاز میں دسویں صدی ہجری سے
العاشر للهجرۃ حتی بلغت	یہ علم ضعف کا شکار ہو چکا تھا
منتهی الضعف فی اوائل	اور چودھویں صدی کے اوائل تک
ھذا القرن الرابع عشر ..."	ضعف کے آخری منزل تک پہنچ گیا تھا[1]

چند نفوس قدسیہ کی موجودگی نے تو دہلی کو تمام ممالک اسلامیہ کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا ۔ شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ میں شام ، مصر ، چین اور حبش کے لوگوں کے جھمگٹے لگے رہتے تھے تو دوسری طرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے خرمن کمال کے خوشہ چین ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے تھے اور علوم دینی کا چرچا کر رہے تھے[2] ۔ سلطنت دم توڑ رہی تھی ۔ سیاسی زوال و پستی کی آخری منزلیں طے ہو رہی تھیں ، لیکن ذہنی شعور ابھی مردہ نہ ہوا تھا ۔ کچھ بیدار مغز انسان تجدید و احیاء کے نئے راستے تلاش کر رہے تھے ، وہ اس سیاسی زوال کو مذہبی اور ذہنی زوال کا پیش خیمہ بنانا نہیں چاہتے تھے

---

[1] آثار الصنادید ۔ ص ۱۸ (باب چہارم)

[2] "شاگردان دے در اقالیم دور و دراز رسیدہ باب علوم دینی بروئے خلق کشادند"
(خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۸۸)

ان تمام کوششوں کے باوجود دہلی دھوپ اور چھاؤں کا شہر تھی۔ یہاں خانقاہیں بھی تھیں۔ شراب خانے بھی۔ مدرسے بھی تھے اور قمار بازی کے اڈے بھی۔

دہلی کی یہ متضاد خصوصیات اس زمانے کے بہت سی لوگوں کی زندگی میں بھی پائی جاتی تھیں۔ لوگ بڑی عقیدت اور ارادت کے ساتھ خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے، پھر اسی جوش اور ولولہ کے ساتھ طوائفوں کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ ان کی رندی اور مذہبیت ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

نہ رندی مذہبیت پر غالب آتی، نہ مذہب رندی پر۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا تھا اگر حالات نہ بدلے تو مسلمان

"اندکے از زماں نگذرد کہ قومے شوند کہ نہ اسلام را دانند نہ کفر را"[1]

اس زمانے کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ نہ رندی سے واقف تھے، نہ مذہبیت سے وہ متضاد چیزوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ نہ رندی ہاتھ سے جائے نہ مذہبیت کا دامن چھوٹے۔ لیکن یہ ایک خود فریبی تھی ؂

نیک و بد در آدمی پنہاں نمی ماند چنانکہ
نافہ در جیب ملوک و بادہ در جامِ بلور (خسروؒ)

یہ مذہبیت جو رندی کے پہلو بہ پہلو چلتی تھی۔ فسق و فجور سے زیادہ متعفن تھی یہ ضمیر کی آواز کو کچلنے کا ایک ظالمانہ انداز تھا!

آئیے دہلی کے محلات، مدرسوں، خانقاہوں، بازاروں اور ادبی محفلوں پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ حالات کا صحیح اندازہ ہو جائے۔

---

[1] سیاسی مکتوبات۔ ص ۵۲

محلاتِ شاہی :- "بزمِ آخر"[51] میں منشی فیاض الدین نے دہلی کے آخری دو بادشاہوں، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے طریقِ معاشرت کی تصویر پیش کی ہے۔ اس پوری تصویر میں صرف آسائش اور عیش کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ رات اور دن جشن میں گزرتے تھے۔ کبھی تورے بندی ہے، کبھی رنجگہ، کبھی نوروز کبھی آخری چہار شنبہ، کبھی خواجہ صاحب کی چھڑیاں، کبھی سلونو، کبھی پھول والوں کی سیر ——— غرض بزم ہی بزم ہے، رزم کا کہیں نام نہیں۔ قلعہ معلّٰی کے باہر جو طوفان برپا ہے اس سے بے خبر، فکرِ فردا سے بے نیاز ——— ایسا معلوم ہوتا ہے "رقصِ پری پیکراں" اور غوغائے رامشگراں" میں ساری دنیا سمٹ کر آگئی ہے۔

امراء کی مجلسیں :- مرزا منو محمد شاہ کے زمانے میں دہلی کے ایک امیر زادے ہیں۔ اُن کا حال یہ ہے :-

"خانہ اش بہشتِ شداد است و کاشانہ اش آشیانہ مجمع پریزاد ہر نوخطے رنگیں کہ با ایں محفل ربط ندارد فردِ باطل است و ہر ملیحے کہ با ایں مجمع مربوط نیست در حلیہ اعتبار عاطل مجلسش دار العیار شاہداں است و بزمش محک امتحان گلرخاں۔ نقد قراضہ حسن تا بدار الضرب بزمش رجوع نکند، کامل عیار نیست چہ شد مثل طلائے دست افشار است و سیم جمال تا در کوزہ مجمعش گداز نیابد چاندی نیست چہ شد کہ زرِ نقرۂ خالص است[52]

[51] مطبوعہ رحمانی پریس، دہلی سنہ ۱۹۲۰ء
[52] مرقع دہلی۔ از نواب سالار جنگ مرتبہ حکیم سید مظفر حسین ص ۲۸ - ۲۷۔

بازار :-

میر نے لکھا تھا ؎

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

لیکن دو بازار تھے، چوک سعد اللہ خاں اور چاندنی چوک جو سارے شہر کی جان تھے
چوک سعد اللہ خاں کی رونق کا یہ عالم تھا کہ اس کو دیکھ کر مرغ نظر کا شکار ہوتا تھا
ایک سیاح نے لکھا ہے :-

"نظر از ملاحظہ محسوسات زنگا رنگ دست و پا گم می کند"[۱]

کسی طرف "رقص امار و خروش رو قیامت آباد" تھا تو دوسری طرف "کرسی ہائے چوبیں از قبیل منابر"[۲] نصب تھیں تاکہ نماز اور روزہ کی تلقین کی جائے۔ کسی گوشہ میں اہل تنجیم و رمال، نظر آتے تھے، تو کسی طرف آتشک و سوزاک کی دوا بیچنے والے۔ ایک جانب "اسلحہ فروش" تھے، دوسری طرف "میوہ فروش"[۳]

چاندنی چوک سب جگہوں سے زیادہ دلفریب تھا۔ کپڑا، جواہرات، عطریات وغیرہ کی وہاں دکانیں تھیں۔ ہروقت رؤسا کے جھمگٹے لگے رہتے تھے۔ ایک یتیم رئیس زادہ چاندنی چوک کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ بیوہ ماں تہی دستی کا عذر کرنے کے بعد اس کو ایک لاکھ روپیہ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ چوک کے نوادر اور نفائس اس قلیل رقم سے نہیں خریدے جا سکتے ہیں، مگر اب اسی قلیل رقم کو اپنے ضروری مصارف کے لئے لے جاؤ[۴]

---

۱ تا ۴ مرقع دہلی۔ ص ۱۴ - ۱۵

۵ مرقع دہلی۔ مقدمہ۔ ص ۲۶

مدرسے :- مدرسہ رحیمیہ، بازار خانم کا مدرسہ اور اجمیری دروازہ کا مدرسہ اورنگ زیب کی وفات سے لے کر غدر ۱۸۵۷ء تک ان مدرسوں سے علم وعرفان کی چشمے ابلے تھے۔ یوں تو دہلی میں سینکڑوں درس گاہیں تھیں۔ لیکن ان تینوں مدرسوں کو امتیازی شان حاصل تھی۔ مدرسہ رحیمیہ میں شاہ ولی اللہؒ مسندِ درس پر متمکن نظر آتے تھے تو بازار خانم کے مدرسہ میں شاہ کلیم اللہؒ کے جانشین۔ اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں شاہ فخر الدینؒ کا چشمۂ فیض جاری رہتا تھا۔ مسلمانوں کی دینی زندگی کو سنوارنے میں ان مدرسوں کا خاص حصّہ تھا۔ مدرسہ رحیمیہ سے علومِ اسلامی کو زندہ کرنے کی عظیم الشان تحریک اٹھی۔ آج ہندوستان میں علومِ دینی کی جتنی درسگاہیں ہیں وہ سب مدرسہ رحیمیہ کے چشمۂ فیض کا نتیجہ ہیں۔ جب مسلمانوں کی دینی زندگی بے روح ہو رہی تھی تو اسی مدرسے کے معلّموں نے اُن کے دینی احساس کو بیدار کرنے کی سعی کی شاہ عبد العزیزؒ، شاہ رفیع الدین، شاہ محمد اسمٰعیلؒ کے وعظ اسی مدرسے میں ہوتے تھے۔

خانقاہیں :- اس زمانے میں دہلی میں بہت سے سلسلوں کے عظیم المرتبت مشائخ جلوہ افروز تھے۔ شاہ عبد العزیز صاحبؒ کا بیان ہے:-

درعہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند و ایں چنیں اتفاق کم می شود۔[۱]	محمد شاہ کے زمانے میں بائیس بزرگ صاحب ارشاد ہر سلسلہ اور طریقہ کے دلّی میں تھے۔ ایسا اتفاق کم ہوتا ہے۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ۔ مرزا مظہر جان جاناںؒ وغیرہ کی خانقاہیں رشد وہدایت

---

[۱] ملفوظات شاہ عبد العزیز دہلویؒ

کا منبع تھیں۔ غدر سے کچھ پہلے تک خانقاہوں کی یہ رونق باقی رہی۔ شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ "دین دار لوگوں کا ملجی و ماوی تھی"[51] اُن کی صحبت کا اثر یہ ہوتا تھا کہ بقول حالیؒ ع

دہد سنگِ سیہ خاصیتِ لعلِ بدخشانی

پھر شاہ ابو سعیدؒ، شاہ عبد الغنیؒ، شاہ محمد آفاقؒ، خواجہ نصیرؒ وغیرہ[52] کی خانقاہیں تھیں، جہاں تزکیۂ باطن اور تہذیبِ نفس کے درس دے جاتے تھے اور باطنی زندگی کو سنوارنے کے لئے رات دن کوشش کی جاتی تھی۔

میلے:۔ دہلی کے میلے کیا تھے، عیش و نشاط کے ہنگامے تھے جہاں اوباش اور شہوت پرستوں کی محفلیں سجتی تھیں اور کوئی اخلاقی جرم ایسا نہ تھا جو وہاں نہ ہوتا ہو ہر مہینے کی ۲۷ کو ایک ناگل کا میلہ ہوتا تھا۔ جہاں شوقین مزاج، تماشہ بین عورتیں بن سنور کر پہنچتی تھیں اور ہر طرح کی عیاشی میں حصہ لیتی تھیں[53]

ایک محمد شاہی امیر کسل سنگھ نے ایک محلہ کسل پوری آباد کیا تھا۔ جہاں فاحشانِ روزگار اور زہلائے بازاری کو بسایا تھا۔ محتسب کی مجال نہ تھی کہ وہاں قدم رکھ سکے۔ ہر وقت وہاں چنگ و رباب کی آواز سنائی دیتی تھی[54]

مشاعرے:۔ مشاعرے غدر سے پہلے کی دلّی کی ادبی محفلوں کی جان تھے۔

---

۵۱ حیاتِ جاوید۔ حالی (رعد اڈیشن سنہ ۱۹۰۱ء) جلد دوم صفحہ ۹

۵۲ ان بزرگوں کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "۱۸۵۷ء سے پہلے کی دلّی" (علماء و مشائخ کا اجتماع) مطبوعہ رسالہ "برہان" جون سنہ ۱۹۴۷ء)

۵۳ مرقعِ دہلی مقدمہ ص ۴۲

۵۴ مرقعِ دہلی مقدمہ ص ۴۲۔ ۴۳

قلعہ معلی میں اکثر مشاعروں کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، امرار و روٗسا کو بھی اس سے دلچسپی تھی۔ شعرار کی آپس کی صحبتیں بڑی دلچسپ اور رنگین ہوتی تھیں، مومن و غالب کی علمی مجلسیں اور مشاعرے، اپنی نظیر آپ تھے۔

غدر کے اثرات دہلی پر:- ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے یک دم دلّی کی بساط الٹ دی۔ پرانی مجلسیں درہم برہم ہوگئیں۔ علمی و مذہبی محفلیں سرد پڑ گئیں۔ گھر کے گھر بے نور و بے چراغ ہو گئے ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور، نہ جوش و خروش ہے

مسجدیں مسمار ہوگئیں۔ خانقاہیں تباہ و برباد ہوگئیں۔ مدرسوں میں کھیتی ہونے لگی۔ مسجد اکبر آبادی "جس کی رفعت و شان کے آگے گنبد اخضر لیست"[۱] معلوم ہوتا تھا ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ مدرسہ رحیمیہ جہاں سے ولی اللٰہی حکمت کا چشمہ اُبلا تھا اور جہاں شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ نے قرآن و حدیث کے درس دئے تھے۔ وہاں "مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگ گیا۔[۲] میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا جیسے جھاڑو دیدی۔"[۳]

---

[۱] آثار الصنادید۔ ص ۲۷

[۲] "واقعات دار الحکومت دہلی" مولوی بشیر الدین ج ۲ ص ۱۶۷

[۳] غالب کا خط سید احمد حسن مودودی کے نام (اردوئے معلی آگرہ ۱۹۱۲ء) ص ۱۸۲ - ۱۸۳

اچھے اچھے گھرانے تباہ و برباد ہوگئے۔ عزت و ناموس کا بچانا محال نظر آنے لگا۔ جب مصائب ناقابل برداشت ہوگئے تو بڑے بڑے بزرگ اور عالم دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ میاں کالے صاحبؒ کے بیٹے میاں نظام الدین نے حیدر آباد کا رُخ کیا[1] اور شاہ فخر الدین کی خانقاہ سونی پڑگئی۔ شاہ احمد سعیدؒ نے حرمین الشریفین کی راہ لی۔ اور شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ کا چراغ گل ہوگیا۔ ہر طرف حسرت اور مایوسی چھاگئی جو اس ہنگامہ دار و گیر سے بچا وہ کافور کفن کی تمنا کرنے لگا۔ زندگی وبال معلوم ہونے لگی آزردہ نے اسی زمانے میں ایک مرثیہ لکھا ؎

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جان پہ بن آتی ہے
مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں نہ آزردہ نکل جائے، نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

ہزاروں علمی ذخیرے اسی تباہی کے نذر ہوگئے۔ مہر نے اسی زمانے میں لکھا تھا[2] ؎

اس دور میں ہر اک نہ چرخ کہن لٹا
اوروں کا زر لٹا، مرا نقدِ سخن لٹا
بلبل کو کیسی کیسی ہوئیں آفتیں نصیب
گلچیں کے دستِ ظلم سے کیا کیا چمن لٹا

---

[1] اردوئے معلیٰ۔ ص ۲۳۱

[2] اردوئے معلیٰ۔ ص ۲۱۳

غدر ۱۸۵۷ء کے ساتھ ہماری معاشرۃ کا ایک دور ختم ہوگیا!

ہندو مسلم تعلقات | ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی برطانوی عہد سے شروع ہوتی ہے "لڑاؤ اور حکومت کرو" برطانوی سامراج کا تقاضہ تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہندؤں اور مسلمانوں میں مختلف قسم کے نفاق اور اختلافات عمداً پیدا کئے گئے تھے۔ سر ہنری ایلیٹ نے اس زہر کو تاریخ ہند کی رگوں میں پہنچا کر اس طرح تاریخی مطمح نظر کو خراب کیا کہ اس کے خلاف آج جو بات کہی جاتی ہے وہ شک آمیز تعجب سے سنی جاتی ہے۔

برطانوی عہد سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات انتہائی شگفتہ تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خلوص و محبت، اتحاد و یگانگی کے اثرات کار فرما نظر آتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک مشترکہ علمی اور ادبی ذوق پیدا کر لیا تھا۔ ہندی اور فارسی کا مطالعہ ہندو اور مسلمان دونوں کرتے تھے، اور ان دونوں زبانوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان کی تشکیل کا سامان بہم پہنچا رہے تھے۔ غلام علی آزاد بلگرامی ٹیک چند، آنند رام مخلص وغیرہ کے علمی کارناموں کو ہندو اور مسلمان سب ہی نے پسند کیا تھا۔

اردو ہندو اور مسلمان دونوں کی محبوب زبان تھی گلشن بےخار[۵] میں شیفتہ نے ۶۱ ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے "نغمۂ عندلیب"[۵۲] میں حکیم میر قطب الدین باطن نے ۸۰ ہندو شعراء اردو کا تذکرہ لکھا ہے۔

---

۵ مطبوعہ نول کشور۔ سنہ ۱۹۱۰ء

۵۲ مطبوعہ نول کشور۔ سنہ ۱۸۷۵ء

(۲) مغلیہ دور کا ایک مشترکہ کلچر تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر رنگے ہوئے تھے۔ کنور پریم کشور فراقی، اپنا نجی روزنامچہ اس طرح شروع کرتا ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا فتاح

"حمد و ثنا پادشاہے را سزا کہ سلطنت کونین بوجودِ اوست و شاہان روئے زمین خداوندان چتر و نگین را افتخار بہ فضلِ او .... و درود و تحیات و سلام زاکیات بر آں سرور کہ در شان او "لولاک لما خلقت الافلاک" نازل شدہ، و صلوات بیغایات و نیاز بے نہایات بر ابن عم و وصی اعظم او کہ مظہر العجائب و اسد اللہ الغالب و صاحب ذو الفقار و قسیم الجنت والنار است صلوات اللہ علیہما و علی آلہ اجمعین۔"[۱]

(۳) مذاہب کے اختلافات کے متعلق درگا داس کی یہ رائے سننے کے قابل ہے:

آفریدگار جمیع مذاہب و مشارب	تمام مذاہب اور مشارب کا آفریدگار
ہماں ذات یکتا است کہ آفرینندۂ	وہی ایک ذات ہے جو عالم کو پیدا کرنے
عالم و پروردگار ہر طبقات است	والا ہے اور ہر طبقہ کا پروردگار ہے
و ایں ہم حکمتِ بالغہ و مصلحتِ کاملہ	اس میں اس کی حکمتِ بالغہ اور مصلحتِ
اوست کہ برائے ہر مذہبے بہ تناسب	کاملہ ہے کہ اس نے ہر مذہب کے لئے
حالات او طریقے جداگانہ فرمود و	اس کے حالات کی مناسبت سے جداگانہ
برائے ہر یکے ہدایتے خاص نمود۔	طریقہ مقرر فرمایا ہے اور ہر ایک کے

[۱] "وقائع عالم شاہی" مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی (رامپور ۱۹۴۹ء) ص ۲

وچنانکہ گلشن روزگار را از اشجار نو بنود گلہائے رنگا رنگ برآراستہ ہم چناں از مذاہب گوناگوں و مشارب بوقلموں ہنگامہ شناسائی خود گرم کردہ شورے وشغفے در دل ہا انداخت، اگر مسجدے است بیاد او بانگ می زند، و اگر بت خانہ است بیاد او جرس می جنباند۔

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چرا است
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

لیے خاص طرح سے ہدایت کی ہے جس طرح کہ دنیا کے باغوں میں طرح طرح کے پیڑوں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے رونق ہے اسی طرح مختلف قسم کے مذاہب اور مشارب کے ذریعے اس نے مختلف انداز میں دلوں میں اپنی شناسائی کا شور برپا کیا ہے۔ اگر مسجد ہے تو اس کی یاد میں اذان دی جاتی ہے۔ اگر بت خانہ ہے تو اسی کی یاد میں جرس بجایا جاتا ہے۔

(میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کفر و دین کا جھگڑا کیا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ایک ہی چراغ سے کعبہ اور بت خانہ روشن ہیں

دریں صورت انسان را لازم است کہ آئینۂ خاطر خود را از زنگ کدورت مصفا ساختہ با اہل ہر ملت و کیش سلوک برادرانہ نماید و از خار زار مخالفت خود را برکراں داشتہ در بوستانِ جنّت نشان اتفاق قیام فرماید کہ گفتہ اند ـــــ

اس حالت میں انسان کو لازم ہے کہ اپنے دل کو کدورت کے زنگ سے صاف کرکے اور ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ کرے مخالفت کے خار زار سے اپنے آپ کو علیحدہ کرکے اتفاق کے بوستان جنت نشان میں قیام کرے جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا
و نیز در معبدگاہ ہر ملتے کہ برسد
بحرمت او کوشد و پیش بزرگان
ہر مذہبے کہ درآید بتعظیم و تکریم او
مبالغہ نماید و در معاملات دینی
باکسے مباحثہ نسازد و
ازیں افکار بے کار چشمۂ یگانگی
بخاشاک بیگانگی نہ انباشد[۵۱]

(دونوں جہان کی آسائش کا انحصار ان دونوں حرفوں پر ہے۔ دوستوں کے ساتھ تلطف دشمنوں کے ساتھ مدارا۔)
اور جب کسی مذہب کی عبادت گاہ میں پہنچے تو اس کی عزت و احترام کرے اور جب کسی مذہب کے بزرگوں کی خدمت میں جاوے تو ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔ دینی معاملات میں کسی سے مباحثہ نہ کرے اور ان بے کار جھگڑوں سے یگانگی کے تعلقات میں بیگانگی نہ پیدا کرے۔

(۴) اٹھارویں صدی کے مسلمانوں کے ہندو مذہب کے متعلق خیالات معلوم کرنے ہوں تو حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا مکتوب چہاردہم[۵۲] غور سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ انھوں نے ہندوؤں کو "مشرکانِ عرب" کے مشابہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا ہے۔ اور وید کو الہامی کتاب مانتے ہوئے، ہندوؤں کو اہل کتاب کا مرتبہ دیا ہے۔

(۵) ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں دلچسپی لیتے تھے۔ مذہبی رواداری کا یہ حال تھا کہ خود شاہان مغلیہ ہولی اور دسہرہ

---

۵۱ مخزن الاخلاق - ص ۶۰ - ۵۹

۵۲ کلمات طیبات - ص ۳۷ تا ۴۰

کا تہوار مناتے تھے

(۶) ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی تعلقات کا یہ عالم تھا کہ ہندو، مسلمان امیروں کے یہاں اور مسلمان، ہندو امیروں کے یہاں ملازمت کرتے تھے۔ میر تقی میر جب عسرت و تنگی کے دن گذارتے تھے تو ہندوؤں ہی نے اُن کی مدد کی۔ خان آرزو، سرور، مصحفی، غالب وغیرہ کے محسنوں کی فہرست میں ہندوؤں کے نام بھی ملیں گے۔

غلام محمد المشہور بہ میاں سجو کے متعلق مخزن الشعراء میں لکھا ہے:۔

"اُستادی برذاتش مسلم اگر سعدی وقت گویم

سزاست، واگر فردوسی عہد خوانم رواست[۵۱]"

اس کے محسن کا نام راجہ چندو لال تھا!

مرزا مظہر جان جاناں رح لالہ برج لال کی پُرزور سفارش ایک امیر سے کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"ذکر کسے بایں اہتمام باشما نکردہ ایم وعادت بمبالغہ نداریم"[۵۲] کسی کا ذکر میں نے اس انداز میں نہیں کیا ہے۔ میری مبالغہ کی عادت نہیں ہے۔

سر سید احمد خاں کے نانا نواب دبیر الدولہ فرید الدین خاں نے اپنے انتقال سے قبل جو جائداد تقسیم کی تو اپنے ایک قدیم ہندو دیوان لالہ تلوک چند کو برابر کا حصہ دیا۔[۵۳]

---

۵۱ مخزن الشعراء (تذکرہ شعرائے گجرات) مؤلفہ قاضی نور الدین فائق مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب (جامع پریس، دہلی ۱۹۳۳ء) ص ۴۴

۵۲ کلمات طیبات ص ۶۵ - ۶۴

۵۳ سیرت فریدیہ ص ۳۸

(۷) پھر ہندو اور مسلمان کھیلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ساتھ رہتے تھے، اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ غدر سے پہلے کا ذکر ہے کہ دہلی میں تیر اندازی کا ایک کلب تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔ سر سید نے ایک ذی عزت ہندو کا قصہ لکھا ہے کہ وہ تیر لگاتے وقت "اللہ غنی" کہتا تھا اس لئے اس کا نام "اللہ غنی" ہی پڑ گیا تھا۔[1]

---

[1] سیرت فریدیہ۔ ص ۴۴

(۴)

اخلاق و مذہب

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مسلمانان ہند کی مذہبی اور اخلاقی حالت انتہائی زبوں تھی۔ فکر و عمل، اخلاق و عادات، کردار و اطوار سب پر انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا۔ زندگی سکر دوام میں تبدیل ہو رہی تھی اور ہر قوم کو سیاسی زوال سے پہلے اور اس کے بعد جو اخلاقی زوال کی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں وہ نہایت سرعت کے ساتھ طے کی جا رہی تھیں۔ اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی اور سماجی نظام کا سارا ڈھانچہ بگڑ رہا تھا۔ عالم گیر نے فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کرا کر جس گرتے ہوئے اخلاقی اور سماجی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی وہ اس کے کم زور اور نااہل جانشینوں کے عہد میں منہدم ہو رہا تھا۔

کسی بزرگ نے کہا ہے :-

وهل افسد الدين الا الملوك ؒ — دین کو محض بادشاہوں، بُرے علماء

واحبار سوء ورهبانها — اور پیروں نے خراب کیا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار علامہ اقبال نے

ان ہی تینوں کو قرار دیا ہے[۵۱] چنانچہ ہم عام مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کے ساتھ ساتھ خصوصیت سے بادشاہوں، علماء سوء اور صوفیۂ خام کی حالت کا جائزہ لیں گے۔

سلاطین و امراء کی اخلاقی اور مذہبی حالت

حضرت مجدد الف ثانی کا ارشاد گرامی ہے:۔

"سلطان کا لروح است و سائر انسان کا لجسد۔ اگر روح صالح است۔ بدن صالح است اگر روح فاسد است بدن فاسد"[۵۲]	سلطان روح کی مانند ہے اور رعایا جسم کی مانند۔ اگر روح صالح ہوتی ہے تو جسم بھی صالح رہتا ہے۔ اگر روح فاسد ہو جاتی ہو تو بدن میں بھی فساد پڑ جاتا ہے۔

اورنگ زیب کے جانشینوں کی اخلاقی حالت اور عوام پر اس کے اثرات دیکھ کر اس کلیہ کی حقیقت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ مغل بادشاہوں کی ہر بے راہ روی کا اثر عوام کی زندگی پر پڑتا تھا اور عیش و عشرت کی جو محفلیں دربار میں سجتی تھیں، اُن کے مہلک جراثیم جھونپڑوں تک اپنا کام کرتے تھے۔

بہادر شاہ، اورنگ زیب کا بیٹا اور جانشین تھا۔ لیکن مذہبی معتقدات میں باپ کی بالکل ضد تھا۔ اس کی مذہبی بے راہ روی کے خلاف ملک میں متعدد بلوے بھی ہوئے۔ گو ارادت خاں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اس کے اعتقادات درست تھے، اور جو کچھ اس کی مخالفت ہوئی وہ سب متعصب لوگوں کی غلط فہمی تھی[۵۳] لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیعہ مذہب کی طرف اس کا رجحان

---

۵۱ ISLAM AND AHMADISM P. 23-24 MEENIT

۵۲ مکتوبات۔ جلد دوم۔ مکتوب ۶۷ ص ۱۳۵۔

۵۳ تاریخ ارادت خاں ELLIOT AND DOWSON VOL VII P. 551-2

ہوگیا تھا۔ سیر المتاخرین میں لکھا ہے :۔

"بہادرشاہ بدستور...... در	بہادرشاہ ، بدستور، شیعہ مذہب
ترویج و تقویت مذہب شیعہ	کو رواج دینے اور تقویت پہنچانے
می کوشید" [۵۱]	کی کوشش کرتا رہا۔

اس نے خطبہ میں اپنے نام کے ساتھ سید کا لفظ شامل کرایا تھا[۵۲]۔ علاوہ ازیں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہ کے نام کے ساتھ خطبوں میں وصیِ مصطفےٰ کا اضافہ کیا تھا[۵۳]۔ اس اضافہ پر لاہور، احمد آباد اور دیگر مقامات پر سخت قسم کے فسادات ہوئے۔ حاجی یار محمد نے نہایت جرأت اور ہمت سے بادشاہ کی مخالفت کی۔ بادشاہ ناراض ہوا تو جواب دیا :۔ "حق تعالیٰ کی چار نعمتیں ہیں ، علم ، حفظ قرآن ، حج اور شہادت۔ بفضل الٰہی تین نعمتیں مجھے حاصل ہیں ، کیا ہی اچھا ہو کہ آپ کے ذریعے سے چوتھی بھی حاصل ہو جائے "

بہادرشاہ کے بعد جہاندارشاہ (۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء) تخت پر آیا۔ اس نے حکومت کی باگ ڈور ایک ناچنے والی عورت لعل کنور کے ہاتھ میں دے دی۔ اس کی ابروئے چشم کے اشارہ پر لوگوں کی قسمتیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ کوئی ایسا اخلاقی ، سماجی اور نہایت کا گناہ نہ تھا جو اس عورت کے اثر میں نہ کیا گیا ہو۔ لعل کنور نے ایک دن اس سے کہا کہ میں نے ڈوبتی کشتی میں آدمیوں کی جو حالت ہوتی ہے وہ نہیں دیکھی حکم شاہی ہوا کہ یہ خواہش بھی پوری کرکے دکھا دی جائے![۵۴] خود بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ لعل کنور

---

۵۱ سیر المتاخرین۔ ص ۷

۵۲ KEENE. THE TURKS IN INDIA P. 199 FN

۵۳ منتخب اللباب۔ خافی خاں۔ جلد دوم۔ ص ۶۸۱ - ۶۶۱ - ۷۰۳

۵۴ عبرت نامہ کامراج بحوالہ LATER MUGHALS I P. 192.

کے ساتھ بازاروں میں پھرتا تھا اور اس کے ساتھ شراب خانوں میں شراب پیتا تھا[۵۱]
ہندوؤں کی رسوم میں دلچسپی کا یہ حال تھا کہ راون کے قلعے بنوا کر آگ لگاتا تھا۔
جہاندار شاہ کی عیش و عشرت کی زندگی نے عوام کی زندگی پر بھی اثر ڈالا، اور
حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ " قاضی قرابہ کش اور مفتی پیالہ نوش " ہوں[۵۲]
جہاندار شاہ کے جانشین فرخ سیر (۱۷۱۹ - ۱۷۱۲) میں سب سے بڑی
بُرائی اس کی کمزوری تھی[۵۳] اور کمزوری سے سینکڑوں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ؎

صد مرض پیدا شد از بے ہمتی
کوتہ دستی، بے دلی، دون ہمتی

اس کی کم زوری سے ملک میں متعدد فتنے کھڑے ہو گئے۔ یہ حضرت شاہ عبدالرحیم
صاحب دہلوی ؒ کا اثر تھا کہ وہ اتنے دنوں تخت پر رہ سکا۔[۵۴] شاہ صاحب کے
وصال کے ۵۰ دن بعد وہ قید ہو گیا۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے صرف اس غرض
سے کہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار کہیں ان جلد جلد تبدیلیوں کی نذر نہ ہو جائے، اس
کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن کم زوری ایک ایسا مرض تھا جس نے اُسے کبھی
حالات پر قابو نہ پانے دیا۔
فرخ سیر کے زمانے میں ایک شخص نمود وا لمود نے نبوت کا دعوے کیا
اپنا علیحدہ مسلک، قواعد اور زبان ایجاد کی۔ آقوسہ مقدسہ نامی کتاب کو الہامی

---

۵۱ مرات واردات (قلمی) و تذکرۃ الملوک یحیی (قلمی)
۵۲ تاریخ ہند۔ از مولوی ذکاء اللہ مرحوم - جلد نہم ص ۸۹
۵۳ LATER MUGHALS, I P. 396
۵۴ انفاس العارفین۔ ص ۶۲

کتاب بتایا۔ اور دعویٰ کیا کہ نبوت اور وصیت کے درمیان ایک لاہوتی عہدہ بیگوت
ہوتا ہے اور وہ اسی پر قائم ہے۔ فرخ سیر اس شخص سے اتنا متاثر ہوا کہ تنہائی
میں اس سے ملاقات کی۔ بادشاہ کی اس دلچسپی اور احترام سے اس مفسد دینی
کو اپنے کام میں بڑی مدد مل گئی۔

محمد شاہ افیم کا شوقین تھا اور عیش و عشرت کا دلدادہ۔ دن رات حرم میں
پڑا رہتا تھا۔ ۲۸ سالہ دورِ حکومت میں اگر وہ کبھی محل سے باہر نکلا ہے تو
صرف لونی پارک میں گھومنے کے لئے یا گڈھ کا میلہ دیکھنے کے لئے[۱] اس کے
جانشین احمد شاہ کی عیش پرستی کا بھی یہی عالم تھا۔ ایک میل تک اس کا زنانہ محل تھا
ہفتوں تک کسی مرد کی شکل اس کے سامنے نہ پڑتی تھی۔ شاہ عالم ثانی کے دربار کا
حال پولیر نے لکھا ہے[۲] وہ مطالعہ کے قابل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ
ان بادشاہوں کے مشاغل۔ ذہنی اور فکری صلاحیتیں کیا تھیں اور وہ کس حد تک
اس زمانے کے سیاسی نظام کو سنبھالنے کی قابلیت رکھتے تھے۔

سلاطین کی عادتوں اور دلچسپیوں کی نقل امرار کرتے تھے۔ اٹھارویں
صدی میں امرار کے گھر عیاشی کے اڈے تھے۔ مخرب اخلاق عادتیں ان کا معمول
تھیں اور اُن کے ضمیر کی آواز اتنی دھیمی پڑ چکی تھی کہ کبھی انھیں بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا
تھا کہ ان کی حرکات اخلاق و مذہب کی توہین ہیں۔

---

[۱] FALL OF THE MUGHAL EMPIRE VOL I P. 6

[۲] SHAHALAM II AND HIS COURT BY ANDTOINE HENRI POLIER EDITED BY PRATULC GUPTA (CALCTTA 1947)

صوفیۂ خام اور علماءِ سوء کی حالت اگر احبار یہود کی حالت دیکھنا چاہو تو آج کل کے علماء کو دیکھ لو اور اگر عیسائیوں کا نقشہ دیکھنا چاہتے ہو تو آج کل کے مشائخ کے سامنے بیٹھ کر کھینچ لو۔[۵ل] ——— ان الفاظ میں اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے عالم نے اپنے ہم عصر علماء کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے صوفیۂ خام اور علماءِ سوء صدہا قسم کی گمراہیوں کا شکار تھے اور ان کی گمراہی کا اثر ہر کہ ومہ پر پڑتا تھا۔

دنیا پرستی سے زیادہ بڑی کوئی لعنت علماء کے لئے نہیں ہو سکتی۔ اس دور کے علماء اسی میں گرفتار تھے اور مختلف امراء اور رؤساء سے منسلک ہو کر سیاست میں حصہ لے رہے تھے ——— ایسی سیاست جس کا مقصد دوسروں کی فلاح و بہبود نہ تھا بلکہ اپنے لئے جاہ و منزلت کا حاصل کرنا تھا۔ اکبر کے زمانے میں علماء کی اس دنیا پرستی کے خلاف حضرت مجدد صاحبؒ نے آواز اٹھائی تھی۔ اس دور میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور اُن کے خاندان نیز شاہ کلیم اللہ شاہ جہان آبادی، اور اُن کے منسلکین نے اس رجحان کے خلاف جنگ کی اور علماء کو اُن کے اعلیٰ فرائض یاد دلائے۔

اس دور کے علماء عموماً یونانی علوم میں پھنسے ہوئے تھے۔ اُن کا سارا وقت دور از کار بحثوں میں صرف ہوتا تھا۔ قرآن و حدیث سے اُن کا رابطہ تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس ماحول میں للکارا اور اعلان کیا۔

"یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیتِ محکم کا نام ہے یا سنتِ ثابتہ قائمہ کا۔"

۵ل الفوز الکبیر

یہ خاندان ولی اللہی کا وہ زبردست اعلان تھا جس سے علم کے متعلق سارے ہندوستان کے نظریے بدل گئے۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی رح حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے تایا شیخ ابوالرضا الہندی رح کے شاگرد تھے۔ اس لئے علم کے متعلق اُن کا نظریہ بھی وہی تھا جو خود حضرت شاہ ولی اللہ اور اُن کے بزرگوں کا تھا۔ علومِ دینی کے متعلق اس دور کے مشائخِ چشت کے خیالات کی اساس و بنیاد اسی پر تھی۔ اور اُنھوں نے زمانے کے عام رجحانات کے خلاف اس سلسلہ میں سخت جنگ کی۔

صوفیۂ خام کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ اُنھوں نے نہ صرف مشائخ متقدمین کی روایات کو فراموش کر دیا تھا بلکہ غیر اسلامی فکر و کردار اُن کا سرمایۂ زندگی بن گیا تھا۔ تصوف کے سرچشمے قرآن و حدیث سے ہٹ کر ویدانت اور اپنشد کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔ عملیات، تعویذ اور گنڈوں میں حد سے زیادہ اعتقاد بڑھ گیا تھا۔ پیر کی غیر شرعی حرکات حجتِ سمجھی جاتی تھیں۔ شاہ ولی اللہ رح نے ان لوگوں کو اس طرح مخاطب کیا ہے:-

"میں ان متقشف واعظوں، عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب و یابس کو لے بیٹھے۔ تم نے لوگوں کو موضوعات اور اباطیل کی طرف بلایا۔ تم نے خلقِ خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا۔ حالانکہ تم فراخی کے لئے مامور تھے، نہ کہ تنگی کے لئے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو اپنا مدار علیہ بنا لیا ہے، حالانکہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں، لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں"

اس قسم کے صوفیہ نے مذہبی تعلیم کو مسخ کرنے کے ساتھ ساتھ، ملت کے قوائے عمل کو شل کر دیا تھا۔ اس دور کے مشائخِ چشت نے اس قسم کے صوفیہ کے خلاف آواز

بلند کی ۔ اور تصوف کی خالص اسلامی صورت نکھار کر پیش کی ۔

عام مسلمانوں کی دینی زندگی | جب بادشاہ ، علماء اور صوفیہ ہی صدہا اخلاقی عیوب اور دینی گمراہیوں میں مبتلا تھے ، تو عام مسلمانوں کی زندگی کا ذکر ہی بے کار ہے "الناس علی دین ملوکھم" ۔ قرون وسطیٰ کا ایک ناقابل تردید اصول تھا ۔

اس دور میں عام مسلمانوں کی مذہبی حالت کا جائزہ لینے کے لئے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصانیف کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے ، اس حکیم الامت نے ملت کی بیماریوں کا تجزیہ بڑی بالغ نظری کے ساتھ کیا ہے اور اس کی ایک ایک دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا ہے ۔ اس زمانے کے صوفیۂ کرام کی کوششوں کی اصلی نوعیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت محدث دہلویؒ نے جن خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے ، اُن ہی کے ازالہ کی کوششیں ہیں ۔

(۱) شرک :-

"تم غیر اللہ کے لئے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو ، یہ تمھارے بدترین افعال ہیں ۔"

(تفہیمات)

"تم نے یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے ۔" (تفہیمات)

(۲) ارکانِ دین سے غفلت :-

(۱) "تم نمازوں سے غافل ہو .... کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لئے وقت نہیں پاتا ، اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے ۔"

(تفہیمات)

(ب) "تم زکوٰۃ سے بھی غافل ہو ...... تم میں کوئی مال دار ایسا نہیں جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے ہوئے نہ ہوں۔ وہ اُن کو کھلاتا اور پہناتا ہے، مگر زکوٰۃ و عبادت کی نیت نہیں کرتا۔"

(تفہیمات)

(س) "تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اس کے لئے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔" (تفہیمات)

(۳) فسق و فجور :۔

"چاہیئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعے پورا کرو۔ خواہ تمھیں ایک سے زیادہ ہی نکاح کیوں نہ کرنا پڑے .... تمھاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اُٹھاتے رہو۔"

(تفہیمات)

(۴) بُری رسومات :۔

"اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے۔ مثلاً یوم عاشورہ کو تم باطل حرکات کرتے ہو۔ ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے، کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے، اور کچھ دوسرے لوگوں نے اُسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں سے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیئے۔

(تفہیمات)

(۵) غیر شرعی حرکات :-

"پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمھاری زندگی تنگ ہو رہی ہے۔ مثلاً شادیوں میں فضول خرچی، طلاق کا ممنوع بنا لینا، بیوہ عورت کو بٹھا رکھنا۔ تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے۔" (تفہیمات)

(۶) کاہلی اور فضول خرچی :-

"اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمھاری ضرورتیں پوری ہوں۔ دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو۔ تم اُن سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اس طرح بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمھارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمھیں معاش کی راہ بھی سجھائے گا۔" (تفہیمات)

"اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اسی قدر خرچ کرو جس کی تم میں سکت ہو۔" (تفہیمات)

شیعہ سنی تنازعات | اٹھارویں صدی کا ایک اہم مسئلہ شیعہ سنی تعلقات کا بھی تھا۔ اورنگ زیب کے بعد شیعوں کا سیاسی اثر بڑی تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا تھا۔ حد یہ ہے کہ اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ تک شیعوں کے اثر میں آگیا تھا۔ اس کے بعد سادات بارہ کے اقتدار سے شیعوں کو بہت تقویت حاصل ہوگئی۔ ایرانی اور تورانی پارٹیوں کے اختلافات کی بنیاد صرف سیاست نہ تھی بلکہ مذہبی اختلافات کو بھی اس میں کافی دخل تھا۔ اس زمانے میں شیعوں نے اپنے عقائد کی ترویج میں تشدد سے کام لیا اور

سنی علمار کو سخت قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مرزا مظہر جان جاناں رح کو شہید کیا گیا، شاہ ولی اللہ رح نے پہنچے اتروا دیئے گئے، شاہ عبدالعزیز رح کو چھپکلی کا ابٹن ملوایا گیا۔ غرض ہر طریقے سے مشاہیر سنی علمار کو پریشان کیا گیا اور اُن کے لئے حالات ایسے پریشان کن کر دیئے گئے کہ ان کو دہلی چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں قیام کرنا پڑا۔

حضرت مجدد صاحب رح کے زمانے میں بھی شیعوں کے اقتدار کا مسئلہ نورجہاں کی وجہ سے بہت اہم ہو گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک رسالہ ردروافض، کے نام سے لکھا تھا۔ اس زمانے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رح نے اپنی فاضلانہ کتاب "ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفا" تصنیف فرماکر بہت سی عقائد باطلہ کی تردید کی۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا خیال ہے کہ پورے اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر ایسی کتاب موجود نہیں ہے۔ شاہ کلیم اللہ دہلوی رح نے بھی ایک کتاب ردروافض کے نام سے تصنیف فرمائی تھی۔

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں نے شیعوں کے عقائد کی اصلاح کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی رح نے اپنے خلیفہ شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کو ہدایت کی کہ وہ "معتقدات رفض" کو رد کرنے کے لئے پوری جدوجہد کریں۔ شاہ فخر الدین صاحب رح نے شیعوں کی مخالفت کا مقابلہ سختی سے نہیں بلکہ محبت سے کیا۔ جس شخص نے مرزا مظہر جان جاناں رح کو شہید کیا تھا اس نے اُن کو بھی شہید کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اُن کی مجلس میں پہنچ کر ایسا متاثر ہوا کہ اپنے ارادے سے توبہ کر لی۔ شاہ فخر الدین صاحب رح نے بہت سے شیعوں کو مرید بھی کیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک بار اس پر اعتراض کیا تو فرمایا: "مرید ہو کر وہ تبرے سے باز آجاتے ہیں۔" آخری زمانے میں شاہ سلیمان تونسوی رح نے یہ راہ اختیار کی

کہ سنی مسلمانوں کو شیعوں کی صحبت اور اثر سے بچنے کی تلقین کی۔

شیعوں سے مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود ان بزرگوں نے اپنے عادلانہ اور منصفانہ رویے میں فرق نہ آنے دیا۔ وہ ہر چیز کو اس کی حقیقی صورت میں دیکھتے تھے، اور کبھی وقتی مخالفت کی رو میں بہ کر عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے شیعوں کو کافر قرار دینے کے متعلق فتویٰ دریافت کیا تو شاہ صاحب نے اختلاف کیا۔ وہ شخص یہ کہہ کر کہ "ایں شیعی است[۵۱]" چلا گیا۔ ایک روہیلہ پٹھان آفتاب نامی شاہ عبدالعزیز صاحب رح کے درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن شاہ صاحب نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے فضائل و مناقب بیان فرمائے تو اس کو اس قدر غصہ آیا کہ (خود شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان ہے):

"بندہ را شیعہ فہمیدہ، آمدن درس موقوف کرد"[۵۲]	بندہ کو شیعہ سمجھ کر درس میں شریک ہونا بند کر دیا۔

جن بزرگوں کا کام انتشار و ابتری کے زمانے میں قوم کے ذہنی توازن کی نگہبانی کرنا تھا وہ کس طرح عوام کے جذبات کا شکار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان ہی بزرگوں کا کام تھا کہ اگر ایک طرف انھوں نے شیعوں کے عقائدِ باطلہ کی تردید میں اپنی زبان اور اپنے قلم کو جنبش دی۔ تو دوسری طرف انھوں نے سُنّی مسلمانوں میں اُن کے خلاف تشدّد کو روکا اور عدل و انصاف کو کبھی نظرانداز نہ کیا۔

آئیے، اب حالات کے اس پس منظر میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مشایخ سلسلہ چشت کے حالات کا مطالعہ کریں!

---

[۵۱] و [۵۲] ملفوظات شاہ عبدالعزیز رح

باب اوّل

حضرت شاہ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی رح

۱۷۲۹ — ۱۶۵۰

حضرت شاہ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی رح کو چشتیہ سلسلہ کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت اور عظمت حاصل ہے۔ ان کے زمانے سے چشتیہ سلسلہ کا دورِ تجدید و احیاء شروع ہوتا ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح کے بعد چشتیہ سلسلہ کا مرکزی نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ اور صوبوں میں مرکز سے غیر متعلق خانقاہیں قائم ہو گئی تھیں۔ حضرت سید محمد گیسو دراز رح، حضرت نور قطب عالم رح، علامہ کمال الدین رح اور دیگر مشاہیر نے سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی جد و جہد کی تھی۔ لیکن سلسلہ کو ایک "کل ہند ادارہ" کی حیثیت سے زندہ نہ کر سکے تھے۔ مرکزیت کے فنا ہو جانے سے سلسلے کے نظام کی اساس و بنیاد ہی بدل گئی تھی، شاہ کلیم اللہ صاحب رح کا یہ کارنامہ تھا کہ انھوں نے چشتیہ سلسلہ کے بے ترتیب نظام میں پھر ایک بار باقاعدگی

پیدا کی اور متقدمین صوفیہ کی نہج پر تبلیغ و اشاعت اور اصلاح و تربیت کا کام شروع کر دیا۔ اُنھوں نے ملک کے دور دراز علاقوں میں اپنے خلفاء بھیجے اور ان کے ذریعے ایک گرتی ہوئی سوسائٹی کو انتشار و ابتری سے بچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ چشتیہ سلسلہ کا نشاۃ ثانیہ اُن ہی کی کوششوں کا رہین منت تھا۔

حضرت شاہ صاحب رح نے رشد و ہدایت کی شمع ایسے زمانے میں روشن کی تھی۔ جب ہندوستان کے مسلمان ایک نہایت ہی نازک دور سے گزر رہے تھے۔ سلطنت مغلیہ کا آفتاب غروب ہوا چاہتا تھا، معاشرہ پر انحطاطی رنگ چھا رہا تھا، زندگی 'سکر دوام' میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ہر شخص ایک گونہ بے خودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔ مذہب کی روح ختم ہو چکی تھی اور اگر کچھ باقی رہ گیا تھا تو اوہام کا تار و پود۔ شاہ صاحب رح نے تنزل اور انحطاط کے اس دور میں احیاء ملت اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جو کوششیں کیں وہ اسلامی ہند کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ وہ حالات کی نامساعدت کو پہچانتے تھے زمانے کی رفتار کو دیکھتے تھے، لیکن ہمت نہ ہارتے تھے اور پکار پکار کر کہتے تھے

"در اعلائے کلمۃ الحق باشید و جان و مال خود صرف ایں کار کنید" [۵۱]	اعلاء کلمۃ الحق میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں صرف کر دو۔

دہلی کے مشہور بازار خانم میں[۵۲] اُن کی خانقاہ تھی۔ خانقاہ کیا تھی

---

[۵۱] مکتوب ۱۲ ص ۲۶

[۵۲] "خانم کا بازار بھی ایک بہت بڑا اور پُر رونق بازار تھا جو قلعے (بقیہ صفحہ ۳۶۸ پر

علم و معرفت، رموز و حکمت، احسان و سلوک کا سرچشمہ تھی، ہزاروں تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے وہاں آتے تھے۔ شائقین علم و فضل اُن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونا باعثِ فخر و مباہات تصور کرتے تھے

میر غلام علی آزاد بلگرامی رح کا بیان ہے :-

"امرا و فقرا، حلقۂ اعتقاد در گوش داشتند، و بہ مطالب دینی و دنیوی کامیاب اندوختند[۱]	امیر اور فقیر (سب ہی) اُن سے نیازمندانہ اعتقاد رکھتے تھے، اور دینی و دنیوی مقاصد میں کامیابی حاصل کرتے تھے۔

شاہ صاحب رح کے علمی اور روحانی دونوں مراتب نہایت اعلیٰ تھے۔ لوگ اُن کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ مآثر الکرام میں لکھا ہے :-

"در علوم عقلی و نقلی پایۂ بلند و در حقائق و معارف رتبۂ ارجمند داشت[۲]	علوم عقلی اور نقلی میں اُن کا پایہ بلند اور حقائق و معارف میں ان کا رتبہ ارجمند تھا۔

(بسلسلہ صفحہ ۳۶۷) کی فصیل کے برابر سراؤگیوں کے مندر تک چلا گیا تھا۔ جہاں اب ٹھنڈی سڑک ہے۔ یہ سارا میدان بھی صاف ہوگیا۔ غرض یہ کہ جامع مسجد کے دروازہ شرقی کے محاذ میں جو صاف اور چٹیل میدان نظر آتا ہے یہ حصہ فوجی اغراض اور دور اندیشی سے عمارات سے صاف کردیا گیا۔ اس میں اب ایڈورڈ پارک بنایا ہے، اور پریڈ گراؤنڈ ہے"

واقعات دارالحکومت، دہلی

جلد دوم۔ ص ۱۲۴

[۱] و [۲] مآثر الکرام ص ۲۰۴

شاہ صاحبؒ کے اسلاف معماری کا پیشہ کرتے تھے لیکن خود ان کو بقول آزاد "اللہ تعالیٰ نے دلوں کی معماری کے لئے مخصوص کیا تھا" خود ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"ما و شما کار فراہم آوردن ٹنکہ و نقار و جنس نیست، فراہم آوردن دلہا مطلوب است" [۵۱]	ہمارا اور تمہارا کام ٹنکہ و نقد و جنس جمع کرنا نہیں ہے بلکہ دلوں کا اکٹھا کرنا مقصود ہے۔

یہی وہ کام ہے جو تصوف کی روح اور اخلاق کی جان ہے اور جس کی اہمیت حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے مولانا فخر الدین مزورڈیؒ کو ایک مکتوب میں سمجھائی تھی [۵۲]

شاہ کلیم اللہؒ کا خاندان | مناقب المحبوبین میں لکھا ہے:۔

"نام پدر ایشاں حاجی نور اللہ بن شیخ احمد بن شیخ حامد صدیقی از اولاد حضرت ابابکر صدیق رضی اللہ عنہ اند، ابا و اجداد ایشاں ساکنان شہر خجند بودند، پدر ایشاں در زمان سلطنت سلطان شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ دہلی در شاہجہاں آباد یعنی دہلی نو آمدہ بود، و پدر	ان کے والد کا نام حاجی نور اللہ بن شیخ احمد بن شیخ حامد صدیقی تھا وہ حضرت ابوبکرؓ کی اولاد سے تھے۔ اُن کے آبا و اجداد خجند کے رہنے والے تھے ...... اُن کے باپ شاہجہاں کے زمانے میں شاہجہاں آباد میں آئے، وہ علم نجوم اور ہیئت میں انتہائی کمال

[۵۱] مکتوبات کلیمی م ۲۴ ص ۳۶

[۵۲] ملاحظہ ہو، سیر الاولیاء

ایشاں در علم نجوم و ہیئت کمالیت تمام داشت، بنا براں بادشاہ مذکور وقت تعمیر لال قلعہ ایشاں را از شہر خجند طلبیدہ بود۔[۵۱]	رکھتے تھے۔ اسی بنا پر شاہجہاں نے لال قلعہ کی تعمیر کے وقت اُن کو شہر خجند سے طلب کیا تھا۔

شاہ کلیم اللہ کے دادا احمد معمار[۵۲] عہد شاہجہانی کے مشہور ماہرین فن میں تھے شاہانِ مغلیہ کی طرف سے نادر العصر کا خطاب ملا تھا۔ اقلیدس، ہیئت، نجوم، ریاضی وغیرہ پر کامل عبور رکھتے تھے، یونانی ریاضیات کی سب سے اونچی کتاب مجسطی اور خواجہ نصیر طوسی کی تحریر اقلیدس کے عالم تھے۔ ان کے بیٹے لطف اللہ مہندس نے (جو شاہ کلیم اللہ کے تایا تھے) ایک مثنوی میں اُن کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

شاہجہاں داورِ گیتی ستان ۔۔۔ روشنی دودۂ صاحب قِراں
عرش بریں قبۂ خرگاہ اوست ۔۔۔ رشک فلک سدۂ درگاہِ اوست
احمد معمار کہ در فن خویش ۔۔۔ صد قدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقفِ تحریر و مقاماتِ آں ۔۔۔ آگہ اشکال و حوالاتِ آں
از طرفِ داور گردوں جناب ۔۔۔ "نادرِ عصر" آمدہ او را خطاب
بود عمارت گر آں بادشاہ ۔۔۔ داشت در آں حضرت فرخندہ راہ

۵۱ مناقب المحبوبین۔ ص ۵۸

۵۲ احمد معمار اور ان کی اولاد کے متعلق مولا سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی نے چند مضامین میں کافی مفید معلومات جمع کر دی ہے (معارف فروری، مارچ ۱۹۳۶ء نیز مئی ۱۹۳۶ء اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۷ء) ان مضامین سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے لیکن ان دونوں مضمون نگاروں میں سے کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ احمد معمار کے خاندان کی سب سے بڑی شخصیت شاہ کلیم اللہ دہلوی تھے۔

تاج محل اور لال قلعہ کو انھی نے تعمیر کیا تھا اسی مثنوی میں لکھتے ہیں ؎

کرد بحکم شہِ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہِ انجم سپاہ — شاہجہاں داورِ گیتی پناہ
قلعہ دہلی کہ ندارد نظیر — کرد بنا احمدِ روشن ضمیر

احمد معمار نے ۱۰۵۹ھ میں انتقال کیا[۵۱]۔ ان کے تین بیٹے۔

(۱) عطاءاللہ

(۲) لطف اللہ

(۳) نور اللہ

تینوں اپنی اپنی جگہ اُستاد تھے[۵۲]۔ عطاءاللہ کے متعلق مثنوی میں لکھا ہے ؎

نادرِ عصر خود و مشہور شہر — عالم و علامہ و دانائے دہر
مردِ ہنر پرور و اُستاد فن — فاضل و دانشور و حبرِ زمن
مخزنِ علم آمدہ تالیف او — گنجِ ہنر ہاست تصانیف او
نثرِ او از آب رواں پاک تر — نظم خوشش غیرتِ سلک گہر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم اور نثر دونوں میں عطاءاللہ کو کمال حاصل تھا لطف اللہ نے اپنے بڑے بھائی سے تعلیم حاصل کی تھی اس لئے کہتے ہیں ؎

---

۵۱ لکھا ہے۔ درزمانِ سعید شاہجہاں — شاہ عالم پناہ جم مقدار
نادرالعصر رفت و گفت خرد — شد بفردوس احمدِ معمار
۱۰۵۹ھ

۵۲ ماہمہ معمار و عمارت گریم
ماہمہ استادِ سخن پروریم

منکہ سخن پرور دانش درم | بندۂ آں جز سخن درم
منکہ ربودم زجہاں گوئے علم | ازچمنش یافتہ ام بوئے علم

لطف اللہ علم ہندسہ کے ماہر تھے۔ مہندس خطاب شاہی تھا۔ شعر و شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ اس مثنوی میں جس کے اقتباسات اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے شاعرانہ کمالات کے جوہر دکھائے ہیں۔

احمد معمار کے سب سے چھوٹے بیٹے نور اللہ تھے، جو شاہ کلیم اللہ کے والد بزرگوار تھے۔ عمر میں لطف اللہ سے چھوٹے تھے، لیکن کمالات میں اُن سے بڑھ کر تھے۔ چنانچہ خود لطف اللہ لکھتے ہیں ؎

لیک بود قصرِ کمالش عجب | زاں شدہ معمار مرا و را لقب
گرچہ کم است سالِ وے از سالِ من | بیش بود حالِ وے از حالِ من
نزدِ وے از نظم گہر بار تر | نظم ز نثر آمدہ ہموار تر
دیدہ ز نورِ سخنش پُرضیا | طبع ز لطفِ سخنش پُرصفا
گنج ہنر آمدہ در مشتِ او | ہفت قلم راندہ سہ انگشتِ او
گرچہ منم بے سخن استادِ فن | آں یک و ایں یک بود استادِ من

دہلی کی جامع مسجد کی پیشانی پر جو کتبے ہیں وہ نور اللہ ہی کی باکمال انگلیوں کا کرشمہ ہیں۔ کتبہ کے آخر میں بسمت شمال لکھا ہوا ہے۔

کتبہ نور اللہ احمد

خاندانِ کلیمی کے تعمیری کارنامے | خاندانِ کلیمی کے تعمیری کارنامے مندرجہ ذیل ہیں

(۱) تاج محل۔ آگرہ

(۲) لال قلعہ۔ دہلی

(۳) جامع مسجد ، دہلی

(۴) محل نواب آصف خاں ، لاہور

(۵) قلعہ جات شمشیر گڈھ اور حسن ابدال

(۶) مقبرہ دلراس بانو بیگم ، اورنگ آباد

خاندان کلیمی کے علمی کارنامے | اس خاندان نے صرف سنگ و ستون ہی پر اپنا نقشِ دوام نہیں چھوڑا - اس کی یادگار چند کتابیں بھی ہیں جو اپنی جگہ اہم ہیں اور جن سے اس خاندان کی علمی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے -

عطا اللہ ، رشیدی تخلص کرتے تھے اور نظم و نثر میں متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں - ریاضی پر ان کی جن تین کتابوں کا علم ہو سکا ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) بیج گنت

(۲) خلاصہ راز

(۳) خزینۃ الاعداد

بیج گنت[۵] بھاسکر اچاریا کی سنسکرت تصنیف وبیجا گنیتا کا فارسی ترجمہ ہے - وبیجا گنیتا کے معنی علم جبر و مقابلہ کے ہیں - عطا اللہ نے یہ ترجمہ شاہجہاں کے آٹھویں سنہ جلوس یعنی ۱۰۴۴ھ میں مکمل کر لیا تھا -

خلاصہ راز[۵۲] میں حساب ، مساحت اور جبر و مقابلہ سے متعلق مضامین ہیں - رسالہ شاہزادہ دارا شکوہ کے نام معنون کیا گیا ہے -

---

۵ قلمی نسخے برٹش میوزیم اور میونخ یونیورسٹی کے کتب خانوں میں موجود ہیں -

۵۲ قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے -

خزینۃ الاعداد[۱] علم حساب، الجبرا اور اقلیدس میں ہے۔ یہ کتاب مبتدیوں تاجروں اور سرکاری ملازموں کے لئے لکھی گئی تھی۔

لطف اللہ کی مندرجہ ذیل تصانیف ہم تک پہنچی ہیں۔

(۱) صور صوفی

(۲) رسالہ خواص اعداد

(۳) شرح خلاصۃ الحساب

(۴) منتخب الحساب

(۵) تذکرہ آسمان سخن

(۶) دیوانِ مہندس

(۷) سحر حلال

صور صوفی، عبدالرحمٰن صوفی (المتوفی ۳۷۶ھ) کی مشہور کتاب صور الکواکب کا فارسی ترجمہ ہے۔ لطف اللہ نے ۱۰۸۰ھ میں اپنے باپ کے حکم سے اس کام کو انجام دیا، اور ان ہی کے نام سے اس کو معنون کیا۔ اس کا اصل نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

رسالہ خواص اعداد، سات صفحات پر مشتمل ہے۔ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ایک مجموعہ کے اندر شامل ہے۔

شرح خلاصۃ الحساب، بہاء الدین محمد بن حسین آملی کی عربی تصنیف خلاصۃ الحساب کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں

---

[۱] اس کا قلمی نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے (۱۰۷)

ملاحظہ ہو: فہرست کتب عربی و فارسی و اردو کتب خانہ جامعہ بمبئی مترجمہ شیخ عبدالقادر

ہے۔ اور دوسرا رامپور کے کتب خانے میں۔

منتخب الحساب، بہاء الدین آملی کی کتاب کا فارسی خلاصہ ہے۔ اس کے دو نسخے انڈیا آفس کے کتب خانے میں، ایک برٹش میوزیم۔ ایک کتب خانہ آصفیہ اور ایک مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

آسمان سخن، دولت شاہ سمرقندی کے فارسی تذکرے کو اکبر کے زمانے میں ایک شاعر فائضی کرباتی نے دس طبقوں میں مکمل کیا تھا۔ لطف اللہ نے دو طبقات کا اس میں اضافہ کر کر اس کا نام آسمان سخن رکھ دیا۔ اس کا ذکر ڈاکٹر اسپرنگر نے شاہانِ اودھ کے کتب خانے کی فہرست میں کیا ہے۔

دیوانِ مہندس، ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک قصیدہ میں دارا شکوہ کی تعریف کی ہے۔

سحر حلال، علمِ اخلاق میں غیر منقوطہ رسالہ ہے۔ زبان فارسی ہے۔ عالم گیر کی تعریف کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لطف اللہ کے دارا شکوہ سے تعلقات کے پیشِ نظر عالم گیر کو اس سے مخالفت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک جگہ لکھا ہے ؎

شہا گوشِ بر داد خواہی نداری | بحال گدایاں نگاہے نداری
رقیباں بقتلم نوشتند فتوے | وگرنہ تو ہرگز گناہے نداری

غالباً تعلقات کو درست کرنے کے لئے لطف اللہ نے سحر حلال کی تصنیف کی تھی، اس کا قلمی نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے

لطف اللہ کے دو بیٹے تھے:۔

(۱) امام الدین الریاضی

(۲) خیر اللہ

امام الدین کا ذکر شاہ کلیم اللہؒ نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے۔ شاہ صاحب نے

چاہتے تھے کہ امام الدین کی ایک لڑکی کا نکاح اپنے عزیز مرید شیخ نظام الدین اورنگ آبادی سے کرادیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

سخن صریح تر آنکہ میاں امام الدین	صاف بات یہ ہے کہ میاں امام الدین
کہ برادر عموزادہ فقیر اند، دخترے	کی جو فقیر کے عموزادہ ہیں۔ ایک
درسن چہاردہ سالہ فی الحال	لڑکی ہے جو ۱۴ سال کی ہے، نماز
بصلاح نماز و روزہ وتلاوت	روزہ تلاوت قرآن سے آراستہ
قرآن آراستہ دارند.....[۵۱]	ہے۔

امام الدین کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے :۔ ریاضیات کے اس ریاض علم کا یہی وہ نونہال ہے جس کے تذکرے کی خوشبو بارہویں صدی کے اہل تذکرہ کی محفل تک پھیلی ہے۔"[۵۲] ان کے حالات خوش گو، حسین قلی خاں عظیم آبادی، کشن چند اخلاص اور احمد علی خاں سندیلوی نے لکھے ہیں۔ خوش گو کا بیان ہے :

"درجمیع علوم رسمی یگانہ ومنفرد بود"

پھر آگے لکھا ہے :۔

"دریں جزو زماں از مغتنمات بودہ"

امام الدین نے ۱۱۴۵ھ کو انتقال کیا۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف اب تک دریافت ہو سکی ہیں :

(۱) تشریح الافلاک

(۲) حاشیہ شرح چغمنی

---

۵۱ مکتوبات کلیمی۔ م ۷، ص ۱۵

۵۲ معارف۔ اپریل ۱۹۳۶ء ص ۲۴۵

(۳) حاشیہ شرح خلاصۃ الحساب

(۴) بیانیہ

تشریح الافلاک، بہار الدین آملی کی تصنیف کی شرح ہے۔ رامپور میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔ بیانیہ۔ معانی و بیان سے متعلق ہے۔ رسالہ کی زبان فارسی ہے" دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ شہزادی زیب النسار بیگم کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

ابوالخیر معروف بہ خیر اللہ، محمد شاہ کے زمانے میں مشہور ہوئے، راجہ جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم سے دہلی، جے پور، بنارس، اجین میں جو رصد خانے قائم کئے تھے۔ اُن کی نگرانی خیر اللہ ہی نے کی تھی۔ وہ دہلی میں درس بھی دیتے تھے۔ محمد علی ان کے بیٹے اور شاگرد تھے۔ وہ بھی اپنے فن میں بڑے مشہور تھے۔ اُن کے بعد کسی شخص کو اتنی شہرت اس خاندان میں حاصل نہیں ہوئی۔ خیر اللہ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) تقریر التحریر[۵۱]

(۲) تقریب التحریر[۵۲]

(۳) حاشیہ بر شرح بیست باب در معرفت اسطرلاب[۵۳]

---

۵۱ قلمی نسخہ۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ (حیدر آباد) اور انڈیا آفس (نمبر ۲۳۶۰)

۵۲ قلمی نسخہ بانکی پور (۱۰۵۸) اور علی گڈھ

فہرست میں اس کا نام ترجمہ مجسطی لکھا ہے (نمبر ۶ علوم فارسی)

۵۳ یہ حواشی بانکی پور لائبریری کی شرح بست باب کے نسخے نمبر ۱۰۴۵ کے کناروں پر درج ہیں۔

(۴) شرح زیچ جدید محمد شاہی[1]

(۵) شرح زلالی[2]

(۶) شرح حافظ[3]

(۷) شرح سکندر نامہ[4]

شاہ کلیم اللہؒ کی ولادت | حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کی ولادت باسعادت ۲۴ جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء کو ہوئی تھی۔ خود ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"بست و چہارم جمادی الثانی مولد فقیر است و تاریخ تولد فقیر غنی است"[5]

(۱۰۶۰ = ۱۰ + ۵۰ + ۱۰۰)

تعلیم و تربیت | شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ خود انھوں نے ابتدائی زمانے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے اکتسابِ علوم کیا تھا تکملہ سیر الاولیار میں لکھا ہے :-

"در ایام جوانی بہ تحصیل علوم مشغول بودند و کمال علم کردہ بودند"[6]

ان کے اساتذہ میں شیخ برہان الدین المعروف بہ شیخ بہلولؒ اور شیخ ابوالرضا الہندیؒ کے اسمارِ گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شیخ بہلولؒ

---

[1] اس شرح کا حوالہ علامہ حسین جون پوری نے اپنی مشہور تصنیف جامع بہادر خانی میں دیا ہے

[2] [3] ان شرحوں کا ذکر تقریب التحریر کے دیباچہ میں ان کے بیٹے نے کیا ہے۔

[4] مطبع شرف المطابع دہلی سے ۱۲۶۸ھ میں طبع ہوئی۔

[5] مکتوباتِ کلیمی۔ ص ۹۳ مکتوب ۱۲۵

[6] تکملہ سیر الاولیار۔ ص ۷۹

سید محمد غوث گوالیاری رح کی اولاد سے تھے، اُن کے علمی تبحر کی دور دور شہرت تھی۔ شیخ ابوالرضا الہندی رح، شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے تایا تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد کے ذہن و قلب پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اُن ہی کے ذریعے سے شاہ کلیم اللہ دہلوی کا رشتہ خاندان ولی اللّٰہی سے قائم ہو جاتا ہے۔

شیخ ابوالرضا الہندی | شیخ وجیہہ الدین شہید کے فرزند رشید اور شاہ عبدالرحیم صاحب رح کے بڑے بھائی تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل حافظ بصیر کی نگرانی میں کی۔ حافظ بصیر اُس زمانے میں اپنے علمی تبحر کی بنا پر بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے[۲] ان کے فیض صحبت سے شیخ ابوالرضا رح نے بہت جلد علوم ظاہری میں دستگاہ حاصل کر لی۔ پھر خواجہ خرد خلف الصدق حضرت خواجہ باقی باللہ رح کی خدمت میں سلوک و معرفت کی دشوار گزار راہیں طے کیں۔ ابتدائی زمانہ میں امراء سے میل جول رکھتے تھے اور شاہی دربار میں ایک ممتاز عہدہ بھی قبول کر لیا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس زندگی سے طبیعت گھبرا گئی اور انھوں نے مسجد فیروز آباد کے قریب ایک حجرے میں رہنا شروع کر دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب رح اس زمانے کا حال لکھتے ہیں:-

"در آں زماں بسیار می بود کہ دو سہ فاقہ متواتر می گزشتند و اگر سد رمقے میسر می آمد چند تائے نان جویں و دوغ می بود کہ محمد جان طحان و امثال وے از نیاز مندان می آوردند و آنرا در فقراء قسمت علی السویہ

---

[۱] حالات کے لئے ملاحظہ ہو گلزار ابرار قلمی

[۲] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:-

حافظ بصیر کہ عمدۂ علماء زمان شاہجہان بود۔ انفاس العارفین ص ۸۸

می کردند وبقلیلے اکتفامی نمودند[۵۱]

اس کے بعد فتوحات کی ایسی کثرت ہوئی کہ ہر طرح کی سہولت حاصل ہوگئی۔

شیخ ابوالرضاؒ اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ علومِ عقلی و نقلی کے ہر گوشہ پر کامل عبور رکھتا طبیعت کا زیادہ رجحان تصوف کی طرف تھا اکثر اوقات اشغال و افکار میں انہماک رہتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ درس و تدریس کا بھی شوق تھا، اور جو شائقینِ علم حاضر ہوتے تھے، ان کی تشنگی کو دور کرنے کے لئے اس طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ آخری زمانے میں تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف کے علاوہ کسی کتاب کا درس دینا پسند نہ کرتے تھے[۵۲] وعظ میں بڑی تاثیر تھی۔ نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ کہتے تھے۔ جن میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین موجود ہوتے تھے۔ احادیث پڑھ کر ان کا 'فارسی' اور 'ہندی' میں ترجمہ کرتے جاتے تھے[۵۳] اور ایسے پُر درد لہجے میں خطاب کرتے تھے کہ سُننے والوں کے دل ہل جاتے تھے۔

شیخ ابوالرضاؒ وحدتِ وجود کے قائل تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رح کا بیان ہے:-

"اکثر حال در توجہ الی اللہ یا بیان معارف با خواص اصحاب می گذشت، بوحدتِ وجود قائل بودند و دراں باب تحقیقے عظیم داشتند، و در مجالسِ صحبت مغلقات کلام صوفیہ رابسیار حل می فرمودند[۵۴]"

---

۵۱ انفاس العارفین ص ۸۸

۵۲ "درآخر بجز دو سبق یکے از تفسیر بیضاوی و دیگر از مشکوٰۃ درس ایشاں نبود"
انفاس العارفین - ص ۹۰

۵۳ انفاس العارفین - ص ۹۰

۵۴ انفاس العارفین - ص ۹۰

استغنا کا یہ عالم تھا کہ اورنگ زیب نے متعدد بار اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن قبول نہ ہوئی۔ شیخ ابوالرضا رح کے تفصیلی حالات، شوارق المعرفت اور انفاس العارفین میں مطالعہ کرنے چاہئیں۔

مدینہ منورہ کو روانگی | تکمیلِ علوم کے بعد، شاہ کلیم اللہ رح کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا اور وہ یک لخت مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ حافظ محمد جمال ملتانی سے روایت ہے کہ اوائلِ عمر میں ان کو ایک کھتری لڑکے سے گرویدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اور عشق اس درجے تک پہنچ گیا تھا کہ ایک لمحہ بھی اس کے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ دلی میں ایک مجذوب تھے۔ جن کے متعلق عام عقیدہ یہ تھا کہ وہ صرف اسی شخص کی نذر قبول کرتے ہیں۔ جس کا کام ہونا ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کچھ شیرینی لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے یہ نذر قبول کرلی۔ دوسرے دن شاہ صاحب رح اس لڑکے کے پاس گئے۔ اس نے نہایت ہی لطف اور توجہ سے اُن کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑی محبت سے پیش آیا۔ لڑکے کی اس ملاطفت سے شاہ صاحب رح کی طبیعت بھر گئی، اور ان کے مذہبی احساس نے پکار کر کہا

همتِ عشق نہ ہو حسنِ خط و خال ہیں بند

صید ہر مور و مگس ہوتے ہیں شہباز کہیں (قائم چاندپوری)

اب شاہ صاحب رح کی طبیعت اس مجذوب کی طرف راغب ہو گئی۔ مجذوب کی صحبت سے شاہ صاحب رح میں ایک جذب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ احترامِ شرع کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی حالت کو چھپانے کی حد سے زیادہ کوشش کرتے تھے۔ لیکن جب ضبط نہ ہو سکا اور بالکل مجبور ہو گئے تو مجذوب سے اپنی حالت بیان کی اور امداد کے طالب ہوئے۔ انھوں نے جواب دیا :-

اگر آتش ازیں قسم خواہند   اگر اس قسم کی آگ چاہتے ہو تو

نزدِ من بسیار است و آب	میرے پاس بہت ہے (لیکن)
نزدِ حضرت شیخ یحییٰ مدنی است	پانی حضرت شیخ یحییٰ مدنی کے پاس
آنجا روید"	ہے۔ وہاں جاؤ۔

شاہ صاحبؒ جن کا قلب وجگر اس آگ سے پہلے ہی جل چکا تھا اور جن کی تشنگی کسی ابرِ کرم کی منتظر تھی۔ شیخ یحییٰ مدنیؒ کا نام سُن کر بے اختیار مدینہ منورہ کی طرف دوڑ پڑے۔ اُن کی والدہ ماجدہ حیات تھیں، لیکن جذبۂ شوق نے اتنی بھی مہلت نہ دی کہ اُن سے جاکر اجازت لے لیں[۵۱]۔ اس طویل مسافت کو نہ معلوم کِن کِن مشکلوں سے طے کیا اور بالآخر شیخ یحییٰ مدنیؒ کے قدموں میں جا پہنچے۔

حضرت شیخ یحییٰ مدنیؒ | حضرت شیخ محی الدین ابو یوسف یحییٰ الچشتیؒ شیخ کمال الدین علامہؒ کی اولاد سے تھے۔ اپنے زمانے کے مشاہیرِ صوفیہ میں ان کا شمار تھا۔ صاحب مراۃ احمدی نے لکھا ہے:

"ذاتِ مبارک ایشاں حجت بود بر مشایخ سلف بلکہ در متقدمین هم مثل ایشاں کم بوده باشند[۵۲]"

۲۰ رمضان ۱۰۵۱ھ کو احمد آباد (گجرات) میں پیدا ہوئے تھے۔ بیس سال کی عمر میں علومِ ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کر لیا۔ پھر سجادۂ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور تزکیۂ باطن میں مصروف رہنے لگے۔ شاہ و گدا سب ہی ان سے عقیدت رکھتے تھے اورنگ زیب جب گجرات کی صوبہ داری پر معمور تھا تو شیخ نظام کو ان کی خدمت میں بھیج کر ملاقات کی استدعا کی تھی۔ شیخ یحییٰ نے معذرت چاہی لیکن

---

۵۱ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۷۹

۵۲ خاتمہ مرات احمدی۔ ص ۷۹

پھر بھی اورنگ زیب اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نے پیش گوئی کی کہ تم تخت پر متمکن ہوگے اور تم سے "دین محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم" کو تقویت پہنچے گی[۵۱] لکھا ہے کہ شاہزادگی کے زمانے میں اورنگ زیب دو سو روپے سال اُن کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد ہر سال ایک ہزار روپیہ بھیجنے لگا۔ سماع پر جب مرزا باقر محتسب نے شیخ کے مچلکے لئے تو اورنگ زیب نے معذرت کا خط لکھا اور محتسب کو تنبیہہ کی کہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرے۔[۵۲] مکتوبات کلیمی میں ان کا ایک خط نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اورنگ زیب کے نام لکھا تھا :-

از جانب شیخ یحییٰ سلام برسد	شیخ یحییٰ کی جانب سے سلام پہنچے
از آنجا کہ سماع قوت صالحانست	سماع نیک لوگوں کی غذا ہے۔ اس
منع کردن راہیم وجہے ندارد	سے روکنے کی کوئی معقول وجہ نہیں
والسلام "[۵۳]	والسلام۔

حضرت یحییٰ مدنیؒ ایک روحانی اشارے پر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے وہیں ۲۸ صفر سنہ ۱۱۰۱ھ کو وصال فرمایا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مقبرے کے متصل سپردِ خاک کئے گئے۔ اُن کے تفصیلی حالات کے لئے معارج الولایت فی مدارج الہدایت کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ان کے ملفوظات مفتاح الکرامات کے نام سے محمد فاضل بن شیخ فیروز نے ترتیب دئے تھے۔

---

[۵۱] خاتمہ مرأت احمدی ص ۸۰

[۵۲] مرأت احمدی ۔ ص ۸۱

[۵۳] مکتوبات کلیمی ۔ ص ۸۲ مکتوب ۱۰۳

شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادیؒ حضرت مدنیؒ کے قدموں پر

مدینہ منورہ پہنچ کر شاہ کلیم اللہ صاحبؒ اپنا زیادہ وقت شیخ مدنیؒ کی خدمت میں گزارنے لگے۔ ایک دن شیخ مدنیؒ اپنے کسی شاگرد کو شرح وقایہ پڑھا رہے تھے۔ شاہ کلیم اللہؒ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ شیخ تو علوم ظاہری ہی کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ شیخ مدنیؒ نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا اور وہ کتاب شاہ کلیم اللہؒ کے ہاتھ میں دے دی۔ شاہ صاحبؒ کا یہ حال ہو گیا کہ کتاب کی عبارت تک سمجھ میں نہ آئی۔ اپنے خیال سے توبہ کی۔ پھر شیخ کے تقدس اور علم و فضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی اور اپنے حسب حال یہ قطعہ پڑھا ؎

آئی تو کہ از نام تو می بارد عشق
وز نامہ و پیغام تو می بارد عشق
عاشق شود آنکس کہ بکویت گزرد
گویا ز در و بامِ تو می بارد عشق [۱]

کچھ عرصہ شاہ کلیم اللہؒ حجاز میں مقیم رہے[۲] شیخ مدنیؒ نے ان کو خرقۂ خلافت سے نوازا اور ظاہری و باطنی نعمت سے سرفراز کیا[۳] شاہ صاحبؒ جب وطن کو واپس ہونے لگے تو انھوں نے ایک کلاہ اور شجرہ دیا کہ دہلی میں شیخ اچھا کو دے دینا۔ شاہ صاحبؒ دہلی پہنچے تو سب سے پہلے اُن ہی سے ملاقات

۱؎ شجرۃ الانوار (قلمی)

۲؎ مآثر الکرام میں لکھا ہے "مدتہا دراں دیار فیض آثار بسر بُرد"، ص ۲۰۸

۳؎ تکملہ سیر الاولیا ص ۸۵

ہوئی اور آپس کی محبت اس قدر بڑھ گئی کہ ایک جان اور دو قالب ہو گئے، لکھا ہے:-

"حضرت شیخ کلیم اللہ تصدق شیخ اچھا شدند، فیما بین ذوقہا وشوقہا وجدانہ بہم رسانیدند تا حینِ حیات رابطۂ یگانگت درمیاں داشتند" [۵۱]

درس و تدریس | شاہ کلیم اللہؒ نے دہلی واپس آکر بازار خانم میں اپنا مسکن بنایا اور سلسلۂ درس و تدریس شروع کر دیا۔ بازار خانم اس وقت دلی کا سب سے زیادہ بارونق بازار تھا۔ ایک طرف قلعہ کی دلکش عمارت تھی، دوسری طرف جامع مسجد کے فلک بوس مینار، درمیان میں شاہ صاحبؒ کا مدرسہ تھا۔ غالباً یہ جگہ ان کے خاندان کو شاہ جہاں کی طرف سے عطا کی گئی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ قلعہ اور جامع مسجد کے معماروں کے لئے اس سے زیادہ موزوں جگہ بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ شجرۃ الانوار کے مصنف نے لکھا ہے:

"غرضکہ فانی فی اللہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی در شہر شاہجہان آباد آمدہ رونق افزا شدند، درآں زماں رونق و تیاری قلعہ تازگی داشت [۵۲] و جامع مسجد مسکن خود نمود و از اکثر اوقات بعد از صلوۃ عصر زیر قلعہ برائے سیر دریا بنا بر تفرج طبع می رفت"

---

۵۱ شجرۃ الانوار۔ شیخ اچھا کے مزار کے متعلق لکھا ہے:-
"مزار حضرت شیخ اچھا در آں مجر است کہ زیر روضۂ امیر خسرو واقع است، و مولوی غلام فرید برادر دینی احقر العباد و خلیفہ خاص حضرت مرشدمن در آنجا مدفون اند"

۵۲ ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں قلعہ کی بنیاد رکھی گئی ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں تیار ہوا
تاریخ ہوئی ؎ شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد

شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کی علمی شہرت بہت جلد اکنافِ ملک میں پھیل گئی اور دور دور سے طلبا تحصیل علم کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، شاہ صاحبؒ کے مدرسہ کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہوتیں۔ لیکن شجرۃ الانوار کے ایک بیان سے اس کی نوعیت پر کافی روشنی پڑتی ہے لکھا ہے :-

"بسیارے طلبائے علم آمدہ سکونت می نمودند و سبق کتب ہامی خواندند و نان و پارچہ نیز از سرکار می یافتند"	بہت سے طلبا، ان کی خدمت میں آکر رہتے اور علم حاصل کرتے تھے۔ ان کو کھانا اور کپڑا بھی سرکار سے ملتا تھا۔

خود شاہ صاحبؒ کو حدیث کے درس میں خاص دلچسپی تھی۔ تذکروں میں حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا ایک واقعہ درج ہے کہ وہ شاہ صاحبؒ سے ملنے کے لئے ایک مرتبہ اُن کے مدرسہ تشریف لے گئے تو دیکھا کہ شاہ صاحبؒ صحیح بخاری کے درس میں مشغول ہیں [۱]

توکل کی زندگی | حضرت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کو توکل اور قناعت کی بے پناہ دولت ملی تھی۔ وہ عسرت اور تنگی میں دن گذارتے تھے لیکن کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا تو کیا معنی، امراء و سلاطین کی نذریں اور جاگیر نامے تک قبول نہ کرتے تھے تکملہ سیر الاولیاء کا بیان ہے

شیخ کی ملکیت میں لے دے کے کل ایک حویلی تھی جس کا ماہوار کرایہ عہ آتا تھا۔ شیخ اس سے گذر اوقات کرتے تھے۔ ۸ ر ماہوار پر ایک مکان

---

[۱] انوار العارفین۔ ص ۴۳۰

کرایے پر دے رکھا تھا اور باقی دو روپے میں پورے گھر کا خرچ چلاتے تھے "۔[۵۱]

بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ قحط یا دیگر غیر معمولی حالات کے باعث اس مختصر سی آمدنی میں گذر اوقات نہ ہو سکی اور وہ قرض دار ہو گئے۔ ایک مکتوب میں شاہ نظام الدین اورنگ آبادی رح کو لکھتے ہیں:۔

"دریں سالہا کہ از تنگی باراں صورت قحط دریں ملک شدہ بود۔ وبانہ دہ نفر سواء مہمان گذران می شد، گاہے بیگاہے قرض داری می شدم "۔[۵۲]

اس زمانے میں جب کہ بارش کی کمی کے باعث ملک میں قحط کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور نو دس آدمی علاوہ مہمانوں کے کھانے والے تھے اکثر اوقات میں قرض دار ہو گیا۔

لیکن اس کے باوجود شاہ صاحب رح نے کسی بادشاہ سے کچھ قبول نہیں کیا، اُن کی خودداری کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی فرخ سیر نے بہت کوشش کی کہ شاہ صاحب کو خزانہ سے کچھ دے دیا جائے لیکن انھوں نے ہر بار انکار ہی کر دیا، تکملہ سیر الاولیا میں لکھا ہے:۔

"بادشاہ فرخ سیر بارہا الحاح نمود کہ حضرت از بیت المال چیزے قبول فرمایند، ایشاں جواب دادند کہ حاجت نیست، باز عرض کرد کہ حویلی از بہر نزول در معرض افتد، فرمودند بہ ایں نیز حاجت نیست[۵۳] باز عرض نمود اگر اجازت باشد بندہ در خدمت آمدہ سعادتِ دارین

---

[۵۱] تکملہ سیر الاولیا، ص ۸۵

[۵۲] مکتوب ۱۷، ص ۲۱

بقیہ نوٹ ۵۳ صفحہ ۳۸۸ پر

به قدم بوسی حاصل نموده باشد۔ فرمودند که توظل الٰہی ہستی در سایۂ آں ذات ہمیشہ بہ دعا گوئی مشغول ام۔ بہ آں نیز حاجت نیست بلکہ بندہ را تصدیع خواہد رسید"۔ [۵۱]

جمعہ کی نماز آپ جامع مسجد میں پڑھتے تھے، وہاں بادشاہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن آپ کا اتنا رعب تھا کہ اُسے بغیر اجازت بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی [۵۲]

شاہ صاحب کا اخلاق | شاہ صاحب رح نہایت حلیم الطبع اور خوش مزاج انسان تھے۔ جب کوئی شخص جس کو ان کی ناراضگی کا خیال ہوتا، معذرت کا خط لکھتا تو اس انداز میں جواب دیتے کہ مومنؔ کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتے ہے

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

وہ دشمنوں اور مخالفوں سے بھی کبھی ناراض نہ ہوتے تھے۔ جب کسی سے تکلیف

(بقیہ نوٹ سلسلہ ص ۳۸۷)

۵۳ بعد کو شاید شاہ صاحب رح نے ایک حویلی قبول فرمالی تھی۔ ایک مکتوب میں شاہ نظام الدین صاحب کو لکھتے ہیں۔

"شاہ ضیاءالدین برائے فقیر از بادشاہ حویلی یک ہزار و دو درعہ بازار خانم کہ مشتمل است۔ بر یک ایوان و دو حجرہ و یک چاہ و یک چاچہ گرفتند۔ م ۱۸ ص ۱۴۶

فخر الطالبین میں لکھا ہے کہ آخر زمانے میں شاہ صاحب کی مالی حالت اچھی ہوگئی تھی اور فتوحات کا سلسلہ ایسا شروع ہوا تھا کہ انھوں نے قریب ایک لاکھ روپیہ، املاک وغیرہ ورثہ چھوڑا تھا (ص ۱۴۶)، لیکن اُن کے مکتوبات سے، اس کی تائید نہیں ہوتی۔ آخر زمانہ کے مکتوبات سے بھی عسرت اور تنگی کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔

۵۱ و ۵۲ تکملہ سیر الاولیا ص ۸۵

پہنچتی تو زبان پر یہ اشعار جاری ہو جاتے ہے

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ مارا یار نبود ایزد اور ایار باد
ہر کہ خارے برنہد در راہ ما از دشمنی،
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد[1]

اپنے مریدوں کو بھی یہی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کی جفا و قفا برداشت کریں[2] اور لب نہ ہلائیں۔ کہتے تھے کہ ہمارا کام دلوں کو ایک جگہ کرنا ہے۔ اس میں جتنی بھی مشکلات پیش آئیں، ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیے[3]

دکن میں ایک بار کچھ لوگوں نے ان کو برا بھلا کہا۔ شاہ نظام الدین رح نے اس کی اطلاع ان کو دی تو جواب میں ارشاد فرمایا :-

"ہر کہ مارا بد یاد می کند ما مستحق زیادہ از انیم کہ او لطف کردہ کم دشنام می دہد، ما عفو کردیم شما ہم عفو کنید[4]"

کوئی شخص ہمیں برائی سے یاد کرتا ہے (تو ہمیں اس سے کوئی شکایت نہیں اس لیے کہ) ہم اس سے زیادہ برائی کے مستحق ہیں۔ اس نے لطف کیا اور ہمیں کم گالیاں دیں ہم نے اسے معاف کر دیا، تم بھی اسے معاف کر دو۔

---

[1] مکتوبات کلیمی، م ۲۳ ص ۲۸، م ۹۸ ص ۷۷
[2] مکتوبات م ۵ ص ۹
[3] مکتوبات م ۳۳ ص ۲۷
[4] مکتوبات ص ۳۰

تصانیف شاہ کلیم اللہ صاحب رح نے تصانیف کا ایک بے بہا ذخیرہ چھوڑا ہے جس سے اُن کے تبحرِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مناقب فریدی میں اُن کی تصانیف کی تعداد ۳۲ بتائی گئی ہے[۵۱] ان کی مندرجہ ذیل تصانیف ہم تک پہنچی ہیں:

(۱) قرآن القرآن

(۲) عشرہ کاملہ

(۳) سواء السبیل

(۴) کشکول

(۵) مرقع

(۶) تسنیم

(۷) الہامات کلیمی

(۸) رسالہ تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیۃ

(۹) شرح القانون

شاہ صاحب کی ایک تصنیف رسالہ ردِّ روافض کا بھی بعض کتابوں میں ذکر ہے، لیکن وہ دستیاب نہیں ہو سکی۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ علم منطق پر بھی ان کا ایک رسالہ تھا[۵۲] وہ بھی اب نایاب ہے۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رح شعر بھی کہتے تھے اور ان کا کلام غدر کی تباہیوں کی نذر ہو گیا تھا[۵۳]

---

۵۱ مناقب فریدی۔ ص ۴۳

۵۲ مناقب المحبوبین ص ۶۴ نیز مناقب فریدی ص ۴۴

۵۳ غالب کا خط حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام

اردوئے معلّٰی حصہ اول ص ۱۸۲ - ۱۸۳

قرآن القرآن، عربی زبان میں قرآن پاک کی نہایت اعلیٰ تفسیر ہے۔ مناقب المحبوبین کے فاضل مصنف نے اس کو جلالین کے ہم پایہ بتایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ شافعی مذہب کی ہے۔ یہ حنفی کی[۵۱] مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخر الدین صاحب رح کو اس کے اصلی نسخے کی تلاش تھی۔ ایک مرتبہ بازار تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک شخص کے پاس اس کا نسخہ دیکھا۔ اور بڑی قیمت دے کر خرید لیا[۵۲]

سنہ ۱۹۲۰ء میں میرٹھ کے مطبع احباب سے منشی عرفان الحق نے اس کو اس طرح شائع کیا تھا کہ کلام پاک کے متن کے نیچے شاہ رفیع الدین رح کا ترجمہ تھا اور حاشیہ پر یہ تفسیر، مولانا محمد قاسم نانوتوی رح نے اس کی تاریخ کہی تھی ؎

کارفرمائے مطبع احباب	شیخ عرفان حق جوان دبیر
اور مختار ہاشمی مطبع	کون ہاشم علی با تدبیر
چھاپا ہو کر کے جمع دونوں نے	ایسا مصحف نہیں ہے جس کی نظیر
بیچ میں ترجمہ ہے اور اوپر	ایک تفسیر کی نئی تحریر
وہ تو فیض شہ رفیع الدین	بحر مواج فیض خیر کثیر
اور یہ فیض شہ کلیم اللہ	تھے طریقت میں جو کہ بدر منیر
چھپ چکا جبکہ سب یہ حرز جان	ہاتف غیب نے لے تشہیر
کر کے آواز کو بلند کہا	چھپا قرآن بمعنی و تفسیر

۱۲۹۰ھ [۵۳]

---

[۵۱] مناقب المحبوبین۔ ص ۴۶

[۵۲] مناقب فخریہ۔ ص ۶۹ قلمی

بقیہ نوٹ نمبر ۳ ص ۳۹۲ پر

عشرہ کاملہ، سوا السبیل، کشکول، مرقع، تسنیم اور الہامات کلیمی تصوف سے متعلق ہیں۔ ان میں تصوف کے مختلف علمی اور عملی پہلوؤں پر نہایت عالمانہ اور دلچسپ گفتگو کی گئی ہے۔ عشرہ کاملہ، کشکول اور مرقع شائع ہو چکے ہیں۔ سوا السبیل کا ایک عمدہ نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے[۵۱]

ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روحانی رہبر کی حیثیت سے شاہ صاحب رحہ بڑی ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ اُنھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ مشائخ متقدمین کی کتابوں اور اپنے ذاتی تجربات سے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ ان اوراق میں موجود ہے۔ اُن کی تصانیف میں کشکول کلیمی کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب ۱۱۰۱ھ میں بعض احباب کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ خود فرماتے ہیں:۔

امروز کہ غرہ ذی قعدہ ۱۱۰۱ھ ہزار و یک صد و یک است، بالتماس بعضے محبان صمیمی لقمات در یوزہ دریں کشکول فراہم آوردہ[۵۲]	آج کہ غرہ ذی قعدہ ۱۱۰۱ھ ہے۔ بعض خالص دوستوں کی درخواست سے کچھ لقمے مانگ کر اس کشکول میں جمع کئے ہیں۔

۵۰ (بقیہ نوٹ ص ۳۹۱) مولانا محمد قاسم رحہ ہی نے یہ تاریخ بھی نکالی تھی ؎

کیا خوب واہ کیا خوب

ختم المصاحف
۱ ۲ ۹ ۰

کیا خوب چھاپا کیا خوب
۱ ۲ ۹ ۰

۱۲۹۰

۵۱ ۳۴۵

۵۲ کشکول کلیمی۔ ص ۳

اس وقت ان کی عمر ۹۴ سال تھی۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن
ظر میں بڑی پختگی اور تجربہ میں بڑی وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ صوفیۂ متاخرین
جا طور پر اس کو اپنا "دستور العمل"[۵۱] بنایا۔ شاہ صاحبؒ نے اس کی مخصوص
بیت کے متعلق لکھا ہے :-

"کشکولے کہ نقماتش لطیفۂ	یہ ایک کشکول ہے جس کے لقمے
ربانیہ را طاقت بخشد.......	لطیفۂ ربانی کو طاقت بخشتے ہیں
و در پیکر اسلامِ مجازی روح	..... اور مجازی اسلام کے قالب
ایمانِ حقیقی در دہد۔ و مردگان	میں حقیقی ایمان کی روح پھونک
طبیعت را حیات جاودانی	دیتے ہیں اور مردہ طبیعت کو جاودانی
ارزانی دارد۔"[۵۲]	زندگی عطا کرتے ہیں۔

کے مشایخ کا یہ دستور تھا کہ وہ خرقۂ خلافت کے ساتھ مرقع اور کشکول
دیتے تھے[۵۳] خود شاہ صاحبؒ کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے
ں مریدین کو اصلاحِ نفس اور روحانی ترقی کے لئے کشکول کے مطالعہ کی
بت فرمایا کرتے تھے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

"شما صحبت ہا دریافتہ اند دو کشکولے و مرقع آنجا موجود اند ہر
طالب را موافق حوصلہ آں بہ نیابت ذکرے و شغلے بفرمایند"[۵۴]

، تکملہ سیر الاولیار - ص ۸۱
، کشکول کلیمی - ص ۲
، تکملہ سیر الاولیار ص ۸۱
، مکتوبات کلیمی - م ۱۱۶ ص ۹۴

حافظ محمد علی صاحب خیر آبادیؒ، کشکول کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میاں اسلم صاحبؒ نے کسی کو پڑھنے کے لئے دے دی، تو حافظ صاحب بہت ناراض ہوئے اور فرمایا "یہ کتابیں ایسی نہیں ہیں کہ نقلِ مجلس بنائی جائیں"۔[۵۱]

مرقع کی حیثیت کشکول کے ضمیمہ کی سی ہے۔ کشکول میں روحانی ترقی کے اعلیٰ مدارج اور دشوار گزار راہوں کا ذکر ہے، تو مرقع میں اس سفر کی تیاری کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے، اس کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ چنانچہ ان دونوں کتابوں نے مل کر ایک مکمّل ضابطۂ روحانی کی شکل اختیار کرلی۔ اور صوفیۂ متاخرین نے اس کو وہی مرتبہ دیا جو صوفیۂ متقدمین نے فوائد الفواد اور کشف المحجوب کو دیا تھا۔ خواجہ گل محمد احمد پوریؒ لکھتے ہیں:

ہر آن کو لقمہ زیں کشکول ما خورد
قلندر گشت، گو از دو جہاں برد
ہر آن کو این مرقع کرد بر دوش
بجاناں بیگماں گردد ہم آغوش[۵۲]

تسنیم کو بھی صوفیہ نے بہت پسند کیا۔ خواجہ محمد عاقلؒ نہایت ہی والہانہ انداز میں اس کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے ایک مرید مولانا عبداللہ نے جو بڑے عالم و فاضل تھے۔ اس کی شرح تنسیم کے نام سے لکھی تھی[۵۳]

---

[۵۱] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۵۷

[۵۲] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۸۱

[۵۳] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۵۶

"رسالہ شرح تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیۃ" علم ہیئت سے متعلق ہے۔ اس کا ایک نادر نسخہ نذیریہ پبلک لائبریری دہلی میں موجود ہے۔[ل] شرح قانون کا واحد نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے۔[۵۲]

مکتوبات | ان تصانیف کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے اپنے مکتوبات بھی چھوڑے ہیں، جن کا مجموعہ مکتوبات کلیمی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شاہ صاحبؒ کی دوسری تصانیف سے اگر ان کی علمیت، تبحر، اور روحانی افکار و خیالات کا پتہ چلتا ہے، تو ان مکتوبات سے اُن کی تبلیغی سرگرمیوں کا پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ اعلاءِ کلمۃ الحق کے لئے اُن کی پُرخلوص جدوجہد چشتیہ سلسلہ کی ترقی کے لیے مسلسل کوشش، اور لشکریوں اور عوام میں روحانی تعلیم و تربیت کے لیے ان کی سعیِ بلیغ کا علم ان ہی مکتوبات سے ہوتا ہے۔ اُن کی دیگر تصانیف اگر ان کی "علمیت" کی شاہد ہیں تو یہ مکتوبات ان کی "عملی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں ان دونوں کے مطالعہ سے شاہ صاحبؒ کی زندگی کے علمی اور عملی دونوں پہلو روشن ہو جاتے ہیں اور اُن کی شخصیت پوری طرح سے ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

تعداد میں یہ مکتوبات ۱۳۲ ہیں۔ ان میں سے سو سے زیادہ خطوط شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کو دکن بھیجے گئے ہیں۔ باقی خطوط مولانا محمد، دیارام، عبدالرشید وغیرہ کے نام ہیں۔ شیخ نظام الدین صاحبؒ کے نام جو مکتوبات ہیں وہ نسبتاً زیادہ صاف اور مفصل ہیں اور حقیقت میں سارے

ل فہرست کتب قلمی نذیریہ پبلک لائبریری، دہلی۔ مرتبہ محمد مہدی جعفر ۷۵۸۴[۳۳]
۵۲ فہرست کتب خانہ رامپور۔ ۴۸۶ (طب)

مجموعے کی جان ہیں۔

شاہ صاحب کی تبلیغی جدوجہد شاہ کلیم اللہ نے اسلامی ہند کی تاریخ کے ایک نہایت ہی نازک اور اہم دور میں احیاء ملت کے لئے جدو جہد کی تھی۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت کا آخری زمانہ تھا۔ ہندوستان کی سیاست کا مرکز ثقل شمال سے جنوب کی طرف منتقل ہو چکا تھا، بادشاہ، شاہی خاندان فوج کا بیشتر حصہ، سب دکن میں پہنچ چکا تھا۔ شمالی ہندوستان کی اہمیت نسبتاً کم ہو گئی تھی۔ دہلی، آگرہ، لاہور سب اپنی عظمت دیرینہ کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ محلات میں حسرت ناک خاموشی طاری تھی۔ سارا ساز و سامان تالوں میں بند پڑا تھا۔ اسلامی ہند کی تاریخ کا یہ عبوری دور تھا۔ شاہ صاحب رح نے وقت کی آواز کو پہچانا اور اپنے عزیز ترین مرید شیخ نظام الدین رح کو تبلیغ و اصلاح کے کام کے لئے دکن روانہ فرما دیا۔ خود ایک مکتوب میں شیخ نظام الدین رح کو لکھتے ہیں:۔

"شمارا اللہ تعالیٰ صاحب ولایت دکن ساختہ است۔ این کار را تمام نمائید، قبل ازیں می نوشتم کہ بہ لشکر بروید، اکنوں ایں امر است ہر جا کہ باشید در اعلائے کلمۃ الحق باشید و جان و مال خود صرف این کار کنید"[۵۱]	تم کو اللہ تعالیٰ نے دکن کی ولایت عطا فرمائی ہے۔ تم یہ کام پورے طور پر انجام دو، میں نے اس سے پہلے تم کو لکھا تھا کہ لشکر میں جاؤ لیکن اب یہ حکم ہے کہ جہاں کہیں ہو اعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں ہی صرف کر دو۔

۵۱ مکتوبات کلیمی۔ م ۲۱ ص ۲۶

شاہ صاحب کے مکتوبات میں ایک بے قرار اور بے چین قلب کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ہر خط میں وہ اپنے مرید کو اعلائے کلمۃ الحق کی ہدایت کرتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں :-

(۱) "جان و مال خود را صرفِ ایں کار کنید"[۵۱]	اپنے جان و مال کو اسی کام میں صرف کر دو۔
(۲) فیض دینی و دنیوی بہ عالم رسانند و ہمہ حلاوت و عیشِ خود فدائے آں بندگاں باید کرد"[۵۲]	دینی اور دنیوی فیض دنیا کو پہنچاؤ۔ اپنا عیش و آرام اور راحت انسانوں پر فدا کر دو

وہ اسلام کو ہندوستان میں انتہائی ترقی پذیر دیکھنا چاہتے تھے اور ان کا احساسِ ملی اسلام کا پیغام ہر کان تک پہنچانے کے لئے مضطرب تھا چنانچہ بار بار مریدوں سے کہتے ہیں :-

"در آں کوشید کہ صورتِ اسلام وسیع گردد و ذاکر ایں کثیر"[۵۳]

وہ خطوط میں اور باتیں بھی لکھتے ہیں لیکن جس کو بار بار دہراتے ہیں، وہ یہ ہی ہے

(۱) "بہر حال در اعلائے کلمۃ الحق کوشید و از مشرق تا مغرب ہمہ حقیقی پر کنید"[۵۴]

---

۵۱ مکتوبات۔ م ۲۱ ص ۲۶

۵۲ مکتوبات م ۷۵ ص ۶۰

۵۳ مکتوبات م ۷۶ ص ۶۰

۵۴ مکتوبات م ۸۰ ص ۶۲

(۲) "متوجہ اعلائے کلمۃ الحق باشند واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون"[1]

اُن کے قلبِ مضطر کی آواز صرف ایک جملہ میں پوشیدہ تھی "از مشرق تا مغرب ہمہ اسلام حقیقی برکنید" اسی دھن میں اُن کے شب و روز گزرتے تھے وہ دہلی میں تھے لیکن دکن کا نظامِ تبلیغ و اصلاح اُن کی ہدایتوں کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ وہ ناسازگار حالات کو دیکھتے تھے، لیکن اللہ پر ان کا بھروسہ تھا اور لا تقنطوا پر اُن کا ایمان۔

لوگوں کو مادیت پسند دیکھ کر ان کا قلب پریشان ہونے لگتا تھا۔ اور وہ گھبرا گھبرا کر کہتے تھے :۔

بردلِ بندگانِ خدا محبتِ دُنیا سرد گرداننده[2]	بندگانِ خدا کے دل سے دنیا کی محبت ختم کر دینا چاہیئے۔

جب عیش پرستی اور نفس پروری میں لوگوں کو گرفتار دیکھتے ہیں تو سمجھاتے ہیں :۔

اے دوست دنیا جائے نفس پروری و تن آسانی نیست[3]	اے دوست! دنیا نفس پروری اور تن آسانی کی جگہ نہیں۔

تبلیغِ دین و دعوتِ حق کے ثواب اور فضیلت کو ان پُر زور الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :۔

---

[1] مکتوبات۔ م ۸۰ ص ۶۲

[2] م ۱۳ ص ۱۹

[3] م ۷۴ ص ۵۹

"داقرب عند اللہ ورسولہ آں کسے روز رستخیز است کہ
در افشائے نور باطن ایمان ساعی است" [۵۱]

جذبۂ اعلائے کلمۃ الحق کا اتنا غلبہ ہے کہ شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کو اپنے ایک مُرید کے منصبِ شاہی ملنے کی اطلاع دیتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ اپنے اصلی نصب العین کی طرف اس طرح متوجہ کرتے ہیں :-

"اے برادر منصب ما و شما فقر است، کوشش کنید در
اعلائے کلمۃ اللہ" [۵۲]

ان کی تمنا تھی کہ ان کے تمام مرید اشاعتِ اسلام اور اعلار کلمۃ اللہ کے لئے کمربستہ ہوجائیں۔ اور وہ خلافت اسی مقصد کے پیشِ نظر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ نظام الدین صاحبؒ نے ایک شخص کے لئے خلافت کی سفارش کی تو جواب میں ارشاد ہوا :-

"جب تک اعلار کلمۃ اللہ کے لئے کمرِ ہمّت نہ باندھی جائے
خلافت سے کیا فائدہ" [۵۳]

بار بار اُن کی زبان سے یہ ہی نکلتا ہے کہ تبلیغِ اسلام اور احیائے دین کی کوشش کرو۔ یہ ہی مسلک ہمارے بزرگوں کا رہا ہے۔ اس میں کوتاہی اچھی نہیں۔ اپنے مرید محمد علی کو لکھتے ہیں :-

"ہمیشہ در اعلائے کلمۃ اللہ کہ پیران من وعن رسیدہ

---

۵۱ مکتوبات کلیمی - م ۸۷ ص ۵۹

۵۲ مکتوبات م ۸۵ ص ۹۸

۵۳ مکتوبات م ۳۹ ص ۳۹

کوشش نمایند"[۵۱]
احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی فضیلت کو وہ یہ کہہ کر ذہن نشین کراتے ہیں کہ یہ موجب رضائے الٰہی ہے اور انبیا کا خصوصی کام ہے :۔

"دریں باب جہاد نمایند و این کار سہل نہ انگارند، ومنتشرا در معمورۂ عالم سازند کہ رضائے الٰہی درین است و اصلاح مفاسد فرزندان آدم نمایند کہ انبیاء مبعوث برائے ہمیں کار بودہ اند"

ایک مکتوب میں اس کو "کار بزرگ" کہتے ہیں :۔

"شما را کارِ بزرگ ایصال فیض و اعلائے کلمۃ اللہ فرمودہ ام ہم دریں کار گرم آمدید"[۵۲]

شاہ صاحب رح کے اس اصرارِ پیہم اور کوشش مسلسل نے مریدوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ شیخ نظام الدین اورنگ آبادی رح نے اپنے پیر و مرشد کی ہدایات پر عمل کیا اور بہت جلد کامیابی حاصل کی۔ جب شیخ نظام الدین صاحب رح کا ایک مرید نور محمد ان کا خط لے کر دہلی آیا تو شاہ کلیم اللہ رح نے سب کیفیت دریافت فرمائی۔ شیخ نظام الدین رح کی تبلیغی مساعی کو بنظرِ استحسان دیکھا اور اس مضمون کا ایک خط بھیجا :۔

"مطالعہ فرمایند امروز کہ ۷ محرم الحرام ۱۱۳۳ھ مرقوم می گردد کہ میاں نور محمد خادم شما کہ از اولاد حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا .... کتابت شما آوردہ اند .... الحمد للہ۔

---

۵۱ م ۱۱۵ ص ۸۸

۵۲ م ۲۸ ص ۳۱

والمنۃ درا علائے کلمۃ اللہ سعی موفور مبذول است۔ مرقوم بود کہ درین وضع اعلاء بیشتر است۔ بہ نسبت آں وضع اے برادر۔ بہر حال مقصود ایصال فیض فقر محمدی است بعالمیاں بہر وضع کہ بیشتر ایں کار سرانجام یابد باید کرد"۔[۵۱]

شیخ نظام الدین صاحب رح کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندو گرویدۂ اسلام ہوگئے۔ بعض اپنے رشتہ داروں کے ڈر سے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ شاہ کلیم اللہ صاحب رح ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"دیگر مرقوم بود بھیہ دیا رام و ہندوہائے دیگر بسیار در ربقۂ اسلام در آمدہ اند، اما با مردم قبیلہ پوشیدہ می مانند"۔[۵۲]

ساتھ ہی ساتھ اس چیز کو بھی پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد اپنے مسلمان ہونے کو مخفی رکھے۔ مبادا بعد موت اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے:-

"برادر من اہتمام نمایند کہ آہستہ آہستہ ایں امر جلیل از بطون بظہور انجامد کہ موت در عقب است مبادا احکام اسلام بعد از رحلت بجا نیا رند و مسلمانان حقیقت را لبسوزانند، دیا رام اگر خطے می نویسد خطے نوشتہ خواہد شد"۔[۵۳]

---

۵۱ مکتوبات کلیمی۔ م ۴۸۔ ص ۶۴

۵۲ مکتوبات م ۲۱۔ ص ۲۵

۵۳ مکتوبات م ۱۷۔ ص ۱۴

اس مکتوب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب رح کی تبلیغی مساعی کس حد تک
دکن میں کامیاب ہوئی تھیں۔ اس خط میں دیا رام کا ذکر ہے۔ یہ شخص بھی اُن
لوگوں میں سے تھا جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا لیکن قبیلہ کے ڈر سے اُس کا
اظہار نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے خط سے پتہ چلتا ہے کہ دیارام کا اسلامی
نام شاہ صاحب رح نے فیض اللہ رکھا تھا۔

"بہ دیا رام یعنی شیخ فیض اللہ اگر کتابت می نویسد جواب
می نویسیم" [۱]

معلوم ہوتا ہے کہ دیا رام نے اس خوف سے کہ کہیں اس کے مسلمان ہونے کا اظہار
نہ ہو جائے، خطوط بہت کم لکھے۔ شاہ کلیم اللہ رح ایک خط کے جواب میں اُنھیں لکھتے
ہیں:۔

"محبت اطوار خواجہ دیارام از یادِ حق بہ آرام تمام باشند۔ قبل ازیں
نمیقۂ ارسال ایں طرف نمودہ بودند۔ یکے از دوستان شاہ نظام الحق
والدین رسانید و ازیں طرف مکرر جواب رفتہ۔ قاصدانِ نامہ بر را
چہ تواں کرد" [۲]

دیارام کو درود کی مواظبت اور چند کتبِ سلوک کے مطالعہ کی تاکید شیخ
نظام الدین صاحب رح کے ذریعے اس طرح فرماتے ہیں ؎

"درجواب دیارام نوشتہ آمد کہ مواظبت بہ درود نبی صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم بسیار نمایند کہ سرمایۂ ہر سعادت این است دیگر

---

[۱] مکتوبات۔ م ۳۴ ص ۴۱
[۲] مکتوبات۔ م ۱۰۸ ص ۸۴

مطالعۂ کتب، سلوک و تواریخ چوں نفحات و تذکرۃ الاولیا و رسائل حقائق چوں لمعات و شرح لمعات و لوائح و شرح آں در مطالعہ داشتہ باشند، اما احدے از بیگانگاں مطلع نہ شود[۵۱]"

شاہ صاحبؒ کا نظام تعلیم و تربیت | شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کے لئے نہایت مکمل نظام قائم کیا تھا۔ انھوں نے اپنے اُن تمام مریدوں کی جن کو تبلیغی و اصلاحی کام پر مامور کیا تھا، نہایت سختی سے نگرانی کی، وہ اُن سے باربار معلوم کرتے رہتے تھے۔

"کجا تا بہ کجا ترقی کردہ اند"[۵۱]

وہ خود دہلی میں رہتے تھے لیکن دکن کا نظام تعلیم و تربیت ان کی زیر ہدایت کام کر رہا تھا، معمولی معمولی معاملات پر وہ مرکز سے ہدایات روانہ کرتے تھے۔ مریدوں کا یہ حال تھا کہ بغیر ان کی اجازت کوئی قدم نہ اُٹھاتے تھے۔ ایک خط میں خود نظام الدین صاحبؒ کو لکھتے ہیں :-

رحمت خدائے تعالیٰ بر شما	اللہ کی تم پر رحمت ہو کہ بے اجازت
باد کہ بے اجازت قدم بر ندارند	قدم تک نہیں اُٹھاتے جس نے بھی
کسیکہ بدولتے رسید بہمیں	(عزت و عظمت اور روحانی سعادت)
ادب رسید"[۵۲]	حاصل کی،اسی ادب سے حاصل کی۔

خطوط کے معاملہ میں وہ نہایت باقاعدگی برتتے تھے۔ خط میں دیر ہو جاتی تو شاق گذرتا۔ انتظار میں رہتے اور لکھتے۔

---

۵۱ مکتوبات۔م ۶ ۔ ص ۱۲-۱۱

۵۲ مکتوبات م ۳۳ ص ۳۵ ۵۳ مکتوبات م ۵ ص ۹

(۱) "دِرِ ایصال نامجات تسامح نورزند۔ المکتوب نصف الملاقات است"[۵۱]	خطوں کے بھیجنے میں دیر نہ کریں۔ خط نصف ملاقات ہے۔
(۲) عذر نوشتن کتابت از طرفِ ما اگر باشد مقبول است و مسموع و از طرف شما نامقبول و نامسموع[۵۲]	خط (میں تاخیر) کا عذر اگر ہماری طرف سے ہو تو قبول کیا جاسکتا ہے اور سنا جاسکتا ہے لیکن اگر تمھاری طرف سے ہو تو نامقبول و نامسموع ہے۔
(۳) "مکتوبِ محبت اسلوب مدتہا است کہ نرسید، چشم نگراں است"[۵۳]	مکتوبِ محبت اسلوب مدت سے نہیں آیا، آنکھیں منتظر ہیں۔

وہ چاہتے تھے کہ مرید جو خط بھیجیں وہ محض رسمی نہ ہوں۔ بلکہ اس میں اپنے پورے حالات وواردات اور تقسیمِ اوقات کی بابت لکھیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کن کن مشاغل میں اُن کا وقت صرف ہوتا ہے اور اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں وہ کس حد تک سرگرم ہیں۔ شاہ صاحب رح کے نزدیک اُن کے اصلاحی نظام کی کامیابی کا انحصار اس پر تھا کہ مریدوں کی پوری نگرانی کی جائے۔ اور ان کی خلوت وجلوت کا پورا پروگرام مرتب کیا جائے۔ وہ ضبطِ اوقات اور پابندیِ اصول کا درس دیتے رہتے تھے۔ اکثر مکتوبات میں اپنے مریدوں سے نظامِ اوقات دریافت فرماتے ہیں، اور معلوم ہونے پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔

---

۵۱ مکتوبات۔ م ۲۳۔ ص ۲۸

۵۲ مکتوبات م ۳۳ ص ۳۵

۵۳ مکتوبات م ۶۴ ص ۵۴

"تقسیم اوقات و توزیعِ مراتب خلوت و جلوت ہمہ معلوم شد"[۱]

اگر کوئی خلیفہ اپنے پروگرام سے مطلع نہ کرتا تو شاہ صاحب خود دریافت فرماتے۔

"اما خوب معلوم نشد کہ اوقاتِ گرامی بکدام توزیع مصروف است آیا بہ رنگ طالب علماں یا درویشاں یا نہ ایشاں و نہ ایشاں"

م ۱۵ ص ۲۰

پابندیِ اوقات نہ کرنے والے کے متعلق صاف صاف لکھ دیتے ہیں۔

"ضبطِ اوقات آنکہ ندارد خسر الدنیا والاخرہ است"

م ۲۲ ص ۲۶

سرگرمی اور مشغولیت کی برابر تاکید رہتی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"شما درکار خود سرگرم تر باشید	تم اپنے کام میں اور زیادہ سرگرم ہوجاؤ
کہ ہیچ کس بر شما شائق نتواند بود	یہاں تک کہ جو تمہارے پاس پہنچے
مگر آنکہ کار شما بکند"	تمھارا کام کرنے لگے۔

م ۴۴ ص ۴۵

بعض اوقات خود بھی شاہ صاحب رح اپنے مریدوں کے لئے نظامِ اوقات متعین فرماتے تھے۔ ایک خط میں فجر کی نماز کے بعد سے لے کر رات تک کا انفرادی اور نفلی پروگرام بتانے کے بعد اجتماعی پروگرام کی طرف اس طرح متوجہ کرتے ہیں۔

"......... شریعت را احکام باید نمود .... یارانِ اہل علم را درس تفسیر و حدیث و عبادات و فقہ درمیان ظہر و عصر و بعد از صبح بگوئید و اہل شوق کہ اندکے بعلم آشنا باشد درس لمعات و لوائح و امثال آں بہر حال

---

[۱] مکتوبات ۔ م ۹۳ ص ۱۷ نیز م ۶ ص ۱۱

مراتبِ تمکیں بہ از مراتبِ تلوین است "

م ۹۹ ص ۷۹ - ۷۸

ذاتی مطالعہ کے لئے حدیث وفقہ، اخلاق وتصوف، سیر وتاریخ کی کتابوں کی ہدایت فرماتے ہیں۔

"بمطالعہ کتب..... حدیث وفقہ وسلوک چوں احیا وکیمیا وامثال ذلک چوں تواریخ مشائخ بیشتر بہتر است "[۵۱]	حدیث وفقہ کی کتابیں اور سلوک کی کتابیں مثلاً احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت اور مشائخ متقدمین کے تذکرے مطالعہ کرنے بہتر ہیں۔

ایک اور خط میں تذکرۃ الاولیاء شیخ فریدالدین عطارؒ، نفحات الانس مولانا جامیؒ منازل السائرین اور رشحات کے مطالعہ کی خاص طور سے تلقین کی ہے۔[۵۲] شاہ صاحب اپنے مریدوں کے تعلقات کی نگرانی بھی فرماتے تھے۔ اگر بربنائے بشریت کوئی جھگڑا یا بدمزگی آپس میں پیدا ہو جاتی تو اس کو جلد سے جلد رفع کرنے کی کوشش کرتے اور عفو ودرگذر کی ہدایت فرماتے تھے تاکہ نظام میں خلل واقع نہ ہونے پائے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"حقائق میاں اسد اللہ ومیاں ضیاء اللہ بہ تفصیل معلوم شد، شما ہرگز مخالفت باہر دو عزیز نخواہید کرد وشما متوجہ کار خود باشید۔"	میاں اسد اللہ اور میاں ضیاء اللہ کے حالات تفصیل سے معلوم ہوئے تم کو ہرگز ان دونوں سے مخالفت نہ کرنی چاہیئے، بلکہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔
م ۲۰ ص ۲۴ - ۲۳	

---

۵۱ مکتوبات کلیمی۔ ص ۱۴

۵۲ مکتوبات کلیمی۔ ص ۷۹

پھر ایک خط میں نصیحت کرتے ہیں :-

"میاں اسداللہ و میاں ضیاءالدین	میاں اسد اللہ اور میاں ضیاءالدین
برادران شما اند باید کہ بایک دیگر	تمھارے بھائی ہیں۔ چاہیئے کہ شیر و
فانی باشند و اگر از یکے خلاف	شکر ہو کر رہو۔ اگر کسی سے دوسرے
مرضی امرے شد دیگرے از کرم	کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جائے
عفو نماید و بہ محبت زندگانی کنند"	تو دوسرا معاف کر دے اور محبت
م ۲۱ ص ۲۶ - ۲۵	سے زندگی بسر کی جائے۔

شاہ صاحبؒ نے ایک مکتوب میں جس کو خود وہ "دستور العمل" قرار دیتے ہیں، اپنے تعلیمی اصول و ضوابط کا پورا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"اے برادر! ایں نامہ مرا دستور العمل خود شناسید و در حکم آں احتیاط نمایید کہ فروگذاشت را در آں مدخل نباشد و حداوسط از دل بروں نہ رود" م ۹۶ صفحہ ۷۳

اس کے بعد حسب ذیل اصول بیان فرماتے ہیں :-

(۱) ایصالِ[1] خیر کو مقصود قرار دیا جائے۔

(۲) ایصالِ خیر میں اخلاص اور تصحیح نیت سے کام لیا جائے (ص ۷۳)

(۳) ہجوم خلائق مستوجب شکر الٰہی ہے (اس سے گریز نہ کیا جائے۔) (ص ۷۴)

(۴) اگر فتوحات ملیں تو آپس میں تقسیم کر دیا جائے ورنہ اس دن کو

---

[1] "خیر عبارت از فنا ر ماسویت از جمیع المسالک الی البقا بحق تعالیٰ و قیام المسالک فی جمیع محبۃ اللہ ایں معنی باید کہ ہمیشہ در نظر باشد و شرح ایں را دریں نامہ نتوانم" م ۹۶ ص ۷۳

غنیمت سمجھا جائے جس دن فتوحات میسر نہ آئیں کہ

"درفقر و فاقہ تاثیرے عظیم است" (ص ۴۷)

(۵) مسئلہ وحدت الوجود کو ہر کس و ناکس کے سامنے نہ چھیڑا جائے بلکہ استعداد و اہلیت دیکھنے کے بعد حسب موقع اس پر بحث کی جائے

"مسئلہ وحدت وجود را شائع پیش ہر آشنا و بیگانہ نخواہید بر زبان آورد" (ص ۴۷)

(۶) ہندو اور مسلمان دونوں سے تعلقات رکھے جائیں تاکہ غیر مسلم تعلیمات اسلام سے متاثر ہوں اور

"ذکر بخاصیت خود او را بر بقۂ اسلام خواہد کشید" (ص ۴۷)

(۷) مریدوں میں ادب اور احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ چونکہ

"صحبتِ انبیاء باصحاب چناں بود" (ص ۴۷)

(۸) اپنے مریدین سے "احیائے سنت" اور اماتتِ بدعت کے لئے پوری کوششیں کرائی جائیں

"ہر کہ از یاراں خود اذن دہند مبالغہ در احیائے سنت و اماتت بدعت خواہد بود" (ص ۷۵)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نظام تعلیم و تربیت کے کچھ اہم اصول اپنی کتابوں میں بھی بیان کئے ہیں۔ مثلاً اذکار کی تعلیم کے متعلق ہدایت کرتے ہیں

"اگر مرید عجمی باشد بہر زبان کہ داشتہ باشد تلقین فرمایند" [۵۱] — اگر مرید عجمی ہو تو اسی کی زبان میں ان کے پڑھنے کی تلقین فرمائیں۔

---

[۵۱] کشکول کلیمی

اشاعت سلسلہ کے لئے ہدایات حضرت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ اپنے سلسلہ کی اشاعت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ جگہ جگہ مریدوں کو حکم ہوتا ہے

(۱) "سعی در شیوع سلسلہ نمایند"

(م ۱۳ ص ۱۹)

(۲) "جہد بلیغ نمائید کہ مردم در سلک شما داخل شوند و بمرتبہ فقر رسند"

(م ۴۷ ص ۶۶)

ایک مکتوب میں ارشاد ہوتا ہے:-

"شما در اصلاح دل محجوبان بکوشید کہ بعز وصال و قرب رسند و بریاضت و مجاہدہ و عشق و بے خودی مریدان و طالباں را تربیت کنید کہ تا قیام قیامت برائے ما و شما فواتح پیہم و متصل برسد

م ۱۱ ص ۱۷

نیز م ۴ ص ۹

ایک مرتبہ شیخ نظام الدین نے اپنے پیر و مرشد سے فتوحات قبول کرنے کے متعلق دریافت کیا۔ شیخ نے اشاعتِ سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیا کہ اگر فتوحات سے کام میں رکاوٹ واقع ہوتی ہو تو قبول نہ کرنا بہتر ہے، ورنہ قبول کرلینی چاہیے:-

"اے درویش خدائے تعالیٰ شما را عقلِ معاش و عقلِ معاد ہر دو داده است۔ آں کنید کہ دراں اجرائے سلسلہ باشد ما گرفتن و نا گرفتن نمی دانیم۔ اگر رونق سلسلہ از عدم قبول است عدم قبول بہتر ورنہ قبول۔

(م ۱۳ ص ۱۹)

ساتھ ہی ساتھ صوفیۂ متقدمین کے فتوحات قبول کرنے کو نیک نیتی پر محمول کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"درویشانِ ماضی کہ قبول بعضے فتوحات کردہ اند اغلب کہ برائے استمالتِ خاطرِ معتقدان کردہ اند والا بضرورت خود کم کسے قبول کردہ باشد"

م ۱۳ ص ۱۹

مرید کی اشاعتِ سلسلہ کی کوششوں کا جب علم ہوتا ہے تو اظہارِ مسرت کرتے ہیں۔ دعائیں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ارواحِ مشائخ اس کام سے خوش ہوتی ہیں۔ اگر شیخ کی اولاد کو خزانہ بھی دے دیا جائے تو شیخ کی روح اس قدر خوش نہیں ہوتی جتنی احیاءِ سلسلہ کی کوششوں سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"پس رحمت خدائے تعالےٰ برشما باد کہ ایں سلسلہ را جاری کردید۔ شکر اللہ سعیکم۔ وایں ہمہ افتادگان حضیض غفلت را باوج حضور رسانید و ارواحِ مشائخ باخود خوشنود کردید۔ بالفرض اگر کسے گنجے باولادِ شیخ بخشد آں قدر رضامندیِ جناب ایشاں درآں نباشد کہ در احیاءِ سلسلہ ایشاں باشد"

م ۴۴ ص ۴۵

نظامِ خلافت مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے خلافت کا نہایت مکمل اور مضبوط نظام قائم کیا تھا۔ ہر کس و ناکس کو خلافت نہیں دی جاتی تھی، نااہل لوگوں کے ہاتھ میں یہ کام پہنچنے کی صورت میں گمراہی اور ضلالت پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔ جس کو وہ جا بجا ظاہر بھی کرتے ہیں۔ خلافت سے متعلق ان کے اصول یہ تھے:۔

(۱) خلافت دینے کا مقصد اشاعت اسلام کے لئے جد و جہد ہے۔

م ۳۹ ص ۳۹

(۲) خلافت جس کو دی جائے اس کے تفصیلی حالات مرکز کو لکھے جائیں تاکہ بس

کی صلاحیت اور اہلیت کا اندازہ ہو سکے [۵۱] م ۱۸ ص ۲۲

(۳) صرف اہلِ علم کو خلافت دی جائے [۵۲] اس لئے کہ

"در صحبتِ او ضلالت رواج نخواہد گرفت"۔ م ۷۴ ص ۵۴

(۴) خلافت کی دو قسمیں کی جائیں۔ خلافت ربانی اور خلافت سلوک

"اول ہر کہ حیثیت فقرا داشتہ باشد باید فرمود من غیر امتیاز بین ان یکون عالما او جاہلاً۔ اما قسم ثانی کہ مثال بنویسند و برو بکنند این قسم مخصوصاً بہ اہل علم دارند"۔ م ۹۶ ص ۷۴

(۵) بیعت کرنے کے بعد فوراً اجازت بیعت نہ دی جائے

م ۹۶ ص ۷۴

شیخ نظام الدین صاحبؒ کو دکن	عورتوں کی بیعت کے متعلق شاہ صاحب کی ہدایات

۵۱ شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ نے ایک شخص محمد مرزا یار بیگ کو خلافت دی۔ شاہ صاحبؒ نے خط لکھا:۔

"محمد مرزا یار بیگ را خلافت دادید۔ خوب کردید۔ بیت

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس

کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس" م ۶ ص ۱۲

ان کی اہلیت کے متعلق اس طرح رائے قائم کی تھی۔

"از رقعہ ایشاں کہ بفقیر نوشتہ بودند، معنیٔ عشق می تخت"

م ۶ ص ۱۲

۵۲ مکتوبات میں جگہ جگہ اس کا اصرار ہے۔ م ۴۴ ص ۴۳، م ۴۹ ص ۵۶ م ۵۲ ص ۵۸

م ۹۴ ص ۷۴

میں جو صورتِ حال پیش آتی تھی اس کے متعلق وہ اپنے پیر و مرشد سے ہدایت و مشورہ طلب کرتے تھے، چنانچہ جب عورتوں کو سلسلہ میں داخل کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا تو شیخ نظام الدین رح نے اپنے شیخ کو لکھا۔ جواب میں حکم ہوا کہ بیعت کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی خلوت سے بچا جائے اور براہِ راست ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت نہ کیا جائے۔ چونکہ مسِ اجنبیہ حرام ہے :-

"برادرمن زناں را بیعت کنید اما بازناں جواناں خلوتہائے طویلہ کہ موجب فتنہ مردم بشود نکنند او در صحبت اولیٰ وقت بیعت دامنے بر دست پیچیدہ دست بر دست او دارند کہ مس اجنبیہ حرام است"

م ۲۱ ص ۲۵

اس مشروط اجازت نامہ کی رو سے شاہ صاحب رح نے عورتوں کو بھی اصلاحِ باطن سے محروم نہ رکھا۔ لیکن شیخ نظام الدین نے اس کے بعد بھی عورتوں کو داخل سلسلہ کرنے میں تامل کیا اس پر آپ نے لکھا :-

"شما در بیعت کردن با عورات چرا ابا می ورزید، اگر جوان اند و اگر پیر، اگر حسین اند اگر قبیح، ہمارا بجائے محرمات پنداشتہ کلمۂ حق بگوش ایشاں باید رسانید" م ۳۵ ص ۴۷۔	تم نے عورتوں کو بیعت کرنے میں کیوں تامل کیا۔ چاہے جوان ہوں یا بوڑھی، خوب صورت ہوں یا بدشکل سب کو محرمات سمجھ کر ان کے کانوں میں کلمۂ حق پہنچانا چاہیئے۔

اتباعِ شریعت کی تلقین | حضرت شاہ کلیم اللہ رح روحانی ترقی کے لئے اتباعِ شریعت کو ازبس ضروری تصور کرتے تھے۔ اُن کا عقیدۂ راسخ یہ تھا کہ شریعت سے ہٹ کر روحانی ترقی کے لئے جو کوشش کی جائے گی وہ نقش بر آب ثابت ہوگی چنانچہ جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

(۱) "بر نہج شریعت باید رفت" — راہِ شریعت پر چلنا چاہیئے۔

م ۹۵ ص ۲۷

(۲) "ہمہ داخلانِ طریقت را تاکید نمایند کہ ظاہر شریعت آراستہ دارند و باطن بعشق مولے پیراستہ سازند" م ۱۲۹ ص ۹۵ — سب داخلانِ طریقت کو تاکید کرنی چاہیئے کہ ظاہر کو شریعت سے آراستہ رکھیں اور اپنا باطن عشق مولےٰ سے پیراستہ۔

اُن کا عقیدہ تھا کہ جو شریعت پر نہیں چلتا وہ گمراہ ہے اور طریقت و حقیقت کے منازل کبھی طے نہ کر سکے گا۔ فرماتے ہیں :۔

"آنچہ در شریعت راسخ نیست، ناقص است بلکہ طریقت و حقیقت او معلوم کہ حقیقتے ندارد۔ مرد آں ست کہ جامع باشد میاں شریعت و طریقت و حقیقت"

م ۹۵ ص ۲۷

وہ شریعت کو معیار سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے کسی شخص کی روحانی بلندی اور پستی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ارشاد ہوتا ہے :۔

"اے برادر در تفاوتِ فقرا را اگر امروز خواہی کہ دریابی، بجانب شریعت او نگاہ کن کہ شریعت معیار است، عیار فقر بر شریعت روشن می گردد"

م ۹۵ ص ۲۷

فرماتے ہیں کہ اگر کسی شیخ کے دس صاحبِ کمال مرید ہوں اور ہر ایک اپنی علیحدہ وضع رکھتا ہو اور شیخ کو ہر ایک کے متعلق حسنِ ظن ہو اور عوام بھی اچھا سمجھتے ہوں اور تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ کون شخص قیامت کے دن سب سے افضل ہوگا تو یہ دیکھو کہ ان دس آدمیوں میں سے کون شریعت کے ساتھ آراستہ ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو قیامت ک

یہی شخص سب سے بلند مرتبہ ہوگا۔

شریعت، طریقت اور حقیقت کا باہمی تعلق اس طرح بیان فرماتے ہیں :-

"مینار حقیقت طریقت است، و مینار طریقت شریعت، آنکہ در چشم او جمالِ شریعت بیش بود طریقت وحقیقت اتم واکمل بود، علامت وصول بدرجۂ حقیقت این است کہ روز بروز آناً فاناً سالک را در شریعت قدم راسخ گردد" م ۱۱۰ ص ۸۵

آگے چل کر وہ ان صوفیۂ خام کی مذمت کرتے ہیں جنھوں نے شریعت کو ترک کر دیا تھا اور فرماتے ہیں :-

ایں ملحدان کہ شریعت را از دست دادہ کلام لاطائل ملحدانہ بسبب گدائی در لقمۂ چرب نمودہ بہ متشرعان طعنۂ بے حقیقتی میزنند، تعزیر کردنی اند کہ ہمہ توحید ایشاں بے معنی است و بے لطفی قالی است بے حال زنہار در صحبت ہم چنیں حمقا نخواہند نشست"[1] م ۱۱۰ ص ۸۵	یہ ملحد جنھوں نے شریعت کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے اور ملحدانہ باتیں لقمۂ چرب حاصل کرنے کے لئے بکتے ہیں اور متشرع لوگوں کو بے حقیقتی کا طعنہ دیتے ہیں، سزا کے قابل ہیں۔ اُن کی توحید سب بے معنی ہے۔ وہ حال سے خالی ہیں۔ ایسے احمقوں کی صحبت میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔

[1] شاہ کلیم اللہ صاحب رح کے بعد اس ہی قسم کے گمراہ کن صوفیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب یہ لکھنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

وصیت دیگر آں نست کہ دست در دستِ مشائخ ایں زماں ہرگز نباید داد و بیعت ایشاں نباید کرد" وصیت نامہ ص ۳

امیروں کی اصلاح شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کی خانقاہ میں جب دولت مندوں کا ہجوم بڑھا تو ان کو اس سے تکلیف ہوئی اور اس ماحول سے دل برداشتگی اور تنگی کا اظہار کیا، شاہ کلیم اللہ صاحب رح کو معلوم ہوا تو لکھا کہ ان لوگوں کو بھی نظر انداز نہ کرو، احیاءِ ملّت اور ترویج سلسلہ کے لئے جب کوشش کی جائیں تو سوسائٹی کے کسی حصے کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ دولت مندوں کو متاثر کرنا بعض دیگر مصلحتوں کی بنا پر بھی ضروری ہے، لکھتے ہیں :۔

"مقصود از دخول اہل دول نہ آں است کہ ایشاں طے مراتب درویشی کنند...... مقصود آں است کہ بہ سبب دخول ایں مردم اکثر مردم دیگر داخل می شوند[۵]، و در نظر عوام دخول ایں مردم اعتبار تمام دارد۔" م ۶ ص ۱۲	اہل دول کے سلسلہ میں داخل ہونے سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ درویشی کے مراتب و درجات طے کریں ..... بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے شامل ہونے سے بہت سے اور لوگ سلسلہ میں داخل ہو جائیں گے چونکہ عوام کی نظر میں ان لوگوں کا سلسلہ میں شامل ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے۔

پیر و مرشد کی اس ہدایت کے بعد شیخ نظام الدین نے دولت مندوں سے زیادہ پرہیز نہ کیا بلکہ ان کی اصلاح کی طرف بھی متوجہ ہو گئے۔ جب نتیجہ کوششوں کے برابر نہ پایا تو آزردہ خاطر ہوئے اور مایوس ہو کر شیخ کو لکھا کہ میں دولت مندوں

---

[۵] ایک دوسرے مکتوب میں دولت مندوں کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"اینہا آلۂ رجوعِ خاص و عوام اند"

م ۱۸ ص ۲۲

کی صحبت سے تنگ آگیا ہوں۔ میری کوششیں بارآور نہیں ہوتیں۔ شاہ صاحب نے سمجھایا کہ ان دولت مندوں سے زیادہ اُمیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہئیں اُن کو فقیر یا درویش نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک مکتوب میں ارشاد ہوتا ہے :۔

بہ یقین شناسید کہ دولت منداں	اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ
ہرگز در ہیچ عصرے مرید یا ہیچ	دولت مند کسی زمانے میں بھی کسی شیخ
شیخ نشدہ اند، اگر شدہ دولت مند	کے مُرید نہیں ہوئے ہیں اگر ہوئے
نہ ماندہ، ہمہ را گذاشتہ لنگ	ہیں تو دولت مند نہیں رہے بلکہ
بستہ اند	سب کچھ چھوڑ کر لنگوٹہ باندھ
	لیا ہے

م ۷، ص ۳۰

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کو ذکر و اشغال سے کیا تعلق یہ تو صرف منصب و وجاہت کے لئے تعویذ گنڈے کی فکر میں رہتے ہیں

(م ۵۴ ص ۴۴)

شاہ صاحب رحؒ نے اپنے مریدوں کو، بادشاہوں، امرار اور رؤسا سے ارتباط کی نوعیت سے بھی خبردار کرنا مناسب سمجھا، لکھا کہ مقصد یہ نہیں کہ تم اُن سے بے حد تعلقات پیدا کرلو، ایسا کرنے سے کام میں خلل واقع ہوتا ہے اور روحانی ترقی میں رُکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ شناسائی کا انداز یہ ہونا چاہیے کہ اگر خط لکھنا ہو تو حضرت بابا فرید گنج شکر رحؒ کی طرح کہ بلبن کو ایک شخص کی سفارش لکھتے ہیں :۔

"میں نے اس شخص کا احوال اول خدا کی طرف پیش کیا ہے، پھر تیری طرف، اگر تو اُسے کچھ عنایت کرے گا تو حقیقت میں دینے والا خدا ہے اور تو مشکور اور، اگر کچھ نہ دے گا تو حقیقت میں باز رکھنے والا خدا

ہے اور تو معذور "

لق، خوشامد اور دربارداری فطرتِ درویش کے خلاف ہے۔ ارشاد ہے:-

"ملاقاتِ سلاطین کہ بر درِ درویش آیند روا باشد اما بر در آنہا نباید رفت م ۴۴ ص ۴۳

"بر درِ ملوک نباید رفت و آیندہ ہر قسم کہ باشد او را منع از آمدن نباید کرد" م ۵۷ ص ۶۰

درویش را باید کہ اختلاطِ بپادشاہان ننماید و بخانہ اہل دول طواف ننماید کہ اختلاط ملوک رونقِ ایمان می برد"[۵۱] م ۶۵ ص ۵۵

ع | شاہ کلیم اللہ صاحب رح کو اپنے زمانے کی جن گمراہیوں کے خلاف آواز نی پڑی تھی ان میں ایک سماع بھی تھا۔ مشایخ سلسلہ چشت نے اس کو نی غذا سے تعبیر کیا تھا، لیکن ساتھ ساتھ اس کے سخت اصول بھی مقرر کر دئے جن کے بغیر وہ سماع کو قطعی ناجائز سمجھتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں ان اصولوں بے اعتنائی عام تھی، اور شاید ہی کوئی شیخ ایسا ہو جو اُن کی پوری طرح ری کرتا ہو، چنانچہ شاہ کلیم اللہ صاحب فرماتے ہیں

امروز قدر راگ مشایخ نمی شناسند آج کل مشایخ سماع کی اہمیت

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ اللہ صاحب رح لکھتے ہیں :-

" در بعض ملفوظات بزرگان چشتیہ مذکور ہست کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد نام او را از دیوان حق سبحانہ، برمی آرند " ص ۶۹

دآداب را رعایت نمی کنند — نہیں سمجھتے ہیں، اور اس کے قواعد
م ۱۰۵ ص ۹۳ — کی پابندی نہیں کرتے ہیں۔

چنانچہ وہ اس کو "ہائے ہوئے سماع" کہتے ہیں اور جگہ جگہ اس کو کم کرنے کی تلقین فرماتے ہیں:۔

"اے برادر! کثرتِ سماع — اے بھائی! سماع کی کثرت کو
ہم خوب ندارم بلکہ تعین ہر روز — میں اچھا نہیں سمجھتا بلکہ ہر روز بھی
ہم نیامدہ — اس کا تعین (مشایخ متقدمین کی)
م ۷ ص ۱۴ — روایت نہیں ہے

وہ ہدایت کرتے تھے کہ سماع کی بجائے مراقبہ میں وقت صرف کیا جائے۔

"حلقہ مراقبہ وسیع از حلقۂ سماع — مراقبہ کا حلقہ سماع کے حلقہ سے
باید کرد" م ۹۹ ص ۸۷ — زیادہ وسیع کرنا چاہیے۔

اکثر مکتوبات میں (م ۱۳، م ۹۷، م ۱۰۳، م ۱۲) مراقبہ ہی کی ہدایت ہے وہ زمانے کی حالت کو دیکھ رہے تھے اس لئے ڈرتے تھے کہ کہیں سماع کی شکل مسخ ہو کر نہ رہ جائے۔ فی نفسہ وہ اس کے مخالف نہیں تھے لیکن حالات نے ان کو اس معاملے میں سخت گیر بنا دیا تھا۔ وہ خود سب اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔ لہذا مریدوں کو بھی ہدایت تھی کہ:۔

"مجلس سماع بطور ما کنند" — محفل سماع ہماری طرح سے
م ۹۴ ص ۴۷ — کریں۔

یہ زمانہ تھا کہ جب مشایخ سرہند کے اثرات بہت زیادہ پھیل گئے تھے۔ بادشاہوں پر اُن کا اثر تھا، اور وہ ان کی رائے کی عزت کرتے تھے۔ شاہ صاحب رح نے اس خیال سے کہ کہیں کوئی ناگوار صورت پیدا نہ ہو، اس امر کی کوشش کی کہ جہاں مشایخ

نقش بند کا اثر ہو وہاں سماع کو بند رکھا جائے۔ ایک مرتبہ جب کہ بادشاہ دکن میں تھا، مشایخ سر ہند حج سے واپسی پر اس کے پاس پہنچے۔ شیخ کلیم اللہ دہلوی کو معلوم ہوا تو مرید کو خط لکھا کہ اس زمانے میں مجلس سماع کو موقوف رکھنا۔ بادشاہ کے ساتھ علمار سرہند ہیں کہیں:۔

"ہیجان مخالفاں نشود"

م ۹۴ ص ۷۴

وصال | آخر عمر میں شاہ صاحب کو نقرس اور وجع المفاصل کے امراض لاحق ہو گئے تھے۔ ایک خط میں جو تقریباً ۸۰، ۷۹ سال کی عمر[۵۱] میں لکھا گیا ہے فرماتے ہیں:

"آزار نقرس و وجع المفاصل بافراط شدہ، کہ دست چپ و زانوئے پائے راست شہر دہ پا آماسیدہ اندو چہار ماہ است کہ صاحب فراشم، دریں روز لنگ لنگاں[۵۲] بہ استعانت چندے از اندروں بہ خانہ می توانم رفت نماز

نقرس اور گٹھیا کا مرض نہایت شدت سے ہو گیا ہے، بایاں ہاتھ اور داہنی ٹانگ اور دونوں پاؤں پر ورم ہو گیا ہے۔ چار مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ اس زمانے میں لنگڑاتا لنگڑاتا چند آدمیوں کی مدد سے اندر سے مکان جاتا ہوں، نماز تیمم سے اور

---

۵۱ اسی مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"امروز نہم جمادی الثانی است، سال عمر ہفتاد و ہشت ہست چہاردہ یا پانزدہ روز باقی است کہ شروع سال نہم خواہد شد" م ۱۲۵ ص ۹۳

شاہ صاحب نے ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

۵۲ فخر الطالبین اور مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ ٹانگ میں درد (بقیہ صفحہ ۴۲۰)

به تیمم نشسته می خوانم	بیٹھ کر پڑھتا ہوں

م ۱۲۵ ص ۹۳

لیکن ان تکالیف کے باوجود وہ اعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہے۔ جامع مکتوبات کلیمی نے لکھا ہے:-

"در ہدایت خلق اللہ و اعلائے کلمۃ اللہ تا دمِ واپسیں کوشش بلیغ بکار بردند"[۵۱]	خلقت کی ہدایت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے آخری سانس تک کوشش کرتے رہے

بیماری کی حالت میں شیخ نظام الدین اورنگ آبادی رح کو خطوط لکھتے تھے اور ضروری ہدایات دیتے تھے۔

شاہ صاحب رح نے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۷۲۹ء کو وصال فرمایا[۵۲]۔ انتقال کے وقت یہ بیت زبان پر تھی

(نوٹ بقیہ ص ۴۱۹) یاماس کی شکایت بزرگانِ چشت کی ایک پرانی خصوصیت ہی۔ خواجہ نور محمد فرماتے ہیں

"ازار نقرس یعنی ازار مفصل ابہام پائے و درد زانو موروثی پیرانِ ماست یعنی مولانا صاحب و شیخ صاحب و شیخ کلیم اللہ و شیخ یحیٰی مدنی ایں ہمہ بزرگاں ایں مرض می داشتند"۔ مناقب المحبوبین۔ ص ۹۶ - ۹۵

مولوی محمد عمر نے لکھا ہے کہ شاہ نور محمد صاحب کو یہ مرض تھا۔ حاجی نجم الدین صاحب کا بیان ہے کہ حضرت شاہ سلیمان رح کو بھی یہ ہی شکایت تھی (مناقب المحبوبین ص ۹۶) قاضی محمد عاقل صاحب کی ایک ٹانگ میں درد رہتا تھا (تکملہ سیر الاولیا ص ۱۳۸)

۵۱ مکتوبات کلیمی ص ۲

۵۲ آزاد بلگرامی (ماثر الکرام) نے سنہ وفات ۱۱۴۲ھ لکھا ہی شجرۃ الانوار، خزینۃ الاصفیا، دیباچہ مکتوبات کلیمی میں ۱۱۴۲ھ ہے، اور یہ ہی صحیح ہے۔ حدائق الحنفیہ میں ۱۱۴۰ھ لکھا ہی جو قطعاً غلط ہی (ص ۴۲۹)

غبار خاطرِ عشاق مدعا طلبی است
بخلوتے کہ منم یاد دوست بے اوبیست [۱]

اپنی مسکونہ حویلی میں جو قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان واقع تھی، سپردِ خاک کئے گئے [۲]
اُن کے ایک مرید نے تاریخ وفات لکھی ہے ؎

کلیم اللہ عارف صاف بودہ
باقلیم بقا شوقش ربودہ
پرسیدم چو تاریخ وفاتش
خرد گفتا کہ ذاتِ پاک بودہ [۳]

۱۱۴۲ھ

شاہ صاحبؒ کے مزار کے گرد ان کے خاندان کے افراد آباد تھے ۱۸۵۷ء تک
یہ علاقہ بہت آباد اور بارونق تھا۔ غدر میں یہ آبادی تباہ و برباد ہوئی۔ مناقب المحبوبین
میں لکھا ہے:-

در سال غدر چوں نصاریٰ بر اہل	غدر میں جب نصاریٰ نے مسلمانوں
اسلام دہلی فتح یافتند مکانہائے	پر فتح پائی تو لال قلعہ کے قریب
کہ قریب لعل قلعہ بودند ہمہ را	کے مکانات منہدم کر دئے۔
منہدم کردند" [۴]	

---

[۱] مناقب المحبوبین ص ۵۴

[۲] آزاد بلگرامی نے لکھا ہے: "در حویلی سکونت خود مدفون گردید" ص ۳۴

[۳] شجرۃ الانوار (قلمی)

[۴] مناقب المحبوبین - ص ۵۴

غالب ایک خط میں سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں :۔

"شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا، ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی، اُن کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے، اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔"[۵۱]

شاہ صاحب رح کی خانقاہ بھی اسی ہنگامہ میں منہدم کر دی گئی۔ میاں نظام الدین نبیرۂ حضرت شاہ فخر الدین رح نے غدر کے بعد مولانا نجم الدین کو بتایا تھا کہ

"من اجازت از انگریز گرفتہ ام	میں نے انگریز سے اجازت لی ہے۔
احاطہ برگرد مزار شریف الیشاں	ان کے مزار شریف کے گرد
تیار خواہم کرد"[۵۲]	احاطہ بنوا دوں گا۔

اولاد | شاہ صاحب رح کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں[۵۳]۔ لڑکوں کے نام خواجہ محمد حامد سعید، محمد فضل اللہ، محمد احسان اللہ تھے۔ لڑکیوں کے نام تھے بی بی رابعہ، بی بی فخر النسا، زینب بی بی۔ خواجہ محمد کا انتقال، شاہ صاحب رح کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، ان کی وفات پر شاہ صاحب نے ایک نہایت پُر درد خط لکھا تھا[۵۴] باقی اولاد کے متعلق ایک خط میں خود لکھتے ہیں[۵۵] :۔

---

۵۱ اُردوئے معلیٰ۔ حصہ اول ص ۱۸۲ - ۱۸۳

۵۲ مناقب المحبوبین ص ۴۵

۵۳ مناقب المحبوبین میں پانچ لڑکیاں بتائی ہیں، چوتھی اور پانچویں کا نام نہیں لکھا ایک کے متعلق لکھا ہے کہ بی بی رابعہ کے انتقال کے بعد محمد ہاشم صاحب سے ان کا نکاح ہو گیا تھا۔

(۵۴، ۵۵ صفحہ ۴۲۳ پر)

"سہ فرزند و سہ دختر موجود اند،	تین بیٹے اور تین بیٹیاں موجود ہیں
حامد بہ کتب سلوک مشغول است	حامد کتب سلوک کے مطالعہ میں
محمد فضل اللہ دہ سالہ دوازدہ	مشغول ہے۔ محمد فضل اللہ دس سال
سیپارہ قرآن حفظ کردہ،	کا ہے۔ ۱۲ پارے کلام پاک کے حفظ
محمد احسان اللہ پنج سالہ بمکتب	کر لئے ہیں۔ محمد احسان اللہ پانچ
شدہ بخواندن ابجد مشغول است	سال کا ہے۔ مکتب میں ابجد پڑھتا
اما سہ دختر، یکے بخانہ محمد ہاشم	ہے۔ لڑکیوں کا یہ ہے کہ ایک
دادیم، بی بی رابعہ[۵۵] نام دارد، و	محمد ہاشم کے نکاح میں ہے۔ بی بی
دیگر بی بی فخر النسا برادر زادہ[۵۶]	رابعہ اس کا نام ہے دوسری بی بی
خود دادیم، سیوم زینب بی بی	فخر النساء برادر زادہ کے نکاح میں
مشہور بہ بی بی مصری چہاردہ سالہ	دیدی ہے۔ تیسری لڑکی زینب بی بی
است تا حال جائے منسوب	جو بی بی مصری کے نام سے مشہور
نشدہ"	ہے۔ ۱۴ سال کی ہے، ابھی کہیں ان
م ۱۲۵ ص ۹۳	کی نسبت نہیں ہوئی ہے۔

(بقیہ نوٹ ص ۴۶۲) ۵۳ مکتوب ۴۱ ص ۴۰۔

۵۴ یہ خط شاہ صاحب رح نے تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں لکھا ہوگا۔ ایک مکتوب میں (م ۱۲۲) میں لکھا ہے کہ احسان اللہ ۵، ۷ سال کی عمر میں عطا ہوئے تھے۔ اس خط میں اُن کی عمر ۵ سال بتائی گئی ہے۔

۵۵ ایک مکتوب میں اُن کا نام بی بی شرف النساء لکھتے ہیں (م ۷۵ ص ۵۰)

۵۶ مناقب المحبوبین میں ان کا نام شیخ عبدالرحیم لکھا ہے (ص ۱۴)

شیخ محمد ہاشم ایک مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا حال شاہ صاحب رح نے خود ایک مکتوب میں لکھا ہے[51]۔ اُن کے والد شاہ حسن دکن میں رہتے تھے۔ شیخ عبداللطیف دولت منذانی (کہ بادشاہ بایشاں اخلاص داشت" م ۵۷) کے وہ مرید تھے، اور اُن ہی کے حکم کے مطابق الٰہ آباد آکر آباد ہوگئے تھے، محمد ہاشم الٰہ آباد سے دہلی تحصیل علم کے لئے آگئے تھے۔ شاہ صاحب رح نے اپنی بڑی لڑکی اُن کے نکاح میں دے دی تھی۔

"چوں بسیار صالح و فقیر و فقیر زادہ بود ایں عقار منعقد شد"	چونکہ بے حد صالح، فقیر اور فقیر زادہ تھے۔ اس لئے یہ رشتہ کرلیا گیا۔
م ۷، ۵ ص ۵۱-۵۰	

شاہ صاحب رح کی چھوٹی صاحبزادی بی بی مصری کے متعلق جامعِ مکتوبات نے لکھا ہے:-

"حضرت ایشاں بایشاں بسیار نظر التفات می داشتند، و تا حال فیضے کہ باولاد ایں معصومہ و عفیفۂ روزگار است بدیگراں دیدہ نمی شود"[52]

بی بی مصری کی شادی شاہ میر سے ہوئی تھی[53]

خلفاء حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی رح کے خلفاء کی تعداد کثیر تھی۔ لیکن اُن کے خلفاء کی مکمل فہرست اور حالات دستیاب نہیں ہوتے، مختلف تذکروں میں جن

---

[51] مکتوبات کلیمی۔ م ۵۷، ص ۵۱-۵۰

[52] مکتوبات کلیمی۔ ص ۳

[53] مناقب المحبوبین ص ۶۴

خلفاء کے اسماء گرامی ملتے ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) شاہ محمد ہاشمؒ
(۲) مولانا شاہ ضیاء الدینؒ
(۳) مولانا شاہ جمال الدین جے پوریؒ
(۴) مولانا شاہ جلال الدینؒ
(۵) مولانا شاہ محمد علیؒ
(۶) مولانا شاہ عبد اللطیفؒ
(۷) مولانا حافظ محمد عبد اللہؒ
(۸) مولانا عبد الصمدؒ
(۹) مخدوم شیخ تھاروؒ
(۱۰) شیخ بدیع الدین عرف شیخ مداری ناگوریؒ (قبر سنگھانہ)
(۱۱) خواجہ مصطفےٰ مراد آبادیؒ
(۱۲) سید محمد علیؒ
(۱۳) شیخ بدہنؒ
(۱۴) حافظ محمودؒ
(۱۵) حافظ سعید پسر شاہ صاحبؒ
(۱۶) شاہ اسد اللہؒ
(۱۷) قاضی عبد الوائیؒ سکنہ بلدہ سنگھانہ
(۱۸) شاہ جلیل قادریؒ

خواجہ مصطفےٰ مراد آبادی | خواجہ صاحب، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی اولاد سے تھے۔ لاہور کے ایک دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے تھے

جوانی ہی میں دنیا سے دل سرد ہو گیا تھا اور شاہ کلیم اللہ رح کے دست حق پرست پر بیعت ہو گئے تھے ۔ بسنہ ۱۱۵۵ھ کو بمقام مراد آباد وصال فرمایا اور اپنی بنائی ہوئی مسجد (مغل پورہ) کے صحن میں سپردِ خاک کئے گئے ۔ ان کے بعد شیخ عبدالرحیم اُن کے سجادہ پر بیٹھے ۔ اُنھوں نے "زہد، قناعت رضا اور تسلیم" میں اپنی زندگی گزار دی کبھی کسی سے وظیفہ قبول نہ کیا ۔ مثنوی مولانا روم سے خاص دلچسپی تھی ۔ ان کا مزار بھی خواجہ صاحب کے مزار کے برابر ہے ۔[۱]

---

[۱] انوار العارفین ص ۳۰۴ ـ ۵۵۱

باب دوم

حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ

شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ، شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کے عزیز ترین مرید اور خلیفہ تھے اور ان ہی کی ہدایت کے ماتحت دکن چلے گئے تھے جہاں انھوں نے نظامیہ سلسلہ کی شاندار خانقاہ قایم کی تھی۔ امیر و غریب، جاہل و عالم سب ہی پروانوں کی طرح اُن کے گرد جمع ہوتے تھے۔ حضرت سید محمد گیسو درازؒ کے بعد سرزمین دکن پر چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے کسی اتنے جلیل القدر بزرگ نے قدم نہیں رکھا تھا، احسن الشمائل کے مصنف کا خیال ہے کہ

"چنیں فیضے کہ از ذات بابرکات حضرت صاحب مدظلہٗ بعالمے رسید ومی رسد شاید از بزرگاں سلف بوقوع آمدہ باشد و بالفعل ایں امر درایں عصر منحصر بذات فایض البرکات است"

وہ تاریخ ہند کے ایک نہایت ہی بحرانی دور میں دکن گئے تھے۔ اورنگ زیب مرہٹوں سے آخری اور فیصلہ کن معرکوں میں مصروف تھا۔ مغلیہ سلطنت اپنی شان و شوکت، اقبال و اقتدار کا دور ختم کر رہی تھی۔ باغیانہ قوتیں اُبھر رہی تھیں

اور ایوانِ شاہی میں زلزلے محسوس ہو رہے تھے۔ ہر طرف ہراس و پریشانی کا عالم تھا۔ ایسے ہوش رُبا دور میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کرنا آسان کام نہ تھا چنانچہ قدرت نے جس شخص کو اس کام کے لئے منتخب کیا وہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔

شاہ نظام الدین صاحبؒ نے دکن میں پہنچ کر ارشاد و تلقین کا ایسا ہنگامہ برپا کیا کہ سارا ملک اُن کی شعلہ نفسی سے گرم ہو گیا۔ ہزاروں انسانوں نے ان سے ہدایت پائی۔ معاصر تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ ان کے ایک لاکھ مرید تھے اور یہ سب ایسے تھے کہ ان کی اصلاح و تربیت میں کافی دماغ سوزی کی گئی ہے۔

ولادت و نسب | شاہ نظام الدین صاحبؒ کا سنہ ولادت کسی معاصر تذکرے یا ملفوظ میں درج نہیں ہے۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ انھوں نے ۸۲ سال کی عمر میں وصال فرمایا تھا[۵۱] اس بنیاد پر اگر اُن کی تاریخ پیدائش کا حساب لگایا جائے تو وہ ۱۰۸۰ھ ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کے ہم عمر تھے، اور اُن ہی کے ساتھ وصال فرمایا۔ لیکن شاہ صاحبؒ کے مکتوبات کے طرز سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ نظام الدینؒ اُن سے عمر میں کافی چھوٹے تھے۔ خاتم سلیمانی کے مصنف نے ان کا سنہ ولادت ۱۰۷۵ھ بتایا ہے[۵۲] لیکن خاتم سلیمانی معاصر تذکرہ نہیں ہے۔ اس لئے اس کے بیان پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

شیخ اورنگ آبادیؒ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے واسطے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے[۵۳] خواجہ محمد عاقل صاحبؒ

---

۵۱ مناقب المحبوبین۔ ص ۷۴

۵۲ خاتم سلیمانی۔ ص

۵۳ شجرۃ الانوار۔ (قلمی) مناقب فخریہ۔ ص ۵

کی سندِ حدیث میں جو سلسلہ درج ہے اس میں اُن کے صاحبزادے شاہ فخر الدین رح کو صدیقی بتایا گیا ہے۔[۵۱]

وطن | شاہ نظام الدین صاحب رح کے وطن کے متعلق کسی معاصر مصنف نے صراحتاً نہیں لکھا۔ مناقب فخریہ، شجرۃ الانوار، تکملہ سیر الاولیاء، خزینۃ الاصفیاء وغیرہ میں صرف اتنا لکھا ہے کہ ان کا وطن پورب میں تھا اور وہاں سے تکمیلِ علوم کے لئے دہلی چلے آئے تھے۔ سرسید نے آثار الصنادید میں ان کا وطن "ملکراؤں" مضافاتِ لکھنؤ سے ہے[۵۲] بتایا ہے کہ بعض شجروں میں اُن کا مقام ولادت "نگراؤں"[۵۳] درج ہے برکات الاولیاء میں ان کا وطن کاکوری لکھا ہے[۵۴] مناقب المحبوبین، انوار العارفین اور سلسلۃ الذہب میں کاکوری اور نگراؤں دونوں درج ہیں اور کسی ایک مقام کے متعلق فیصلہ نہیں کیا گیا۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے:۔

"وطن اصلی ایشاں در ضلع پورب در قصبہ کاکوری و نگراؤں متصل بلدہ لکھنؤ است[۵۵]

خواجہ حسن نظامی صاحب اور نواب مصلح الدین خاں کا خیال ہے کہ اُن کا وطن کاکوری تھا[۵۶]

---

۵۱ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۹۴ ۵۲ آثار الصنادید (باب چہارم) ص ۳۰

۵۳ شجرۂ چشتیہ سلیمانیہ فخریہ۔ مولانا غلام فرید خاں چشتی ص ۳۰ ۵۴ برکات الاولیا ص ۱۴۴

۵۵ مناقب المحبوبین ص ۷۴

۵۶ منادی مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۳۶ء میں نواب مصلح الدین صاحب کا بیان درج ہے خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنے ایک مکتوب (بنام مصنف) میں اسی خیال کی تائید کی ہے۔ نواب صاحب کے متعلق خواجہ صاحب نے لکھا ہے۔ "اُن کی معلومات احوال قدیم کی نسبت ایسی ہے کہ دہلی میں کوئی شخص ان کی برابر پرانی باتوں کو نہیں جانتا۔"

خواجہ محمد عاقلؒ کے سلسلۂ حدیث میں شاہ فخر صاحبؒ کی ولدیت اس طرح درج ہے:-

"ابن الشیخ نظام الدین الغوری ثم الاورنگ آبادی قدس اللہ سرہ"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصلی وطن غور تھا، اور وہاں سے وہ یا اُن کے اجداد ہندوستان تشریف لائے تھے۔

دہلی میں | حضرت شاہ نظام الدین صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ پھر تکمیل کے لئے دہلی آگئے۔ کہ دہلی اس وقت ہندوستان کا علمی وروحانی مرکز تھا۔ یہاں اُنھوں نے شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کا شہرہ سُنا۔ چنانچہ ایک دن اُن کی حویلی میں پہنچے۔ شاہ صاحب کے یہاں اس وقت محفلِ سماع منعقد ہو رہی تھی شاہ صاحبؒ کا دستور تھا کہ سماع کے وقت مکان کے دروازے بند کرادیتے تھے، اور پھر کسی ناآشنا شخص کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ شیخ نظام الدینؒ نے دروازے پر دستک دی۔ شاہ کلیم اللہ صاحب نے آواز سُن کر ایک مُرید کو اشارہ کیا کہ باہر جاکر دیکھے۔ مرید نے ایک غیر متعارف شخص کو دروازہ پر کھڑا دیکھا تو نام دریافت کیا۔ اور آکر شیخ سے عرض کی کہ ایک بیگانہ شخص، گدا صورت، نظام الدین نامی طالبِ ملاقات ہے۔ شیخ نے نام سنتے ہی فوراً حکم دیا کہ جلدی سے اس کو اندر لے آؤ۔ مریدوں کو یہ سُن کر حیرت ہوئی کہ شیخ نے کیوں خلافِ معمول ایک ناآشنا اور بیگانہ شخص کو سماع کے وقت اندر آنے کی اجازت دے دی۔ لیکن شیخ نے فوراً یہ کہہ کر اُن کی تسلی کر دی۔

---

[1] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۸۰

"ازیں شخص و نام نامیِ وے بوئے — اس شخص سے اور اس کے نام نامی سے
آشنائی می آید، غیر نسیت۔ — آشنائی کی بو آتی ہے، یہ غیر نہیں ہے۔"

اور شیخ نظام الدین رح سے نہایت خلوص اور محبت سے ملے۔ اور ان کی ظاہری تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ عرصہ تک شیخ نظام الدین صاحب رح شاہ صاحب رح کی خدمتِ بابرکت میں رہ کر علوم ظاہری حاصل کرتے رہے [۵]

بیعت اس زمانے میں دو واقعات ایسے پیش آئے کہ شیخ نظام الدین رح کی توجہ، علومِ ظاہری سے ہٹ کر علوم باطنی کی جانب ہوگئی وہ دراصل علومِ ظاہری کی تحصیل و تکمیل کے لئے حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب رح کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے لیکن شاہ صاحب رح علومِ ظاہری کے علاوہ علوم باطنی میں بھی یگانہ عصر تھے اور اس کی تعلیم و تربیت بھی بڑی محنت اور توجہ سے کرتے تھے، اس لئے اس نو وارد طالب علم کی طبیعت بھی اس طرف راغب ہوگئی۔

ایک دن حضرت شیخ یحییٰ مدنی کا ایک مرید شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نظام الدین اس وقت کسی کتاب کا سبق لے رہے تھے۔ اس مرید نے جب شاہ صاحب کو دیکھا تو مستی کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ

"از جوشِ دل مست و بے ہوش افتاد"

شیخ نظام الدین کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا اور شاہ کلیم اللہ صاحب رح سے

---

[۵] مناقب فخریہ۔ ص ۶ - ۵
خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اول ص ۴۹۶
تکملہ سیر الاولیاء ص ۹۴
شجرۃ الانوار۔ (قلمی)

سے اُن کی عقیدت اور ارادت میں اضافہ ہو گیا[۱] ایک دن شاہ کلیم اللہ صاحبؒ مجلس سے اُٹھے اور فرش کے کنارے تک پہنچے۔ شیخ نظام الدین نے بڑھ کر فوراً جوتے اُٹھائے اور صاف کر کر رکھ دئے۔ شاہ صاحبؒ کو شیخ نظام الدینؒ کی یہ ادا بہت پسند آئی، اور انتہائی محبت سے اُن کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"نظام الدین تو ہمارے پاس علوم ظاہری حاصل کرنے آیا ہے، یا فوائدِ باطنی کے لئے جو زیادہ بہتر اور اچھے ہیں"

شیخ نظام الدین نے فوراً جواب دیا ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

شاہ صاحبؒ کو یہ شعر سُن کر اپنے پیر شیخ یحییٰ مدنیؒ کی وہ پیشین گوئی یاد آ گئی جس میں اُنھوں نے فرمایا تھا کہ ایک شخص ایسے موقع پر یہ شعر پڑھے گا اور وہ ہماری نسبت کا مالک ہوگا۔ اس سے چشتیہ سلسلہ کو بے حد ترقی ہوگی[۲] شاہ صاحب سمجھ گئے کہ ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

---

[۱] شجرۃ الانوار میں لکھا ہے کہ اسی واقعہ کے بعد شاہ کلیم اللہ صاحبؒ سے اُنھوں نے وہ شعر کہہ دیا تھا اور بیعت ہو گئے تھے لیکن مناقب فخریہ، تکملہ سیر الاولیاء اور خزینۃ الاسرار میں لکھا ہے کہ دوسرے واقعہ کے بعد وہ مرید ہوئے

[۲] مناقب فخریہ۔ ص ۶، ۷
تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۹۵
خزینۃ الاصفیاء ص ۴۹۷ - ۴۹۶

اور اسی وقت اُن کو بیعت کر لیا۔

دکن کو روانگی | شاہ کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی روحانی تعلیم و تربیت خاص توجہ سے کی جب اس سے فارغ ہوئے تو اُن کو دکن جانے کا حکم دیا۔ اس زمانے میں دکن جہنم زار بنا ہوا تھا۔ مرہٹوں کی لوٹ مار، قتل و غارت گری، پھر مسلسل جنگ و جدل نے مدنی زندگی کی سب نعمتوں کو ختم کر دیا تھا۔ خوف و ہراس، افسردگی اور پریشانی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ سپہ سالار سے لے کر معمولی سپاہی تک ہندوستان کو واپس آنے کے لئے بے چین تھے۔ حد یہ ہے کہ ایک امیر نے شہنشاہ کو ایک لاکھ روپیہ صرف اس لئے پیش کئے کہ اس کو ایک سال تک دہلی رہنے کی اجازت دیدی جائے[۵] ایسے سخت اور نازک زمانے میں جبکہ جنوبی ہندوستان کے مسلمان خود شمال کی طرف رجوع ہو رہے تھے۔ شاہ کلیم اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عزیز ترین مرید اور خلیفہ کو دکن جانے کا حکم دیا۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"تم کو اللہ تعالےٰ نے دکن کی ولایت عطا فرمائی ہے تم یہ کام پورے طور پر انجام دو میں نے اس سے پہلے تم کو لکھا تھا کہ لشکر میں جاؤ۔ لیکن اب یہ حکم ہے کہ جہاں کہیں ہو اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں صرف کر دو۔"[۶]

دکن نظامیہ سلسلہ کے لئے کوئی نئی یا غیر متعارف جگہ نہیں تھی وہاں امیر حسن علاء سجزی جامع فوائد الفواد، شیخ برہان الدین غریب اور سید محمد گیسو دراز جیسے بزرگ آسودہ تھے۔ اور تاریخ کے ایک نازک دور ہی میں وہ بھی سلسلۂ نظامیہ کو دکن میں پھیلا

---

۵ ماثر الامرا۔ جلد اول ص ۷۵۴

۶ مکتوبات کلیمی۔ م ۲۱ ص ۲۶

چکے تھے۔ اِن بزرگوں نے دکن میں اس وقت کام کیا تھا۔ جب سلطنت دہلی کا زوال شروع ہو گیا تھا حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ نے دکن کو اپنی کوششوں کا مرکز اس وقت بنایا جب سلطنتِ مغلیہ پر نزع کا عالم طاری تھا۔

شاہ نظام الدینؒ لشکر شاہی میں | مکتوباتِ کلیمی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نظام الدین صاحبؒ لشکر شاہی کے ہمراہ دکن گئے تھے۔ اور کچھ عرصہ دکن میں اُن کی نقل و حرکت لشکر ہی کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اُن کے خطوط لشکریوں کے ذریعے آتے جاتے تھے، اور شاید اسی وجہ سے شاہ صاحبؒ نے ایک مکتوب میں تاکید کی تھی کہ وہ دکن کے حالات بڑی احتیاط سے لکھا کریں[1]

مکتوبات میں جگہ جگہ لشکر کا ذکر ملتا ہے مثلاً

(۱) "از ابتدائے آمدن شما در لشکر پادشاہی کہ تاریخ حال ہفت ہشت ماہ گذشتہ باشد دو کتابت رسیدہ"

م ۱، ص ۶

(۲) "در لشکرے کہ شما ہستید اکثر شنیدہ می شود کہ معتقداتِ رفض بغایت رائج است"

م ۷ ص ۱۳

(۳) "قبل ازیں می نوشتم کہ بر لشکر بر وید، اکنوں ایں امر است ہر جا کہ باشید در اعلائے کلمۃ الحق باشید"

م ۲۱، ص ۲۶

(۴) مکتوب شما از لشکر رسید"

م ۳۲ ص ۳۴

---

[1] مکتوباتِ کلیمی۔ م ۵۱ ص ۸۴

(۵) "بہر طریق بودن شما در لشکر موجب رحمت علی عباد اللہ است"

م ۳۳ ص ۳۵

(۶) "حکم آں است کہ در لشکر خدمت گاری طالب علمان حق نمائید و ایں سعادتِ خود شمارید و جہد کنید تا مردم بسیار از حضیض غفلت بزوایہ معرفت بہ طفیل شما رسند"

م ۶۰ ، ص ۵۲

چنانچہ شیخ نظام الدین صاحب رح نے اپنے پیر و مرشد کی ہدایت کے ماتحت عرصہ تک دکن کے لشکریوں میں تبلیغ و اصلاح کا کام کیا۔ اُن کی کوششیں بہت حد تک کامیاب ہوئیں۔ لشکر کے لوگ اُن کے گرویدہ ہو گئے۔ خود شاہ کلیم اللہ صاحب رح ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

دیگر معلوم شد کہ از لشکر دو جوان بسیار از وضع شما محظوظ بودند و تعظیمے از مذاق شمامی کردند، معلوم شد کہ کمال رُشد شناختہ اند۔" [۵۱]

مختلف مقامات پر قیام | دکن میں شاہ نظام الدین صاحب رح کا مختلف مقامات پر قیام رہا۔ ایک مکتوب میں شاہ کلیم اللہ رح فرماتے ہیں ؎

"خطے کہ بعد از سیر بیجا پور
۲ر شوال مرقوم بود رسید" [۵۲]

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں :۔

اللہ اللہ دریں روزہا در بُرہان پور خوبیہا است، وطن اختیار بکنید	اللہ اللہ اس زمانے میں بُرہان پور میں بڑی خوبیاں ہیں، اسی کو وطن

---

۵۱ مکتوبات کلیمی ص ۲۲

۵۲ مکتوبات کلیمی م ۵۴ ص ۴۴

برلب آب اگرچہ صحرا باشد انشاءاللہ آبادی ہم آں جا خواہد رفت ۔"	بنا ہو ، کسی دریا کے کنارے اگر صحرا بھی ہوگا تو انشاءاللہ وہاں آبادی آبادی چلی جائے گی ۔
م ۲۵ ص ۲۹	

برہان پور کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر شاہ کلیم اللہؒ کا خیال تھا کہ اسی کو وطن بنایا جائے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"برائے توطن شہر برہان پور در جمیع خوبیہا است ، خوب است ہم گذر مردم ہندوستان و ہم گذر مردم دکھن و ہم گذر حجاج بیت الحرام واکثر درویشاں دریں شہر بودند ، اما تکیہ برلب آب اختیار کنند واز نظام پورہ نام نہند ۔"	توطن کے لیے برہان پور میں بڑی خوبیاں ہیں ۔ وہاں سے شمالی ہندوستان کے لوگ گذرتے ہیں اور دکن کے لوگ بھی ، حاجی بھی اسی راہ سے جاتے ہیں بہت سے درویش اس شہر میں رہتے تھے ۔ لیکن تکیہ پانی کے قریب بنانا چاہیے اور اس کا نام نظام پورہ رکھنا چاہیے ۔
م ۶۱ ص ۵۳	

لیکن بقضائے الٰہی برہان پور مستقر نہ بن سکا ۔ شجرۃ الانوار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قیام کچھ عرصہ شولاپور بھی رہا تھا ۔ سب سے آخر میں اورنگ آباد پہنچے ۔ پیرو مرشد نے خط لکھا :

"خواجہ عبداللطیف نے لکھا تھا کہ شاہ نظام الدین جیو اورنگ آباد چلے گئے ہیں ۔ لیکن تمھارے خط نہ آنے سے تشویش ہے ۔ معلوم ہوا کہ ابھی جگہ مقرر نہیں ہوئی ہے ۔" [۵۷]

---

[۵۷] مکتوبات کلیمی ۔ م ۵۲ ص ۴۸

آخرکار اورنگ آباد ہی میں قیام فرمالیا اور سلسلہ کی نشر و اشاعت میں مشغول ہوگئے

قیام خانقاہ | جب اورنگ آباد میں شیخ نظام الدین نے قیام کا مستقل ارادہ کرلیا تو وہاں اپنے لئے ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی جو بہت جلد مرجع عوام و خواص بن گئی۔ ابتدائی زمانہ میں خلقت کا ہجوم دیکھ کر اُن کو تکلیف ہوئی۔ لیکن بعد کو مرشد کی ہدایت کے بموجب وہ لوگوں سے نہایت خوشی سے ملنے لگے۔ شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کی ہدایت تھی کہ ہر کس و ناکس کی طرف التفات کیا جائے لیکن

"از رجوعِ خلائق و کثرتِ مریداں خود را گم نہ خواہی کرد۔"

م ۱۰۰ ص ۷۹

حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی رحؒ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ حضرت اورنگ آبادیؒ کی خانقاہ کے دس دروازے تھے ہر در پر ایک کاتب بیٹھا رہتا تھا، جو حاجت مند آتا اس کی حاجت کو لکھ کر دے دیتا[ل۵] اس پر حضرت کی مہر لگادی جاتی تھی جس کا سجع تھا

"ذکر مولےٰ از ہمہ اولےٰ

اور ~ در رعایت دلہا بکوش

نظام دین بدنیا مفروش [۵۲]

حاجت مند یہ پرچہ جس امیر کے پاس لے جاتا وہ اس کی حاجت براری کو اپنے لئے سعادت دارین سمجھتا تھا۔ خانقاہ کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے

ل۵ نافع السالکین ص ۱۰۷

۵۲ فخر الطالبین۔ ص ۸۸

و تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۹۶

در جمیع احوال و افعال و اقوال موجب سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بجا می آورد و اصلا تجاوز و تفاوت از سنت نہ شنیدہ[1]	ہر کام اور ہر بات سنت نبوی ص کے مطابق کرتے تھے۔ کبھی کسی سنت سے ہٹ کر کوئی کام کرنا اُن کے متعلق نہیں سُنا گیا۔

نظام اوقات | فخر الطالبین میں ہے کہ حضرت نظام الدین صاحب رح کو ابتدائی زمانہ میں کتابوں سے بے حد دلچسپی تھی۔ اور اسی میں ان کا بیشتر وقت گزرتا، تھا، لیکن اورنگ آباد پہنچنے کے بعد غیر از شغل" کسی چیز سے تعلق نہ رہا[2] اور عبادت اور ریاضت ہی میں اُن کا سارا وقت صرف ہونے لگا۔ ذکر میں مشغولیت زیادہ رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے لئے ایک ایسا حجرہ بنوایا تھا جو زنانہ اور مردانہ مکان کے درمیان میں تھا، جب چاہتے اس کو زنانہ بنا لیتے۔ جب ضرورت ہوتی مردانہ کر دیتے۔

شیخ نظام الدین رح صبح کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد حجرے میں تشریف لے جاتے تھے اور دن نکلنے کے ۵، ۶ گھنٹے بعد تک یادِ حق میں مصروف رہتے تھے۔ اس وقت کوئی شخص ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ اشغال سے فراغت کے بعد حجرہ کا دروازہ کھول دیا جاتا تھا، اور ہر شخص جو زیارت سے مشرف ہونا چاہتا تھا اندر جا سکتا تھا۔ دوپہر کے بعد پھر خلوت ہو جاتی تھی۔ نماز ظہر سے فراغت کے بعد حجرہ کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ پھر عصر کی

---

[1] احسن الشمائل (قلمی)،
وتکملہ سیر الاولیا، ص ۱۰۲

[2] احسن الشمائل

نماز کے قریب حجرہ کا دروازہ کھلتا تھا، اور "یاراں و عزیزاں" سعادتِ قدمبوسی حاصل کرتے تھے۔ اسی وقت خواجہ نورالدین، مشکوۃ شریف یا کسی اور کتاب کی قرأت کرتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد احوالِ مشائخ سے متعلق کتابیں پڑھوا کر سُنتے تھے، اکثر یہ کام خواجہ کامگار خاں کے سپرد ہوتا تھا۔ ساری مجلس خاموشی سے سُنتی رہتی تھی۔ مغرب کے قریب خاموشی ہو جاتی تھی۔ حضرت شیخ نماز مغرب سے فارغ ہو کر حجرہ میں چلے جاتے تھے، اور اس وقت مخصوص لوگ حاضر ہو سکتے تھے[۵۱]

بحث و مباحثہ سے آپ کو نفرت تھی، اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو خود جواب دینے کے بجائے کسی کتاب کا حوالہ دے کر اسی کے مطالعہ کی ہدایت فرما دیتے تھے۔[۵۲]

کھانا کبھی تنہا نہیں کھاتے تھے۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہوتا تو مخلصوں کے گھروں پر کھانا بھجوانے کے بعد خود تناول فرماتے تھے[۵۳]

لباس | شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ لباس میں تکلف کو پسند نہیں فرماتے تھے، جو میسر آجاتا، پہن لیتے تھے۔ لکھا ہے:-

"ہر چہ میسر می شد از جامہ و پیراہن و سراویل می پوشیدند"[۵۴]

کپڑے مٹی کے رنگ میں رنگوا لیتے تھے۔ پیراہن میں اکثر پیوند ہوتے تھے۔ پیراہن

---

۵۱ احسن الشمائل

۵۲ احسن الشمائل (قلمی)

۵۳ احسن الشمائل (قلمی)

۵۴ احسن الشمائل۔ نیز شجرۃ الانوار، و تکملہ سیر الاولیا، ص ۹۹۔

دو روپے آٹھ آنے، تین روپے میں تیار ہوتا تھا۔ بیش قیمت کپڑا کبھی زیب تن نہ فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ جاڑوں کے موسم میں خواجہ کامگار خاں نے کچھ شال وغیرہ خدمت میں پیش کئے تو یہ کہہ کر واپس کر دئے کہ ہمیں ایسے لباس سے رغبت نہیں ہے[۵۱]

جب جمعہ کی نماز کو یا کہیں اور تشریف لے جاتے تھے تو جامہ اور دستار پہنتے تھے۔ گھر میں کلاہ اور اس پر دستارچہ باندھتے تھے[۵۲] نماز جمعہ کے لئے اکثر پیدل جاتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی سے گھوڑا منگا لیتے۔ لیکن خود اپنے پاس گھوڑا یا پالکی کبھی نہیں رکھی۔ اکثر ایسا ہوا کہ مریدین نے غلام بچے خدمت کے لئے پیش کئے۔ لیکن آپ نے مریدوں کو عنایت فرما دئے[۵۳]

مرشد کی نظر میں | حضرت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ اپنے خلیفہ کی سعادت مندی اور تبلیغی جدوجہد سے بے حد متاثر اور خوش تھے۔ ایک مرتبہ شیخ نظام الدینؒ کو شبہ ہوا کہ شاید کسی نے شاہ صاحبؒ کو اُن کی بُرائی لکھ کر بھیجی ہے شاہ صاحبؒ نے لکھا:۔

"باللہ و اللہ کہ در حق شما کسے چیزے	خدا کی قسم کسی نے تمھارے متعلق
اکنوں نمی نویسد و بر تقدیرے	کوئی بات نہیں لکھی اور اگر کوئی
اگر نویسد باللہ و اللہ کہ اثر ندارد	لکھے گا بھی تو واللہ اس کا اثر نہ
ونخواہد داشت" م ۶۴ ص ۸۴	ہو گا۔

۵۱ احسن الشمائل ۔ تکملہ سیر الاولیاء ۔ ص ۹۹

۵۲ فخر الطالبین ۔ ص ۹۷

۵۳ احسن الشمائل

ایک مرتبہ شیخ اورنگ آبادیؒ نے پیر کو ایک کتاب بھیجی۔ جواب میں ارشاد ہوا۔

"کتاب شما رسید انچہ درباب ارسال ہدیہ مرقوم بود آں را سعادت خود دانستہ در روز قیامت ہمیں قدر شفیع من بس است کہ ایں ہمہ لطف بر فقیر فرمودہ"

م ۱۸ ص ۲۲

شاہ صاحبؒ نے جس طرح مکتوبات میں اُن کو مخاطب کیا ہے، اس سے اُن کے جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک جگہ بے اختیار اس طرح خطاب کرتے ہیں:۔

"اے برادر، اے جان جہاں، اے تمام ایمان و جان من"

م ۵۸ ص ۵۱

ایک مکتوب میں نہایت حسرت بھرے انداز میں لکھتے ہیں:۔

"فقیر را باشما بسیار خصوصیت است۔ شما چرا نامہرباں می دانید اگر من بر شما مہربان نباشم، در دنیا کدام نور دیدہ دارم کہ برو مہربان خواہم بود" م ۹۵ ص ۷۲

فقیر کو تم سے بڑی خصوصیت ہے تم نے کس طرح مجھے نامہرباں سمجھا۔ اگر میں تم پر مہربان نہ ہوں گا تو دنیا میں میرا کون سا ایسا نور دیدہ ہے کہ اس پر مہربان ہوں گا۔

مریدوں کی روحانی تربیت مریدوں کی اصلاح و تربیت کے سلسلے میں اُن کے بنیادی اصول شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کی تعلیمات و ہدایات پر مبنی تھے، ان ہی کی روشنی میں انھوں نے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کا سارا پروگرام مرتب کیا تھا، کہا کرتے تھے کہ تخلیقِ انسانی کا مقصد عبادت ہے۔ اور اس کے سوا کچھ نہیں کہتے ہیں۔

"در کلام اللہ وارد است مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ

قرآن پاک میں ہے کہ ہم نے جن اور انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا پس سب

پس برہمہ لازم کہ دریں کار سعی بلیغ نمایند" ۵۱ | پر لازم ہے کہ اس کام میں پوری پوری کوشش کریں۔

عبادت، اشغال و اوراد کے بارے میں نہایت سختی سے کام لیتے تھے۔ رات میں اور دن میں ہر وقت مریدوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ آدھی رات کو مریدوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ جس کو سوتا ہوا پاتے تھے اس پر پانی ڈال کر جگا دیتے تھے۔ لکھا ہے:-

"ہر شخصے کہ بخواب رفت خود ملاحظہ فرمودہ کوزہ آبِ سرد ہمراہ می داشتند و براں می پاشیدند تا ایں مرتبہ تقید در تربیت داشتند" ۵۲

شیخ اورنگ آبادیؒ نے اپنی روحانی تعلیم میں پاس انفاس اور ذکر جہر کو خاص اہمیت دی تھی، فرمایا کرتے تھے "حبس نفس کے ذریعے سے باطنی اصلاح و تربیت ممکن ہے" ۵۳ مغرب کے وقت ایک شخص بیعت ہوا، فوراً خواجہ محمد نورالدین ۵۴ کو حکم ہوا کہ اس شخص کو ذکر جہر سکھا دو ۵۵ مکتوباتِ کلیمی سے ایسا معلوم ہوتا ہے

۵۱، ۵۲، ۵۳ احسن الشمائل

۵۴ خواجہ نورالدین، شاہ نظام الدین صاحبؒ کے عزیز ترین مرید تھے۔ شاہ کلیم اللہ صاحبؒ بھی ان کی بڑی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ شاہ نظام الدین صاحبؒ کے نام ایک خط میں ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔ "قدوۃ الاصفیا، والاصحاب زبدۃ الاحباب خواجہ محمد نورالدین" پھر فرماتے ہیں۔ "عجب صاحب توفیق است کہ اللہ تعالیٰ، طفیل شما، عمر و حیات در منصب محبت الٰہی این مرد بیفزاید" م ۱۳ ص ۴۳۔ خواجہ نورالدین نے شاہ صاحب سے درخواست کی تھی کہ اللہ سے دعا فرمائیے کہ شیخ کی محبت بڑھ جائے

۵۵ م ۴۳ ص ۴۴ نیز م ۳۰ ص ۳۷

کہ جامع مسجد میں وہ دو دو سو، تین تین سو مریدوں کے ساتھ ذکر جہر میں مصروف رہتے تھے۔ اور اعظم شاہ نے ان کو اس سے منع بھی کیا تھا[۵۱]۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی نابالغ لڑکیوں کو ذکر جہر بتا دیا شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کو اطلاع ہوئی تو لکھا کہ بچوں کو ذکر جہر بتانے سے گریز کیا جائے کہ اس میں جان کا خطرہ ہے[۵۲]

شیخ اورنگ آبادیؒ اپنے مریدوں کو اتباعِ شیخ اور ادب کی تعلیم خاص طور پر دیتے تھے، کہا کرتے تھے کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے اپنے رفقا کو زد و کوب تک کیا لیکن انھوں نے مرشد کو نہیں چھوڑا اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ ـــــ

"اگر شیخ حرفے بمرید گوید از صورت شیخ بیزار شود[۵۳]	اگر شیخ مرید سے ایک حرف بھی کہہ دیتا ہے تو وہ شیخ کی صورت سے بیزار ہو جاتا ہے

اظہار مشیخت سے وہ ناخوش ہوتے تھے۔ ایک دن ایک مرید نے جو حضرت بابا صاحبؒ

---

۵۱ شاہ کلیم اللہ صاحب ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :۔

"......... در روئیداد فیما بین و حقیقت فرستادن اعظم شاہ قاب طعام در دآں .... و منع او از ذکر جہر در مسجد جامع با دو صد سہ صد کس وقت مغرب ہمہ معلوم شد، برادر من آنچہ شما کردید خوب کردید"

م ۶ ص ۱۰

م ۹۹ ص ۷۰ میں شاہ کلیم اللہ صاحب نے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو فرمائی اور آخر کو مسجد میں ذکر جہر سے منع کیا۔

۵۲ مکتوبات کلیمی م ۲۱ ص ۲۵ ۵۳ احسن الشمائل

کی اولاد سے تھا، ایک تسبیح پیش کی اور کہا کہ اس میں چند دانے بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی تسبیح کے شامل ہیں، فرمایا "اگر تبرک کے طور پر یہ تمہارے پاس رہے تو اچھا ہے میں تو کبھی تسبیح ہاتھ میں لیتا ہی نہیں۔ میرے اندر جو تسبیح ہے اس میں مشغول رہتا ہوں" پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

"تسبیح در دست گرفتن بدعت است	تسبیح ہاتھ میں لینا بدعت ہے
کسے را کہ تسبیح باطن در دست	جس کے ہاتھ میں باطن کی تسبیح ہو
آمدہ باشد، تسبیح ظاہر را چرا	وہ کیوں ظاہری تسبیح ہاتھ میں
بدست گیرد" [1]	پکڑے گا۔

فتوح وخیرات | ابتدائی زمانے میں شاہ نظام الدین صاحبؒ کسی شخص کی نذر قبول نہ کرتے تھے۔ جب شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ دل شکنی اچھی نہیں ہے۔ جو شخص بھی خلوص کے ساتھ کوئی چیز پیش کرے اسے قبول کرلو اور محتاجوں کو دے دو [2]

زر کہ ستانی و بیفشانیش
بہتر از آنست کہ نستانیش [2]

اس کے بعد وہ فتوحات قبول کرنے لگے۔ جمعہ کے دن جو نذر آتی تھی وہ قوالوں کو یا مجلس میں جو مستحق لوگ موجود ہوتے ان کو دیدی جاتی تھی۔ باقی دنوں میں جو آتا تھا وہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا [3]

---

[1] احسن الشمائل

[2] شجرۃ الانوار (قلمی)

[3] احسن الشمائل (قلمی)

فخر الطالبین میں لکھا ہے کہ اُن کے پاس اشرفی، روپیہ، پیسے علیحدہ علیحدہ کاغذ میں بندھے ہوئے رکھے رہتے تھے، جو محتاج آتا اُس میں سے دیدیتے تھے۔ فقیر کو ایک پیسہ سے زیادہ نہ دیتے تھے، اور لوگوں کو اشرفیاں تک دیتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ شریف کے لئے بڑی مشکل ہے۔ وہ شرم کے مارے بھیک بھی نہیں مانگ سکتا اور فاقہ کرتا ہے[۵۱] ان لوگوں کا کیا ہے یہ تو در در پھر کر خوب جمع کر لیتے ہیں۔

سماع سماع کے معاملے میں شاہ نظام الدین صاحب اپنے پیر و مرشد کے اصولوں پر عمل کرتے تھے[۵۲] زمان، مکان اور اخوان کی سب پابندیوں پر اُن کی نظر رہتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے

سماع بسیار دل را بمیراند[۵۳] — سماع کی زیادتی دل کو مار دیتی ہے

خواجہ کامگار خان نے اُن کی سماع کی سات مجلسوں کا تفصیلی حال لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشائخ متقدمین کے اصولوں سے انحراف نہ کرتے تھے۔

اخلاق شیخ اورنگ آبادی رح کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ لوگوں کی دل گیری کو اپنا فرض اولین تصور کرتے تھے۔ ہر شخص سے خواہ وہ آشنا ہو یا بیگانہ ایک ہی طریقے سے ملتے تھے[۵۴] ہر شخص کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے، لکھا ہے:۔

---

۵۱ فخر الطالبین ص ۹۵ (قلمی)

۵۲ لکھا ہے:۔ "احتیاطے کہ روز سماع در محفل مبارک ایشان بوقوع می آمد درہیچ از مشائخ زماں دیدہ و شنیدہ نشد"

احسن الشمائل (قلمی)، و تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۰۱

۵۳ احسن الشمائل۔ شجرۃ الانوار۔ تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۰۱

۵۴ احسن الشمائل

"برائے ہمہ کس تمام قد استادہ می شدند و تعظیم بجا می آوردند، با طفل چہار سالہ ہموں وضع مبارک می داشتند کہ با پیر ہفتاد سالہ و با کابر و فضلائے خود [51]	ہر شخص کے لئے وہ کھڑے ہو جاتے تھے اور اس کی تعظیم کرتے تھے (حد یہ ہے کہ) چار سال کے بچے کے لئے بھی وہی مبارک وضع رکھتے تھے جو ۷۰ سالہ بوڑھے یا اکابر و فضلا کے لئے۔

ہر آنے والے کو کچھ نہ کچھ ضرور کھلاتے۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو عطر ہی عنایت فرما دیتے تھے۔ لکھا ہے۔

"ہرگز ایں بنظر نیامدہ کہ ہیچ وارد و زائرے از فائدہ خالی باز گردیدہ باشد"۔ [52]	کبھی یہ چیز نہیں دیکھی گئی کہ کوئی آنے والا یا زائر خالی ہات واپس چلا گیا ہو۔

جب تک لوگ اُن کے پاس رہتے، وہ دوزانو بیٹھے رہتے۔ چار زانو بیٹھے ہوئے اُن کو کسی شخص نے نہیں دیکھا، جب کوئی کتاب مجلس میں پڑھی جاتی تو لوگوں کو حکم ہوتا تھا کہ بالکل خاموش بیٹھیں [53]

دل گیری کو انھوں نے مقصد حیات بنا لیا تھا۔ کسی شخص کو رنجیدہ کرنا یا اس کے جذبات کو ٹھیس لگانا اُن سے نہیں آتا تھا، ایک مرتبہ ایک درویش ان کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا "میں توجہ دینا خوب جانتا ہوں اور میری توجہ میں بہت تاثیر

---

[51] احسن الشمائل

تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۰۱

[52] احسن الشمائل۔ (قلمی) تکملہ سیر الاولیاء

[53] احسن الشمائل

ہے۔ اگر تمھیں ذوق ہو تو مجھ سے تربیت حاصل کرلو، میں تم کو بتانے میں دریغ نہ کروں گا
شیخ اورنگ آبادی رح نے اس کے آگے زانوے ادب طے کرنا منظور فرمالیا۔ فخر الطالبین
میں لکھا ہے :۔

چوں شیوۂ حضرت دوستی انسان	چونکہ حضرت کا طریقہ انسان اور
وحیوان بود، ازراہ کریمی اخلاق	حیوان سے دوستی کا تھا، اس لئے
خود بزانوئے ادب پیش آں	ازراہ خلق اس برخود غلط شخص کے
برخود غلط نشستند" لہ	سامنے ادب سے بیٹھ گئے۔

وہ شخص ہر روز آتا اور توجہ دیتا۔ دو سال اسی طرح گذر گئے۔ اور اس شخص نے
سارے شہر میں یہ مشہور کر دیا کہ شیخ مجھ سے توجہ حاصل کرتے ہیں۔ ایک دن
میاں عبدالقادر (جو شیخ صاحب کے مرید تھے) خانقاہ کے دروازے پر کھڑے
ہوگئے اور جوں ہی وہ شخص آیا اس پر ایسی نظر ڈالی کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔
شاہ صاحب رح کو معلوم ہوا تو باہر گئے۔ میاں عبدالقادر کو ڈانٹا اور فرمایا:۔

"چرا خاطر کسے را شکستہ باید	کیوں کسی کے دل کو دکھایا جائے
کرد۔ اگر دریں فرصت کہ پیش	اگر فرصت میں ایک ساعت اس کے
اویک ساعت نشستم و او دل	پاس بیٹھ جاتا ہوں اور اس کا
شاد شد ازیں چہ بہتر است" لہ	دل اس سے خوش ہو جاتا ہے تو اس
	سے بہتر کیا بات ہے

شیخ اورنگ آبادی اور اعظم شاہ | شیخ نظام الدین اورنگ آبادی رح امراء
وسلاطین سے حتی المقدور بچنے اور علیحدہ رہنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ان

لہ، لہ فخر الطالبین۔ ص ۹۳

کے تحائف کو قبول کرنا بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ اعظم شاہ[۵۱] نے ان کی خدمت میں کچھ کھانا بھیجا تو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے دوسری مرتبہ پھر یہ کہہ کر بھیجا کہ صوفیوں کے لئے قبول کر لیجئے۔ لیکن آپ نے پھر بھی قبول نہ کیا۔[۵۲]

شاہ وقت اور شیخ اورنگ آبادی شیخ نظام الدین اورنگ آبادی نے دکن میں اپنے سلسلہ کی روایات کا پورا خیال رکھا۔ لوگوں نے اُن سے بار بار اصرار کیا کہ بادشاہ سے ملاقات فرمائیں۔ لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ ایک صاحب نے یہاں تک کہا کہ میں خود ملاقات کرا دوں گا، لیکن آپ راضی نہ ہوئے۔ شاہ کلیم اللہ صاحب رح کو جب اپنے مرید کی استقامت اور راسخ الاعتقادی کی اطلاع ہوئی تو بہت خوش ہوئے۔[۵۳]

ایک مرتبہ بادشاہ نے خود بلایا لیکن آپ نے دربار میں جانے سے انکار کر دیا۔ شاہ کلیم اللہ کو معلوم ہوا تو خط لکھا۔

"خوب کردید کہ قبول ایں معنی نہ کردید کہ ہمیں طلب سلاطین دلیل رعونیت وجباری است۔ اگر در طبیعت ایشاں شکستگی و فدویت فقرا باشد ابرام بہ سلطانیت نکنند بلکہ خود از سر قدم ساختہ بخدمت شتابند تا ممدوح جناب حدیث کہ نعم الامیر علی باب الفقیر باشند" م ۷۴ ص ۵۴

---

[۵۱] اورنگ زیب کا تیسرا لڑکا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کو احمد آباد (گجرات) کا حاکم بنا کر بھیج دیا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد وہ تخت پر بیٹھا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں بہادر شاہ سے مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔

[۵۲] مکتوبات کلیمی۔ ص ۱۰ م ۶ [۵۳] مکتوبات کلیمی۔ م ۲۴ ص ۲۸

خاندان آصفیہ پر اثرات جس زمانہ میں شیخ نظام الدین صاحب رح دکن بھیجے گئے تھے اس وقت نواب غازی الدین خاں[۵۱] (۱۶۴۹-۱۷۱۱) وہاں موجود تھے۔ چنانچہ شیخ کے تقدس کا شہرہ سن کر انھوں نے شیخ کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ شیخ نے اپنے بزرگوں کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے جانے سے انکار کر دیا۔ پیر و مرشد کو جب یہ معلوم ہوا تو خط لکھا :۔

"مرقوم بود کہ غازی الدین خاں	تم نے لکھا تھا کہ غازی الدین خاں
طلب ملاقات کرد۔ نرفتم۔ خوب	نے ملاقات کے لئے بلایا۔ اور تم نہیں گئے
کردید کر نرفتید۔ اگر او را فنا	تم نے بہت اچھا کیا کہ نہ گئے۔ اگر اسے
در خدمت فقرا بودے خود می آمد	فقراء میں سچی دلچسپی اور اعتقاد ہوتا
و خود آرائی نمی کرد[۵۲]	تو خود حاضر ہوتا، خود آرائی نہ کرتا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس انکار کے بعد بھی غازی الدین خاں نے اصرار کیا۔ شاہ کلیم اللہ صاحب رح کو معلوم ہوا تو لکھا :۔

می دانند کہ پیش فقرا بادشاہاں	تمھیں معلوم ہو کہ فقراء کی خدمت میں
رفتہ اند و سعادت دانستہ اند	بادشاہ حاضر ہوئے ہیں اور اس کو اپنے
غازی الدین خاں نوکر است	لئے سعادت سمجھا ہے۔ غازی الدین خاں

---

۵۱ اس زمانے میں غازی الدین خاں کے دکن میں کام کے لئے ملاحظہ ہو :۔

NIZAM-UL-MULK ASAF JAH BY
Dr YUSUF HUSSAIN KHAN
PP. 16 - 40

۵۲ مکتوبات کلیمی، م ۳۵ ص ۳۶

از نوکراں بادشاہ اگر احیاناً او
بہ فقیر نوشت من اجازت نامہ نخواہم
نوشت ۵۱

تو بادشاہ کے نوکروں میں سے ہے
اگر وہ مجھے لکھے گا تو بھی میں اجازت
نامہ نہیں لکھوں گا۔

مکتوبات سے غازی الدین خاں اور شیخ نظام الدین صاحبؒ کے تعلقات پر اور زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن خیال یہ ہے کہ وہ بعد کو حاضر ہوئے اور اپنے عقیدت مندانہ جذبات کو برقرار رکھا۔ مناقب فخریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غازی الدین خاں کے بعد بھی عقیدت مندی کا سلسلہ جاری رہا۔ لکھا ہے:-

"........ نواب سلطان الملک آصف جاہ نیز شرف بیعت
در خدمت آں ظل الٰہی داشت" ۵۲

نظام الملک آصف جاہ اول (۱۷۴۸ - ۱۶۷۱) بڑے مذہبی جذبات رکھتے تھے۔ آزاد بلگرامی نے ان کے متعلق لکھا ہے:-

امیرے بایں جلالتِ شان بر مسند
امارت قدم نگذاشتہ، اختر
طالع ایں صاحب اقبال از آغاز
عمر تا انجام بر مدارج ترقی صعود
نمود........ سادات و علماء
مشایخ دیار عرب و ماوراءالنہر و
خراسان و عجم و عراق و ہند

اس شان کا امیر کبھی مسند امارت
پر نہیں بیٹھا۔ اس صاحب اقبال
کا اختر طالع ابتدائی زمانے سے آخر
تک ترقی کے مدارج طے کرتا رہا۔
.... سادات، علماء اور
مشائخ عرب، ماوراء النہر، خراسان
عراق اور ہندوستان سے ان کی

۵۱ مکتوبات کلیمی۔ م ۸۹ ص ۶۷
۵۲ مناقب فخریہ۔ ص ۷ (قلمی)

آوازۂ قدردانی استماع یافتہ رو بدکن آوردند" [1]	قدردانی کی شہرت سن کر دکن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

انھوں نے ایک کتاب "رشک گلستان ارم" شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے احوال میں تصنیف فرمائی تھی۔

نظام القلوب | شاہ نظام الدین صاحبؒ نے ایک کتاب "نظام القلوب" تصنیف فرمائی تھی۔ یہ کتاب ۱۳۰۹ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی تھی اس میں مندرجہ ذیل ۲۱ فصلیں ہیں:-

(۱) در فوائد ذکر جہر
(۲) در ارشاد و تلقین
(۳) در ذکر پاس انفاس و حبس دم و نفی و اثبات لامعبود الا اللہ و سہ پایہ
(۴) در ذکر ذات کلمۂ اللہ و حبس دم اسم اللہ و اللہ جہراً باید خواہ یا قصر در محاربۂ صغیر و کبیر
(۵) در ذکر اللہ حاضری
(۶) فی طریق تعلیم الذکر
(۷) در ذکر نفی و اثبات و ذکر ناسوتی و ملکوتی و جبروتی و لاہوتی۔
(۸) در ذکر یک ضربی تا دوازدہ ضرب
(۹) در ذکر حدادی
(۱۰) در ذکر کشف معانی قرآن و کشف قبور

---

[1] روضۃ الاولیاء۔ آزاد بلگرامی (قلمی)

(۱۱) در ذکر پنج تن پاک و ذکر کشف روح رسول اللہ و کشف الارواح و اسمار ملائکہ و اسم شیخ۔

(۱۲) در ذکر حسب الاستعداد و صلاحیت از انتقال بعضے صفات بسوئے صفات دیگر

(۱۳) در ذکر جبر ئیلی و سہروردی و بدلا و فنا و بقا و ذکر جبروت و یاھو و کشف ملکوت و حضور و یاحی یا قیوم ولا ھو الا ھو۔

(۱۴) در اسمار اذکار یذکرون اہل اللہ

(۱۵) در معرفت اذکار عربی و فارسی و بعضے سلوک جوگیہ و اذکار ایشاں و جلسہ

(۱۶) در ذکر اسم جلال و جمال مشترک

(۱۷) در شغل آئینہ و نظر ہر دو چشم در بالائے ابرو

(۱۸) در مراقبہ و در بیان مراقبہ سلسلہ نقشبندیہ

(۱۹) در ذکر جالنوزان

(۲۰) انوارے کہ در حالت ذکر ظاہر شوند

(۲۱) در علامات آواز شیطانی و رحمانی

اس کتاب میں گو مختلف اشغال و اذکار کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ شاہ کلیم اللہ صاحب رح کی کتابوں کی طرح اس قدر واضح نہیں ہے کہ بغیر رہبر کے اس پر عمل کیا جا سکے۔

ملفوظات و حالات | حضرت شاہ نظام الدین صاحب رح کے حالات میں ایک نہایت مفصل کتاب "رشک گلستان ارم" نظام الملک آصف جاہ اول نے تصنیف کی تھی[۱] شجرۃ الانوار کا مصنف لکھتا ہے :۔

[۱] نوٹ صفحہ ۵۵۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔

کاتب حروف کتابے را مسمّٰی بہ رشکِ گلستانِ ارم تصنیف نظام الملک آصف جاہ کہ یکے از مریدان حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادی قدس سرہ العزیز مفصلاً احوال آں حضرت دراں نوشتہ دیدہ ام "۵۰	کاتب حروف نے "رشکِ گلستانِ ارم" نامی کتاب جو نظام الملک آصف جاہ مرید شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کی تصنیف ہے اور جس میں حضرت شیخ کا مفصل حال درج ہے دیکھی ہے۔

یہ کتاب مولوی رحیم بخش فخری مصنف شجرۃ الانوار نے شاہ فخر صاحب کے ایک مشہور خلیفہ حاجی واصل کے پاس دیکھی تھی۔ جس وقت وہ کتاب شجرۃ الانوار لکھ رہے تھے اس وقت اُنھوں نے اس کتاب کو بہت تلاش کیا۔ اور اکثر "برادرانِ دینی" سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ لیکن دستیاب نہ ہوسکی۔

شاہ نظام الدین صاحب رح کے حالات اور ملفوظات میں ایک دوسری مفصل کتاب خواجہ کامگار خاں نے احسن الشمائل کے نام سے لکھی تھی۔ جس میں ضیاء نخشبی کی "چہل ناموس" کے طرز پر شیخ کا حال لکھا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ہمارے پیش نظر ہے ۵۱ شجرۃ الانوار اور تکملہ سیر الاولیاء کے مصنفین نے خاص طور

---

۵۰ (نوٹ ص ۵۴۵) غلام سرور نے خزینۃ الاصفیاء (جلد اول ص ۴۹۷) میں غلطی سے نواب نظام الملک کی اس تصنیف کا نام احسن الشمائل لکھدیا ہے احسن الشمائل خواجہ کامگار خاں کی تصنیف ہے

۵۱ شجرۃ الانوار - (قلمی)

۵۲ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ذخیرۂ کتب میں احسن الشمائل کا ایک قدیم نسخہ ہے (منیہ) غالباً یہ مصنف ہی کے قلم کا ہے۔

ے اس سے استفادہ کیا ہے۔

وصال | شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۴۲ھ کو اورنگ آباد میں وصال فرمایا۔ مزار مبارک پر ایک عالی شان گنبد اور قریب ہی ایک مسجد بنائی گئی۔ غلام سرور نے تاریخ لکھی ہے ۵۱

شد ز دنیا چو سوئے خلد بریں

راہبر رہنما نظام الدین

سال ترحیل اوست شیخ کبیر

ہم ولی ہذا نظام الدین

۱۱۴۲ھ ۵۲

مناقب المحبوبین میں ہے کہ وہ اپنے پیر کے وصال کے بعد چھ مہینے اور زندہ رہے تھے ۵۳

شادی اور اولاد | حضرت شیخ اورنگ آبادیؒ جس وقت دکن گئے تھے اس وقت ان کی شادی نہیں ہوئی تھی، وہاں پہنچ کر وہ کچھ عرصہ تک مجرد رہے۔ شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کا حکم تھا کہ شادی نہ کی جائے کہ اس صورت میں وہ عظیم الشان اصلاحی اور تجدیدی کام جس پر وہ مامور کئے گئے تھے۔ اچھی طرح انجام نہیں پا سکتا تھا۔ لیکن اورنگ آباد میں شیخ نظام الدینؒ کو کچھ تکلیف ہوئی اور اطبا نے شادی کا مشورہ دیا۔ شاہ کلیم اللہ صاحب نے لکھا۔

---

۵۱ شجرۃ الانوار

۵۲ خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اول ص ۴۹۷

۵۳ مناقب المحبوبین۔ ص ۷۴

"تا ممکن باشد گرد زن نباید رفت"	جب تک ممکن ہو عورت کے پاس نہ
م ۲۹ ص ۳۰	جاؤ۔
اگر احتیاج نباشد ہرگز کد خدا	اگر ضرورت نہ ہو تو ہرگز شادی
نباشد م ۳۰ ص ۳۳	نہ کرو

مگر اطبّا نے جب مجبور کیا تو شاہ کلیم اللہ صاحب نے اپنے خاندان میں ان کی شادی کرنی چاہی۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :۔

"میاں امام الدین کہ برادر عمو زادہ	میاں امام الدین کی، جو فقیر کے
فقیر اند دخترے در سن چہاردہ	چچا زاد بھائی ہیں، ایک چودہ سالہ
سالہ فی الحال بصلاحِ نماز و روزہ	لڑکی ہے۔ نماز، روزہ، تلاوت قرآن
و تلاوتِ قرآن آراستہ دارند	سے آراستہ ہے...... ماں باپ دونوں
.... و از طرفین نجیب	طرف سے اچھا خاندان ہے.....
نمی دہند چیزے و نمی خواہند چیزے	نہ کچھ جہیز دیں گے نہ کچھ جہیز چاہتے
.... بر کاسہ آب انعقاد	ہیں۔ پانی کے ایک پیالہ پر نکاح ہو جائے
میسّر می شود۔ اگر اشارہ نمایند	گا۔ اگر اشارہ کریں (یعنی مرضی کا
علی الرسم یک نشان از طرف شما	اظہار کریں) تو تمھاری طرف سے
دادہ آید [۵]	علی الرسم کوئی نشان دے دیا جائے۔

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

"ایں جا در قبیلۂ ما دو سہ دختر بودند	یہاں ہمارے خاندان میں دو تین
می خواہم کہ یکے نامزد شما بکنم"	لڑکیاں ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان
م ۲۹ ص ۳۲	میں سے ایک تمھارے نامزد کروں۔

---

[۵] مکتوبات کلیمی۔ م ۷ ص ۱۵

مگر معلوم نہیں کہ شیخ صاحب نے کس جگہ شادی کی، ان کی ایک زوجہ حضرت سید محمد گیسو دراز کے خاندان سے تھیں۔ اُن کے بطن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکوں کے نام محمد اسمٰعیل[ؒ] اور فخر الدین تھے۔ دوسری بیوی سے تین لڑکے ہوئے جن کے نام غلام معین الدین، غلام بہار الدین، غلام کلیم اللہ تھے محمد اسمٰعیل خواجہ کامگار خاں کے مرید تھے۔ باقی سب بھائیوں نے شاہ فخر صاحب[ؒ] سے بیعت کی تھی[۱]

خلفاء شجرۃ الانوار میں لکھا ہے :۔

خلفائے ذی کرامت واہل ارشاد	(ان کے) بے شمار ایسے خلفاء
بے شمار در اطراف اقالیم خلائق	جو ذی کرامت اور صاحبِ
را رہنما بودہ اند۔"	ارشاد تھے مختلف علاقوں میں
	خلقت کی رہنمائی کرتے تھے۔

شاہ صاحب کے مندرجہ ذیل خلفاء خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں :۔

(۱) خواجہ کامکار خاں[ؒ]

(۲) محمد علی[ؒ]

(۳) خواجہ نور الدین[ؒ]

(۴) سیّد شاہ شریف[ؒ]

(۵) شاہ عشق اللہ[ؒ]

(۶) غلام قادر خاں[ؒ]

(۷) محمد یار بیگ[ؒ]

---

[۱] مناقب فخریہ۔ ص ۹ (قلمی)

(۸) محمد جعفرؒ

(۹) شیر محمدؒ

(۱۰) کرم علی شاہؒ

(۱۱) امام الدینؒ

(۱۲) شیخ محمودؒ

(۱۳) حافظ مودودؒ

خواجہ نورالدینؒ خواجہ نورالدین ، شاہ صاحبؒ کے عزیز خلیفہ تھے۔ شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے اُن کی تعریف نہایت شاندار الفاظ میں کی تھی۔ ایک خط میں شاہ نظام الدین صاحب کو لکھتے ہیں کہ وہ فنا فی الشیخ میں تمھارے سب خلفاء سے فوقیت لئے ہوئے ہیں اگر عربی علم اور حاصل کرلیں تو

علمے ازیں مرد روشن شود"	ایک عالم اس شخص سے روشن ہوجائے۔
م ۲۷ ص ۵۸	

شاہ کلیم اللہ صاحب نے ان کو اپنا نیمہ آستین بھیجا تھا[۱] اور ایک خط میں لکھا تھا

"ہمچوں ایں عزیز را باید کہ امتیاز دادہ	ایسے مرید کے لئے چاہیے کہ مخصوص طریقے
در تربیتِ باطن ایشاں کوشش	پر اس کی باطنی تربیت کی طرف
بسیار نمودہ" [۲]	توجہ کی جائے۔

شاہ نظام الدین صاحب کا ان پر خاص التفات وکرم تھا ان سے کتابیں پڑھوا کر سنتے تھے اور اُن کی باطنی تربیت میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔

---

[۱] مکتوبات کلیمی م ۹۴ ص ۷۴ م ۴۳ ص ۴۲ [۲] مکتوبات کلیمی ص ۵۵ م ۶۶

باب سوم

حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ

محمد شاہ کی دلی ہے۔ زوال و انحطاط کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔ قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے۔ سکھ اور مرہٹے ہر طرف لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں۔ نادر شاہ کا قتلِ عام اسی سرزمین پر ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ہچکیاں لے رہا ہے اور دم توڑنا ہی چاہتا ہے۔ جس دور کی ابتدا، ایبک و التمش کی رزم آرائیوں سے ہوئی تھی، وہ آج محمد شاہ کی بزم آرائیوں اور ہنگامہ ہائے نائے و نوش میں ختم ہو رہا ہے۔ فلسفۂ تاریخ کے مفکر کی یہ صدا فضاؤں میں گونج رہی ہے:

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

محمد اقبالؒ

اس سیاسی بدامنی اور اخلاقی پستی کے زمانے میں اللہ کے کچھ بندے درس و تدریس کے کام میں مشغول ہیں۔ ہوا تیز و تند ہے۔ لیکن وہ اپنا چراغ

جلا رہے ہیں۔ طوفان اُمنڈتا چلا آرہا ہے، لیکن وہ ہمت نہیں ہارتے اور اپنے کام میں اسی طرح مشغول ہیں۔ دہلی میں جس کا عالم بقول حضرت شاہ عبدالعزیزؒ یہ تھا کہ

بِهَا مَدَارِسُ لَوْطَافَ الْبَصِيرُ بِهَا
لَمْ تَفْتَحْ عَيْنُهُ إِلَّا عَلَى الصُّحُفِ

جس طرف نکل جائیے اس میں مدارس نظر آئیں گے۔ اور وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوگا۔

دو مدرسے ایسے ہیں جو اس وقت کی دلی کی جان ہیں ایک مدرسہ رحیمیہ[ف] جس میں دربار ولی اللٰہی سج رہا ہے اور ایک زبردست انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالی جارہی ہے اور دوسرا اجمیری دروازہ کا مدرسہ جس میں دکن کا ایک نوعمر عالم کسی روحانی اشارے پر آکر اقامت گزیں ہورہا ہے تقریباً نصف صدی قبل اس نوجوان کے والد کو دہلی کے ایک مشہور بزرگ نے دکن میں تبلیغ و اصلاح کے کام کے لئے بھیجا تھا۔ آج اس کا یہ فرزند علم وعرفان کی شمع جلانے کے لئے دکن کو چھوڑ کر دہلی چلا آیا ہے۔ دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھچ کر اس کے گرد جمع ہورہے

ف یہ وہی مدرسہ ہے جس کی نسبت مولوی بشیرالدین احمد صاحب مرحوم لکھتے ہیں:-

"اس مدرسے میں چھوٹے چھوٹے مکان بن گئے ہیں، جو ہان کسان وغیرہ غریب غریب لوگ رہتے ہیں۔ یہیں ایک چھوٹی سی مسجد آپ (شاہ ولی اللہ) کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نماز پڑھتے تھے۔ اب چونکہ یہ کل جائداد رائے بہادر لالہ شیو پرشاد صاحب کی ہے، اس لئے اس گلی پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے۔"

واقعات دارالحکومت دہلی

ج ۲ ص ۱۶۷

ہیں۔ اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ لیتا ہے وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ جب حدیث کا درس دینا شروع کرتا ہے تو سننے والوں پر ع

فنا د سامعہ در موجہ کوثر و تسنیم

کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ یہ شاہ فخر الدین ؒ ہیں۔ اُن کے والد شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ، حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کے عزیز ترین مرید اور خلیفہ تھے، اور اُن ہی کے حکم کے مطابق وہ دکن چلے گئے تھے۔

ولادت | شاہ فخر الدین صاحبؒ کی ولادت باسعادت ۱۱۲۶ھ مطابق ۱۷۱۴ء کو بمقام اورنگ آباد ہوئی تھی جب حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب کو اپنے عزیز مرید شاہ نظام الدینؒ کے یہاں بیٹا پیدا ہونے کی خبر پہنچی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ فخر الدین نام تجویز کیا[۱] اور اپنا ملبوسِ خاص نومولود کے لئے عنایت فرمایا۔ ساتھ ہی ساتھ اس بچّہ کے شاندار مستقبل کی بشارت دی۔ ایک موقع میں خود شاہ فخر صاحبؒ نے اس کا ذکر اس طرح فرمایا :-

"حضرت شیخ بعد تولد من رقعہ کہ برائے حضرت صاحب قبلہ نوشتہ بودند۔ چنانچہ تا حال آں رقعہ پیش ما است، برائے من بسیار بشارات و الفاظ زیادہ تر از رتبہ من نوشتہ اند	حضرت شیخ (یعنی شاہ کلیم اللہ صاحبؒ) نے میرے تولد کے بعد جو خط حضرت والد صاحب قبلہ کو لکھا تھا وہ اب تک میرے پاس ہے۔ اس میں میرے لئے بہت سی بشارتیں ہیں اور ایسے الفاظ ہیں جو میرے

[۱] مناقب فخریہ۔ ص ۸ (قلمی)

وبہ تصدیق تلفظ ایشاں حق تعالیٰ برمن رحمت کردہ است "[۵۱]	رتبہ سے بڑھ کر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان ہی کلمات کی برکت سے مجھ پر رحمت فرمائی ہے

شاہ صاحبؒ نے اِس مکتوب میں یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ لڑکا شاہ جہاں آباد میں ہدایت وارشاد کی شمع روشن کرے گا۔[۵۲]

شاہ فخر الدین صاحب کے چار بھائی اور ایک بہن تھی۔ ایک بھائی حقیقی تھے، باقی سوتیلے۔ بڑے بھائی خواجہ کامگار خاں کے مرید تھے۔ باقی تینوں بھائی شاہ فخر صاحبؒ سے بیعت تھے[۵۳]

شاہ فخر صاحبؒ کے بڑے بھائی بہت سادہ لوح اور نیک طینت انسان تھے۔ شاہ فخر صاحبؒ اُن کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔

"برادر کلان من بسیار سادہ بودند ومرا بہ لفظ ملا یاد کردند، برایں جہت کہ ایشاں اکثرے بہ تماشا مشغول می شدند، وبہ ایں ذوق داشتند من اکثر کم حاضر می شدم مرا ملا می گفتند"[۵۴]	میرے بڑے بھائی بہت سادہ لوح تھے، مجھے مُلا کہہ کر خطاب کیا کرتے تھے اور وہ اس وجہ سے کہ وہ اکثر تماشہ میں مشغول رہتے تھے اور اس میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے میں اس میں کم شریک ہوتا تھا۔ اس لیے مجھے مُلا کہتے تھے۔

شاہ فخر صاحبؒ کو اپنے بہن بھائیوں سے بڑی محبت تھی۔ اپنی بہن کو "آپا" کہا کرتے تھے[۵۵] بڑے بھائی کا جب انتقال ہوا تو نہایت رنجیدہ اور غمگین ہوئے[۵۶]

---

۵۱ فخر الطالبین۔ ص ۱۰۷ - ۱۰۶ (قلمی) ۵۶ فخر الطالبین ص ۶۰
۵۲ مناقب فخریہ ص ۸ "
۵۳ مناقب فخریہ ص ۹ "
۵۴ فخر الطالبین۔ ص ۱۰۷ "
۵۵ فخر الطالبین۔ ص ۱۰۷ "

سلسلہ نسب اور لقب حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ باپ کی جانب سے "صدیقی" تھے اور ماں کی جانب سے "سید" ان کی والدہ جن کا نام سید بیگم تھا حضرت سید محمد گیسو دراز کے خاندان سے تھیں [۱]

حضرت شاہ فخر صاحب کا لقب "محب النبی" تھا [۲] اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آپ نے خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت چراغ دہلویؒ کو اس لقب سے مخاطب کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا [۳]

تعلیم حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ ان کے والد ماجد حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ خود بڑے ذی علم بزرگ تھے انھوں نے اپنے اس بیٹے کی جس کے شاندار مستقبل کے متعلق حضرت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ بشارت دے چکے تھے تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ اور اس زمانے کے نہایت ہی مشہور علماء سے ان کی تعلیم کی تکمیل کرائی [۴]

شاہ فخر صاحبؒ نے فصوص الحکم، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ کتابیں میاں محمد جان سے پڑھی تھیں۔ میاں محمد جان جید عالم تھے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف پر ان کو بڑا عبور تھا اور اُن کے فلسفۂ وحدت وجود کے ماہر استاد تھے [۵] انھوں نے شاہ فخر الدین صاحبؒ میں بھی امام اکبرؒ کے

۱۔ شجرۃ الانوار۔ (قلمی)

۲۔ تکملہ سیر الاولیا، ۱۱۴-۱۱۳۔ مناقب فخریہ۔ ص ۴ (قلمی)

۳۔ تکملہ سیر الاولیا ص ۱۱۴-۱۱۳۔ مناقب المحبوبین ص ۸۱-۷۹-۸۴

۴۔ تکملہ سیر الاولیا ص ۱۰۶

۵۔ تکملہ سیر الاولیا ص ۱۰۶

فلسفہ کا درک پیدا کر دیا۔ ایک زمانے میں شاہ فخر الدین صاحبؒ نے فلسفہ وحدت وجود کی تشریح میں ایک رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ امام الکبرؒ کے باریک نکات کو عوام خاطر خواہ طریقہ پر نہ سمجھ سکیں گے اور پھر شارح کو بدنام کرنا شروع کر دیں گے، اپنے ارادے سے باز رہے[۱]

شاہ فخر الدین صاحبؒ نے ہدایہ اپنے عہد کے دوسرے عظیم المرتبت بزرگ مولانا عبدالحکیم صاحبؒ سے پڑھی تھی۔

مولانا عبدالحکیمؒ اپنے زمانے کے مشہور فقیہہ تھے۔ ان کا توکل اور علمی تبحر دونوں مشہور تھے۔ تکملہ میں لکھا ہے۔

"بزرگے خوب عالم بود.......... در علم فقہ تمام مہارت داشت و هم توکل بدرجہ اتم بود"[۲]

ان کے زہد و توکل کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات پاجامہ تک اُن کے پاس نہ ہوتا تھا۔ اور وہ ایک "تہمہ" میں گذر اوقات کرتے تھے۔ ایسے بزرگوں کی صحبت سے ظاہر ہے کہ شاہ فخر الدین صاحبؒ کو کس درجہ استغنا اور توکل کا سبق ملا ہوگا۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ نے حدیث کی سند دکن کے ایک مشہور محدث حافظ اسعد الانصاری المکی ثم اورنگ آبادیؒ سے حاصل کی تھی[۳] حافظ صاحب شیخ محمد ابراہیم کردیؒ کے شاگرد تھے۔ شیخ کردیؒ جید عالم اور محدث تھے ان کا حال شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے انفاس العارفین میں لکھا ہے[۴]

---

[۱] فخر الطالبین ص ۷۷ (قلمی)

[۲] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۰۷ - ۱۰۶

[۳] ملاحظہ ہو سند حدیث مندرجہ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۰۸

[۴] انفاس العارفین۔ ص ۲۰۰ - ۱۹۸

شاہ فخر الدین صاحبؒ نے اپنے والد ماجد حضرت شاہ نظام الدین صاحبؒ سے بھی کچھ کتابیں مثلاً شرح وقایہ، مشارق الانوار اور نفحات الانس وغیرہ پڑھی تھیں۔ ان درسی کتابوں کے علاوہ شاہ فخر صاحبؒ نے دیگر علوم و فنون سے بھی واقفیت حاصل کی، طب اور تیر اندازی کے متعلق کتابیں پڑھیں اور فنون سپاہ گری میں مہارت حاصل کی۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے:۔

"ذات پاک کہ جامع جمیع علوم و فنون اند کہ درین فن (سپاہ گری)
ہم مہارتے تمام داشتند"[1]

بیعت شاہ فخر صاحبؒ کے والد ماجد کو اُن سے بیحد محبت تھی۔ اس لئے اصلاحِ باطن کی جانب خاص توجہ فرماتے تھے۔ بچپن ہی میں ان کو مرید کر لیا تھا۔[2] شاہ نظام الدین صاحبؒ کے انتقال کے وقت شاہ فخر الدین صاحبؒ کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔ باپ نے قاضی کریم الدین کے ذریعے (کہ نسبت خویشی بہ آں جناب داشت ص ۱۰) اپنے جگر گوشے کو پاس بلوایا اور دیر تک اپنے سینۂ مبارک سے چپیاں رکھ کر اپنی تمام باطنی نعمتیں اُن کے سینے میں منتقل کر دیں۔ اس کے بعد ان کی روح پُر فتوح عالمِ قدس کی طرف پرواز کر گئی۔[3]

شاہ فخر الدین صاحبؒ نے ابھی تکمیلِ علوم نہیں کی تھی۔ باپ کے وصال کے تین سال بعد تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔[4]

---

[1] مناقب فخریہ (قلمی) ص ۲۱
[2] فخر الطالبین (قلمی) ص ۱۱۲
[3] مناقب فخریہ (قلمی) ص ۱۰
[4] مناقب فخریہ (قلمی) ص ۱۰

لشکر میں ملازمت | تعلیم سے فراغت پانے کے بعد۔ باپ کے سجادہ پر بیٹھنے کے بجائے شاہ فخر صاحب رح نے لشکر میں ملازمت کرلی۔ لیکن درویشی فطرت کا تقاضہ تھا۔ اس لئے اس کو کسی طرح نہ ٹال سکتے تھے۔ اگر دن تیغ و سنان کی جھنکاروں میں گذرتا تھا تو رات رکوع و سجود میں۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخر الدین صاحب رح تمام تمام رات خیمہ میں عبادت کرتے رہتے تھے [۵۱] آپ کو اس زمانے میں اخفائے حال کی بڑی فکر رہتی تھی۔ آپ انتہائی سخت ریاضت اور محنت کرتے تھے، لیکن کسی کو اس کی خبر تک نہ ہوتی تھی۔ جو لوگ آپ کی ظاہری حالت کو دیکھتے تھے وہ کبھی اس بات کا گمان بھی نہیں کرسکتے تھے کہ یہ شخص اس قدر اعلیٰ روحانی مراتب طے کرچکا ہے۔ آخری زمانے میں ایک مرتبہ اپنی سابقہ ریاضتوں کے متعلق فرمانے لگے:-

"من در ایام سابقہ محنت در مشغولی ہم بسیار کردہ ام" [۵۲]

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ آپ نے آٹھ سال تک رات دن مشقتیں اٹھائی تھیں [۵۳] لشکر میں آپ نظام الدولہ ناصر جنگ اور ہمت یار خاں [۵۴] کے ساتھ

---

۵۱ مناقب فخریہ - ص ۱۲ (قلمی)

۵۲ فخر الطالبین - ص ۲۱ (قلمی)

۵۳ فخر الطالبین - ص ۱۱ (قلمی)

۵۴ ہمت یار خاں - آصف جاہ اول کے نہایت ہی معتبر سپہ سالاروں میں تھا اور متعدد اہم جنگوں میں اُن کے ساتھ رہا تھا ملاحظہ ہو۔

NIZAM UL MULK ASAF JAH I BY DR. YUSUF HUSSAIN KHAN P. 159

۱۱۶۳ھ میں کرنول کے باغی سرداروں نے قتل کردیا تھا (1310 P 251)

رہتے تھے۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے:-

"بہ صحبت نواب نظام الدولہ ناصر جنگ عم مغفور راقم عفی اللہ عنہ و ہمت یار خاں غفر اللہ اوقات بسر بردند و فوج کشی ہا و شمشیر زنی ہا نمودند و صوم دائمی در آں حالت می داشتند۔"[۵]	میرے چچا نواب نظام الدولہ ناصر جنگ اور ہمت یار خاں کے ساتھ رہتے تھے، فوج کشی اور شمشیر زنی کرتے تھے، اور اسی حالت میں ہمیشہ روزے بھی رکھتے تھے۔

لشکر میں گو آپ نے اپنے کمالات کو پوشیدہ رکھنے کی انتہائی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ جب شہرت بڑھنے لگی تو آپ لشکر کو چھوڑ کر اورنگ آباد چلے گئے۔

اورنگ آباد میں قیام

اورنگ آباد پہنچ کر شاہ صاحب اپنے والد کے سجادۂ مشیخت پر جلوہ افروز ہو گئے۔ اس زمانے میں بھی آپ کا یہ اصول تھا کہ حتی المقدور اظہارِ حال سے گریز فرماتے تھے اور اپنے کمالات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے، لیکن جس خانقاہ اور سجادہ سے آپ متعلق تھے وہاں اخفاءِ حال آسان نہ تھا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کو آپ کے کمالاتِ باطنی اور ریاضاتِ شاقہ کا علم ہوا، اور ساتھ ہی ساتھ عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھنا شروع ہو گیا لکھا ہے:-

روز بروز شہرت در افزائش شد۔ آں حضرت دیدند کہ تمام	روز بروز شہرت بڑھنے لگی حضرت شیخ نے جب دیکھا کہ تمام ملک دکن

۵ مناقب فخریہ ص ۱۱

ملک دکن اشتہار شد۔ خواستند	میں مشہور ہوگئے تو چاہا کہ کسی
کہ بجائے دیگر عزم فرمایند و ستر	دوسری جگہ چلے جائیں اور اپنے
حال را بحال دارند۔" [۵۱]	حال کو پوشیدہ رکھیں۔

لیکن اورنگ آباد چھوڑنا بھی ان کے لئے آسان نہ تھا۔ جب وہاں سے روانگی کا ارادہ کرتے تو دل میں خیال آتا کہ یہاں میرے والد اور مرشد کا مزار ہے۔ آخر کس طرح اس کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اس کے بعد پھر ارادہ فسخ کر دیتے۔ اسی کش مکش میں تھے کہ خواب میں شاہ نظام الدین صاحب اورنگ آبادیؒ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا ؎

شہِ اقلیم فقرم بے خودی تختِ روانِ من
نہ چوں فرہاد مزدورم نہ چوں مجنوں زمیندارم [۵۲]

پھر عارف روم کے اس مصرعے سے کچھ استقلال پیدا ہوا۔

بند بگسل باش آزاد اے پسر

مذبذب ارادے میں پختگی پیدا ہوگئی اور انھوں نے اورنگ آباد کو خیرباد کہنے کا تہیہ کر لیا۔ [۵۳]

دہلی کو روانگی ایک دن آپ اپنے دو ملازم قاسم اور حیات کے ساتھ اورنگ آباد سے پیادہ پا چل کھڑے ہوئے۔ مناقب فخریہ میں آپ کی روانگی کا سنہ ۱۱۶۴ھ درج ہے [۵۴] مناقب المحبوبین میں ۱۱۶۵ھ لکھا ہے اور نواب غازی الدین خاں کی مثنوی

[۵۱] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۰۹

[۵۲] مناقب فخریہ ص ۱۶

[۵۳] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۰۹ ۔ فخر الطالبین ص ۱۲۱

[۵۴] مناقب فخریہ۔ ص ۲۲

کے اِن اشعار سے سند لی گئی ہے ۵۱

بود سالے کہ فرخ و میموں
شصت و پنج و ہزار صد افزوں
فخر دیں با قدوم سعد و سعید
دہلی کہنہ را نوا بخشید[۵۱]

اس سفر کا حال نظام الملک نے فخریۃ النظام میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے[۵۲]۔ دہلی میں ایک بڑھیا نے آپ کو اپنے یہاں ٹھہرایا۔ یہاں مکان کے قریب ایک بت خانہ تھا۔ ہندو بھی آپ سے عقیدت مندی کا اظہار کرنے لگے[۵۳]۔ یہاں سے چلے تو حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی رح کے مزار پر حاضر ہوئے۔ اور وہاں کی مسجد میں معتکف ہو گئے[۵۴]۔ پھر اپنے سلسلہ کے دیگر بزرگوں کے مزارات پر حاضر ہوتے ہوئے حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب رح کے مزار پر پہنچے۔ شاہ کلیم اللہ صاحب کے فرزند نہایت محبت سے پیش آئے۔ تین دن تک اُن کے مہمان رہے۔ اس کے بعد کٹرہ پہلیل[۵۵] میں ایک حویلی کرائے پر لے لی، اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے:-

"آں حضرت در کٹرہ پہلیل حویلی بہ کرایہ گرفتند و آں مکاں بہ قدوم ایں

---

۵۱ مناقب المحبوبین۔ ص ۵۰

۵۲ مناقب فخریہ۔ ص ۱۷، تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۰۹۔ فخریۃ النظام دستیاب نہ ہو سکی۔

۵۳ مناقب فخریہ۔ ص ۱۸

۵۴ مناقب فخریہ۔ ص ۲۰

۵۵ شجرۃ الانوار میں اس کٹرہ کا نام بہوبیل لکھا ہے۔

گلبن رعنا رشک افزائے گلزار شد۔ و دراں محل شغلِ تدریس
در پیش کردند [۱۵]

یہاں بیعت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ دور دور سے لوگ آپ کی خدمت میں آنے لگے۔ شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کا بیٹا اور شاہ کلیم اللہ دہلوی رح کے سلسلے کا بزرگ دہلی میں غیر معروف اور گمنام نہیں رہ سکتا تھا۔ دہلی کے باشندے دونوں بزرگوں سے عقیدت اور ارادت رکھتے تھے۔ یہیں قیام کے زمانے میں شیخ نور محمد مہاروی رح جنھوں نے اٹھارویں صدی میں سلسلۂ چشتیہ کو پنجاب میں پروان چڑھایا۔ آپ کے حلقۂ مریدین میں شامل ہوئے [۲۵] ان کے علاوہ حافظ محمد قاسم (جو شاہ عالم بادشاہ کے امام جماعت تھے۔ اُن کے مرید ہوئے [۳۵] مرزا حسین اکبر آبادی رح جو فنون سپہ گری میں یگانہ روزگار تھے کھچ کر آپ کے قدموں میں آگئے اور مرید ہو گئے [۴۵]

پاک پٹن کا سفر | دہلی آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ شاہ فخر الدین صاحب رح نے پاک پٹن کا ارادہ کر دیا۔ دکن سے روانگی کے وقت انھوں نے اجمیر شریف میں قیام کیا تھا۔ دہلی میں اپنے سلسلے کے سب بزرگوں کے مزارات پر حاضر

---

۱۵ مناقب فخریہ۔ ص ۲۰

۲۵ مناقب فخریہ۔ ص ۲۰۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ قبلہ عالم فرمایا کرتے تھے۔
"اول کسیکہ بیعت از مولانا در دہلی کرد من بودم" ص ۸۴

۳۵ مناقب فخریہ۔ ص ۲۱
نیز شجرۃ الانوار (قلمی)

۴۵ مناقب فخریہ ص ۲۱، تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۱۲ - ۱۱۱

ہو چکے تھے۔ بابا صاحب کے مزار پر حاضری نہ ہوئی تھی، اس لئے پاک پٹن کا ارادہ کیا۔ پاک پٹن کا یہ سفر جس طرح پورا کیا وہ عقیدت و ارادت کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ میلوں کی پیادہ پا مسافت سے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں لیکن چلے جا رہے ہیں۔ جب بالکل ہی مجبور ہو جاتے ہیں تو ٹھیرتے ہیں، اور آبلوں پر مہندی لگاتے ہیں۔ ابھی پورا آرام نہیں ہو پاتا کہ پھر چل پڑتے ہیں۔

شاہ نور محمد صاحب اس سفر میں آپ کے ہمراہ تھے۔ پاک پٹن سے کچھ دور ایک گاؤں میں رات کو دونوں ٹھیر گئے۔ صبح ہوئی تو شاہ نور محمد صاحبؒ نے اپنے مرشد کو نہ پایا۔ تلاش کیا تو صرف نعلین مبارک پڑی ہوئی ملیں۔ بہت تشویش ہوئی۔ آخر بڑی جستجو کے بعد پتہ چلا کہ آپ پاک پٹن پہنچ چکے ہیں۔ اور بابا صاحبؒ کے احترام میں اپنی نعلین اس گاؤں میں چھوڑ گئے ہیں [۵۱]

پاک پٹن میں شیخ محمد یوسف صاحبؒ سجادہ نشین تھے۔ انھوں نے نہایت محبت کا برتاؤ کیا۔ شاہ فخر الدین صاحبؒ مزار کے قریب ایک حجرہ میں ٹھہر گئے اور عبادت میں مشغول رہنے لگے۔ یہاں ہر شب کو ایک ہزار رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے [۵۲]

پاک پٹن سے جب واپسی ہوئی تو راستے میں فرمانے لگے کہ دکن کی طرف سے دل میں کچھ تشویش سی پیدا ہو رہی ہے۔ چند ہی دن میں معلوم ہو گیا کہ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ جن سے شاہ صاحبؒ کو روحانی تعلق تھا شہید

---

۵۱ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۱۲ - ۱۱۱

۵۲ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۱۲

دئے گئے [۵] دہلی واپسی پر شاہ صاحب نے کچھ دن کٹرہ پھلیل ہی میں
ارے - اس کے بعد اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں منتقل ہوگئے اور
ں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا [۶]

یں وتدریس | شاہ فخرالدین صاحب رح نے اجمیری دروازہ کے جس
رسہ میں درس وتدریس کا کام شروع کیا - وہ امیر غازی الدین خاں فیروز
لک کا بنوایا ہوا تھا [۷] اس مدرسہ میں بیٹھ کر آپ نے صرف چند درسی
ابوں کو پڑھانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حقائق و معارف کے وہ دریا
ائے کہ بقول مصنف مناقب فخریہ :-

۵ مناقب فخریہ - ص ۲۵ - ۱۷ محرم ۱۱۷۵ھ کو وہ پانڈی چری کے معرکہ میں شہید ہوئے نظام الملک آصف جاہ اول کے صاحبزادے تھے - خلد آباد میں حضرت برہان الدین اولیا ذری زربخش کے احاطہ میں دفن کیا گیا - شعر وسخن کا اچھا مذاق تھا - نام تخلص کرتے تھے - آزاد بلگرامی سے مشورہ سخن کرتے تھے اُن کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں -

۵ مناقب فخریہ - ص ۲۵

۷ ملاحظہ ہو - ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں از مولوی ابوالحسنات ندوی ص ۲۸ - ۲۷

شجرۃ الانوار میں لکھا ہے :-

"در مدرسہ خورد نواب غیاض الدین خاں مرحوم کہ بیرون اجمیری دروازہ واقع است سکونت ورزیدند وارشاد و تدریس اشتغال نمودند، مرجع خاص و عام شدند"

شجرۃ الانوار سے جو معاصر تذکرہ ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو مدرسے تھے مدرسہ کلاں اور مدرسہ خورد -

"........ سینہ ہائے گنوز حقائق و دلہائے معادن معارف گشت خفتگاں بیدار و بے ہوشاں ہوشیار گشتند و بے خبراں باخبر و بے اثراں با اثر گردیدند، دلِ مردگاں زندہ، دل زندگاں بسمل شدند، بازار عشق و محبت الٰہی گرم شد و دریائے شوق و ذوق موجہائے زد"[5]

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا ذکر آپ کے درس کے سلسلہ میں متعدد جگہ آیا ہے[6] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاص طور سے ان ہی احادیث کا درس دیتے تھے۔ مدرسہ کا نظام کچھ اس طرح تھا کہ شاہ صاحبؒ جن لوگوں کو حدیث کا درس دیتے تھے وہ دوسرے طالب علموں کو معقول و منقول کی تعلیم دیتے تھے۔ سید حمد ذکر میں لکھا ہے:-

"خود صحیح مسلم در جناب اقدس	وہ خود حضرت شیخؒ کی خدمت
تلمذی کنند و در خدمت حدیث	میں صحیح مسلم کا مطالعہ کرتے ہیں اور
مشغول اند۔ و درس کتب معقول	خدمت حدیث میں مشغول ہیں۔

---

۵ مناقب فخریہ۔ ص ۲۵

۵ فخر الطالبین۔ ص ۲۲۔ ص ۲۱۔ ص ۳۲

شجرۃ الانوار سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکوٰۃ بھی درس میں رہتی تھی۔

"روزے در خدمت سراسر برکت حاضر بودم آں روز درس مشکوٰۃ شریف بود"

مولوی عبد الحی صاحب مرحوم نے اس دور میں ہندوستان کا جو نصاب تعلیم متعین کیا ہے اس میں حدیث میں صرف مشکوٰۃ المصابیح کا نام ہے (الندوہ فروری ۱۹۰۹ئ ص ۱۳) شاہ فخر الدین صاحبؒ کے حالات و ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اور بخاری بھی بعض مدارس میں رائج تھیں۔

"منقول باشاگرداں می دہند وشب وروز مصروف بہ حکم مولانا در تعلیم وتعلم" [۵۱]

اور منقول ومعقول کی کتابوں کا درس دوسرے شاگردوں کو دیتے ہیں رات دن مولانا کے حکم سے پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہتے ہیں۔

بعض خاص شاگردوں کو حضرت شاہ فخر صاحبؒ ابتدائی کتابیں بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ میر بدیع الدین کو جو آپ کے بہت عزیز شاگرد اور مرید تھے) آپ نے میزان سے لے کر صحیح بخاری تک پڑھائی تھی [۵۲]۔ ایک مرتبہ آپ سفر السعادت کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ اس کے بعض مقامات حاضرین کو بھی سنائے جاتے تھے۔ سناتے سناتے فرمانے لگے :۔

"دریں ایام دل می خواہد کہ ایں کتاب را بہ شخصے از یاراں درس گویم۔ میر بدیع الدین خود بخاری می خوانند، وسید احمد صحیح مسلم، بکہ باید گفت" [۵۳]

ان دنوں جی چاہتا ہے کہ یہ کتاب کسی مرید کو پڑھاؤں میر بدیع الدین بخاری پڑھتے ہیں۔ سید احمد صحیح مسلم ۔ (اب) کس کو پڑھائی جائے۔

آپ کے اس سوال پر مصنف مناقب فخریہ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔

رمضان کے مہینے میں علوم درسی کی تعلیم مدرسہ میں بند رہتی تھی لیکن حضرت شاہ فخر صاحبؒ کا درس حدیث جاری رہتا تھا آخری دنوں میں یہ بھی موقوف

---

۵۱ مناقب فخریہ ۔ ص ۳۲

۵۲ فخر الطالبین ۔ ص ۳۱

۵۳ فخر الطالبین ۔ ص ۳۱

ہو جاتا تھا۔ کیونکہ شاہ صاحب ان دنوں میں معتکف ہو جاتے تھے۔[۱]

شاہ فخر الدین صاحبؒ کے اس مدرسے میں دور دور سے طلباء آتے تھے۔ اکثر مشہور مریدین آپ کے مدرسہ کے طلباء ہی تھے۔ آپ کی تعلیم کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر باطنی اصلاح کا رنگ غالب تھا۔ سلوک کی تعلیم اس نصاب اور درس کا خاص حصہ تھی۔ شاہ عبدالرحمن صاحب لکھنویؒ جب تحصیلِ علم کے لئے دہلی آئے تو سب سے پہلے شاہ فخر الدین صاحبؒ ہی کے مدرسے میں حاضر ہوئے۔ اور شاہ صاحبؒ سے علومِ ظاہر کی تعلیم کی درخواست کی۔ شاہ صاحبؒ نے جواب دیا۔ جمعیت خاطر کے ساتھ باقی کتابوں کو پڑھ لو علم حاصل ہو جائے گا۔ مولانا عبدالرحمن صاحبؒ کو اس وقت علم ظاہر کی طرف بہت زیادہ رغبت تھی۔ یہاں سلوک اور تجلیۂ باطن پر خاص زور تھا۔ اس لئے مولانا چند دن دہلی قیام کرنے کے بعد، رام پور چلے گئے۔[۲]

جس زمانے شاہ فخر الدین صاحبؒ، اجمیری دروازہ کے مدرسے میں درس و تدریس میں مشغول تھے اور حقائق و معارف کے دریا بہا رہے تھے دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا مدرسہ اپنے پورے عروج پر تھا۔ شاہ فخر الدین صاحبؒ کے مدرسے میں تصوف کا رنگ غالب تھا اور سلوک و علم باطن کی طرف زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کے مرتب (شاہ عبدالرحیم صاحبؒ) کے مدرسہ میں احسان و سلوک کے ساتھ علم ظاہر پر خاص زور تھا۔ اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک زبردست انقلابی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

[۱] فخر الطالبین۔ ص ۴۸۔ ۴۷

[۲] انوار الرحمن۔ ص ۱۷

علمی ذوق | شاہ فخر الدین صاحب نے نہایت اعلیٰ علمی ذوق پایا تھا، بیشتر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ کتابوں کے حاصل کرنے اور جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ حد یہ تھی کہ اگر قرض بھی ہاتھ آجاتی تھیں تو خرید لیتے تھے۔ آپ کا نہایت عمدہ کتب خانہ تھا۔ فخر الطالبین میں لکھا ہے:۔

مگر کتب ہارا کہ حضرت صاحب بسیار دوست می دارند، واگر قرض ہم بدست آید خرید می فرمایند، وبفضل الٰہی، اکنوں کتاب خانہ بسیار در سرکار است[۱]	لیکن کتابوں کو حضرت شیخ بہت دوست رکھتے ہیں۔ اگر قرض بھی ہاتھ آجاتی ہیں تو خرید لیتے ہیں۔ بفضل الٰہی سرکار کے کتب خانے میں بہت سی کتابیں ہیں۔

کوئی نہ کوئی کتاب آپ کے سامنے رہتی تھی۔ کبھی حدیث بیان فرماتے، کبھی عوارف المعارف سناتے[۲] فوائد الفواد سے تو اتنا عشق تھا کہ ہر وقت سینے سے لگی رہتی تھی[۳]

تصانیف | حضرت شاہ فخر الدین صاحب رح نے تین کتابیں تصنیف فرمائی تھیں۔

(۱) نظام العقائد
(۲) رسالہ مرجیہ
(۳) فخر الحسن

---

[۱] فخر الطالبین۔ ص ۹۶
[۲] شجرۃ الانوار
[۳] مناقب فخریہ۔ ص ۳۲

یہ تینوں کتابیں ان کی علمیت اور محققانہ قابلیت کی آئینہ دار ہیں۔ سرسید نے لکھا ہے ؛۔ ان کا دیکھنا آپ کی ممارستِ علمی پر دلیلِ قاطع اور برہانِ ساطع ہے۔[۵۱]

نظام العقائد، علم عقائد پر ہے۔ اس میں نہایت عمدگی اور اختصار سے اسلام کے بنیادی عقائد پر بحث کی گئی ہے سبب تالیف یہ بتایا ہے، کہ پاک پٹن میں بعض اعزہ و احباب نے اصرار کیا کہ عقائد اہل سنت والجماعت کو بموجب مذہب امام اعظمؒ صاف عبارت میں بیان کیا جائے۔ تعمیل میں یہ کتاب لکھی گئی۔ طرزِ بیان سادہ اور دل کش ہے[۵۲] رسالہ مرجیہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور کتاب غنیۃ الطالبین کے ایک بیان کی تشریح میں لکھا گیا ہے۔ حضرت غوث الاعظم صاحبؒ نے حنفیہ کو فرقۂ مرجیہ میں شمار کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ آں حضرت کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ ملحقات سے ہے۔ حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے اس پر بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ حضرت ہی کا کلام ہے۔ لیکن اس جملہ سے ان کا اصلی مقصد وہ نہیں جو عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ فرقۂ مرجیہ نے رحمت الٰہی کے غلبہ میں بہت مبالغہ کیا ہے اور مضمون غضب کو فراموش کر دیا ہے اور حنفیہ فی الجملہ رحمت کو غلبہ دیتے ہیں۔ اس مناسبت سے انھوں نے حنفیہ کا ذکر فرقۂ مرجیہ میں کیا ہے۔ لیکن حنفیہ اس قدر رحمت کو

---

[۵۱] آثار الصنادید باب چہارم ص ۳۴

[۵۲] فارسی اصل اور اردو ترجمہ دونوں علیحدہ علیحدہ شائع ہو چکے ہیں
ظرافت الفوائد، ترجمہ نظام العقائد (مطبع رضوی، دہلی)

غلبہ نہیں دیتے جیساکہ دوسرے فرقۂ مرجیہ دیتے ہیں۔ اس سبب سے "زائغ عن الحق" (حق سے ہٹے ہوئے) نہیں ہیں۔

تیسری کتاب فخر الحسن ہے جو شاہ صاحب رح نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح کے ایک بیان کی تردید میں لکھی تھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب رح نے انتباہ میں یہ اعتراض کیا تھا کہ چشتیہ سلسلہ حضرت علیؓ تک متصل نہیں ہوتا کیونکہ حضرت خواجہ حسن بصری، حضرت علیؓ کے زمانے میں بہت کم عمر تھے اور کم عمری میں ان کو روحانی خلافت کس طرح مل سکتی تھی[1] شاہ فخر الدین صاحب رح نے فخر الحسن میں اس بیان کی تردید کی ہے اور محدثانہ کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت حسن بصری رح کو خلافت ملی تھی اور یہ اعتراض غلط ہے۔ شاہ فخر صاحب کی اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا عبد العلی بحر العلوم رح نے جب اس رسالے کو دیکھا تو فرمایا کہ حسنِ اعتقاد کے ساتھ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ بزرگوں نے لکھا ہے حق ہے لیکن یہ تحقیق جو مولانا نے کی ہے ہم کو معلوم نہ تھی[2]
فخر الحسن میں احادیث کی متداول کتب اور شروح کے علاوہ اِن کتابوں کے حوالہ موجود ہیں جن سے ان کے علمی تبحر اور وسعتِ مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] قول الجمیل میں بھی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح نے اس شبہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاہ عبد العزیز صاحب رح نے حاشیہ قول الجمیل میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ حسن بصری رح کی ملاقات حضرت علیؓ سے بہ اعتبار تاریخ ثابت نہیں۔

[2] مناقب حافظیہ۔ ص ۲۰۷

مولانا بحر العلوم (المتوفی ۱۲۲۵ھ) کو مولانا سید سلیمان ندوی نے ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ صاحب کے طبقہ میں گنا ہے

(۱) تاریخ صغیر بخاری (۲) تہذیب الکمال مزی (۳) شروط الائمہ حازمی۔
(۴) تہذیب الاسماء واللغات نودی (۵) سنن کبریٰ بیہقی (۶) تاریخ خطیب بغدادی
(۷) حلیۃ الاولیاء (۸) تقریب نودی (۹) تاریخ الاسلام ذہبی۔
(۱۰) مراۃ الجنان یافعیؒ (۱۱) سنن دارقطنی (۱۲) کتاب الثقات ابن حبان
(۱۳) فتح الباری (۱۴) تدریب الراوی (۱۵) منہاج السنہ ابن تیمیہؒ

گذشتہ صدی کے ایک مشہور عالم مولانا احسن الزماں حیدر آبادی مرید و خلیفہ مولانا محمد علی خیر آبادیؒ نے قول المستحسن فی شرح فخر الحسن کے نام سے شاہ صاحب کی اس تصنیف کی مبسوط شرح عربی میں لکھی تھی۔ مناقب حافظیہ میں لکھا ہے کہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب نے فخر الحسن کا جواب لکھنا چاہا لیکن نہ لکھ سکے۔[۵۱]

شاہ فخر الدین صاحبؒ نے اس کتاب کو لکھنے کے بعد اپنی مجلس میں جستہ جستہ سنوایا تھا۔ مصنف مناقب فخریہ نے فخر الحسن نام تجویز کیا تھا۔ جو شاہ صاحبؒ نے نہایت خوشی اور "بشاشت" سے پسند فرمایا تھا۔[۵۲]

ان تصانیف کے علاوہ ایک زمانے میں حضرت شاہ فخر صاحبؒ کے کچھ خطوط بھی دستیاب ہوتے تھے۔ اب صرف ایک خط مناقب المحبوبین میں محفوظ ہے۔ جس میں اتباع شریعت کی تلقین کی گئی ہے اور وحدت وجود کے بعض نکات کو واضح کیا گیا ہے۔

معمولات اور نظام اوقات | حضرت شاہ فخر صاحبؒ اپنے معمولات کے بہت پابند تھے۔ جن مزارات پر حاضری یا جس کام کی بجا آوری انھوں نے اپنے آپ پر

---

۵۱ مناقب حافظیہ۔ ص ۲۰۷

۵۲ مناقب فخریہ۔ ص ۹۸-۹۷

لازم قرار دے لی تھی اس کی پابندی کرتے تھے۔ اُن کے زمانے میں دہلی میں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ لیکن وہ کبھی اپنے معمولات میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ فخر الطالبین میں لکھا ہے۔

"ہنگامہا در شہر می شوند تاہم | شہر میں ہنگامے ہوتے رہتے ہیں
معمول خود را ناغہ نمی کنند [۵] | لیکن وہ اپنے معمولات کو ناغہ نہیں کرتے"

شاہ صاحب رح، فجر کی نماز کے بعد اپنے حجرے میں تشریف لے جاتے تھے۔ تین چار گھڑی دن نکلے تک وہیں رہتے تھے۔ اس وقت کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بعد وہ حجرے سے باہر مجلس میں آکر بیٹھتے تھے۔ اس وقت یاران و مخلصاں سب حاضر خدمت ہوتے تھے۔ اس کے بعد حدیث یا عوارف المعارف کا درس شروع ہوتا تھا۔ کوئی شخص اس کی عبارت پڑھ دیتا، اور آپ اس پر تقریر فرماتے تھے۔ پھر کھانے کا وقت ہو جاتا۔ قیلولہ کے وقت امیر کلو یا ننھو موجود ہوتے تھے۔ اور حضرت مولانا رح کوئی کتاب سینہ پر رکھ کر مطالعہ میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اکثر یہ کتاب فوائد الفواد ہوتی تھی۔ اس کے بعد نماز ظہر با جماعت ادا فرماتے تھے۔ تمام یاران مدرسہ بھی جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ آپ ہر ایک سے نہایت "خندہ روئی" اور "بشاشت" سے گفتگو فرماتے تھے۔ جمعہ اور سہ شنبہ کو مولوی عظمت اللہ صاحب سے بلا ناغہ مثنوی مولانا روم رح سنتے تھے۔ اس مجلس میں سوائے خاص مریدوں کے کسی کے آنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ تینوں طرف کے دروازے "مقفل" کر دئے جاتے تھے [۶]

---

۵ فخر الطالبین ص ۱۳۰

۶ شجرۃ الانوار ص (قلمی)

رمضان المبارک کے مہینے میں حفاظ وغیرہ کے لئے خاص بندوبست ہوتا تھا اور ایسی رونق رہتی تھی کہ:-

"در رمضان شریف ہر روزے	رمضان شریف کے زمانے میں
ارباب عبادت در ظل عاطفت	اربابِ عبادت کے دن مثل عید
مثل عید و ہر شے در افطار و	اور رات، شب قدر کی طرح ان کے
تراویح ہمہ چو شب قدر" [۵۱]	ظل عاطفت میں بسر ہوتی تھی -

آپ کا معمول تھا کہ ۲۷ رمضان کو سرائے عرب چلے جاتے تھے، اور قطب صاحب یا نظام الدین صاحب رح میں معتکف ہوتے تھے [۵۲]

لباس اور خوراک | جب باہر تشریف لے جاتے تو دستار، جامہ اور دوپٹہ زیب تن ہوتا۔ جب گھر میں تشریف فرما ہوتے تو جبّہ و کلاہ استعمال فرماتے سردی کے موسم میں فرغل اور دوشالہ بھی استعمال فرمالیتے تھے۔ شروع زمانے میں ایک تلوار اور کٹار دھنی بھی اپنے پاس رکھتے تھے [۵۳]

شاہ فخر صاحب رح کی خوراک بہت کم تھی۔ اکثر پرہیزی کھانا کھاتے تھے - مناقب المحبوبین میں لکھا ہے:-

ایں قدر کم خور شخصے کم خواہد بود [۵۴]	اتنا کم کھانے والا شاید ہی کوئی شخص ہو

---

[۵۱] تکملہ سیر الاولیاء - ص ۱۱۸

[۵۲] تکملہ سیر الاولیاء - ص ۱۱۸

[۵۳] مناقب فخریہ - ص ۳۴

[۵۴] مناقب المحبوبین - ص ۹۷

[۵۵] تکملہ سیر الاولیاء - ص ۱۱۹

اخلاق حضرت شاہ فخر صاحبؒ کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ ہر چھوٹے بڑے سے انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ کسی کو مصیبت میں دیکھتے تو جب تک اس کی مدد نہ کر لیتے چین نہ پڑتا۔ ایک مرتبہ حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ جب جہاز میں سوار ہونے لگے ایک بڑھیا نے بڑھ کر سوال کیا اور عرض کیا مجھے لڑکی کی شادی کرنی ہے اور میرا حال یہ ہے کہ فاقے کرتی ہوں، کس طرح یہ کام انجام دوں۔ شاہ صاحبؒ نے یہ سنتے ہی جہاز سے اپنا سامان اتار لیا اور جو کچھ زاد راہ تھا، اس بڑھیا کے حوالے کر دیا، اور خود وطن واپس آ گئے۔[۵۱]

حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کسی شخص کو رنجیدہ یا ملول نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر آنے والے کی دل جوئی کرتے تھے اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ آپ کے پاس سے کوئی شخص رنجیدہ خاطر نہ جائے۔ آپ کے اخلاق سے دشمن تک متاثر ہوتے تھے۔ لوگ آپ کی جان لینے کی فکر میں جاتے، لیکن جب آپ سے ملتے تو بقول مصنف مناقب فخریہ ؎

اے برتر از سپہر و مہ و مہر جاہ تو
گردن کشاں مسخر تیغ نگاہ تو[۵۲]

ایک افغانی آپکی خانقاہ میں آیا اور آپؒ پر حملہ کیا۔ خدام نے ہاتھ پکڑ لئے آپ نے فرمایا۔ ہاتھ چھوڑ دو اور اپنا سر مبارک زمین پر ڈال کر فرمایا:۔

"ما حاضریم ہر چہ بخاطر شماست بکنید۔"[۵۳] ہم حاضر ہیں جو کچھ تمھارے جی میں ہے کرو۔

---

[۵۱] شجرۃ الانوار

[۵۲] مناقب فخریہ۔ ص ۵۱

[۵۳] مناقب فخریہ۔ ص ۵۲

وہ شخص اس وقت شرمندہ ہو کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمیوں کو اور اپنے ساتھ لایا۔ اس کو دیکھتے ہی آپ تعظیم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے، اور فرمایا "صاحب بخیر و عافیت ؟" ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ اخلاق کا وہ ہتھیار جو پہلی بار اُچٹتا ہوا لگا تھا اپنا کام کر گیا۔ اور ان لوگوں نے "سنگ ہائے حویلی" پر اپنے سر اور پیر کوٹ کوٹ کر معافی مانگی [۵۱]

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخر صاحب ہر چھوٹے بڑے کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ علالت اور "امراضِ شدید" میں بھی آپ اسی طرح آنے والے کا استقبال کرتے [۵۲] مصیبت میں ہر شخص کی دست گیری کے لئے تیار رہتے۔ لوگوں کی خوشی اور غم میں شرکت فرماتے۔ اگر کسی غریب کے یہاں کوئی تقریب یا غمی ہوتی تو کئی کئی بار تشریف لے جاتے، اور اپنے مریدین و معتقدین کو ہدایت فرماتے کہ وہ وہاں ضرور جائیں۔ تاکہ

"خاطر او مطمئن شود و غم ازیں تفقدات کریمانہ برطرف گردد" [۵۳]

بیمار کی عیادت کرنی ہوتی تو یہی طریقہ اختیار فرماتے۔ خود کئی کئی بار جاتے اور اپنے مریدین کو ہدایت کرتے کہ وہ بار بار مزاج پرسی کے لئے جائیں [۵۴] ایک مرتبہ اکبر آباد کے ایک پرانے دوست مرزا غلام حسین علاج کی غرض سے دہلی آئے تو آپ نے

---

[۵۱] مناقب فخریہ ۔ ص ۳۱

[۵۲] مناقب فخریہ ۔ ص ۳۱

[۵۳] مناقب فخریہ ۔ ص ۳۱

[۵۴] فخر الطالبین ۔ ص ۲۴

اُن کی حددرجہ نگرانی اور امداد کی۔ ایک علیحدہ مکان سکونت کے لیے دیا طبیب معالجہ کے لیے مقرر کیا اور کئی کئی بار خود اُن کی مزاج پرسی کے لیے جاتے تھے[۵۱] جو لوگ روزانہ اور پابندی سے آنے والے تھے ان کی غیر حاضری سے پریشان ہوجاتے اور اُن کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بے چین رہتے دو روز پیرا خاکروب نہیں آیا تو بہت متفکر ہوئے۔ جب معلوم ہوا کہ وہ بہت بیمار ہے تو فوراً اُسے دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ بہت محبت سے اُس کا حال دریافت کیا۔ میر حسن حکیم کو علاج کے لئے مقرر کیا اور نقد انعام دینے کے بعد فرمایا۔

میاں پیر محمد! شما کہ از دو روز نیامدید و از فقیر کہ در پرسش احوال شما تاخیر واقع شد معاف خواہند فرمود"[۵۲]	میاں پیر محمد! تم جو دو روز نہیں آئے اور فقیر سے اس زمانے میں پرسش احوال میں تاخیر ہوئی اس کو معاف فرمادو۔

اخلاق کی ان ہی بلندیوں کو دیکھ کر مناقب فخریہ کا مصنف بے اختیار پکار اُٹھتا ہے ؎

بہ دہلی مظہر ماہِ حجازی
تو گوئی نائبِ شاہِ حجازی[۵۳]

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ دہلی کے ایک شخص نے اپنے زمانے کے تین

---

۵۱ فخر الطالبین ۔ ص ۲۴
۵۲ مناقب فخریہ ۔ ص ۳۷
۵۳ شجرۃ الانوار

بڑے بزرگوں کے اخلاق کا امتحان کرنا چاہا۔ اس نے شاہ ولی اللہ صاحبؒ شاہ فخرالدین صاحبؒ اور مرزا مظہر جان جاناںؒ کو مدعو کیا۔ تینوں بزرگ اس کے مکان پر پہنچ گئے۔ میزبان زنانے مکان میں کھانا لینے کے لئے گیا۔ کئی گھنٹے بعد واپس آیا۔ اور بیوی کی علالت کا عذر کرکے کچھ پیسے ان تینوں بزرگوں کو دیے شاہ فخرالدین صاحبؒ نے یہ پیسے کھڑے ہو کر لئے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بیٹھ کر مرزا مظہر جان جاناں نے یہ کہہ کر کہ تم نے مجھے بڑی تکلیف پہنچائی۔

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ شاہ فخرالدین صاحبؒ نہایت صادق القول بزرگ تھے[۱] وعدہ بہت کم کرتے تھے، لیکن جب کر لیتے تو تا[illegible] بے قرار ہو [illegible][۲]

شیخی اور اظہار بزرگی سے آپ کو سخت تنفر تھا۔ جب کسی دعوت یا جلسہ میں تشریف لے جاتے تو لوگوں کو ساتھ چلنے کی اجازت نہ دیتے۔ اس سے نمائش ہوتی تھی اور یہ آپ کو پسند نہ تھی۔ حکم تھا کہ لوگ علیحدہ علیحدہ منزل مقصود پر پہنچ جائیں[۳] کوئی آپ کی تعریف کرتا تو ناپسند فرماتے۔ کوئی مرید اگر ہاتھ باندھ کر یا گردن جھکا کر ادب یا تعظیم کا اظہار کرتا تو ناخوش ہوتے تھے[۴] کوئی شخص پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو روک دیتے اور ناراض ہوتے تھے[۵] دعوتوں کو پسند نہیں فرماتے

---

۱ مناقب فخریہ - ص ۳۴

۲ مناقب فخریہ - ص ۳۳

۳ فخر الطالبین - ص ۲۵، ۲۳

۴ مناقب فخریہ - ص ۳۲

۵ شجرۃ الانوار

تھے لیکن کسی کی استدعا کو رد بھی نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ

"خوشی سائل را بر خوشی خود مقدم دارند"[۵۱]

جب کوئی شخص ملنے آتا تو نہایت بشاشت اور خندہ روئی کے ساتھ گفتگو فرماتے۔ اکثر "حضرت" یا "صاحب" سے خطاب کرتے تھے[۵۲] جو شخص ملنے آتا اس سے اس کی فہم و ادراک کے مطابق گفتگو فرماتے۔

"گفتگوئے با ہر کس موافق اطوار او، با عالم از علم و بہ سپاہی از سپاہ گری و با ھوس از کیمیا"[۵۳]

ہر شخص سے اس کے رجحان اور دلچسپی کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ عالم سے علم کے متعلق، سپاہی سے سپاہ گری کی بابت اور ھوس سے کیمیا کی نسبت۔

اسی خوبی کو بیان کرنے کے بعد مصنف مناقب فخریہ لکھتا ہے۔ ع

یار ما چوں آب در ہر رنگ شامل می شود[۵۴]

ایک مرتبہ آپ نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ میرے پاس لوگ مختلف خیال سے آتے ہیں۔ بعض مجھ کو عالم جان کر آتے ہیں۔ بعض صوفی خیال کرتے ہیں۔ کچھ کیمیاگر سمجھتے ہیں۔ بعض میرے اخلاق کی وجہ سے ملنے آتے ہیں۔ بعض اعمال و اوراد کے لئے۔

"پس مرا نیز سلوک موافق اعتقاد ایشاں بہ ایشاں است"[۵۵]

---

۵۱ فخر الطالبین۔ ص ۲۳

۵۲ مناقب فخریہ۔ ص ۳۳

۵۳ مناقب فخریہ۔ ص ۳۳

۵۴ مناقب فخریہ

۵۵ فخر الطالبین۔ ص ۱۴

شاہ نور محمد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ شاہ فخر صاحبؒ بڑے خوش طبع تھے لیکن جب میں حاضر ہوتا تو خوش طبعی نہ کرتے تھے۔ لہذا جب میں دیکھتا تھا کہ ایسے لوگ اُن کی مجلس میں ہیں جن سے وہ خوش طبعی کرتے ہیں تو میں وہاں سے چلا آتا تھا اور وہ اس لئے کہ

"با اہل ہر طریق نگاہ داشت مناسبت او تلقین ہموں و تیرہ بود۔"[۵۱]

شاہ فخر صاحبؒ تحکمانہ انداز میں یا قطعی طور پر کوئی بات نہ کہتے تھے "چنیں باید کرد" کبھی آپ کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ یوں ہی فرماتے "صلاح چنیں می نماید" کسی سے کوئی کام کرنے کو کہتے تو نہایت نرمی سے۔

لکھا ہے:-

"بطور حکم ہرگز خطاب نفرمایند۔ بنوعے ارشاد می کنند کہ گویا شخصے محتاج در خدمت اغیار بعرض رساند۔"[۵۳]

اکثر ایسا ہوا کہ لوگ آپ کے کتب خانے سے کتابیں چرا کرلے گئے۔ کوئی اجنبی شخص اُن کو فروخت کرنے کے لئے بھی حضرت ہی کی خدمت میں آگیا تو کبھی آپ نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کتاب تمھیں کہاں سے ملی[۵۴] ایک مرتبہ ایک شخص آپ کے کپڑے اور چاقو وغیرہ چرا کرلے گیا۔ چور کا پتہ چل گیا۔ لیکن آپ نے اس کے منہ پر قطعاً اس کا اظہار نہیں فرمایا[۵۵] کشمیر کے صوبے دار بلند خاں نے آپ کی خدمت میں ایک ہزار روپے بطور نذر بھیجے، لانے والے نے صرف کرلئے

---

[۵۱] مناقب فخریہ۔ ص ۴۲

[۵۲]، [۵۳] فخر الطالبین۔ ص ۲۵

[۵۴]، [۵۵] مناقب فخریہ۔ ص ۳۸

بلند خاں کو معلوم ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ صوبہ دار اس کو سزا دے آپ نے لکھ دیا کہ اسی کی قسمت کے تھے۔ اس سے کچھ نہ کہنا "قسمت او بود ہیچ نگوئید" [51]

ایک مرتبہ نواب خیر النساء بیگم ہمشیرہ شاہ عالم نے کچھ ظروفِ نقرئی، اور بارہ سو روپے آپ کی خدمت میں روانہ کیے۔ ملازم نے آپ کو اطلاع بھی نہ کی اور اپنے پاس رکھ لیے۔ کچھ مدت کے بعد بیگم کو شبہ ہوا اور ملازم سے رسید طلب کی۔ ملازم سخت حیران اور پریشان ہوا۔ شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی چاہی۔ آپ نے فوراً سید احمد کو حکم دیا کہ جو کچھ سامان یہ شخص بیان کرے وہ لکھ دو۔ اس کے بعد مہر لگا کر اس کو دے دی [52] اخلاق کی یہ بلندیاں لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی تھیں اور اکثر اُن کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو جاتا تھا۔

جب آپ دہلی تشریف لائے تھے تو ایک بڑھیا آپ کی خدمت کرنے لگی تھی۔ جب وہ مرنے کے قریب ہوئی تو اُس نے اپنے بیٹے میر کلو کو آپ کے سپرد کیا۔ آپ نے اس کا بے حد خیال رکھا اور بیٹوں کی طرح اس کی پرورش کی۔ اور

"باوجود حرکت جوانانہ گاہے معاتب نشدند، والیوم بکمال اعزاز است" [53]

دل جوئی کا یہ عالم تھا کہ شخص کی خواہش اور آرزو کو پورا کرتے تھے۔ ایک مجذوب کا واقعہ اسرار الکمالیہ میں لکھا ہے کہ ایک دن کہنے لگا کہ میاں

---

[51] مناقب فخریہ ص ۳۸

[52] شجرۃ الانوار

[53] مناقب فخریہ ص ۴۰

نور محمد صاحب کی دعوت کر رہا ہوں۔ شاہ صاحب نے مسکرا کر پوچھا کہ اِس ضیافت کے لئے کہاں سے آئے گا۔ س نے فوراً کہا آپ دیں گے۔ یہ سنتے ہی آپ نے لانگری کو حکم دیا کہ ضیافت کے لئے کھانا تیار کرا دیا جائے[۵۱]

جس زمانے میں شاہ صاحب رح دہلی میں جلوہ افروز تھے وہ بڑی سیاسی بدامنی اور ہنگامے کا دور تھا۔ بڑے بڑے گھرانے تباہ و برباد ہو رہے تھے امیر غریب ہو گئے تھے۔ خاندانوں کی عزت اور ناموس خاک میں مل رہا تھا۔ شاہ صاحب رح کو ایسے گھرانوں کا خاص خیال رہتا تھا۔ اور اُن کی مدد فرمایا کرتے تھے۔ بھیک مانگنے والوں کو وہ زیادہ نہ دیتے تھے بلکہ یہ فرما دیتے تھے کہ اگر میں اُن کو نہ دوں گا تو کوئی دوسرا دیدے گا۔ دنیا تو اُن کا ہے جو اپنی عزت اور ناموس کی وجہ سے بھیک نہیں مانگ سکتے اور فاقہ کرتے ہیں[۵۲]

مریدوں کو آپ ہمیشہ یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص ہمیں بُرا کہے تو اس سے مکابرہ نہ کرو[۵۳]

آپ کی صحبت کے اثرات | شاہ فخر الدین صاحب رح کی صحبت جادو کا اثر رکھتی تھی۔ جو ان کی خانقاہ میں آجاتا تھا، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا جس پر نظر پڑ جاتی وہ شکار ہو جاتا۔ جرائم پیشہ لوگ پناہ تلاش کرنے خانقاہ میں آتے اور ولی بن کر نکلتے[۵۴] گردن کشاں، تکلیف پہنچانے کی نسبت سے

---

۵۱ مناقب المحبوبین۔ ص ۷۱

۵۲ فخر الطالبین۔ ص ۹۵

۵۳ فخر الطالبین۔ ص ۸۹

۵۴ فخر الطالبین۔ ص ۶۵

آتے اور حلقہ بگوش ہو جاتے۔ اُن کا سر پھوڑنے آتے خود اپنا سر پھوڑتے ہوئے جاتے

جس طرف نظر اُٹھ جاتی اپنا کام کر جاتی ؎

این نگاہے است کہ سطح فلک درگذرد

پردۂ دل چہ بود پردۂ افلاک درد ۵۱

ایک شخص ایذا دینے کی نیت سے آپ کے پاس آیا۔ لیکن یہاں آکر از خود رفتہ ہو گیا۔ اور نعرہ لگانے لگا۔

رہزن دل ہمیں است"۵۲

ایک قاتل اپنی جان بچانے کے لئے، آپ کی خانقاہ میں آیا۔ چند ہی روز میں اس کا یہ حال ہو گیا کہ

"در ہر کہ نظر می کرد حالتش متغیر می شد" ۵۳

ایک مرتبہ دس افغانی آپ کو شہید کرنے کی نیت سے قطب صاحب رحیں جمع ہوئے۔ لیکن جب نگاہیں ملیں تو عالم بدل گیا۔ مناقب فخریہ کے مصنف نے لکھا ہے ؎

نگاہت دشمناں را دوست کردہ

اثرہا در رگ و در پوست کردہ

کہ آرے خلیلے زبت خانۂ

کنی آشنائے زبیگانۂ ۵۴

---

۵۱ مناقب فخریہ ص ۵۹

۵۲ مناقب فخریہ ص ۵۰

۵۳ مناقب فخریہ ص ۱۶

۵۴ مناقب فخریہ ص ۵۰

مناقب کا مصنف جب پہلی بار خود حاضر ہوا تھا تو ایسا محسوس کرنے لگا تھا۔

"گویا شرابے بود کہ درجامِ دل من ریختند د آتشے بود کہ در سینۂ من اندا ختند" [۵۱]	گویا ایک شراب تھی جو جامِ دل میں ڈال دی یا ایک آگ تھی جو میرے سینے میں بھر دی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ صاحبؒ | حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ جو اس وقت علمی دنیا کے صدرنشین تھے۔ شاہ صاحبؒ کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔ ملفوظاتِ عزیزی میں متعدد جگہ حضرت شاہ فخر صاحب کا ذکر آیا ہے اور اس سے ان کی قلبی تعلق اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں "تفسیر عزیزیہ" کا ایک قلمی نسخہ (کتبہ ۱۲۴۹ھ) ہے شیخ مصدق الدین جو شاہ فخر صاحب کے مرید تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے درسِ تفسیر میں شریک ہوتے تھے اور جو کچھ سنتے تھے "لفظ بلفظا ودرا ورسلک تحریر کشیدند" (ص ۲) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے جب اس مجموعہ کو ملاحظہ فرمایا تو ایک مقدمہ لکھا اس میں ایک جگہ شیخ مصدق الدین کی شاہ فخر صاحبؒ سے نسبتِ ارادت کا ذکر کرتے ہیں تو اس طرح نام لیتے ہیں:۔

"برادر دینی، جوہر ...... حق گزینی، سالک راہِ خدا جوئی، ملازم طریقہ صدق گوئی مقبول جناب مولانا عالی جناب خلائق مآب و بالفضل اولانا فخر الملتہ والدین محمد قدس اللہ سرہٗ الامجد" [۵۲]

---

۵۱ مناقب فخریہ۔ ص ۱۶

۵۲ تفسیر عزیزیہ (قلمی)، ص ۲ سر شاہ سلیمان کلکشن

شاہ فخر صاحبؒ کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور اُن کے بھائیوں سے بڑا تعلق تھا۔ اکثر مشکلات میں اُن کی مدد فرماتے تھے۔ دہلی میں جب شیعوں کا اقتدار بڑھا تو شاہ عبدالعزیز صاحب پر بھی مصیبت نازل ہوئی۔ ایسے وقت میں شاہ فخر صاحبؒ ہی نے اُن کی مدد فرمائی۔ اور اُن کو اپنی حویلی میں رکھا۔ لکھا ہے :-

"فرزندان شاہ ولی اللہ مغفور را در آنچہ متصدیان سلطانی از حویلی علیحدہ ساختہ و حویلی را بہ ضبط آوردہ بودند۔ آں حضرت بہ حویلی مبارک جا دادند، و غم خواری فرمودند و حویلی مذکور را از جناب سلطان بہ ایشاں دہانیدند و باعزاز و اکرام در آں جا رسانیدند"[۱]

حضرت شاہ فخر صاحب کا دہلی میں بڑا اثر اور اقتدار تھا۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ALEXANDER SETON ریذیڈنٹ دہلی سے شاہ عبدالعزیز صاحب کا جھگڑا ہو گیا۔ حضرت شاہ فخر صاحبؒ نے درمیان میں پڑ کر صفائی کرائی[۲]

امیر شاہ خاں صاحب کا بیان کیا ہوا ایک واقعہ امیر الروایات میں درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نجف خاں نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحب کو اپنی قلم رو سے نکالا تھا اور یہ بزرگ معہ زنانوں کے شاہدرہ تک پیدل آئے تھے تو شاہ فخر صاحبؒ نے شاہدرہ سے اُن کی سواری کا بندوبست کیا تھا[۳]

---

۱۵ مناقب فخریہ۔ ص ۳۱

۲۵ مناقب فریدی۔ ص ۳۶

۳۵ "الفرقان" ——— شاہ ولی اللہ نمبر۔ ص ۲۳۲

اتباع شریعت و سنت کی تلقین | جس وقت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے مسند ارشاد بچھائی تھی۔ اس وقت کو بڑے بڑے بزرگ دہلی میں موجود تھے جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا ہے۔

"در عہد محمد شاہ بادشاہ بیست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند" [۵۱]

لیکن کثیر تعداد ایسے صوفیوں کی تھی جو شریعت اور سنت کو چھوڑ چکے تھے اور اپنے نفس کو دھوکہ میں ڈال کر دوسروں کو گمراہ کر رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے وصیت نامہ میں ایسے دھوکہ بازوں سے بچنے کی ہدایت کی تھی۔ فخر الطالبین کا مصنف سید نور الدین فخری جو شاہ فخر الدین صاحبؒ کا مرید ہے لکھتا ہے۔

"بہر اہل اللہ ہر کس را کہ نصیب دست دہد قول و فعل او را قال اللہ و قال الرسول انگارد" [۵۲]

یہ بات نور الدین نے اس وقت لکھی ہے جب اس نے اپنے مرشد کو اس معیار پر پورا پایا ہے۔ ملفوظات میں جگہ جگہ اتباع شریعت و سنت کی تلقین ہے۔ خود شاہ صاحبؒ کا یہ عالم تھا کہ معمولی معمولی باتوں میں سنت کا خیال رہتا تھا۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے۔

"در امور جزوی و کلی اتباع سنت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام | چھوٹی اور بڑی ہر بات میں خود اتباع سنت نبوی کرتے اور لوگوں

---

۵۱ ملفوظات شاہ عبدالعزیز۔ ص ۱۰۶

۵۲ فخر الطالبین۔ ص ۲

و بہ بندگان نیز دریں امر تاکید اکید[۵۱] کو بھی اس امر کی بڑی تاکید کرتے ہیں۔

آپ کی وضع قطع، اعمال و عادات سب شریعت کے مطابق تھے۔ سید نور الدین کا بیان ہے:۔

"وضع و عملِ ایشاں مطابق و تابع حدیث نبوی است صلی اللہ علیہ وسلم"[۵۲]	ان کی وضع اور عمل حدیث نبوی کے مطابق اور تابع ہے۔

تقریر کرتے تو ہمیشہ شریعت کے مطابق۔ جامع ملفوظ کا بیان ہے:۔

"تقریر خواجہ کہ عین شریعت واقع شد"[۵۳]

مسئلہ وحدتِ وجود پر شاہ صاحبؒ کا ایمان تھا۔ لیکن اس کے متعلق بحث و مباحثہ اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ اس سے شریعت کے خلاف چند شدید غلطیاں پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔[۵۴]

اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو بغیر سند کبھی نہ فرماتے۔[۵۵] نماز جماعت سے ادا کرتے اور اسی کی تلقین فرماتے:۔

"تقید جماعت بدرجہ اتم در خاطر مبارک است"[۵۶]

---

۵۱ مناقب فخریہ۔ ص ۴۰ نیز شجرہ الانوار

۵۲ فخر الطالبین۔ ص ۱۳۲

۵۳ فخر الطالبین۔ ص ۴

۵۴ مناقب فخریہ۔ ص ۳۴

۵۵ فخر الطالبین۔ ص ۱۴

۵۶ فخر الطالبین۔ ص ۲۶

معمولی معمولی باتوں میں اتباعِ سنت کا خیال رہتا تھا۔ برتن "مکان ضرور" اور وضو کے لئے علیحدہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے مریدین کو اس کی تلقین فرماتے ہوئے کہنے لگے کہ حضور سرور کائنات کی یہ سنت ہے۔ وہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے[۵۲] ایک مرتبہ کھانے کے لئے بیٹھے تو فرمانے لگے۔ "میں جس طرح بیٹھا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح بیٹھا کرتے تھے[۵۳] پھر لوگوں کو مسواک کی ہدایت فرمائی کہ اس پر حدیث شریف میں بہت اصرار کیا گیا ہے کہ جو شخص خواب سے بیدار ہو اس کو مسواک کرنی چاہیئے[۵۴] ایک مرتبہ خوشبو کی تلقین فرماتے ہوئے نہایت محبت آمیز لہجہ میں فرمایا "حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو بہت پسند تھی"[۵۵]

ملفوظات و حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے مریدوں کو اتباع سنت و شریعت پر مجبور کرتے تھے۔ اور طرح طرح سے اس کے فوائد بیان فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنا قصہ بیان کرنے لگے کہ جنگ کے دوران میں بارود کے اثر سے آنکھوں کو نقصان پہنچ گیا تھا اور ڈر تھا کہ بصارت بہت کم ہو جائے گی لیکن سرمہ کے استعمال سے بصارت میں زیادہ کمی نہیں ہوئی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہ متابعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھی[۵۶]

ایک جگہ مریدوں کو ہدایت ہوتی ہے:۔

درودے کہ در حدیث شریف	حدیث شریف میں جو درود آیا ہی
آمدہ ہموں را بخوانند بطرف	اسی کو پڑھیں۔ دوسری چیزوں کی

۵۲، ۵۳، ۵۴ فخر الطالبین - ص ۱۰۰ - ۱۰۱

۵۵، ۵۶ فخر الطالبین - ص ۱۰۱

چیزہائے دیگر رجوع نکنند و بہ	طرف رجوع نہ کریں ۔ مذہب حنفی
مذہب حنفی تعصب می کنند	پر مضبوطی سے قائم رہیں ۔ حدیث
بطرف حدیث بسیار رجوع دارند"[1]	کی طرف کثرت سے رجوع کریں ۔

وفات سے کچھ پہلے کا ذکر ہے کہ ریش مبارک بڑھ گئی تھی ۔ ملول ہو کر فرمانے لگے:

" ایں ترک سنت از ما شد"[2]

سکھ اور شاہ صاحب رح شاہ فخر الدین صاحب رح کے زمانے میں سکھوں کی چیرہ دستیاں انتہا کو پہنچ گئی تھیں ۔ دہلی کا ہر خاندان ہراسان اور پریشان تھا ۔ بڑے بڑے خاندانوں کی عزت خطرے میں تھی ۔ شاہ فخر الدین صاحب رح نے قتل و غارت گری کے یہ سب نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے ۔ خود جب وہ دہلی سے غیاث گڈھ گئے تھے تو سکھوں سے حفاظت کے لئے راستے میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا[3] سکھوں کی غارت گری سے ان کو سخت صدمہ تھا ۔ انسانی خون کی ارزانی دیکھ کر وہ خون کے آنسو روتے تھے ۔ مسلمانوں کو ہراساں اور پریشان دیکھ کر اُن کا دل تڑپنے لگتا تھا ۔ اُن کو بادشاہ کی حالت پر غصہ آتا تھا کہ وہ ان فتنوں کے انسداد سے کیوں غافل ہے ۔ آخر کو نہ رہا گیا اور ایک دن دربار میں بادشاہ سے کہہ اُٹھے :۔

" بہ تنبیہ آنہا (فرقہ سکھاں) باید پرداخت کہ فلاحِ دینی و دنیوی در ضمن آں است "[4]

---

[1] فخر الطالبین ص ۱۴۴

[2] ۔ [3] شجرۃ الانوار

[4] مناقب فخریہ ۔ ص ۳۶

و تکملہ سیر الاولیاء ۔ ص ۱۱۷

بادشاہ کو ہدایت | چاروں طرف زوال و انحطاط، کش مکش و کشیدگی، ابتری و بربادی دیکھ کر شاہ صاحب مجبور ہوگئے کہ بادشاہ کو سمجھا دیں کہ امراء کے آپس کے لڑائی جھگڑوں سے ملک ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اُسے نظامِ مملکت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ایک دن بادشاہ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا

"سلطان عصر تا بذات خود بہ امور ملک ستانی و ملک داری متوجہ نشود، و اختیار محنت و مشقت نکند بند و بست بہ ہیچ وجہ صورت نمی گیرد۔"	سلطان وقت جب تک بذاتِ خود امور مملکت کی طرف متوجہ نہ ہوگا اور محنت و مشقت اختیار نہ کرے گا۔ حالات کبھی ٹھیک نہ ہو سکیں گے۔

حکومت امیروں کے سپرد کرنے کے خطرناک نتائج سے اس طرح بادشاہ کو آگاہی کرتے ہیں:۔

"اگر امیرے ماموروِ مختار و نائب سلطنت نماید امرائے دیگر ناخوش می شوند و سر بہ طاعت اونمی نہند۔ و بے خبر بہ پے بروئی باسلطان می گردد و رعب سلطان ہر کہ و مہ نمی ماند۔ و فوج بادشاہی کہ محتاج بہ آں امیر شد او را نمی شناسد و سر رشتہ تعلق شاں از سلطان منقطع می گردد۔ و دماغ امیر ہوائے انا ولا غیرے می پیچد دگاہ باشد کہ بر سرِ بلغی می آرد، و در سلف اکثر ہم چنیں شدہ است"[۵]

جس سیاسی بصیرت کے ساتھ شاہ صاحب نے بادشاہ کو خطرات سے آگاہ

۵ۓ مناقب فخریہ۔ ص ۳۵۔ ۳۶
و تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۱۷۔ ۱۱۶

کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسی پیچیدگیوں اور زوال کے اصلی اسباب کو سمجھ چکے تھے۔ ایک جگہ پھر بادشاہ کو ہدایت فرماتے ہیں:

"پس اوّل مقدم این است کہ آں صاحب بذات خود مستعد محنت کشی و ملک گیری شوند" [۵]

رشد وہدایت، اصلاح وتربیت کی جو آواز شاہ صاحبؒ نے بلند کی تھی وہ جھونپڑوں سے لے کر محلات تک گونجی۔ اس کے اثرات کیا ہوئے؟ کوئی نہیں بتا سکتا جہاں ع ——— ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ کی صدائیں سنائی دیتی ہوں وہاں اس کے اثرات کا تلاش کرنا بے سود ہے لیکن شاہ صاحبؒ کی بے باکی اور جرأت کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑے گا۔ انھوں نے کلمۂ حق بلند کرکے اپنا فرض ادا کر دیا۔

شیعہ اور شاہ صاحب اس زمانے میں شیعوں کا اقتدار ہندوستان میں بہت بڑھ گیا تھا۔ سنی علماء پر سختی کی جا رہی تھی، اور پُر امن زندگی ناممکن بن چکی تھی۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ گو ان ہنگاموں سے بہت دور تھے اور شیعوں کو مرید بھی کر لیتے تھے۔ لیکن وہ بھی اُن کی سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ مصنف مناقب فخریہ نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں دشمنوں نے مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کو شہید کیا تھا۔ میں ایک بڑ کے درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا کہ ایک ایرانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک بڑے سنی عالم کو تو میں قتل کر چکا ہوں۔

---

[۵] مناقب فخریہ۔ ص ۳۶ - ۳۵
و تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۱۷ - ۱۱۶

لیکن ابھی جو سب سے بڑا شتنی عالم ہے وہ باقی ہے۔ جلد ہی میں اس کا بھی کام تمام کر دیتا۔ مگر کیا کروں اس کے ارد گرد تو مریدوں کا ایک جمگھٹا رہتا ہے۔ میں اسے کبھی تنہا نہیں پاتا[۵۱] شاہ صاحب کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔ حق تعالےٰ حافظ و ناصر است۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس شدید مخالفت کے شاہ صاحبؒ حالات سے نا اُمید نہ تھے۔ اور شیعوں میں اپنا کام کرتے تھے۔ وہ انھیں مرید بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے شاہ فخر صاحبؒ سے کہ "بسیار محبت و بے تکلفی بود" اس کی وجہ پوچھی۔ فرمایا کہ اس طرح سے وہ تبرے سے باز آجاتے ہیں۔

"ازیں جہت از سب و تبرا باز می آیند"[۵۲]

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ صاحبؒ نے اس طریقے سے شیعوں پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ ملفوظات شاہ فخر الدینؒ میں بعض ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے جو شیعہ تھے لیکن آپ کی صحبت میں رہ کر سُنی ہو گئے تھے۔ ایک شخص کے متعلق لکھا ہے

"پیش از ملاقاتِ حضرت مولانا مذہب شیعہ داشت بغلظتِ تمام۔ اکنوں بفضل الٰہی تابع سنت است۔"[۵۳]

اپنے ایک خط میں اخفا کی ہدایت کرتے ہوئے نہایت دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں

---

۵۱ مناقب فخریہ۔ ص ۵۵

۵۲ ملفوظات شاہ عبدالعزیز۔ ص ۲۹ - ص ۵۷۔

۵۳ فخر الطالبین۔ ص ۱۱۶۔

"گویند کہ در مذہب شیعہ تقیہ رواست۔ من گوئم کہ فقیر را لازم است" [۵۱]

کہتے ہیں کہ تقیہ شیعہ مذہب میں رواہے۔ میں کہتا ہوں فقیر کے لئے تو یہ لازم ہے۔

اُمرار و سلاطین سے تعلقات | چشتیہ سلسلہ کا ایک نہایت ہی اہم اصول یہ رہا ہے کہ امرار و سلاطین سے حتی المقدور بچا جائے۔ اور اُن کی مجلسوں سے گریز کیا جائے۔ شاہ فخر الدین صاحبؒ بھی اس سلسلے میں اپنے بزرگوں کی سنت پر عمل کرتے تھے۔ فخر الطالبین کا مصنف لکھتا ہے:-

"از اغنیا ملاقات بکمال استغنا دارند" [۵۲]

مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ اور امرار نے ہر چند دیہات قبول کرنے کی درخواست کی، لیکن آپ نے قبول نہ کی۔

"ہر چند حضرت ظل سبحانی و امرائے مرید و معتقد تمنائے قبول دیہات نمودند، قبول نہ فرمودند و ارشاد کردند کہ اگر خواہید کہ ما دریں شہر باشیم بار دیگر ایں حرف تمنائے بمیاں نیاید" [۵۳]

ہر چند حضرت ظل سبحانی اور اُن اُمرار نے جو آپ کے مرید و معتقد تھے، دیہات قبول کرنے کی درخواست کی، لیکن قبول نہ کی بلکہ فرمایا کہ اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی شہر میں رہیں تو اس طرح کی بات پھر (زبان) پر نہ آئے۔

ایک دن بادشاہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قلعہ میں تشریف لے چلنے

---

۵۱ مناقب المحبوبین۔ ص ۵۲

۵۲ فخر الطالبین۔ ص ۸

۵۳ مناقب فخریہ۔ ص ۳۴

کی درخواست کی۔ آپ چلے گئے۔ وہاں مجبوراً آپ کو کھانا بھی کھانا پڑا جب واپس آئے تو اس کا تدارک اس طرح کیا کہ فوراً فقراء اور درویشوں کے مکانات پر تشریف لے گئے، اور اُن کے ساتھ کھانا کھایا[۵۱]

سرسید نے لکھا ہے "جتنے امراء ذوالاقتدار اور سلطانِ عہد تھے۔ آپ کی بیعت سے مشرف ہو کر آپ ہی کی خاکِ در کو وسیلۂ آبرو اور آپ ہی کے غبارِ آستاں کو تاجِ عزت و اعتبار سمجھتے تھے[۵۲] شاہ عالم بادشاہ کو آپ سے بے حد عقیدت تھی[۵۳] مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ آپ سے ملاقات کے لئے آیا کرتا تھا[۵۴] عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحبؒ نے چند تبرکات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے غیاث گڈھ[۵۵] جانا چاہا تو بادشاہ نے نہ جانے دیا۔ ایک مرتبہ چلے گئے جب واپسی کی خبر ملی تو شاہ عالم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے :-

"چوں حضرت ظلِ سبحانی شاہ عالم بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ خبر فرحت اثر آمدن حضرت مولانا صاحب شنیدند کمال سرور بخاطر گذرا یندند"[۵۶]

---

۵۱ مناقب فخریہ ۔ ص ۳۳

۵۲ آثار الصنادید۔ ص ۳۲

۵۳ شجرۃ الانوار

۵۴ مناقب فخریہ ۔ ص ۳۳

۵۵ ان تبرکات کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو
السنۃ الجلیلۃ فی الچشتیۃ العلیۃ از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ص ۹۵-۹۸
اس کتاب میں واقعات جلال خانی" مصنفہ محمد علی خاں سے اس جبہ کے متعلق تفصیلی معلومات درج کی گئی ہے

۵۶ شجرۃ الانوار

بادشاہ گل و شیرینی اُن کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا[۵۱]۔ شاہی خاندان کو بھی آپ سے بے حد عقیدت و ارادت تھی۔ شاہ عالم کی بہن خیر النسا بیگم آپ کی مرید تھیں[۵۲]۔ نواب زینت محل، والدۂ شاہ عالم نے آپ کی خدمت میں ایک رتھ نذر گذرانی تھی[۵۳]۔

اُمرا و مشاہیر کی عقیدت کا بھی یہی حال تھا۔ فوج کے سینکڑوں سردار آپ کے مرید و معتقد تھے۔ لکھا ہے :۔

"سرداران مغلیہ و ہندوستان کہ ہمہ مریدان و مخلصاں اند"[۵۴]

کشمیر تک سے صوبہ دار آپ کی خدمت میں نذر بھیجتے تھے[۵۵] لیکن آپ میں استغنا اس قدر تھا کہ کبھی اس طرف توجہ بھی نہ فرماتے تھے مجد الدولہ بہادر نے تین دن تک آپ کے لئے دعوت کا کھانا بھیجا۔ چوتھے دن حکم پہنچ گیا کہ دعوت صرف تین دن تک ہو سکتی ہے اور پھر کھانا قبول نہ کیا[۵۶]۔ نواب ضابطہ خاں مشہور سرداروں میں سے تھا۔ مناقب فخریہ میں اس کے متعلق لکھا ہے :۔

او در حسن اعتقاد مردے بود بے نظیر و در سعادت ازلی یکتائے روزگار بود"[۵۷]

شاہ صاحبؒ کا وہ نہایت مخلص مرید تھا اور بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ جب آپ

---

۵۱ فخر الطالبین۔ ص ۱۰۹۔ و شجرۃ الانوار

۵۲ شجرۃ الانوار

۵۳ فخر الطالبین۔ ص ۱۰۵

۵۴ مناقب فخریہ۔ ص ۴۰

۵۵ مناقب فخریہ۔ ص ۳۸

۵۶ مناقب فخریہ۔ ص ۴۱

۵۷ مناقب فخریہ۔ ص ۳۴

غیاث گڈھ تشریف لے گئے تو اس نے نہایت عقیدت وارادت سے خیر مقدم کیا۔ اور کئی دیہات نذر کرنے چاہے۔ آپ نے انکار کیا۔ اس نے اصرار کیا۔ کہ مدرسے کے درویشوں کے مصارف کے لئے قبول فرمالیجئے۔ قدموں میں گر گیا۔ آپ نے پھر بھی قبول نہ کیا بلکہ یہ فرمایا کہ اُن کی آمدنی حضرت خواجہ اجمیری اور اور سلطان المشائخ کی درگاہوں اور خادموں کے مصارف میں خرچ کی جائے نیز شاہجہاں آباد کے بعض مشائخ کو اس میں سے دے دیا جائے[۵۲]۔ شجرۃ الانوار کا مصنف لکھتا ہے :-

"سبحان اللہ زہے استغنا کہ در مزاج مبارک بود، یک حبہ برائے خود دیاران خود معین نفرمود"[۵۳]

ایک مرتبہ کسی نے بادشاہ کو ضابطہ خاں کی جانب سے بدظن کر دیا۔ حضرت شاہ فخر صاحب نے بادشاہ کی ناراضگی کو دور کرایا[۵۴]

بہادر شاہ ظفر اور شاہ صاحب — بہادر شاہ نے اپنے دیوان میں جگہ جگہ حضرت شاہ فخر الدین صاحب سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ایک شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ اُن سے بیعت بھی تھے۔

کیوں نہ تو سر بفلک کھینچے کہ فخر الدین نے
دی ہے دستار ترے سر پہ ظفر کھینچ کے باندھ

۵۲؎ مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ عرس خواجہ معین الدین میں شامیانہ زرین و سبز، چراغاں و دیگر سامان بھیجا کرتا تھا۔ چراغ دہلوی قطب صاحب کے عرسوں کے بیشتر مصارف خود کرتا تھا۔ شہر کے بڑے بڑے لوگوں مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادوں کی امداد کرتا تھا۔ ص ۴۴

۵۳؎ شجرۃ الانوار

ظفر نے حضرت شاہ صاحبؒ کو بچپن ہی میں دیکھا ہوگا، اس لئے کہ شاہ صاحب کا وصال ۱۱۹۹ھ میں ہوا تھا اور ظفر کی ولادت ۱۱۸۹ھ میں ہوئی تھی لیکن عقیدت کا یہ عالم ہے کہ بار بار اشعار میں اس کا اظہار کرتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

اے ظفر کیا بتاؤں تجھ سے کہ جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن اپنے فخر دیں کے کفش برداروں میں ہوں

جو ہاتھ آئے ظفر خاک پائے فخر الدین
تو میں رکھوں اُسے آنکھوں کی توتیا کے لئے

کوچۂ فخر جہاں کی اے ظفر
خاک کی چٹکی بھی بس اکسیر ہے

سچ تو ظفر یوں ہے کہ جز و فخر دیں
اور نہیں کوئی سہارا مجھے

جو سمجھے کفش پائے فخر دیں کو تاج سر اپنا
پسند اس کو ظفر کب افسرِ شاہانہ آتا ہے

ظفر رکھتے نہیں مطلب جہاں کے نکتہ دانوں سے
ہمیں فخر جہاں کا ایک نکتہ سو برابر ہے

جس کو حضرتؐ نے کہا الفقر فخری اے ظفر
فخرِ دیں، فخرِ جہاں، پردہ فقیری ختم ہے

ظفر دشوار ہے ہر چند اہلِ معرفت ہونا
مگر صدقہ سے فخر الدینؒ کے ہو سکتا تو سب کچھ ہے

کیا خطر اس کو راہِ دیں میں ظفر
رہنما جس کا فخرِ دیں ہو جائے

اے فخرِ جہاں، فخرِ زماں، فخرِ دو عالم
ہے لطف ترا حق میں دلِ ریش کے مرہم

ہر تار نفس میں ہو اگر سو گرہِ غم
وا ناخنِ تائید سے ہوں ترے بیک دم

ایک اشارے نال تساڈیں کھلدے عقدے سارے
ڈھیل نہ کر اے فخر پیا سلطان نظام کے پیارے

مرشد پاک رواں فخر الدین
قبلہ و کعبہ جان فخر الدین
ایک جہاں فخرِ جہاں کہتا ہے
پر ہے فخرِ دو جہاں فخر الدین
میں گدا ہوں ترے دروازہ کا
جاؤں اس در سے کہاں فخر الدین

موجزن ہے تیرا دریائے کرم — از گدا تا بگدا فخر الدین
ہے مدد تیری توانائی بخش — میں ہوں بیتاب و تواں فخر الدین
کیا کروں عرض عیاں ہے تم پر — میرا سب رازِ نہاں فخر الدین
رکھ ظفر ہر نفس و ہر ساعت — شغل دل وردِ زباں فخر الدین

ظفر اپنی شاعری کو حضرت شاہ فخر صاحبؒ کی عنایت سمجھتا تھا۔ ایک جگہ کہتا ہے :-

کہتا ہے ظفر جو کچھ اب جوشِ محبت میں
اے فخرِ جہاں سب وہ تیری ہی عنایت ہے

اسلامی سوسائٹی کو درست کرنے کی کوششیں | شاہ فخر الدین صاحبؒ نے جس وقت ارشاد و تلقین کا کام شروع کیا تھا۔ اس وقت مسلمانانِ ہند تنزل اور انحطاط کی آخری حد پر پہنچ چکے تھے۔ مذہب کی روح ختم ہو چکی تھی۔ توہم پرستی میں ہر شخص گرفتار تھا۔ اعمال، تعویذ گنڈوں میں حد سے زیادہ اعتقاد تھا۔ اور اس نے عمل کی طاقت کو سلب کر لیا تھا۔ زندگی جمودِ مرگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مذہب سے ناواقفیت عام تھی، قرآن عربی میں تھا۔ اس لئے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔ کتاب اللہ محض تبرک بن کر رہ گئی تھی۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ سورہ یٰسین کا فائدہ اور مقصد صرف اتنا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دم آسانی سے نکل جاتا ہے۔[1]

---

[1] اقبالؒ نے لکھا ہے ؎

بہ بندِ صوفی و ملا اسیری — حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست — کہ از یٰسین او آساں بمیری

یہ مذہب کی روح مُردہ ہو جانے کی آخری اور حسرت ناک حد تھی۔ ان ہی حالات کے پیش نظر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کیا تاکہ ہر خاص و عام اس سے استفادہ کر سکے اور کتاب اللہ جو ہدایت کے لئے بھیجی گئی ہے صرف تبرک بن کر نہ رہ جائے۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ عوام کی اس ذہنیت کو دیکھ رہے تھے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ مسلمان کس طرح تعلیماتِ اسلام سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چند رسوم کی پابندی کو وہ "اسلام" سمجھے بیٹھے ہیں۔ صحیح تعلیم اُن تک نہیں پہنچ رہی۔ چنانچہ انھوں نے جمعہ کے خطبہ کو اردو میں پڑھنے کا مشورہ دیا:-

"پس اگر خطبہ بہ لفظ ہندی در مملکت خواندہ شود برائے چیزے کہ موضوع است حاصل می شود الا برائے سائر الناس فائدہ ندارد کہ از زبان عربی واقف نیستند" ۵

اگر ہندوستان میں خطبہ ہندی زبان میں پڑھا جائے تو اس کا اصلی مقصد حاصل ہو جائے۔ ورنہ عوام کے لئے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے کہ وہ تو عربی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے۔

یہ سب باتیں اس لئے تھیں کہ عوام مذہب کی حقیقت و ماہیت کو سمجھ سکیں۔

شاہ فخر الدین صاحبؒ کے زمانے میں تعویذ گنڈوں کا بہت زور تھا دنیا دار صوفیوں نے اس کو اپنی روزی کا ذریعہ بنا لیا تھا، اور اس طرح

---

۵ فخر الطالبین ۔ ص ۴۴

مسلمانوں کے قوائے عمل کو شل کر رہے تھے۔ شاہ فخر الدین صاحبؒ نے جب اس کے بُرے اثرات دیکھے تو لوگوں کو اعمال و وظائف بتانے سے گریز کرنے لگے۔ لکھا ہے:-

"آں حضرت را از خواستنِ اعمال نفرت کلی است" [۵۱]

جس کسی کو کچھ بتانا ہوتا تو خود مناسب موقع پر بتا دیتے، لیکن عام طور پر اعمال بتانے سے پرہیز کرتے۔ اگر کسی کو عمل بتانا پڑتا تو حدیث شریف سے بتاتے۔ لکھا ہے:-

"اکثرے اعمال حضرت مولانا از حافظ جیو سند دارند و صحت حدیث شریف"

یہ حافظ جیو کون تھے، اُن کے متعلق بھی سن لیجیے:-

"حافظ جیو شاگرد شیخ محمد طاہر خلف الرشید شیخ ابراہیم کردی بودند و جامع فن حدیث" [۵۲]

آپ کی تلقین تھی کہ ہر شخص کو تابع رضائے خداوندی ہونا چاہیے [۵۳]۔ سید نور الدین فخری نے آپ سے عمل پوچھا۔ فرمانے لگے۔ میں پہلے ہی لوگوں کو عمل کم بتاتا تھا۔ فلاں شخص کو عمل بتانے کے بعد، میں کسی کو نہیں بتاتا۔ اس نے عمل کا بے جا استعمال کیا۔ پھر فرمایا:-

"عمل شخصے را باید گفت کہ اگر کسے بسیار تصدیع دہد بلکہ بے حرمت کند تاہم از عمل در مقابلت نیاید و بر خدا بگذارد" [۵۴]

---

[۵۱] فخر الطالبین۔ ص ۱۲۰ [۵۲] حافظ جیو چند سال تک اورنگ آباد میں شاہ صاحب کے مکان پر مقیم رہے تھے۔

[۵۳]، [۵۴] فخر الطالبین۔ ص ۱۲۷۔

شاہ صاحب رحؒ نے اس سلسلے میں اور بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ اور عوام کے خیالات کی اصلاح کی۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شاہ صاحب کے مرید ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کا ہر کام اُن کی مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔ آپ نے تنبیہہ کی:۔

"در کار خانۂ خدائے مداخلت نہ کنیم۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ ہرچہ خواستہ باشد بکند"[51]

اس زمانے میں لوگ مختلف طریقوں اور سلسلوں پر بیک وقت چلنے کی فکر کر رہے تھے۔ اس طرح سے ہر سلسلہ کے روحانی نظام کی مرکزیت اور افادیت کم ہوتی جا رہی تھی۔ آپ نے ان حالات کو دیکھ کر پھر ایک بار "یک در گیر و محکم گیر" کی آواز بلند کی۔ اور فرمایا:۔

"کمال مرد ہمیں است کہ در یک مذہب یا در یک طریق یا در یک روشن ند چیزے کہ بیا ید وادا در ا بد بدو شے دوم را در آں مخلوط نکند"[52]

نماز کی آپ کو خاص فکر رہتی تھی "اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ" پر آپ کا ایمان تھا۔ مریدوں سے نماز کے متعلق پوچھتے تھے اور بچوں کو نماز سکھانے کی تاکید فرماتے تھے[53]

ایک مرتبہ سلطان المشائخ رحؒ کے عرس کے موقع پر صوفی یار محمد اللہ دو ایک اور مرید طوائفوں کا ناچ دیکھنے لگے۔ اتفاقاً آپ کا بھی اس طرف گذر ہو گیا۔ آپ کے غصہ کی حد نہ رہی۔ اور:۔

---

۵۱ فخر الطالبین۔ ص ۱۱۵

۵۲ فخر الطالبین۔ ص ۱۲

۵۳ فخر الطالبین۔ ص ۲۷۔۲۶

"وانگشتان دست مبارک	اپنے دست مبارک کی انگلیاں
خود را در گریبان آنہا انداختہ	اُن کے گریبانوں میں ڈال کران
طرف خود کشیدند و فرمودند	کو کھینچا۔ اور فرمایا کہ ہمارے بزرگوں
کہ بزرگان مایاں بسیار خونِ جگر	نے بڑا خونِ جگر پی کر قوالوں کے
خوردہ سماع قوالاں را بدرجہ	سماع کو درجۂ اباحت تک
اباحت رسانیدہ اند و شما رقص	پہنچایا ہے اور تم ہو کہ عورتوں کا رقص
عورتاں می بینید و سماعِ ایشاں	دیکھتے ہو، اور اُن کا گانا سُنتے
می شنوید" [۵۱]	ہو!

نظام سلسلہ اور تبلیغی مساعی | حضرت شاہ صاحبؒ ہر شخص کو جو مرید ہونا چاہتا تھا، اپنے سلسلے میں داخل کر لیتے تھے[۵۲] لیکن خلافت کے معاملہ میں سختی برتتے تھے[۵۳] ۱۱۹۹ھ میں آپ نے بعیت کرنے کی عام اجازت دے دی لیکن "بشرط اتباعِ سنت و عمل بر کتاب"[۵۴]

تبلیغ کے سلسلے میں آپ کا وہی مسلک تھا جو حضرت شاہ کلیم اللہ اور دیگر بزرگانِ چشت کا تھا کہ ہندوؤں کو ذکر بتاؤ۔ اس انتظار میں نہ رہو کہ وہ پہلے سے مسلمان ہو جائیں پھر ذکر بتایا جائے۔ اس لئے کہ "ذکر خود اورا در ربقۂ اسلام خواہد کشید"[۵۵]

[۵۱] شجرۃ الانوار
[۵۲] فخر الطالبین۔ ص ۵۹
[۵۳] فخر الطالبین۔ ص ۸۲
[۵۴] تکملہ سیر الاولیاء، ص ۱۲۱
[۵۵] مکتوبات کلیمی

اس زمانے میں بہت سے ہندو خاموش طریقے سے مسلمان ہوئے تھے۔ بعض کا ذکر شاہ کلیم اللہ صاحب کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان صاف طور سے مخالفت کے ڈر سے نہیں کرتے تھے اور یہ ڈر ایک حد تک صحیح بھی تھا۔ شجرۃ الانوار۔ میں ایک ہندو عورت کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کھلم کھلا مسلمان ہوگئی تھی، اور اس کے بعد دہلی میں بلوہ ہوگیا تھا۔ بدامنی یہاں تک پھیلی تھی کہ حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ نے دہلی چھوڑنے کا ارادہ کرلیا تھا[۵۱]۔ فخر الطالبین میں ایک ہندو کا ذکر ہے کہ جب وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس آتا تھا تو وہ دروازے بند کرادیا کرتے تھے[۵۲]۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ملفوظات میں بھی ایک ہندو اتم چند کا ذکر ہے۔ وہ مسلمان ہوگیا تھا لیکن اس کا ذکر نہ کرتا تھا[۵۳]۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت تمام اُن بزرگوں نے جو تبلیغ و اصلاح کے کام میں مصروف تھے اسی طرح سے اپنے کام کو انجام دیا۔

نور الدین فخری ؒ نے کئی ایسے ہندوؤں کا ذکر کیا ہے جو حضرت شاہ فخر صاحبؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے تھے، ایک جگہ لکھا ہے:۔

"ہندوے آمد کہ از مدتے در طریقہ شامل شدہ است و نماز ہم باخفا می گذارد گویا از یاراں است"[۵۴]

شاہ صاحب، ہندوؤں سے بہت اچھی طرح ملتے تھے، ان کو سمجھنے کی کوشش

---

۵۱ شجرۃ الانوار

۵۲ فخر الطالبین۔ ص ۶۸

۵۳ ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ۔ ص ۱۱

۵۴ فخر الطالبین۔ ص ۶۸

کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سفر میں ایک ہندو سے ملاقات ہوئی وہ عامل تھا۔ اور جس چیز کو چاہتا تھا منگا لیتا تھا۔ شاہ صاحب سے کہنے لگا :۔

اگر کرم فرمودہ بخانہ من تشریف فرمائید موکلان این عمل بشما آشنا سازم"

شاہ صاحب رح نے فرمایا کہ ہر بات قرآن شریف میں موجود ہے مجھے اس کی ضرورت نہیں

"جملہ امور در قرآن شریف موجود است حاجت ندارم" [۵۱]

شاہ فخر صاحب رح فرمایا کرتے تھے کہ اس انتظار میں نہیں رہنا چاہیے کہ اول مسلمان ہو جائیں پھر ذکر بتایا جائے۔

"مارا چناں معلوم است کہ از تعلیم نام خدائے عزوجل کوتاہی نباید کرد و دربند آں نباید شد کہ اول مسلم شود من بعد چیزے شغل کند۔ نام اثرہا است خود بطرف خدا خواہد کشید" [۵۲]

یہی وہ طریقہ تھا جس کے اختیار کرنے کی تاکید شاہ کلیم اللہ صاحب رح نے فرمائی تھی۔ اور جس کی تاثیر اُن کے سلسلے کے ہر بزرگ نے محسوس کی تھی اور اس پر عمل کیا تھا۔

وفات | حضرت شاہ فخر الدین صاحب رح نے ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ کو وصال فرمایا [۵۳] اس وقت آپ کی عمر ۷۳ سال تھی۔ وصال سے ایک دن قبل زبان پر مثنوی کا یہ شعر تھا ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم
چشم بگذارم سراسر جاں شوم [۵۴]

---

۵۱ مناقب المحبوبین ص ۹۳ ۔ ۵۳ شجرۃ الانوار

۵۲ فخر الطالبین ۔ ص ۶۹ ۔ ۵۴ شجرۃ الانوار

وصیت تھی کہ انتقال کے بعد جنازہ میڈھو خاں کے سپرد کر دیا جائے۔ میڈھو خاں آپ کے عزیز مرید تھے اور پہاڑ گنج میں رہتے تھے۔ حاجی محمد امین نے جو شاہ ولی اللہ صاحب رح کے مرید تھے آپ کو غسل دیا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے مزار پاک کے قریب سپرد خاک کیا گیا[۱]۔ عقیدت مندوں کا ایک ہجوم آپ کے جنازہ کے ساتھ تھا۔ اکبر شاہ ثانی زار و قطار روتا ہوا قبرستان تک پہنچ گیا[۲]۔

آپ کے مزار کے سرہانے یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

بگذاشت فخر دیں چوں جہاں سرائے فانی — برآستانہ جا و داں قطب جاودانی

سال وصال آں ماہ از غیب چوں بجستم — تاریخ گفت ہاتف خورشید دو جہانی

۱۱۹۹

من کلام سید الشعرا مقبول الٰہی ۱۲۱۸ھ[۳]

حدیث و کتاب سے آپ کا بے پناہ تعلق ملحوظ رکھتے ہوئے عرس کے موقع پر کلام اللہ شریف اور صحیح بخاری کا ختم ہوتا تھا[۴]۔

شاہ نور محمد صاحب رح نے اُن کی وفات کے بعد فرمایا :-

"ذات شریف حضرت مولانا چہ کمال بود۔ بخوبیکہ در دہلی آمدند ہماں طور

---

۱ شجرۃ الانوار

۲ مناقب فریدی۔ ص ۴۷

۳ آثار الصنادید ص ۱۸۷

۴ مناقب حافظیہ ص ۱۸۶

پاک صاف از دینار فلتند و از کسے یا فلتی و ناباکسے وادنی واشتند۔
نزاع ہیچ کس ازپس نگذاشتند چنانکہ درایام تکاہل مزاج شریف
بقدری مبلغ دوہزار روپیہ از دکن بخدمت آمدہ بود۔ ہماں وقت دوازدہ
صدروپیہ بقرض داراں کہ در لنگر فقرار خرچ شدہ بود دادند وہشت صد
باقی بہ مستحقاں تقسیم کردہ دادند و مالبقا سوائے کتابہا ہیچ بنود۔"[۵۱]

اولاد حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ کے ایک فرزند تھے۔ اُن کا نام غلام قطب الدین
تھا۔ وہ دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ صاحبؒ جب دہلی تشریف لائے
تو ان کو اپنی بہن کے سپرد کر دیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ایک مرتبہ
اپنی مجلس میں فرمایا:۔

"مولوی فخرالدین صاحب را دیدم کہ سوائے یک پسر کہ او را ہم بہ ہمشیرہ
خود کہ در دکن بود، دادہ آمدہ و متکفل پرورش آں بزرگ بود و ایں جا
بکمال بے تعلقی می گزرانیدند، لیکن در فکر احباء چناں مصروف بودند کہ
مردم در فکر اہل و عیال خویش۔"[۵۲]

شاہ فخرالدین صاحبؒ کے بعد غلام قطب الدین صاحبؒ ہی سجادہ نشین ہوئے
وہ اپنے تقدس اور زہد کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ محمد اکبر شاہ اور
بہادر شاہ ظفر[۵۳] اُن کے مرید تھے۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے:۔

---

۵۱ مناقب المحبوبین - ص ۹۱ ۵۲ ملفوظات شاہ عبدالعزیز - ص ۱۱۸
۵۳ بہادر شاہ خود بھی پیری مریدی کرتا تھا۔ خاص مریدوں کو دو دو روپیہ مہینہ بھی دیتا تھا
تاریخ ہند مولوی ذکاءاللہ - ج ۹ ص ۳۴۶
روزنامچہ (ص ۲۸، ص ۱۶۲) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ غالب نے سراج المعرفت کے
دیباچہ میں اس کی مذہبی حیثیت کا ذکر کیا ہے (اردوئے معلیٰ جلد دوم ص ۴)
نیز ملاحظہ ہو آثار الصنادید - ص ۸۵

"حضرت ظل سبحانی محمد اکبر شاہ بادشاہ ...... باعتقاد تمام مرید
آں فرزند رشید حضرت فخر صاحب گشتند و بعضے فرزنداں و متعلقان
خود را نیز مرید کنانیدند"

بہادر شاہ ظفر نے لکھا ہے ؎

مرید قطب دیں ہوں، خاکپائے فخر دیں ہوں میں
اگرچہ شاہ ہوں، ان کا غلام کم تریں ہوں میں
ان ہی کے فیض سے ہے نام روشن میرا عالم میں
وگرنہ یوں تو بالکل روسیہ مثل نگیں ہوں میں
نہ کعبہ سے غرض مجھ کو، نہ میخانے سے کچھ مطلب
ہمیشہ گھستا اُن کے آستانے پر جبیں ہوں میں
مجھے تو خانقاہ و مے کدہ دونوں برابر ہیں
ولیکن یہ تمنا ہے کہ ان کا ہوں کہیں ہوں میں
یہی عقدہ کشا میرے، یہی ہیں رہنما میرے
سمجھتا اُن کو اپنا حامی دنیا و دیں ہوں میں
بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
ولیکن اے ظفر اُن کا گدائے رہ نشیں ہوں میں

غلام قطب الدین صاحب رحؒ نے ۱۸ محرم ۱۲۳۳ھ کو وصال فرمایا[۵] اور

---

۵ "واقعات دار الحکومت دہلی" میں آپ کا سنہ وصال ۱۲۳۰ھ درج ہے (ج ۲، ص ۳۹۷)
"مزارات اولیائے دہلی" میں ۱۲۳۹ھ درج ہے۔ مناقب فریدی میں ۱۸ محرم ۱۲۳۲ھ تاریخ
وفات بتائی گئی ہے۔ میں نے مناقب فریدی (ص ۳۵) کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

حضرت قطب صاحبؒ کے جوار میں آسودہ ہوئے۔

غلام قطب الدین صاحبؒ کے بھی ایک ہی فرزند تھے۔ اُن کا نام میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب تھا۔ دلی میں خواص و عوام سب اُن کا ادب و احترام کرتے تھے۔ سر سیّد نے لکھا ہے۔

"اس زمانے میں ایسا نامی گرامی شیخ نہیں ہے، حضور والا اور تمام سلاطین و جمیع امرا ر عظام آپ کے نہایت معتقد ہیں۔"[۱]

دہلی کا ہر شخص امیر و غریب، چھوٹا اور بڑا ان سے ملتا تھا۔ غالب کو اُن سے خاص لگاؤ اور اُنس تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں۔ بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرائے کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا۔ صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔"[۲]

بہادر شاہ ظفر کو بھی اُن سے بڑی عقیدت تھی۔ لکھتا ہے ؎

نظامِ خانہ تخرِ جہاں تمھیں تو ہو — قیامِ سلسلہ و خانداں تمھیں تو ہو
نہ کیونکہ تم سے ہوں ظاہر صفاتِ قطب الدین — خدا رکھے تمھیں اُن کا نشاں تمھیں تو ہو
تمھارے در پہ جھکا کر سرِ ارادتِ خلق — کہے ہے کعبہ، امن و اماں تمھیں تو ہو
نثار تم پہ ہیں پروانہ ساں ہزاروں دل — کہ شمعِ محفلِ صاحب دلاں تمھیں تو ہو
تمھاری قوتِ باطن سے تقویت ہے مجھے — کہ میرے باعثِ تاب و تواں تمھیں تو ہو
بغیر آپ کے ہوں کیوں نہ جان و دل بے چین — کہ راحتِ دل و آرامِ جاں تمھیں تو ہو
ظفر کی چاہیئے تمھیں نصرت نصیر الدین — کہ اس کے یار و مددگار تمھیں تو ہو

[۱] آثار الصنادید
[۲] اُردوئے معلی حصہ دوم ص ۱۷

کالے صاحب خود بھی بادشاہ کے پاس اکثر جایا کرتے تھے۔ بمبئی کے احسن الاخبار اور دلی کے سراج الاخبار کے اقتباسات سے جو خواجہ حسن نظامی صاحب نے بہادر شاہ کے روزنامچہ کے نام سے شائع کئے ہیں۔ بادشاہ کے ان سے گہرے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے ۔۔ بادشاہ کی طرف سے اُن کا وظیفہ بھی مقرر تھا۔ تقریبات کے موقع پر بادشاہ اُن کے سارے اخراجات برداشت کرتا تھا[۵۱]

حکیم میر قطب الدین باطن کالے صاحب کے مرید تھے۔ انھوں نے گلشن بے خار کے جواب میں "نغمہ عندلیب"[۵۲] تذکرہ لکھا تھا

کالے صاحب کی حویلی گلی قاسم جان میں تھی جو اب احاطہ کالے صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ کالے صاحب نے ۱۵ ربیع صفر سنہ ۱۲۶۲ھ کو وصال فرمایا۔ مہرولی میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا[۵۳]

کالے صاحب کے پانچ بیٹے تھے :۔

(۱) غلام نظام الدین

(۲) غلام معین الدین

(۳) وجیہہ الدین

(۴) امین الدین

(۵) کمال الدین

---

۵۱ کالے صاحبؒ کے بہادر شاہ سے تعلقات کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کا مضمون "۱۸۵۷ء سے پہلے کی دلی" مطبوعہ "برہان" دہلی۔ جولائی ۱۹۵۷ء ص ۵ تا ۸
نیز ملاحظہ ہو۔ "بہادر شاہ کا روزنامچہ" ص ۷۹، ۸۶، ۹۲ وغیرہ

۵۲ مطبوعہ نول کشور ۱۸۷۵ء ۵۳ مناقب فریدی۔ ص ۳۹

پہلے دو صاحبزادے ایک سیدزادی سے تھے۔ بقیہ ایک شہزادی سے [۵۱]
کالے صاحب کے بعد اُن کے فرزند اکبر، غلام نظام الدین سجادۂ مشیخت پر
بیٹھے اُن کے مریدوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ غدر میں کالے صاحب کی املاک ضبط
ہوگئیں۔ نظام الدین صاحب حیدر آباد چلے گئے [۵۲] بعد کو جب حالات درست
ہوئے تو دہلی واپس آ گئے۔ ۱۲۹۲ھ میں وصال فرمایا اور والد کے پہلو میں دفن
ہوئے۔ [۵۳]

غلام نظام الدین صاحب رحؒ نے چونکہ لاولد وصال فرمایا تھا۔ اس لئے اُن کے بعد
اُن کے بھائی غلام معین الدین رحؒ سجادہ نشین ہوئے۔ کمال الدین صاحب
اورنگ آباد چلے گئے تھے۔ جہاں اُن کے لڑکے میاں سیف الدین رحؒ وغیرہ پیدا ہوئے [۵۴]
اب میاں سیف الدین رحؒ کی اولاد میں کوئی صاحب اورنگ آباد کے سجادہ نشین ہیں۔
دہلی میں سجادگی کالے صاحب رحؒ کے نواسوں میں ہے۔ میاں کالے صاحب رحؒ
کی لڑکی میاں عبدالسلام صاحب سے منسوب ہوئی تھیں۔ اُن سے ایک لڑکے میاں
عبدالصمد صاحب تھے۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں میں مقبول تھے۔ ان دونوں
بزرگوں کے مزارات نئی دہلی میں لیڈی ہارڈنگ ہسپتال کے قریب ہیں۔ جہاں
بہت اچھی مسجد اور درگاہ بنی ہوئی ہے۔ آج کل میاں عبدالصمد صاحب کے فرزند

---

[۵۱] مناقب المحبوبین۔ ص ۵۰۔۱ د

[۵۲] غالب کا خط بنام نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں شفق۔
اردوئے معلّٰی حصہ اول ص ۱۲۳۱ مد

[۵۳] مناقب فریدی۔ ص ۳۹

[۵۴] "منادی" ۱۲ر اگست ۱۹۳۶ء

حاجی میاں صاحب سجادہ نشین ہیں۔ وہ پوری طرح اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اور دلی کے ہزاروں ہندو مسلمان اُن کے مرید و معتقد ہیں۔"[۵۱]

خلفا حضرت شاہ فخر صاحبؒ کے وصال کے بعد مولانا سید احمد صاحبؒ مسندِ ارشاد پر بیٹھے اس دوران میں حضرت شاہ فخر صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا قطب الدین صاحبؒ اورنگ آباد سے تشریف لے آئے اور اپنے والد کے سجادۂ مشیخت پر جلوہ فرما ہو گئے[۵۲]

شاہ فخر صاحبؒ کے بعد اُن کے مدرسے کا کام سید احمد صاحبؒ غلام فخر چشتیؒ اور حاجی لعل صاحبؒ نے سنبھالا۔ اور اُن کے علمی فیض کو حتی المقدور جاری رکھا[۵۳]

حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کو بجا طور پر نظامیہ سلسلہ کا "مجدد" کہا جاتا ہے۔ انھوں نے نظامیہ سلسلہ کو نئی زندگی بخشی اور اپنے خلفاء کو ملک کے دور دراز حصوں میں بھیج کر نظامیہ سلسلہ کی خانقاہیں قائم کرائیں، حسین فخری نے لکھا ہے :۔

"خلفائے مرشدی و مخدومی در ہفت اقالیم دائر و سائر و محیط اند"[۵۴]

اُن کے خلفاء میں خصوصیت کے ساتھ شاہ نور محمد صاحبؒ نے پنجاب میں، شاہ نیاز احمد صاحبؒ نے یو پی میں، حاجی لعل محمد صاحبؒ نے دہلی کے اطراف و

---

۵۱ مکتوب خواجہ حسن نظامی بنام مصنف مطبوعہ "منادی" ۸، ۱۶ اپریل ۱۹۴۷ء

۵۲ مناقب المحبوبین ص ۶۸

۵۳ مناقب المحبوبین۔ ص ۶۹

۵۴ شجرۃ الانوار

جوانب میں، مولانا جمال الدینؒ نے رام پور میں۔ میر ضیاء الدینؒ نے جے پور میں،
میر شمس الدینؒ نے اجمیر میں سلسلہ کی تبلیغ و ترویج میں بڑی پُر خلوص جد و جہد کی۔
شاہ فخر الدین صاحبؒ کے ملفوظات، سوانح اور دیگر معاصر کتب میں جن
خلفاء کے نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) سید بدیع الدین
(۲) مولوی نور اللہ
(۳) مولوی مکرم
(۴) مولوی فرید الدین
(۵) مولوی روشن علی
(۶) مولوی حسن علی
(۷) محمد غوث نبیسہ شاہ کلیم اللہ
(۸) محمد غوث کرت پوری
(۹) حاجی خدا بخش
(۱۰) محمد قطب الدین شرقی
(۱۱) میاں عبداللہ
(۱۲) سید احمد
(۱۳) مولوی عبدالوہاب بیکانیری
(۱۴) مولوی محمد صالح
(۱۵) مولوی علاء الدین
(۱۶) شیخ محمد زماں
(۱۷) شاہ مراد

(۱۸) حافظ سعد اللہ

(۱۹) ملا گل محمد

(۲۰) سید قمرالدین منت

(۲۱) محمد فتح اللہ

(۲۲) صوفی یار محمد

(۲۳) حاجی محمد واصل

(۲۴) سید محمد میر

(۲۵) عظیم الدین

(۲۶) میاں محمد امان

(۲۷) خلیفہ محمد پناہ

(۲۸) مولوی عظمت اللہ

(۲۹) رفیع الدین خاں

(۳۰) شاہ محمد اعظم

(۳۱) غلام فرید چشتی

(۳۲) میر محمد عظیم بن عبدالرحمٰن

(۳۳) ظہور اللہ

(۳۴) میاں عصمت اللہ

(۳۵) حاجی احمد

(۳۶) شاہ قمرالدین

(۳۷) شاہ روح اللہ

۳۸ سید شریف

(۳۹) مولانا حسن علی

دہلی کے بعض بڑے بڑے شاعر اور ادیب شاہ فخر صاحبؒ کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے۔ خواجہ احسن اللہ بیانؔ دہلوی، مرزا مظہر جان جاناںؒ کے شاگرد تھے لیکن شاہ فخر صاحبؒ سے بیعت تھے۔ وہ دہلی کے اعلیٰ شاعروں میں گنے جاتے تھے۔ شیفتہ اُن کے متعلق لکھتے ہیں :-

"حد یثش شیریں و دل آویز، سخنش نمکیں و شور انگیز از شیوا بیانی است"[۵۱]

عنایت اللہ حجامؔ، سوداؔ کے شاگرد تھے اور حضرت شاہ فخر صاحبؒ سے بیعت تھے۔ شیفتہ لکھتے ہیں :-

"مولانا فخر الدین رحمۃ علیہ الرحمۃ دستِ ارادت بدامن زدہ فکر تش بدل می سازد"[۵۲]

میر قمر الدین منتؔ کو گورنر جنرل کی طرف سے "ملک الشعراء" کا خطاب تھا۔ وہ شاہ فخر صاحبؒ سے بیعت پر فخر کرتے تھے۔[۵۳]

میر غلام حسین یادؔ، شاہ عبد العزیز صاحب کے رشتہ دار اور شاہ فخر صاحبؒ کے مرید تھے۔[۵۴]

مولوی سید بدیع الدین بڑے جید عالم اور بزرگ تھے۔ مناقب فریدی کے مصنف کا بیان ہے کہ وہ شاہ فخر صاحبؒ کے بے مثل خلیفہ تھے۔ اُن سے بڑا فیض جاری ہوا۔ درس و تدریس، ارشاد و تلقین میں ہر وقت سرگرم رہتے تھے۔ اُن کے بعد میر عیوض علی دہلوی خلیفہ ہوئے۔ اُن کے بعد کارِ خلافت مولانا ظہر الدین کیرانوی نے انجام دیا۔ مؤخر الذکر نے ۱۲۰۸ھ کو وصال فرمایا۔ قصبہ پنت میں آسودہ ہیں۔[۵۵]

۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴ تذکرہ گلشن بے خار ص ۳۷-۶-۵-۹۳

۵۵ مناقب فریدی۔ ص ۳۹

میر مہدی صاحب شاہ فخر صاحبؒ کے خلفا میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ انھوں نے دہلی میں شاہ صاحبؒ کے کام کو جاری رکھا۔ شجرۃ الانوار کے مصنف کا بیان ہے:

"...... در ارشاد و رہنمائی	اس شہر میں بڑی خوبی کے ساتھ
عباد دریں شہر بخوبیہا معروف اند	خلق خدا کی رہنمائی میں مصروف
و باوصاف حمائد موصوف ،	ہیں۔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں
بسیارے از اہل شہر و شاہزادہا	بہت سے اہل شہر اور شہزادے
مرید میر صاحب اند	میر صاحب کے مرید ہیں۔

اُن کو اپنے پیر و مرشد سے بڑا عشق تھا۔ لکھا ہے:-

"بر نام پیر خود و مرشد خود جان از دست می دہند"[۵۱]

مولوی بشیر الدین نے ان کا اصلی نام مولانا امام الدین بتایا ہے[۵۲]۔ مصنف مناقب فریدی نے عماد الدین سید محمد لکھا ہے[۵۳]

شاہ فخر صاحب نے ان کو خلافت دے کر شاہی خاندان کی اصلاح و تربیت کے لیے متعین فرمادیا تھا۔ مناقب فریدی میں لکھا ہے کہ وہ "شاہ ولایت قلعۂ معلیٰ" بنائے گئے تھے اور شاہ فخر صاحبؒ سے شاہی خاندان کے جو افراد بیعت تھے اُن کی تعلیم و تربیت ان ہی کے سپرد تھی[۵۴] ہر وقت اُن کے یہاں شہزادوں کا جھمگٹا لگا رہتا تھا۔ بہادر شاہ کے روزنامچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ان کی خدمت

---

۵۱ شجرۃ الانوار

۵۲ واقعات دار الحکومت، دہلی۔ ج ۲۔ ص ۱۳۳

۵۳ مناقب فریدی۔ ص ۳۸

۵۴ مناقب فریدی۔ ص ۳۸

میں حاضر ہوا کرتا تھا، اور نہایت دھوم دھام سے اس کی سواری ان کی خانقاہ میں پہنچتی تھی [۵۱] مرزا سلیم خلف اکبر شاہ ثانی آپ کا مرید اور معتقد تھا [۵۲] مرزا نجستہ بخت نے میر محمدی رح کے وصال کے بعد ان کی جانشینی کا دعویٰ کیا [۵۳]

میر صاحب نے ۱۲۴۲ھ کو وصال فرمایا [۵۴] مرزا سلیم شاہزادے نے فرطِ عقیدت سے آپ کو اپنے مکان کے صحن میں ہی دفن کیا۔ جو اب میر محمدی کی خانقاہ کے نام سے مشہور رہے [۵۵] اور چتلی قبر کے پاس واقع ہے۔

میر محمدی کے بعض مریدین کے نام یہ ہیں :۔

(۱) مرزا نجستہ بخت بن شاہ عالم

(۲) شہزادہ سلیم بن اکبر شاہ

(۳) میران شاہ محمد بن بہادر شاہ ظفر

(۴) میر جلال الدین

(۵) مولوی گل محمد

(۶) مولوی نوازش علی

(۷) شیخ ابراہیم ذوق

(۸) مرزا روشن بخت [۵۶]

---

۵۱ بہادر شاہ کا روزنامچہ۔ ص ۱۱۳

۵۲، ۵۳ واقعات ج ۲ ص ۱۵۲

۵۳ مناقب فریدی۔ ص ۳۸

۵۴ مناقب فریدی ص ۳۹ - ۳۸

۵۵ واقعات۔ ج ص ۱۵۲

۵۶ مناقب فریدی ص ۳۹ - ۳۸

مولانا ضیاء الدین | مولانا ضیاء الدین صاحب رحؒ نے جے پور میں نظامیہ سلسلہ کی اشاعت اور مذہب اسلام کی تبلیغ و ترویج میں بے پناہ کوششیں کی تھیں۔ ابتدائی زمانے میں وہ ملازمت کرتے تھے۔ اور اخفاء حال کی کوشش کرتے تھے۔ پیر کا حکم ہوا کہ جے پور جا کر ارشاد و تلقین کا کام کرو۔ چنانچہ آپ جے پور تشریف لے گئے اور وہاں اسلامی شعار کی ترویج میں بڑی کوششیں کیں۔ حسین بخش فخری کا بیان ہے کہ اُن ہی کی کوششوں سے جے پور میں "طریقہ اسلام و صلوٰۃ و آذان" جاری ہوا۔ لکھا ہے :-

"در شہر جے نگر (جے پور) کہ قریب مقام راجہ است و دراں شہر غلبہ کفرہ کافراں بسیار تا حال ہویدا است، و درآں نجابت خانہ و بت پرست بدرجہ کمال اند، استقامت نمودند و مردماں خاص و عام بہ آں سید السادات میر ضیاء الدین تولا نمودند و بہ سبب کشف و کرامات و خرق عادات و قوتِ باطنی راجہ و ہمگی سرداران راجہ و تمامی اہل شہر چہ از ہنوداں کافراں و چہ مسلمانان مطیع و فرماں بردار آں سید پاک شدند۔" [۵۱]

آج تک اُن کا قائم کیا ہوا مدرسہ "مدرسہ ضیاء العلوم" کے نام سے جاری ہے۔ اس مدرسے کے مختصر سے کتب خانے میں حدیث کی کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے۔

مولوی جمال الدین | شاہ فخر صاحب رحؒ کے عزیز ترین خلفاء میں تھے اور پیر کے حکم کے مطابق رامپور میں قیام فرمالیا تھا۔ شجرۃ الانوار میں لکھا ہے :-

"مریداں بسیاری دارند، صاحبِ کشف و کرامت اند، مردمانِ آں نواحی فیض یاب آں جناب اند۔" [۵۲]

---

[۵۱]، [۵۲] شجرۃ الانوار

مولوی جمال الدین صاحب کا وطن لاہور تھا۔ وہاں سے علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کے لئے، دہلی تشریف لے آئے تھے اور یہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے حدیث کا درس لیتے تھے۔ بعد کو وہ شاہ فخر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس قدر متاثر ہوئے کہ اُن کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے [۵۱]

مولوی صاحب نہایت منکسر المزاج اور حلیم الطبع بزرگ تھے۔ ہندو اور مسلمان سب ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ منشی جانکی داس دیوان صدر رام پور ایک مرتبہ خدمت عالی میں حاضر ہوئے تو نصیحت فرمائی جس کو معبودِ حقیقی جانتے ہو، اس کی یاد سے غافل نہ رہنا" [۵۲]

نواب سید احمد علی خاں والئ رامپور کو اُن سے بڑی عقیدت تھی۔ اور اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ۱۰۳ سال کی عمر پائی تھی، اس لئے شاہ فخر صاحب کے خاندان کے اکثر بزرگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ کالے صاحب رامپور تشریف لائے تو آپ شہر کے دروازے سے اُن کی پالکی کو کاندھے پر لائے" [۵۳]

مولوی صاحب علومِ ظاہری کا درس بھی دیتے تھے۔ اُن کے خلفاء میں شاہ غلام رسول خاں صاحب بڑے مرتاض بزرگ تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد اس سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا۔ انوار العارفین میں مولوی جمال الدین صاحب کا سنہ وفات ۲۹ جمادی الاول ۱۲۳۲ھ درج ہے [۵۴] تذکرہ کاملان رامپور میں

[۵۱] انوار العارفین۔ ص ۵۱۲

[۵۲]، [۵۳] تذکرہ کاملان، رامپور۔ ص ۹۲ - ۹۱

[۵۴] انوار العارفین۔ ص ۵۱۲

۱۲۲۱ھ دیا ہوا ہے۔[۱]

| مولانا حاجی لعل محمد صاحبؒ | حضرت شاہ فخر صاحبؒ کے ارشد خلفاء میں تھے

انھوں نے پیر کے وصال کے بعد دہلی میں اُن کی روایات کو قائم رکھا۔ لکھا ہے :-

"مریدان و خلفائے بسیار دارند، ذات گرامی صفات حضرت حاجی محمد لعل صاحب در مدرسہ و در شہر ز مغتنمات ست"۔[۲]

شاہ فخر صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے خلفاء کو عاجز کرکے خلافت دی ہے مگر حاجی صاحب کی عاجزی نے مجھے عاجز کرکے خلافت لی ہے[۳] وہ نہایت کریم النفس اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ بڑی بڑی ریاضتیں کی تھیں۔ ۱۲ سال تک خواجہ اجمیریؒ کے آستانہ پر حاضر رہے۔ تین مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ ان کی روحانی طاقت بہت زبردست تھی۔ مناقب حافظیہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ایک مرید جامع مسجد میں مراقبہ کر رہے تھے۔ جب آنکھ بند کرتے آنکھ کھل جاتی۔ آخر کار پوچھنے لگے کیا اس وقت مسجد میں شاہ فخر صاحبؒ کے مریدوں میں سے کوئی شخص موجود ہے؟ معلوم ہوا کہ حاجی لعل محمد صاحب مسجد کے گوشے میں وظیفہ پڑھ رہے ہیں[۴]

۱۲ رمضان المبارک ۱۲۲۹ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ سلطان المشائخ کے مزار مبارک کے قریب آپ کا مزار ہے۔ آپ کے بعد مرزا الٰہی بخش اللہ بیگ صاحب

---

۱ تذکرہ کاملان رامپور۔ ص ۹۲

۲ شجرۃ الانوار

۳ سلسلۃ الذہب۔ ص ۵۹

۴ مناقب حافظیہ۔ ص ۲۹

نے ارشاد و تلقین کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن انھوں نے صرف تین شخصوں کو مرید
کیا۔ ۱۲۷۷ھ کو وصال فرمایا اور حضرت حاجی صاحب کے مزار کے قریب مدفون
کئے گئے۔ ان کے بعد خواجہ محب اللہ صاحب سجادہ پر بیٹھے۔ اُن کے مریدین کی
تعداد کثیر تھی۔ سب سے زیادہ مشہور مرید اور خلیفہ حضرت خواجہ میاں محمد صاحب تھے جو ۱۳۱۵ھ
میں خواجہ صاحب کے وصال کے بعد سجادۂ مشیخت پر بیٹھے۔ وہ بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ انھوں
نے ہوشیارپور میں چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت میں بڑا نمایاں حصہ لیا
اُن کی سوانح عمری "یادِ پیر" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ۱۳۳۲ھ کو وصال
فرمایا۔ آج کل خواجہ علی محمد شاہ صاحب سجادہ نشین ہیں۔ وہ بہت سی خوبیوں
کے بزرگ ہیں اور سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔

باب چہارم

حضرت خواجہ نور محمد صاحب مہارویؒ

حضرت شاہ نور محمد صاحب مہاروی، شاہ فخر الدین صاحبؒ کے محبوب ترین خلفاء میں سے تھے۔ مولانا غلام سرور کا بیان ہے

"حضرت مولانا را آنچہ عنایت بے غایت و الطاف بے قیاس بحق دے مصروف بود بحال احدے از خلفائے خود نبود" [۱]	حضرت مولانا کی جو عنایت بے غایت اور الطاف بے قیاس اُن پر تھا، اپنے خلفاء میں سے کسی پر نہ تھا۔

پنجاب میں چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی تبلیغ و ترویج اُن ہی کی پُرخلوص جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے بعد پنجاب میں چشتیہ سلسلہ کے کسی بزرگ نے ترویج سلسلہ میں اس قدر کوشش نہیں کی، جتنی اٹھارویں صدی میں حضرت شاہ نور محمد صاحب مہارویؒ نے کی تھی۔ مناقب المحبوبین کے فاضل مصنف

[۱] خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اول، ص ۵۰۶

نے صحیح لکھا ہے :۔

"پس اول کسیکہ بعد از حضرت گنج شکرؒ و اولاد و خلفاء ایشاں سکہ بریں ملک مذکور زد۔ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ بود کہ چنداں فیض ازیں جناب در ملک پنجاب و سندھ وغیرہ انتشار یافت کہ در نہر قریہ و شہر و بلدہ درویشاں غلامان آں حضرت و غلاماں غلام آں حضرت صاحب ذوق و وجد و سماع و صاحب خانقاہ موجود اند و جوق در جوق گروہ علماء آمدہ ربقۂ اطاعت و غلامی آنجناب باعتقاد تمام در گردن خود انداختہ داخل سلسلۂ چشتیہ نظامیہ شدند" [۵۱]

تونسہ شریف، احمد پور، چاچڑاں، مکھڈ، جلال پور، گولڑہ وغیرہ مقامات کی خانقاہوں کے چراغ اُن ہی کے ذریعے روشن ہوئے۔ حاجی نجم الدین صاحبؒ نے لکھا ہے کہ شاہ نور محمد صاحبؒ کے خانقاہ قائم کرنے سے قبل پنجاب اور سندھ میں خاص طور سے مہار، بھاول پور اور ملتان کے گرد و نواح میں، قادریہ اور سہروردیہ سلسلہ کا زور تھا۔ شاہ نور محمد صاحب کی خانقاہ قائم ہونے کے بعد:

"رونق دیگر سلسلہا در پیش ایں	دوسرے سلسلوں کی رونق اس
سلسلہ نظامیہ چناں گم شد کہ	سلسلہ نظامیہ کے سامنے اس
در پیش آفتاب نور ستارگاں	طرح گم ہوگئی جیسے آفتاب کے سامنے
و چراغاں گم می شود" [۵۲]	ستاروں اور چراغوں کا نور گم ہو جاتا ہے۔

پیدائش اور خاندان شاہ نور محمد صاحب ۱۴ رمضان المبارک ۱۱۴۲ھ کو

---

[۵۱] مناقب المحبوبین ۔ ص ۱۰۶ ۔ ۱۰۵

[۵۲] مناقب المحبوبین ص ۱۰۶

چوٹالہ[۱] میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد کا نام "ہنوال" تھا۔ قوم سے کہل[۲] تھے۔ مناقب المحبوبین میں اُن کا نسب نامہ درج ہے[۳] چھٹی پشت کے بعد اُن کے بزرگوں کے نام بالکل ہندوانی شروع ہو جاتے ہیں۔ بعد کے ناموں میں بھی کچھ ہندوانی رنگ ہے۔ چنانچہ خود شاہ صاحب کا خاندانی نام بہبل تھا جس کو حضرت شاہ فخر صاحب نے بدل کر نور محمد کر دیا[۴]

شاہ صاحب کے اجداد زراعت کرتے تھے، اور مویشی چراتے تھے، ایک مرتبہ شاہ فخر صاحبؒ نے اُن کے اجداد کے متعلق پوچھا تو شاہ نور محمد صاحبؒ نے عرض کیا۔

"زراعت می کردند و مواشی می چرانیدند و می دوشیدند و بر مال مردماں می دویدند"[۵]

شاہ نور محمد صاحبؒ کی والدۂ ماجدہ کا نام عاقل بی بی تھا۔ وہ کمال (قوم چھٹہ) کی لڑکی تھیں۔ کمال قصبہ بھولرہ[۶] میں رہتے تھے۔ عاقل بی بی کی شادی سے قبل ایک بزرگ فتح دریا نیکوکارہ[۷] نے ان کو ایک زبردست ولی کی ماں ہونے

۱۔ از مہار شریف سہ کروہ است سمت مشرق متعلقہ بلدہ بھاولپور۔ مناقب المحبوبین ص ۵۲

۲۔ قوم پنوار کی ایک شاخ ہے

۳۔ ص ۵۳

۴۔ تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۲۱

۵۔ مناقب المحبوبین۔ ص ۵۳ ۔ مناقب المحبوبین۔ ص ۸۷

۶۔ کہ از مہار شریف سمت جنوب قریب سی و پنج کروہ یا چہل خواہد شد" مناقب المحبوبین ص ۵۳

۷۔ حضرت مخدوم جہانیاں جلال الدین بخاری کے سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے

کی بشارت دی تھی اور فرمایا تھا :۔

"از فیض او ہمہ عالم سیراب خواہد شد"[۵۱]

ابتدائی تعلیم اور بچپن کے حالات شاہ نور محمد صاحب کے والد چوہاٹہ سے مہار آگئے تھے اور وہیں مستقل قیام فرمالیا تھا۔ جب شاہ نور محمد صاحب کی عمر ۵ سال کی ہوئی تو والد ماجد نے قرآن پاک پڑھنے کے لئے حافظ محمد مسعودؒ کے پاس بٹھایا۔ حافظ مسعودؒ بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ لکھا ہے :۔

"یکے از صلحاء وقت و متقیان زمانہ بود"[۵۲]

اُن ہی کی خدمت میں شاہ صاحبؒ نے قرآن پاک حفظ کیا۔ ایک دن شیخ احمد دودی والےؒ[۵۳] جو بڑے مرتاض بزرگ تھے۔ مولوی مسعود کے مدرسہ میں آئے۔ شاہ نور محمد صاحب کو دیکھا تو فرمانے لگے، سبحان اللہ ایک زمانہ آئے گا کہ اس بچے کے در پر بادشاہ سر رکھیں گے۔ حافظ مسعود کو تعجب ہوا اور تمسخر آمیز لہجہ میں فرمایا :۔

سبحان اللہ، دریں زمان چنیں	سبحان اللہ، اس زمانے میں
اولیاء کامل ماندہ اند کہ پسر ہندال	ایسے اولیاء کامل رہ گئے ہیں کہ ہندال
جٹ را کہ بر سر خود گنج دارد	جاٹ کے بیٹے کے متعلق جس کے سر

---

۵۱ مناقب المحبوبین ۔ ص ۵۵

۵۲ مناقب المحبوبین ۔ ص ۵۶

۵۳ " ایں بزرگ مرید سلطان محمود لنگاہ بود و در سلسلہ قادریہ توسل می داشت، خانقاہ ایں ہر دو پیر و مرید ہم در قصبہ دودہ است ۔ متعلقہ کوٹ نمالیہ و ایں قصبہ مذکور بر کنار دریائے راوی است ۔ مناقب المحبوبین ص ۵۷

می گویند کہ بادشاہاں بر درایں | پر گنج ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ بادشاہ
سجدہ خواہند کرد[51] | اس کے در پر سر جھکائیں گے۔

کسے معلوم تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ بھاول پور کا نواب بھاول خاں ان کی آستانہ بوسی کو اپنے لئے سعادت دارین سمجھے گا!

حافظ مسعودؒ کی تعلیم سے جب فارغ ہوئے تو ان والد اور بھائیوں کی رائے ہوئی کہ ان کو کسی کاروبار میں ڈالا جائے۔ لیکن فطرت سے اس بچے کی قسمت میں علم و عرفان، سلوک و باطن کے اعلیٰ منازل مقدر ہو چکے تھے۔ شاہ نور محمد نے اس رائے کو پسند نہیں کیا اور تعلیم کو جاری رکھنے کا اصرار کیا، اور موضع بڈھیرا[52] تشریف لے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ تحصیل علوم کے بعد موضع ببلانہ[53] آئے۔ یہاں شیخ احمد کھوکھر سے چند کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد ڈیرہ غازی خاں چلے آئے یہاں شرح ملا تک علم حاصل کیا

لاہور میں تحصیل علم | ڈیرہ غازی خاں کچھ عرصہ قیام کے بعد شاہ صاحبؒ محکم دین سیلانی کے ساتھ لاہور آگئے۔ محکم دین، شاہ صاحب کے دوست، اور ہم سبق تھے۔ ان کے مزاج میں ذرا تیزی زیادہ تھی اور اسی وجہ سے وہ مدت العمر مجذوب رہے۔ شاہ صاحبؒ ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے "

"مرد خوب صاحب شوق و لبسے بزرگ بودہ اند"[54]

---

[51] مناقب المحبوبین ص ۵۷

[52] مہار شریف سے چند میل کے فاصلے پر

[53] متعلقہ پاک پٹن

[54] مناقب المحبوبین

[55] مناقب المحبوبین۔ ص ۸۶

جب شاہ صاحب لاہور آئے تھے تو اُن کے والدین کو اس کی خبر نہ تھی۔ چنانچہ بہت عرصہ تک اُن کو سخت پریشانی رہی [۵۱]

لاہور میں شاہ صاحب سخت تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ اور علم حاصل کرتے تھے بعض اوقات اُنھیں گدائی کرکے اپنا پیٹ پالنا پڑا [۵۲]۔ لیکن ذوق و شوق میں کبھی کمی نہ آئی بلکہ زیادہ انہماک کے ساتھ کسبِ علوم میں مشغول رہے۔

دہلی میں آمد | لاہور سے شاہ نور محمد صاحبؒ نے تکمیلِ تعلیم کے لئے دہلی کا رُخ کیا اس زمانے میں نواب غازی الدین خاں کے مدرسے کی بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ اسی مدرسے میں داخل ہو گئے اور حافظ برخوردار جی سے کافیہ پڑھنا شروع کیا۔ شاہ فخر صاحبؒ ابھی اورنگ آباد سے تشریف نہیں لائے تھے۔ میاں برخوردار جی اس مدرسے میں درس دیتے تھے۔ اُن کے متعلق شاہ نور محمد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے :-

میاں برخوردار جی، مرد خوب صاحب نسبت بودند " [۵۳]	میاں برخوردار جی، اچھے آدمی تھے اور صاحبِ نسبت تھے۔

وہ چشتیہ سلسلہ میں بیعت تھے۔ شاہ نور محمد صاحب پر خاص التفات تھا۔ دن میں ایک مرتبہ کھانا کھاتے تھے، اور شاہ نور محمد صاحبؒ کو ساتھ کھلاتے تھے۔ انھوں نے اپنے اس عزیز شاگرد کو قطبی کا درس دینا شروع کیا۔ ابھی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ ان کو گھر جانا پڑا۔ اور شاہ نور محمد صاحبؒ کا سلسلۂ تعلیم یک لخت منقطع ہو گیا۔

---

۵۱ مناقب المحبوبین - ص ۷۵

۵۲، ۵۳ مناقب المحبوبین ص ۸۵

شاہ فخر صاحبؒ کی خدمت میں حاضری | شاہ نور محمد صاحب کو اپنی تعلیم کے
بند ہو جانے کا سخت رنج اور ملال تھا۔ ایک دن دہلی میں ایک حوض کے کنارے
نہایت اُداس اور غم گین بیٹھے تھے، حافظ محمد صالح ساکن بھیرہ نے اُداسی کا سبب
دریافت کیا تو فرمانے لگے۔

"اُستاداں مشفق و رفیق وطن رفتند تسکین خواندن نمی شود"۔

حافظ صاحب نے بتایا کہ حال ہی میں ایک بڑا عالم اور پیرزادہ دکن سے آیا ہے
اور کہتا ہے کہ اگر کوئی علم حاصل کرنا چاہے گا تو اس کو پڑھا دوں گا۔ قلندر بخش نامی
ایک شخص میرے پاس آیا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے کھانے پہننے کو بھی وہی بزرگ دیتے
ہیں۔ شاہ نور محمد صاحب نے وہاں چلنے کی درخواست کی۔ چنانچہ اگلے دن دونوں
شاہ فخر صاحبؒ کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب حویلی کے دروازے پر پہنچے
تو خوشحال ملازم نے بتایا کہ شاہ صاحب، خانم کے بازار تشریف لے گئے ہیں دونوں
ناکام واپس ہوئے۔ دوسرے دن بعد نماز ظہر شاہ نور محمد صاحب تنہا شاہ صاحب
سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے۔ حویلی کے دروازے پر پہنچے تو ایک دربان کو بیٹھا
ہوا پایا۔ خیال ہوا کہ ناواقفیت میں اندر کس طرح جایا جائے۔ کچھ دیر سوچا پھر ہمت
کرکے اندر داخل ہوئے۔ حویلی کے اندر ایک اور دروازہ تھا۔ اس دروازے کے
مقابل ایک دالان تھا۔ کمرے میں ایک تخت پر صاف چاندنی بچھی ہوئی تھی۔
گاؤ تکیہ لگا تھا اور شاہ فخر صاحب تشریف فرما تھے۔ شاہ نور محمد صاحب کا عالم
تھا کہ تمام انگرکھا پھٹا ہوا تھا۔ ایک چادر جسم پر لپٹی ہوئی تھی سر کے بال بڑھے ہوئے
تھے۔ کبھی اپنی حالت کو دیکھتے تھے، کبھی دالان کی طرف، اور اندر قدم رکھنے کی
ہمت نہ ہوتی تھی۔ اچانک شاہ فخر صاحبؒ کی نظر اُن پر پڑی۔ فوراً اپنے پاس بلایا
شاہ نور محمد صاحب جب قریب آئے تو فوراً تخت سے اُتر کر کھڑے ہو گئے معانقہ

کیا اور اس محبت سے ملے" گویا یارانِ قدیم از مدت جدا ماندہ ۔ بیک دیگر بغل گری می کنند۔" پھر نور محمد صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب تخت پر بٹھا لیا اور پوچھا تمھارا وطن کہاں ہے؟ نور محمد صاحب نے جواب دیا۔ نواحی پاک پٹن، فرمانے لگے۔ کیا بابا صاحب کی اولاد سے ہو۔ عرض کیا نہیں۔ لیکن پاک پٹن کا نام سنتے ہی خوشی کے آثار چہرہ پر نمایاں ہوگئے، اور دریافت فرمایا۔ یہاں کیوں آئے ہو؟ عرض کیا، میں نے سُنا ہے کہ حضور تعلیم دیتے ہیں۔ میں بھی کرم کا اُمیدوار ہوں۔ پوچھا، پہلے کہاں پڑھتے تھے؟ عرض کیا۔ میاں برخوردار جیو کے پاس فرمایا۔ ہمارا پڑھانا مدت سے موقوف ہے ۔ ایسا کرو کہ فی الحال اُن ہی سے پڑھ لو، اس کے بعد ہمارے پاس آجانا۔ شاہ نور محمد صاحبؒ نے جواب میں عرض کیا۔ "عرصہ مابین بسیار است، و مسافت بعید، وقت ما دریں آمد و رفت ضائع خواہد شد" یہ سُن کر شاہ صاحب نے تبسم فرمایا اور یہ شعر پڑھا [1]

ما برائے وصل کردن آمدیم
نے برائے فصل کردن آمدیم

اور فرمایا۔ خیر ہمارے پاس پڑھ لیا کرو!

شاہ فخر صاحب سے تحصیل علم | شاہ نور محمد صاحبؒ اب طالب علم کی حیثیت سے شاہ فخر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ شاہ فخر صاحب کے تبحر علمی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئے۔ اب تک وہ چھوٹے چھوٹے مدرسوں میں معمولی معمولی استادوں سے پڑھتے رہے تھے۔ اب ایک ایسے عالم کے پاس پہنچ گئے تھے جو علم کا ایک بحر ذخار تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُن کے تبحر کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار پکار اُٹھے تھے:۔ "سبحان اللہ بحر علوم بود ندا" [1]

[1] مناقب المحبوبین ۔ ص ۸۱

شاہ نور محمد صاحبؒ نے قطبی کا سبق لینا شروع کیا۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ ابھی کتاب ختم نہ ہوئی تھی کہ شاہ صاحب نے فرمایا۔ تم علم ظاہری میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ جتنا پڑھ لیا ہے وہ ضرورت کے لئے کافی ہے۔ اب اس علم میں مشغول ہو جاؤ جس کے تم لائق ہو"[۵۱] اس بیان سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے علوم ظاہری کا خاتمہ قطبی ہی پر کر دیا تھا لیکن تکملۂ سیر الاولیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نور محمد صاحب نے اور زیادہ اکتساب علوم کیا اور حدیث کی سند لی[۵۲]

بیعت | شاہ نور محمد صاحبؒ نے ۱۱۶۵ھ میں شاہ فخر صاحبؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ شاہ فخر صاحبؒ کے دہلی تشریف لانے کے بعد وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ان سے بیعت کی، بیعت ہونے کا مفصل واقعہ خود انھوں نے اپنی مجلس میں ایک مرتبہ بیان کیا تھا۔ شاہ صاحبؒ سے مرید کرنے کے لئے جب استدعا کی تو فرمایا۔ پہلے استخارہ کرلو۔ جیسا اشارہ ہوگا ویسا کیا جائے گا۔ شاہ صاحب نے استخارہ کیا۔ خواب میں دیکھا کہ کھانے کا طبق اُن کے ہاتھ پر ہے اور شاہ فخر صاحب کا جبہ اُن کی گردن میں پڑا ہے۔ شاہ فخر صاحب آگے آگے جا رہے ہیں۔ اور خود اُن کے پیچھے چل رہے ہیں۔ صبح کو یہ خواب شاہ فخر صاحبؒ سے بیان کیا۔ فرمایا۔ چند روز استغفار پڑھو۔ پھر حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے عرس کے دن حضرت قطب صاحبؒ کے مزار مبارک پر لے جا کر ان کو مرید کر لیا۔[۵۳]

پاک پٹن اور مہار میں قیام | بیعت کرنے کے کچھ عرصہ بعد، شاہ فخر صاحبؒ نے پاک پٹن کا قصد کیا۔ شاہ نور محمد صاحبؒ اس سفر میں اُن کے ہمراہ روانہ ہوئے

---

[۵۱] مناقب المحبوبین ص ۸۵

[۵۲]، [۵۳] مناقب المحبوبین ص ۸۴

جب دونوں پاک پٹن پہنچ گئے تو شاہ فخر صاحبؒ نے شاہ نور محمد صاحبؒ کو مہار جاکر اپنی والدہ سے ملنے کا حکم دیا۔ تعمیلِ ارشاد میں شاہ صاحب وطن روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں اُن کا حُلیہ اور لباس درویشانہ تھا۔ مہار پہنچ کر وہ سب سے پہلے اپنے استاد محمد مسعود کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابھی وہ حافظ مسعود صاحب ہی کی خدمت میں تھے کہ لوگوں نے اُن کی والدہ کے پاس جاکر کہا کہ دہلی سے ایک شخص آیا ہے۔ آؤ۔ اس سے چل کر اپنے بیٹے کا حال دریافت کر لو۔ چنانچہ عاقل بی بی اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر مسجد میں آئیں اور حافظ مسعود سے اپنے بیٹے کا حال دریافت کرنے لگیں۔ حافظ صاحب کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ سعادت مند بیٹے کو معلوم ہوا تو بے اختیار ماں کے قدموں میں گر پڑا ؎

خرّم آں لحظہ کہ مشتاق بیارے برسد
آرزو مند نگارے بہ نگارے برسد

مہار شریف جب تک قیام رہا اُن کا یہ معمول تھا کہ تمام دن مسجد میں اقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دن حافظ شرف الدین نے (جو حافظ محمد مسعود صاحب کے عزیز اور دوست تھے) ان سے دریافت کیا "اے میاں بابل تم دہلی میں اتنے عرصے رہے۔ وہاں کیا حاصل کیا"۔ جواب دیا:۔

"ہندوستانی صاحبزادہ از پیرزادگان، دکھن در دہلی آمدہ بود، در خدمت او می ماندم و دیگچہ ہائے او می لیسیدم"۔ [1]

یہ سُن کر حافظ شرف الدین صاحب نے افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ تو نے کیوں اپنی

---

[1] مناقب المحبوبین۔ ص ۵۹

عمر خراب کی۔ دیکھ مولوی احمد یار، مولوی محمد صالح اور مولوی اسد اللہ اور فلاں فلاں لوگ دہلی گئے اور علم حاصل کرکے آئے۔ اور تو وہاں دیگچیاں چاٹتا رہا۔

مہار میں آٹھ دن قیام کے بعد شاہ نور محمدؒ نے روانگی کی اجازت مانگی۔ والدین نے مجبوراً اجازت دے دی۔ آپ پاک پٹن پہنچے۔ شاہ فخر صاحب نہایت محبت سے ملے۔ گھر کا اور والدہ کا حال دریافت کیا۔ اس کے بعد "برج نظامی" میں عبادت کرنے کا حکم دیا۔ اس زمانے میں شاہ فخر صاحبؒ نے اپنا یہ دستور بنا لیا تھا کہ جو شخص مرید ہونے کے لئے حاضر ہوتا اُس کو شاہ نور محمد صاحب کے پاس بھیج دیتے۔ چنانچہ اس طرح سینکڑوں آدمی شاہ صاحب کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گئے۔ عرس ختم ہونے کے بعد شاہ فخر صاحبؒ نے قبلۂ عالم سے کہا میرا ابھی دو مہینے یہاں قیام کا ارادہ اور ہے۔ تم اپنی والدہ کے پاس ہو آؤ۔ مولانا نور محمد وطن چلے گئے۔ دو مہینے کے بعد جب پاک پٹن واپس آئے تو مہار کا ایک قافلہ بھی ساتھ تھا۔ قبلۂ عالم کے بھائی ملک سلطان، برہان اور اُن کے چچا لکھمیر اور اُستاد محمد مسعود، شاہ فخر صاحب کے حلقۂ مریدین میں شامل ہونے کے لئے ساتھ آئے تھے۔ یہ سب لوگ شاہ نور محمد صاحبؒ کے خلوص اور اعتقاد سے متاثر ہو کر شاہ فخر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

کچھ دن یہ قافلہ پاک پٹن میں مقیم رہا۔ اس کے بعد شاہ فخر صاحبؒ دہلی تشریف لے آئے اور یہ لوگ وطن واپس ہو گئے

مہار میں قیام کی ہدایت | ایک دن شاہ فخر صاحبؒ نے قبلۂ عالم شاہ نور محمد صاحب سے فرمایا:۔

"اے نور محمد! خلق را با تو کار خواہد بود"

یہ سن کر آپ کی حیرت اور استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ عرض کیا "میں ایک کمترین

پنجابی ہوں، کس طرح اس اعلیٰ مرتبہ کے لائق سمجھا گیا"۔ لیکن وہ مرشدِ کامل جس کی نظر میں کیمیا کا اثر تھا اس "پنجابی" کی صلاحیتوں سے واقف تھا۔ اُس نے اپنے مرید کے استعجاب کو دیکھا اور خاموش ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد خلافت عطا فرماکر مہاراں میں قیام کرنے کا حکم دیا۔ مرید نے فوراً تعمیل کی اور مہاراں روانہ ہوگئے۔

لکھا ہے کہ قبلۂ عالم کے مہاراں چلے جانے کے بعد حضرت شاہ فخرالدین صاحب یہ دوہرہ اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

تن مٹکے من چھیرنا سُرت ملووُں ہار
مکھن لے گیا پنجابی چھاچھ پیو سنسار[۵۲]

نواب غازی الدین خاں نے ان اشعار میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

شیخ درحق او چنیں فرمود
کیں زما ہرچہ بودہ است ربود
نیز ارشاد زاں شاہ دین است
کایں زماں قطب وقت خود است[۵۳]

مہار میں قیام خانقاہ | مہار پہنچ کر شاہ نور محمد صاحب نے مسندِ ارشاد بچھائی خلوص اور حقانیت کا اثر یہ ہوا کہ بہت ہی جلد خلقت کا ہجوم لگنے لگا۔ ایک مرتبہ

---

۵۱ "در ریاست نواب بھاول خاں بہ قریہ مہاران کہ از پاک پٹن بجانب غرب بفاصلہ چہل کردہ واقع است رخت اقامت انداخت۔"

خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۵۰۷

۵۲ مناقب المحبوبین۔ ص ۷۷۔ نیز سلسلۂ عالیہ چشتیہ ص ۳۱

۵۳ مناقب المحبوبین ص ۷۷

ایک شخص مہار سے دہلی آرہا تھا۔ شیخ نور محمد صاحب نے اس سے کہا کہ شاہ فخر صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونا، سلام عرض کرنا اور کہنا کہ آنجناب کی توجہ سے یہاں خوب روشنی دیکھی۔ وہ شخص دہلی آیا اور جب حضرت شاہ فخر الدین صاحب کی خدمات میں حاضر ہو کر پنجابی زبان میں کہا :-

"حضرت جی پنیاں پڑیو اور کہیو آساں روشنی اچھی ڈٹھی"[۵۱]

اپنے مرید کی کوششوں کی کامیابی کا حال سن کر شاہ فخر صاحب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ کئی مرتبہ یہ جملہ دہرا کر سنا اور پھر فرمایا :-

"میاں نور محمد مردے خوب است۔ ونسبت شائستہ بہم رسانیدہ"[۵۲]

شاہ نور محمد صاحب کی خانقاہ میں ہزاروں عقیدت مند حاضر ہوتے تھے۔ نافع السالکین میں لکھا ہے :-

"ہزاراں گروہ مرداں می آیند وزیارت می کنند"[۵۳]

جب وہ پاک پٹن جاتے تھے تو ۵۰۰، ۵۰۰۰ درویش ان کے ہمراہ ہوتے تھے[۵۴] اور مہار کا یہ قافلہ درویشانہ شان کے ساتھ باباصاحبؒ کے عرس میں شریک ہوتا تھا۔

شاہ نور محمد کی صحبت میں اس قدر کشش اور تعلیم میں اس قدر تاثیر تھی کہ جو وہاں پہنچ جاتا تھا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ جو اُن کے دستِ حق پرست پر

[۵۱-۵۲] شجرۃ الانوار (قلمی)

[۵۳] نافع السالکین۔ ص ۸

[۵۴] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۹

بیعت ہوجاتا، اس کی زندگی میں حیرت انگیز تغیر ہوجاتا۔ شاہ محمد سلیمان تونسوی فرمایا کرتے تھے :۔

"عجیب تاثیر بود ہر کہ دست ایشاں گرفتے او را تاثیر شدے"۔[۵۱]

شاہ نور محمد صاحب کا زیادہ وقت تلقین وارشاد میں صرف ہوتا تھا۔ اُن کی مجلس ہر وقت گرم رہتی تھی۔ تکملہ سیر الاولیار میں لکھا ہے

"واکثر در عالم محفل آرائی بودند"۔[۵۲]

جو شخص آتا تھا اس کی وضع، استعداد، لیاقت اور مذاق کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔ لکھا ہے

"ہر قسم آدم کہ می آید اختلاط مناسب وضع آں می فرمودند"۔[۵۳]

کبھی کسی کی گفتگو سے مکدر خاطر نہ ہوتے تھے۔ گفتگو سے انحراف نہ فرماتے تھے[۵۴] جو شخص سوال کرتا اس کا شافی جواب دیتے۔ اُن کی خانقاہ میں امیر غریب سب ہی آتے تھے۔ امرار و اہل دول کا اکثر جھمگٹا رہتا تھا۔ بعض لوگوں کو اس سے غلط فہمی بھی ہوتی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ نور محمد صاحب کو دنیاداروں سے کوئی خاص لگاؤ یا تعلق نہیں تھا ان کے مشہور مرید اور خلیفہ حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی رح کا بیان ہے :۔

"قبلۂ عالم را قدس سرہٗ از صحبت دنیا داراں بسیار نفرت بودے"۔[۵۵]

---

[۵۱] نافع السالکین ص ۹۹ - ۱۲۶

[۵۲]، [۵۳] تکملہ سیر الاولیار - ص ۱۲۰

[۵۴] مناقب المحبوبین - ص ۸۶

[۵۵] تکملہ سیر الاولیار،

شاہ نور محمد صاحبؒ کے ملفوظات قاضی محمد عمر صاحب سید پوری نے خلاصۃ الفوائد کے نام سے اور مولوی محمد گھلوی[۵۱] نے خیر الاذکار کے نام سے جمع کئے ہیں۔

اصلاح و تربیت مریدین شاہ نور محمد صاحب اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت میں خاص دل چسپی لیتے تھے۔ تکملہ میں لکھا ہے کہ وہ اپنے خلفاء کو تعلیم و تربیت کے بعد مکمل کر دیتے تھے[۵۲]۔ وہ ہر مرید کی استعداد اور صلاحیت کا علیحدہ جائزہ لیتے تھے اور پھر تربیت کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ وہ بالکل ایک طبیب کی مانند تھے، جو مریض کے مزاج اور مرض کی نوعیت کو دیکھ کر دوائیں دیتا اور علاج کرتا ہے۔ ایک مرتبہ حکیم مولوی محمد عمر سے فرمانے لگے کہ ہمارا دار الشفا ہے۔ یہاں حکیم موجود ہے۔ حکیم صاحب نے فوراً جواب دیا

"شفا بخش امراض ظاہری و باطنی ذات شریف حضور است که ہر آیندہ را از زیارت حضور شفا صوری و معنوی حاصل می شود۔"

شاہ نور محمد صاحب اپنے مریدوں کو درستیِ اخلاق اور اتباعِ شریعت کا درس دیتے تھے۔ اُن کے ملفوظات میں ان ہی دو چیزوں پر جگہ جگہ زور دیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی اخلاقی تعلیم میں خاص طور سے ان تین باتوں پر زور دیا تھا۔

---

[۵۱] مولوی محمد گھلوی رح حضرت نور محمد نارووالہ کے مرید تھے۔ انھوں نے یہ ملفوظ اپنے پیر اور قبلۂ عالم کے ذکر میں جمع کیا تھا
مناقب المحبوبین ص ۶۴

[۵۲] تکملہ سیر الاولیاء

(۱) "یکے آنکہ غصہ بر کسے نکند - کہ غصہ جوہرے است در باطن و اظہار آں نورِ معرفت را میراند۔"

(۲) "دوم آنکہ اگر کسے در حق احدے شکایت کند آں را ماوّل بالخیر باید نمود۔"

(۳) "محاسبہ در امورِ دنیا باید کرد۔"

ان تین ہدایتوں میں اخلاقی درستی کے بے پناہ راز مضمر تھے۔ تمام اخلاقی زندگی جہاں تک وہ دوسروں سے متعلق ہے ان ہی کے گرد گھومتی ہے۔ خواجہ گل محمد احمد پوری نے ان اصولوں کی تشریح کی ہے اور ان کی حقیقت و ماہیت کو سمجھایا ہے[۱ھ]

شاہ نور محمد صاحبؒ اتباعِ شریعت کی بھی خاص تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اُن کے دل میں شریعت کا بڑا احترام تھا۔ فرمایا کرتے تھے۔

"قالب را موافق شریعت کردن و انضمام قلب با اتباعِ شریعت است۔ دعوام را پرسش ازیں خواہد بود۔"[۵۲]

اتباعِ سنت کا یہ حال تھا کہ کہا کرتے تھے:-

"چیزے کہ مروی از جناب رسالت مآب صلعم نباشد بغیر ضرورت چگونہ بکار بردہ شود۔"[۵۳]

وہ اپنے مریدوں کو لوگوں میں رہنے اور اصلاحی جدوجہد کرنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے "افاضۂ خلق"[۵۴] اُن کی نظر میں اہم ترین کام تھا۔ ایک مرتبہ ایک

---

۵۱ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۲۷۔

۵۲ مناقب المحبوبین۔ ص ۹۴۔

۵۳ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۲۶

۵۴ مناقب المحبوبین۔ ص ۹۲۔

بزرگ کا قصہ سنایا کہ اُن کے دل پر عنایاتِ الٰہی نازل ہونی شروع ہوئیں، تو اس خیال سے کہ تنہائی میں شاید اس میں اور ترقی ہو، گوشہ نشین ہو گئے فوراً قلبی کیفیات بند ہو گئیں [۵۱] شاہ صاحب اپنے مریدوں کو سمجھایا کرتے تھے۔ کہ عوام میں رہ کر اُن کی اصلاح کی کوشش کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔

وحدتِ وجود کے متعلق شاہ صاحب کا مسلک وہی تھا، جو حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب کا تھا۔ اس مسئلہ پر عوام میں گفتگو کو ناپسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے:۔

"برائے ہم ماضیہ کہ حوادث واقع می شدند محض برائے اظہار وحدت وجود" [۵۲]

قبلۂ عالم کے ارشاد و تلقین کا اثر مریدوں پر بہت گہرا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فرما رہے تھے کہ جو کسی سے ناخوش ہو اُسے خوش کرنا چاہیے۔ حافظ محمد جمالؒ پر ان کلمات کا ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے فوراً وہاں سے اُٹھ کر اپنے دشمن کے قدموں پر سر رکھ دیا [۵۳] مناقب المحبوبین میں ایک عورت کا واقعہ درج ہے کہ تھوڑی دیر اُن کی مجلس میں بیٹھ کر اس کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ "کلام عرفان و توحید" بیان کرنے لگی [۵۴]

مرشد کی نظر میں | شاہ فخر صاحبؒ کو شاہ نور محمد صاحبؒ سے بڑی محبت

---

۵۱ مناقب المحبوبین - ص ۹۴

۵۲ مناقب المحبوبین - ص ۹۷

۵۳ تکملہ سیرالاولیاء - ص ۱۲۷

۵۴ مناقب المحبوبین - ص ۶۶ - ۶۵

تھی، فرمایا کرتے تھے کہ نور محمد نے تمام عمر میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا
اور نہ کبھی کسی تکلیف کا موقع دیا۔[۵۱]

وہ اپنے پیرومرشد کا اتباع اس طرح کرتے تھے کہ بقول مولانا گل محمد
احمدپوری:-

"ازخصائل آں حضرت بود کہ ہیچ حالت از احوال حضرت مولانا
مولوی صاحب رضی اللہ عنہ ذکر نمی فرمودند مگر کہ باں حالت خود موصوف
می بودند"[۵۲]

پیر سے اُن کی عقیدت اور محبت کا یہ عالم تھا کہ جب تک وہ زندہ رہے ۶ مہینے جہاں
میں رہتے تھے، اور ۶ مہینے دہلی میں[۵۳] شاہ فخرؒ بھی ان پر انتہائی شفقت و
مہربانی فرماتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر یہ پنجابی میرے پاس نہ آتا تو میں دل میں ارمان
لے کر دنیا سے جاتا[۵۴] ایک مرتبہ ان کی مجلس میں حضرت سید رسول نما کا ذکر ہو رہا
تھا۔ فرمانے لگے حق تعالےٰ نے ہمیں ایک ایسا مرید دیا ہے جو "خدا نما" ہے[۵۵] شاہ
فخر صاحبؒ کا یہ دستور تھا کہ جب شاہ نور محمد صاحب وطن کو روانگی کا قصد کرتے
تو شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں کو قبلۂ عالم کی دعوتیں کرنے کا حکم دیتے اور فرماتے
کہ ان کی خدمت میں نذر نیاز پیش کریں۔ چنانچہ جب شاہ نور محمد صاحب وطن جانے

---

۵۱ فخرالطالبین۔ ص ۱۵ (قلمی)

۵۲ تکملہ سیرالاولیا ص ۱۲۴

۵۳ مناقب المحبوبین۔ ص ۶۰

۵۴ مناقب المحبوبین ص ۶۷

۵۵ مناقب المحبوبین۔ ص ۴۸

تھے تو صدہا روپیہ فتوح کا اُن کے پاس جمع ہو جاتا تھا[۵۱]

ایک دن شاہ فخر صاحبؒ قبلۂ عالم کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا، اے نور محمد۔ سبحان اللہ۔ کہاں دکن، کہاں پاک پٹن۔ پروردگار کی قدرت دیکھ کہ مجھے دکن سے بلایا اور تجھے پاک پٹن سے بھیجا۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

حسن زبصرہ، بلال از حبش، صہیب از شام
زخاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجمی است[۵۲]

معاصرین کی نظر میں | شاہ نور محمد صاحبؒ ان ممتاز بزرگوں میں سے تھے، جن کے تعبد، ریاضت اور تبلیغی جدوجہد کی تعریف معاصرین تک نے کی ہے۔ ان کے پیر بھائی جس طرح تذکروں میں ان کا ذکر کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں کی نگاہ میں بڑی عزت اور وقعت رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے مشہور بزرگ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور ان سے استفادہ کیا تھا[۵۳]۔ مناقب فخریہ کا مصنف ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"و مظہر اتم و مرید مراداں حضرت و مقبول حضرت اللہ و محبوب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم مرشد آفاق و ہادی اقوام و مامور از حضرت رسالتؐ بتربیت خلائق مشغول بحق۔ فارغ از علائق، مخدومنا و مولانا خواجہ نور محمد است مدظلہ العالی کہ چندیں ہزار کس نعمت از خوانش دریافتہ و لذت از مائدہ او چشیدہ"[۵۴]

۵۱ مناقب المحبوبین ص ۷۶

۵۲ مناقب المحبوبین۔ ص ۹۰

۵۳ انوار الرحمٰن ۔ ص ۷۸

۵۴ مناقب فخریہ ۔ ص ۲۹ (قلمی)

دوسرے معاصر یعنی مصنف فخر الطالبین نے انھیں

"افتخار درویشاں، مرہم دل ریشاں سرآمد اتقیا، جامع علوم حیا، صفائے چہرۂ محبوباں، کہربائے دل معشوقاں، ہمنشین مسکنت و دانائے سر حلقہ در مندان الہی "

لکھا ہے۔

حسین بخش فخریؒ نے اُن کی تبلیغی مساعی کی تعریف اِن الفاظ میں کی ہے۔

حضرت مولانا صاحب آں مخصوص خود را خلافت دادہ طرف سرزمین پاک پٹن روانہ نمود، ہرگاہ ہیکہ میاں نور محمد آں جا رفتہ سکونت ورزید۔ مردماں آں نواحی از خاص، وعام، ہزار و ہزار، از میاں نور محمد تولا نمودند و مرید شدند و اکثر از آنہا خلافت نمودہ فیض رساں خاص و عام گشتند "	حضرت مولانا صاحب نے اپنے اُن مخصوص مرید کو خلافت دے کر پاک پٹن کی طرف روانہ فرما دیا۔ جوں ہی میاں نور محمد نے وہاں پہنچ کر سکونت اختیار کی۔ اس علاقے کے لوگ خاص اور عام، ہزاروں کی تعداد میں اُن کے سلسلے میں منسلک ہونے لگے اور اُن میں سے بہت سے مریدوں نے خلافت پائی۔ خاص و عام کی رہنمائی اور فیض رسانی کا کام کیا۔

علالت اور وصال شاہ نور محمد صاحب کو اپنے پیر و مرشد شاہ فخر صاحب سے عشق تھا۔ اُن کی وفات کا ان پر بے حد اثر ہوا[۱]۔ پیر کے بعد گو وہ ۶½ سال تک زندہ رہے۔ لیکن طبیعت کبھی خوش اور بحال نہ رہی۔ شاہ صاحبؒ کے وصال کے بعد فوراً ہی اُن کو "کاست بدنی" کی شکایت ہوگئی تھی۔ کچھ دنوں بعد اُن کے

---

[۱] مناقب المحبوبین

عزیز مرید اور خلیفہ حضرت نارووالہ صاحب نے وصال فرمایا۔ صدمہ دُگنا ہوگیا پیر اور مرید کے غم میں اُن کا مرض ترقی کرگیا۔ وصال سے ایک سال قبل، اُنھوں نے تمام اعزا و اقربا سے بے تعلقی اختیار کرلی۔ جب خاموشی کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا:۔

کلام من تفسیر و حدیث است
بکدام گفتہ شود و کہ می فہمد[۵۱]

جب شاہ نور محمد صاحب رح کی حالت نازک ہوئی تو مریدوں کو مزار کے متعلق اُن کی مرضی دریافت کرنے کا خیال ہوا۔ خواجہ محمد عاقل نے لوگوں کے اصرار پر دریافت کیا کہ حضور کا مزار کہاں بنایا جائے؟ جواب میں ارشاد ہوا۔

"من غیب داں نیستم حق تعالیٰ	میں غیب کا جاننے والا نہیں ہوں
می داند کہ کجا خواہند مرد"[۵۲]	حق تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ میں کہاں مروں گا۔

۳ ذی الحج ۱۲۰۵ھ کو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی، کسی نے تاریخ وفات لکھی ؎

حیف واویلا جہاں بے نور گشت[۵۳]
۱۲۰۵ھ

---

[۵۱] مناقب المحبوبین

[۵۲] تکملہ سیر الاولیاء، ص ۲۹-۱۲۸

[۵۳] مہر کا سجع تھا ع "ز نور محمد جہاں روشن است"
مناقب المحبوبین۔ ص ۹۱

مزار مبارک تاج سرور میں ہے۔ وہاں حضرت بابا فریدؒ کے پوتے اور شیخ بدرالدین سلیمانؒ کے بیٹے تاج الدین سرورؒ آسودہ ہیں اور ان ہی کی نسبت سے اس جگہ کا نام تاج سرور پڑ گیا ہے۔ فریدی خانوادہ کے لوگ بکثرت وہاں آباد ہیں۔ اس بنا پر اُسے "بستی چشتیاں" بھی کہا جاتا ہے۔ شاہ نور محمد صاحب کو تاج سرور صاحبؒ کے مزار سے بڑی عقیدت تھی۔ ہر جمعہ کو وہاں جاتے تھے، اور وہیں خانقاہ بھی قائم کر لی تھی اُن کے متعلق اپنی مجلس میں ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ :۔

"شیخ تاج الدین سرور کامل مکمل اند، اما صاحب ارشاد نیستند"

اولاد | شاہ نور محمد صاحبؒ کی ایک زوجہ عظمت بی بی تھیں۔ اُن کے بطن سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ لڑکوں کے نام یہ تھے :۔

شیخ نور الصمد

شیخ نور احمد

شیخ نور الحسن

لڑکیوں کے نام یہ تھے :۔ زینب بی بی اور صاحب بی بی۔ دونوں لڑکیوں کی شادی ہو گئی تھی، لیکن کسی نے اولاد نہیں چھوڑی [۱]

شیخ نور الصمد، شاہ فخر صاحبؒ کے مرید تھے۔ شیخ نور احمد اپنے والد ماجد سے بیعت تھے۔ شیخ نور الحسن، قاضی عاقل محمد کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے [۲]

شاہ نور محمد صاحب کے بعد اُن کے بڑے لڑکے شیخ نور الصمد مسندِ سجادگی پر

---

[۱] مناقب المحبوبین۔ ص ۶۲

[۲] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۰۴

[۳] مناقب المحبوبین۔ ص ۶۱

بیٹھے۔ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ قوم مہاران نے اُن کو شہید کر دیا[۵۱] اُن کے بھی تین لڑکے تھے۔

شیخ نور حسین

شیخ غلام نبی

شیخ غلام مصطفٰے

تینوں علم و عمل، زہد و ورع میں اپنے دادا کی مخصوص روایات کے حامل تھے۔ شیخ نور الصمد صاحب رح کی شہادت کے بعد شیخ نور احمد صاحب مسند نشین ہوئے ان کے متعلق، خواجہ گل محمد احمد پوری کا بیان ہے:۔

"خاص و عام از شرق تا غرب از	شرق سے غرب تک خاص اور عام
فیض وجود ایشاں بہرہ یاب اند[۵۲]	اُن سے مستفیض ہوتے ہیں۔

شیخ نور احمد صاحب کثیر الاولاد تھے۔ اُن کے چھ لڑکے تھے

میاں خواج محمود

حافظ غلام فرید [۵۳]

حافظ نبی بخش

حافظ خدا بخش

حافظ قادر بخش

حافظ گنج بخش

---

۵۱ نافع السالکین۔ ص ۱۰

۵۲ تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۳۰

۵۳ حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ مناقب فریدی ص ۲۳ وغیرہ

شیخ نور احمد صاحب کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے میاں خواج محمود مسند نشین ہوئے۔ اُن کے بعد اُن کے صاحب زادے شیخ نور بخش سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے بعد میاں نور جہانیاںؒ اور خواجہ محمد یوسفؒ نے مسندِ سجادگی کو رونق بخشیؒ۔ آج کل میاں محمود بخش صاحب سجادہ نشین ہیں خواجہ نظام الدین صاحب اُن کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"وہ ایک نہایت برگزیدہ ہستی، صوم وصلوٰۃ کے پابند۔ احکام شرعی کے پورے عامل، عابد اور متقی ہیں۔ تمام اوقات نیک کاموں میں بسر فرماتے ہیں، اور حالاتِ حاضرہ سے باخبر۔" [1]

[1] مکتوب خواجہ نظام الدین تونسوی بنام مصنف

خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ

نور الصمد — نور احمد — نور الحسن

غلام مصطفیٰ — غلام نبی — نور حسین — سلطان محمود — نصیر بخش — نظام بخش

محمود — عبدالستار — میاں عبدالغفور

اللہ بخش — میاں عبداللہ — غلام محی الدین

عبدالرحمٰن — عبدالرحیم

خواج محمود — غلام فرید — نبی بخش — خدا بخش — قادر بخش — گنج بخش

نور بخش — غلام قطب الدین — غلام فخر الدین

نور جہانیاں — کمال الدین — غلام صدیق — غلام رسول — غلام دستگیر — میاں امام بخش

خلفاء و مریدین | خواجہ نور محمد صاحبؒ کے خلفاء نے تونسہ شریف، حاجی پور چاچڑاں وغیرہ مقامات پر نظامیہ سلسلہ کی خانقاہیں قائم کیں اور سلسلہ کا فیض تمام پنجاب میں پھیلا دیا۔ خواجہ صاحبؒ کے مریدوں کی تعداد کافی تھی۔ حاجی نجم الدین صاحبؒ کا بیان ہے :-

"حضرت قبلہ عالم را بجز خلفاء مجازین دیگر مریدان کامل و صاحب نسبت ہم بسیار بودند" [۵۱]	حضرت قبلہ عالم کے مریدان کامل اور صاحب نسبت کی تعداد، علاوہ خلفاء مجازین کے کثیر تھی

بعض خلفاء کے نام یہ ہیں :-

(۱) حضرت تاروو الہ صاحبؒ	(۱۲) غلام محمد سکنہ میرادالی
(۲) قاری عزیز اللہ	(۱۳) محمد غوث بجیدانہ
(۳) نواب غازی الدین	(۱۴) محمد بخش چشتی
(۴) حافظ غلام حسین	(۱۵) اصالت خاں
(۵) قاری صبغتہ اللہ	(۱۶) نواب لطف اللہ خاں
(۶) میاں محمد فاضل نیکو کارہ	(۱۷) مولوی نور محمد سکنہ نواح بھاول پور
(۷) میاں غلام حسین بھٹی	(۱۸) مولوی محمد حسین
(۸) غلام محمد کیڑی	(۱۹) حافظ بنی
(۹) حافظ ناصر	(۲۰) مولوی محمد اکرم ڈیرہ غازی خاں
(۱۰) مولوی محمد مسعود جہانگہ والا	(۲۱) مولوی محمد عجیب
(۱۱) نور الحق	(۲۲) اختیار خاں

---

۵۱ مناقب المحبوبین - ص ۴۷

(۲۳) مخدوم نوبہار اُچی صاحب
(۲۴) عبدالوہاب اوچی
(۲۵) مخدوم عبدالکریم
(۲۶) مخدوم محب بہانیاں
(۲۷) مولوی تاج محمود ساکن گڑھی
(۲۸) شیخ جمال چشتی، فیروزپوری
(۲۹) حافظ عظمت میرن شاہ
(۳۰) سید صالح محمد شاہ

شیخ نور محمد نارووالہ صاحبؒ نارووالہ صاحبؒ قبلۂ عالم کے عزیز ترین اور قدیم ترین خلیفہ تھے۔ قبلۂ عالم نے سب سے پہلے ان ہی کو خلافت عطا فرمائی تھی۔ وہ بڑے جید عالم اور صاحبِ ذوق بزرگ تھے۔ حضرت شاہ فخر صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میاں نارووالہ سے "بوئے شکر بار" آتی ہے [۵۱] پہلی بار جب وہ شاہ فخر صاحب کی خدمت میں اپنے پیر کے ہمراہ حاضر ہوئے تھے تو شاہ صاحبؒ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا تھا :-

"مارا از چشمان ایشاں عشق بنظر می آید" [۵۲] — ان کی آنکھوں میں ہمیں عشق نظر آتا ہے۔

مصنف مناقب فخریہ اُن کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"مولانا نور محمد ساکن نارو مردے است کہ درشان اوایں آیۃ کریمہ کافی است : حاش للہ ماہذا بشرا ان ہذا الا ملک کریم" [۵۲]

جس وقت وہ قبلۂ عالم سے مرید ہوئے تھے۔ اس وقت وہ خود بڑے اعلیٰ پیمانہ پر درس تدریس کے کام میں مشغول تھے۔ لیکن جب قبلۂ عالم کی خدمت میں پہنچے تو بزرگوں کی روایات کے مطابق، شاہ نور محمد صاحب سے تصوف کی

---

۵۱ مناقب المحبوبین۔ ص ۱۱۶
۵۲ مناقب فخریہ ۔ ص ۲۹ (قلمی)

کچھ کتابوں کا درس لیا۔ رسالہ اسرار الکمالیہ میں لکھا ہے کہ حضرت جمال الدین ملتانی فرمایا کرتے تھے کہ ہم تین آدمی (خود، نارووالہ صاحب اور قاضی عاقل محمد) قبلہ عالم کی خدمت میں لوائح، سواء السبیل، تسنیم وغیرہ پڑھا کرتے تھے جب پڑھ کر اپنے مقام پر واپس آتے تھے تو پھر نارووالہ صاحب سے اس کی تحقیق کرتے تھے

واگر در ظاہر ایں فیض از قبلۂ عالم بودے	اگرچہ ظاہر میں یہ فیض قبلہ عالم
"امادر حقیقت ایں ہمہ فیض و ادراک	کا ہوتا تھا لیکن حقیقت میں سب کچھ
مسائل و فہم آں کما حقہٗ از میاں	فیض اور مسائل کا ادراک میاں صاحب
صاحب نارووالہ بود کہ ما ہمہ را	نارووالہ ہی سے حاصل ہوتا تھا کہ وہ
بہ بیان واضح می فہمانیدند"	ہر چیز کو صاف طریقہ پر سمجھا دیتے تھے

نارووالہ صاحب شریعت وسنت کے بے حد پابند تھے۔ خیر الاذکار میں لکھا ہے :-

"آں حضرت جامع شریعت وطریقت	حضرت شیخ شریعت، طریقت حقیقت
وحقیقت بودہ پاسِ مراعات	کے جامع تھے۔ شریعت کا احترام
ظاہر شریعت بدرجہ اتم بود کہ ہیچ	اس قدر تھا کہ کبھی کوئی مستحب تک
مستحبے فوت نمی شد و ہر دم باوضو	فوت نہ ہوتا تھا۔ ہر دم باوضو رہتے
می بودند ...... در مراتب	تھے ...... مراتب طریقت، آداب
طریقت وآداب ومجاہدہ وریاضت	ومجاہدہ اور ریاضت میں اتنے مصروف
چناں مصروف بودند کہ ہیچ کس را	رہتے تھے کہ کسی کو (ان کے سامنے)
یارائے ذکر امور دنیاوی نبودے"	دنیا کے امور کے ذکر کی جرأت نہ ہوتی تھی

اُن کے سینے میں عشق حقیقی کی آگ فروزاں رہتی تھی اور وہ ان ہی بھڑکتے ہوئے شعلوں سے اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مرید نے نواب غازی الدین خاں کے

باغ میں رنگ برنگ کے پھولوں کو دیکھنے کی درخواست کی فرمایا ؎

ما اسیراں را تماشائے چمن درکار نیست
داغہائے سینۂ ما کمتر از گلزار نیست[۵۲]

نارووالہ صاحب بے حد منکسر المزاج بزرگ تھے۔ باوجود جید عالم ہونے کے اُن میں علمی غرور قطعاً نہ تھا۔ لکھا ہے:-

باوجود آں کمالیت...... خود را چناں قاصر می دانستند کہ گویا مبتدی اند"[۵۳]	باوجود اس کمال کے اپنے آپ کو اتنا قاصر سمجھتے تھے گویا کہ مبتدی ہیں۔

اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ اُن کے اوقات کے متعلق دریافت فرماتے اور مناسب موقع ہدایات دیتے تھے ــــــ ایک مرید کو لکھتے ہیں:-

"اوقات شریفہ را موزع دارند۔ وقت تعلیم تعلیم، وقت ذکر ذکر"[۵۴]

شاہ نارووالہ صاحبؒ نے ۴ جمادی الاول ۱۲۳۱ھ کو وصال فرمایا۔ لفظ "چراغ" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ ان کا مزار حاجی پور میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ اُن کی قبر پر کسی قسم کا سایہ نہ ہو "تا مانع نور آسمانی نگردد"۔ ان کے مریدوں نے یہ اطلاع شاہ نور محمد صاحب کو کی۔ انھوں نے نہایت اصرار کے ساتھ اُن کے مزار پر عمارت[۵۵] بنوادی۔ شاہ نور محمد صاحب کو اُن کے وصال سے سخت صدمہ ہوا فرمایا:

---

[۵۱] یہ باغ بہار میں نواب غازی الدین خاں نے بنوایا تھا۔ نواب موصوف کو قبلۂ عالم سے بڑی عقیدت تھی اور آں سے خلافت پائی تھی۔ [۵۲] مناقب المحبوبین ص ۱۰۹ [۵۳] مناقب المحبوبین ص ۱۱۰

[۵۴] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۳۱، [۵۵] مناقب المحبوبین ص ۱۱۳

"اگر میاں صاحب چندے مہلت یافتند، عالمے ازایشاں روشن می شد" [1]	اگر میاں صاحب کچھ اور مہلت پاتے تو ایک عالم ان سے روشن ہو جاتا۔

اور ان کے مریدوں کو ہدایت فرمائی کہ جب کوئی حاجت ہو تو بے تکلف ان سے کہہ دیا کریں [2]

شاہ نارو والہ صاحب کے ملفوظات مولوی محمد صاحب نے خیر الاذکار کے نام سے مرتب کیے ہیں۔

شاہ نارو والہ صاحب ؒ کے ایک فرزند تھے جن کا نام حافظ محمد تھا شاہ صاحب ؒ کے بعد وہی مسند نشین ہوئے۔ اُن کے تین بیٹے تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبدالرحیم اور مولانا غلام رسول۔

نارو والہ کے صاحب کے مشہور خلفاء کے نام یہ ہیں۔

(۱) عبداللہ خاں	ڈیرہ غازی خاں
(۲) مولوی محمد حسن	راجن پور
(۳) نور محمد بڈرہ	محمد پور
(۴) مولوی ابوبکر	حاجی پور
(۵) مولوی محمد کہلوی	(جامع خیر الاذکار)

مولوی حافظ غلام حسین | قبلۂ عالم کے مرید اور خلیفہ تھے۔ "تجرید، تفرید، توحید"

[1] خلاصۃ الفوائد (ملفوظ خواجہ نور محمد) بحوالہ تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۳۱

[2] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۳۲

و مناقب المحبوبین ص ۱۱۷

میں یکتائے زمانہ تھے، تمام عمر آستانہ شیخ پر گذار دی۔ ۹ ذی قعدہ سنہ ۱۲۲۲ھ کو وصال فرمایا۔ شاہ نور محمد صاحب کے قریب سپردِ خاک کئے گئے۔ ان کے خلفاء میں غلام مرتضیٰ صاحب بہت شہرت اور عظمت کے مالک تھے۔

نواب غازی الدین خاں نواب غازی الدین خاں، شاہ فخر صاحبؒ کے مرید تھے اور قبلۂ عالم سے خلافت پائی تھی۔ قبلۂ عالم کے مناقب میں ایک مثنوی لکھی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ذکر نور محمد آں ہمہ نور | گر نویسم جہاں شود پُر شور

دست نسبت عیاں کشید او را | جذبِ دل سوئے جاں کشید او را

پیکرِ او تمام پیکرِ جاں | ہست معنیش ز گوہرِ جاں

کارش از فخرِ دیں گرامی شد | وارثِ نسبتِ نظامی شد
شیخ در حق او چنیں فرمود | زما ہر چہ بودہ است بہ بود
ہم بگفتا کزیں جہاں آرا | شدہ اُمیدِ مغفرت ما را

ہست امروز او مرادِ جہاں | مرجعِ خاص و عام شیخ زماں

حضرت شاہ نیاز احمد بریلویؒ

حضرت مولانا شاہ نیاز احمد صاحبؒ، شاہ فخر صاحبؒ کے مشہور ترین خلفا میں تھے علم و فضل میں یکتائے عصر تھے۔ زہد و تقویٰ کا دور دور شہرہ تھا۔ بریلی میں ان کی خانقاہ تھی۔ ہزاروں عقیدت مندوں کا وہاں ہجوم لگا رہتا تھا تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے دور دور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مولانا غلام سرور کا بیان ہے۔

"خلق بے شمار بہ حلقۂ ارادت وے	بے شمار خلق ان کے حلقہ ارادت میں
درآمد و مردماں از اقالیم دور و	شامل تھی۔ اور لوگ دور دراز ملکوں سے
دراز یعنی از کابل و قندہار و شیراز	یعنی کابل، قندہار، شیراز، اور بدخشاں
و بدخشاں بہ خدمت بابرکت وے	سے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض
حاضر آمدہ مستفید و مستفیض شدند"[۱]	اٹھاتے اور فائدہ حاصل کرتے تھے۔

خود شاہ صاحب کا عالم یہ تھا کہ عشقِ حقیقی کے نشے میں چور رہتے تھے۔ دردِ عشق

---

[۱] خزینۃ الاصفیا جلد اول۔ ص

ان کا سرمایۂ حیات تھا۔ یہ آگ ہر وقت ان کے سینے میں سلگتی تھی کبھی کبھی اس کے شرارے شعر کی صورت میں نمودار ہوتے تھے۔ وہ شعر بہت کم کہتے تھے۔ لیکن جب کبھی کہتے تھے اپنا دل نکال کر رکھ دیتے تھے۔ ان کے لفظ لفظ سے اثر ٹپکتا تھا۔ ان کا شعر اعماقِ روح سے نکلتا اور سننے والے کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا کلام اس زمانہ کے صوفیہ میں بہت مقبول ہوا۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے لکھا ہے۔

"حضرت شاہ دل آگاہ بہ شعر رغبت تمام داشت۔ واشعار آب دار متضمن حقایق و معارف گفتے۔ چنانچہ دیوان نیاز کہ از تصانیف آں حضرت است بسیار مرغوب و مطبوع طبع جماعت اصفیاء است[۱]"	حضرت شاہ صاحب شعر کی جانب بڑی رغبت رکھتے تھے اور نہایت آب دار اشعار جن میں حقایق و معارف کا ذکر ہوتا تھا، کہتے تھے۔ چنانچہ دیوان نیاز جماعت اصفیا میں بے حد مرغوب ہے۔

ولادت اور ابتدائی حالات شاہ نیاز احمد صاحبؒ ۱۱۴۳ھ میں بہ مقام سرہند پیدا ہوئے[۲]۔ والد ماجد حکیم شاہ رحمت صاحب کا سایہ بچپن ہی میں سے اٹھ گیا تھا۔ والدۂ ماجدہ نے پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ جب سرہند کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو دہلی میں شاہ فخر الدین صاحبؒ کی خدمت بابرکت میں علوم ظاہری کی تکمیل کے لئے حاضر ہوئے۔ شاہ نیاز احمد صاحبؒ نہایت ذکی اور ذہین انسان تھے۔ ۱۷ سال کی عمر میں معقول و منقول، فروع و اصول، حدیث و تفسیر

۱؎ جلد اول۔ ص ۔۔۔ ۲؎ مناقب فریدی۔ ص ۷۰۔

میں کمال حاصل کرلیا۔ علومِ ظاہری سے فراغت ہوئی تو شاہ فخرالدین دہلویؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کرلی۔ اور علومِ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال تھی۔ آپ کی لیاقت، استعداد اور سعیٔ پیہم سے پیر بہت متاثر ہوئے اور اپنا خلیفہ راستیں مقرر کیا۔ اور بریلی میں اقامت کی ہدایت فرمائی۔ بریلی پہنچ کر شاہ نیاز احمد صاحب نے اپنی خانقاہ قایم کی جو بہت جلد بقول مولانا غلام سرورؔ "معدن فیوضِ ربانی" اور "مطلع انوار سبحانی" بن گئی۔ جگہ جگہ سے لوگ آپ کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کو ہندوستان میں جو کچھ فروغ ہوا، وہ مولانا شاہ فخرالدین صاحب دہلویؒ کے دو مریدوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شاہ نور محمد صاحب نے پنجاب میں اور شاہ نیاز احمد صاحب نے یوپی میں سلسلے کو خوب پروان چڑھایا۔

دہلی میں درس وتدریس

اس زمانہ کے صوفیہ نے درس وتدریس کا کام اپنے پروگرام کا ایک لازمی جزو بنالیا تھا۔ چنانچہ شاہ نیاز احمد صاحب نے بھی کافی عرصہ تک دہلی میں درس وتدریس کا کام انجام دیا۔ مصحفی نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کی "شانِ علم" اور "وجاہت" دیکھی تھی۔ ریاض الفصحا کے ایک بیان سے دہلی میں ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔[۱]

مصحفی اور شاہ صاحبؒ

مصحفی نے دہلی میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب سے تلمذ کیا تھا۔ ریاض الفصحا میں لکھتے ہیں۔

"چند روز میزان ہم از ایشاں در
شاہ جہاں آباد خواندہ بود"[۲]

---

[۱] ریاض الفصحا ص ۳۲۹ [۲] ریاض الفصحا ص ۳۲۹ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

جب مصحفی لکھنؤ چلے گئے اور ان کے شاعرانہ کمالات کا شہرہ شاہ صاحبؒ کے کانوں تک پہنچا تو اپنی ایک غزل مصحفی کو لکھ کر بھیجی ؎

کسیکہ سر نہاں است ..... ہمہ اوست
عروسِ خلوت و ہم شمع انجمن ہمہ اوست

زمصحفِ رخِ خوباں ہمیں بود رقمم
کہ خط و خال و رخ و زلف پُر شکن ہمہ اوست

نظر بہ عیب مکن در ظہور باغ وجود!
کہ طوطیان چمن زاغ و ہم زغن ہمہ اوست

از سرِ عشق چو واقف شوی یقیں دانی!
کہ قیس و لیلےٰ و شیریں و کوہ کن ہمہ اوست

شنیدہ ام بہ صنم خانہ از زبانِ صنم
صنم پرست و صنم گر صنم شکن ہمہ اوست

رساند مطربِ خوش گو ہمیں ندا در گوش!
کہ چوب و تار صدائے تنن تنن ہمہ اوست

شاہ صاحب بہ حیثیت اردو شاعر

شاہ نیاز احمد صاحبؒ کو سوز و گداز سے بھری ہوئی طبیعت ودیعت کی گئی تھی۔ عشق ان کے خمیر میں تھا۔ جذباتِ عشق و محبّت کبھی کبھی شعر کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ شاہ صاحب شعر بہت کم کہتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے اردو اور فارسی دونوں دیوان بہت مختصر ہیں لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنی جامعیت اور افادیت میں کم نہیں۔ ان کی فکرِ رسا نے تصوف کے نہایت باریک نکات کو انتہائی حسن اور دل کشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے کلام میں آورد نہیں۔ وہ قلبی واردات کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سوز و گداز، درد، علوِ معانی کے علاوہ نفاست، سلاست اور روانی ان کے کلام کے خاص جوہر

ہیں حضرت نیازؔ نے فکرِ رسا پائی تھی۔ اور اس پر خود حضرت نیازؔ کو ناز تھا کہتے ہیں ؎

رکھتے ہیں نیازؔ یہ اہلِ دل ترے شعر سننے کا اشتیاق
غزل ایک دوسری اور کہہ تجھے حق نے فکرِ رسا دیا!

ایک جگہ اپنی فصیح البیانی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

بھلا ایک غزل اور بھی ایسی کہیو
تجھے میں فصیح البیان دیکھتا ہوں

سلاست اور روانی حضرت نیازؔ کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ وہ نہایت بلند خیالات کو انتہائی سادگی نفاست اور دلکشی کے ساتھ ادا کرتے ہیں اس سادگی میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ یہاں آمد ہی آمد ہے آورد کا نام نہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

رواں آنکھوں سے ہے سیلاب گل گوں الٰہی چشم ہے یا چشمۂ خوں!

اک تو ہی نہیں بین ہمی بوند بن آنکھوں کا مارا اے اہلِ نظر نرگسِ بیمار سے کہہ دو

کروں کیا بیاں میں اے ہم نشیں تیرا سکے لطفِ نگاہ کا کہ تعینات کی قید سے مجھے ایک دم میں چھڑا دیا

فرشِ زمیں ہے خاک نشینوں کا بستر ا بے خان ومانِ عشق کا تکیہ ہے خشت و سنگ

مجھ سے مریض کو طبیب ہاتھ تو اپنا مت لگا اس کو خدا پہ چھوڑ دے بہرِ خدا جو ہو سو ہو

جسے ذات بے رنگ بے چوں کہیں ہیں ‏ ‏ ‏ بہ ہر رنگ جلوہ کناں دیکھتا ہوں

صورتِ گل میں کھل کھلا کے ہنسا ‏ ‏ ‏ شکلِ بلبل میں چہچہا دیکھا

شمع ہو کر کے اور پروانہ ‏ ‏ ‏ آپ میں آپ کو جلا دیکھا

کرکے دعوا کہیں انا الحق کا ! ‏ ‏ ‏ برسرِ دار وہ کھنچا دیکھا

کائنات ان کے نزدیک ایک بحرِ رواں ہے مسلسل اور متواتر۔

اگر کوئی جانے جہاں غیرِ حق ہے ‏ ‏ ‏ سو میں اس کو دھوکا گماں دیکھتا ہوں

یہ جو کچھ کہ پیدا ہے سب عینِ حق ہے ‏ ‏ ‏ کہ ایک بحرِ ہستی رواں دیکھتا ہوں

ازل سے ہے لے کے ابد تک ہی جو ہی سو ہے ‏ ‏ ‏ بہ رنگ بحرِ رواں جس میں ہے نہ توڑ نہ جوڑ

اسی مسئلے کو ریاضی سے بھی ثابت کرتے ہیں۔ جو رشتہ ایک (مبتدا الاعداد) اور دوسرے اعداد میں ہے وہی رشتہ خدا اور کائنات کے درمیان ہے۔

تعینات کے نقطوں سے ہے کثیر احد ‏ ‏ ‏ وہی ہے ایک یہ دس سو ہزار لاکھ کروڑ

ہیں دیدۂ بینا میں ہم سارے کم و بسیار ایک ‏ ‏ ‏ کثرت نمایاں اتنی ہو جتنا کرے تکرار ایک

وحدتِ ادیان

شاہ نیاز احمد صاحبؒ وحدتِ ادیان کے قائل تھے۔ ان کی حریتِ فکر و ضمیر کا یہ عالم ہے، کہتے ہیں۔

یہ سب ادیان و ملل ہیں شاخ ہائے یک درخت ‏ ‏ ‏ ایک جڑ سے ہیں یہ نکلی ڈالیاں سب پھوٹ پھوٹ

گر بادۂ توحید پیئں اہلِ مشارب ‏ ‏ ‏ ہفتاد و دو ملت کی ہو تکرار فراموش

جو رب الحرم ہے صنم بھی وہی ہے ... حرم دیر میں ایک سا دیکھتا ہوں
اے برہمن اور اے شیخ مانے ... یہ آپس کا جھگڑا یہاں دیکھتا ہوں

عشق حقیقی

شاہ نیاز احمد صاحبؒ صوفی تھے عشق الہٰی ان کے خمیر میں تھا۔ وہ عشق کے بندے تھے، عشق کی دنیا میں رہتے تھے۔ عارف رومؒ کی طرح ان کے قلب کی دھڑکنوں میں یہ آواز پوشیدہ تھی ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما!

عشق کے اُن پر اتنے احسان ہیں کہ کہتے ہیں ؎

کہاں تک کہوں لطف و احسانِ عشق
کہ جوں جوں گھٹا میں بڑھایا مجھے
یہاں تک دیا مجھ کو حسن عروج
کہ بندے سے مولا بنایا مجھے

عشق کی دنیا میں پہنچ کر وہ عقل و ہوش کو الوداع کہتے ہیں ؎

جو نہیں آمد آمد عشق کا مجھے دل نے مژدہ سنا دیا
خرد و حواس و شکیب نے وہیں کوس کوچ بجا دیا
جب بر در دل حضرت عشق آن پکارے
گو شے ہوئی عقل اور ہوئے اوسان کنارے

جب شاہ فخرالدین صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ؎

جبھی جا کے مکتب عشق میں سبق مقام فنا لیا

جو کچھ لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو دہ صاف دل سے بھلا دیا

علومِ ظاہری کو خیر باد کہہ کر وہ اس شان سے عشق کے میدان میں قدم رکھتے ہیں ؎

عشق کے میدان میں آ صورتِ انسان بنا
عاشق مولا ہوا چاند کا جیسے چکور

جذباتِ عشق ان کے سینے میں متلاطم ہوتے ہیں۔ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ؎

جوش زن ہے عشق کی مے اب خم دل میں نیاز
گہہ ابل کر وہ گرے گہہ خم سے نکلے پھوٹ پھوٹ
کیا جوش میں ہے اب مے وحدت خم دل میں
ابلے ہے پڑی رومی و عطار سے کہہ دو

آتش عشق ان کے سینے کو جلا دیتی ہے ؎

کہیں عاشق نیاز کی صورت
سینہ بریاں و دل جلا دیکھا

طوفانِ اشک امنڈ تا ہے۔ بے اختیار نیاز کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھتے ہیں ؎

یا الٰہی زورق گردوں سنبھال
بے طرح امڈا ہے یہ طوفانِ اشک

ایک لمحہ رکتا ہے۔ سوچتا ہے کہ حقیقتاً یہ اس کی یاوری کی ہے ؎

پھک چکے تھے ہم تو اے یارو ابھی
گر نہ ہوتا اس گھڑی احسانِ اشک

عشق نے شاہ صاحب کی شاعری میں ایک درد، سوز اور گرمی پیدا کر دی ہے

جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ محسوس بھی کرتے ہیں، اس لئے اس کی آتش انگیزی بھی بے پناہ ہوتی ہے۔ ہر لفظ جو ان کی زبان سے نکلتا ہے گرمی اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

تبحر علمی اور تصانیف

شاہ نیاز احمد صاحب بڑے جید عالم تھے۔ ان کی تصانیف ان کی علمیت کی شاہد ہیں۔ حضرت عزیز میاں صاحب، خاکسار مصنف کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں — "حضرت نیاز بے نیاز شاہ نیاز احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں

شمس العین شریف

رسالہ راز و نیاز

تحفہ نیازیہ حضرت بے نیاز

رسالہ تسمیہ المراتب

مجموعہ قصائد عربیہ

شرح قصائد عربیہ

حاشیہ شرح چغمینی [1]

حضرت شاہ صاحبؒ کے اشعار سے بھی تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ فلسفہ و منطق وغیرہ کی اصطلاحات جگہ جگہ اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں۔[2]

خلفاء و مریدین

حضرت شاہ نیاز احمد صاحبؒ کے خلفاء کی تعداد کثیر تھی۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ان کے سلسلہ کی خانقاہیں قائم تھیں

---

[1] مکتوب حضرت عزیز میاں بنام مصنف [2] ملاحظہ ہو، مصنف کا مضمون "حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی بہ حیثیت اردو شاعر" مطبوعہ رسالہ "اردو" اکتوبر ۱۹۴۵ء ص ۸۰

حضرت عزیز میاں صاحب نے خاکسار مصنف کی گزارش پر ان کے خلفاء کی مندرجہ ذیل فہرست ارسال فرمائی ہے۔

(۱) تاج الاولیا شاہ نظام الدین صاحب
(۲) مولوی عبداللطیف صاحب سمرقندی
(۳) مولوی نعمت اللہ خاں بخاری کابل
(۴) حافظ وزیر خواجہ کابل
(۵) مولوی محمد حسین مکہ معظمہ
(۶) میر محمد سمیع صاحب بدخشانی
(۷) سکین شاہ صاحب ولایتی
(۸) ملا عیوض محمد بدخشانی
(۹) مولوی یار محمد کابلی
(۱۰) محمد عثمان خاں وزیر خیلی کابل
(۱۱) ملا جان محمد خاں اخون کابل
(۱۲) مخدوم عبدالشہید صاحب یارقندی
(۱۳) حاجی ہاشم صاحب کابل
(۱۴) محمد فخر عالم شاہ جہاں پوری
(۱۵) سید احمد علی شاہ آبادی
(۱۶) سید حشمت علی شاہ آبادی
(۱۷) میاں فخر الدین صاحب
(۱۸) خلیفہ وجیہ الدین۔
(۱۹) مرزا اسد اللہ بیگ بریلوی
(۲۰) حاجی شرف الدین ردولی
(۲۱) سید صاحب شاہ زادہ کیٹر در اجمیر شریف
(۲۲) سید ضیاء الدین
(۲۳) محمد عبداللہ خاں صاحب شاہ جہاں پور
(۲۴) مولاداد خاں شاہ جہاں پور
(۲۵) مولوی محمود عالم بچھرایونی
(۲۶) بخش اللہ شاہ آبادی
(۲۷) حکیم رحیم اللہ بچھرایونی
(۲۸) مولوی عبدالرحمان جاورہ
(۲۹) غلام مولیٰ اکبرآبادی
(۳۰) محمد کفایت اللہ
(۳۱) مولوی عبید اللہ جی بکھیلی
(۳۲) مولوی عبدالرحمان
(۳۳) شاہ شمس الحق لکھنؤ
(۳۴) شاہ نور الدین بریلوی

(۳۵) مولوی متاں خاں شاہ جہاں پور (۳۶) خلیفہ عبد الرسول کابل

(۳۷) مخدوم جی بدخشانی

سجادہ نشین

حضرت شاہ نیاز احمد صاحبؒ نے ۶ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ کو بمقام بریلی وصال فرمایا۔ ان کے بعد ان کے خلف اکبر حضرت تاج الاولیا شاہ نظام الدین صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی شاہ نصیر الدین بدایوں تشریف لے گئے تھے۔ اور وہیں لاولد وصال فرمایا۔ وہ مجرد زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہ نظام الدین بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ہزاروں عقیدت مندان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کے مریدوں میں دو بزرگ خاص طور سے قابل ذکر ہیں (۱) مولانا عبد السلام صاحب نیازی دہلوی اور (۲) مولوی عبد الرحمان صاحب مرحوم کچھرایونی۔ مولانا عبد السلام صاحب نہایت جید عالم ہیں۔ فلسفہ، ریاضی اور الہٰیات پر خاص عبور ہے۔ وحدت وجود پر ان کی گفتگو بڑی دلچسپ اور عالمانہ ہوتی ہے۔ مولوی عبد الرحمٰن صاحب مرحوم بزرگوں کی دیرینہ روایات کے حامل تھے اور اپنے سلسلہ کے مشایخ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔

شاہ نظام الدینؒ کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ محی الدین صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے۔ آج کل شاہ صاحب کے نواسے حضرت عزیز میاں صاحب سجادہ پر جلوہ فرما ہیں۔ ان کے مریدین کی تعداد کثیر ہے۔ رازؔ تخلص کرتے ہیں۔ شعر میں درد سوز اور معنی سب کچھ ہوتا ہے۔ شاہ نیاز احمد صاحب کے کچھ اشعار کی تضمین کی ہے۔ جن میں راز و نیاز کی باتیں بڑے انداز سے کہی گئی ہیں۔ ان کے خلفاء میں ایک بزرگ مولوی سید انوار الرحمان صاحب بسمل تھے جو بڑے زاہد، عالم اور شگفتہ مزاج بزرگ تھے۔

مسکین شاہ صاحب

حضرت شاہ نیاز احمد صاحبؒ کے خلفاء میں ایک خاص مرتبہ

کے مالک تھے۔ قصبہ کشتوار نواح کشمیر میں آپ کی ولادت ہوئی۔ بزرگ عہدۂ قضا پر مامور تھے۔ آپ بھی کچھ عرصہ قاضی رہے۔ پھر سب سرمایہ راہِ خدا میں لٹا کر دنیا سے کنارہ کش ہو گئے سب سے پہلے قادریہ سلسلہ میں حضرت گنگال شاہ سے بیعت کی۔ پھر نقشبندیہ سلسلہ میں حضرت شاہ غلام علی صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے۔ مسئلہ وحدتِ وجود پر کچھ اطمینان چاہتے تھے۔ بالآخر شاہ نیاز احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان ہی کے ہو گئے۔ شاہ صاحب نے ان کو جے پور روانہ فرمایا۔ جہاں ہندو اور مسلمان سب ہی آپ سے عقیدت رکھنے لگے۔ ۲۸ جمادی الاول ۱۲۷۵ھ کو وصال فرمایا خزینۃ الاصفیاء میں تاریخ وفات لکھی ہے ؎

شاہ مسکین چوں بحق شد واصل
رفت نزدِ خدا آگاہ !
گفت تاریخ رحلتش سرور
کہ امامِ بہشت مسکیں شاہ ![1]

ان کے خلیفہ سیکر میں شاہ ولی محمد صاحب[2]، فتح پور میں محبوب علی شاہ صاحب کرنال میں فیض اللہ شاہ صاحب، الہ آباد میں مولانا سکندر علی صاحب، لکھنؤ میں، مولوی گل محمد، جے پور میں مولانا صادق علی شاہ صاحب تھے۔ آج کل ان کے سجادہ نشین مولانا فضل حق شاہ صاحب ہیں۔

---

[1] خزینۃ الاصفیاء [2] مکتوب سید اکرام حسین صاحب رضوی سیکر، بنام مصنف

باب ششم

حضرت خواجہ محمد عاقلؒ

خواجہ محمد عاقلؒ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے ممتاز ترین خلفاء میں تھے۔ پنجاب میں نظامیہ سلسلہ کی اشاعت میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ چاچڑاں، کوٹ مٹھن احمد پور وغیرہ مقامات کی خانقاہیں ان ہی کی کوششوں سے وجود میں آئیں۔ حاجی نجم الدین صاحب نے لکھا ہے۔

"ہزار ہا مخلوق از در وازۂ ایشاں	ہزار ہا مخلوق نے ان کے دروازے
فیض یاب شدند وصد ہا صاحب	سے فیض پایا اور سینکڑوں صاحب
خانقاہا از ایشاں مبعوث شدند"[۱]	خانقاہ ان سے مبعوث ہوئے۔

ان کے علمی تبحر، پابندیِ شرع، بزرگانہ شفقت، اخلاق و مروت کا دور دور شہرہ تھا۔ لوگ بڑی عقیدت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پنجاب کے نہایت ہی دور افتادہ اور غیر معروف علاقوں میں مذہبی اور روحانی تعلیم کا چرچہ ہوگیا اور ان کے خرمنِ کمال کے خوشہ چین دور

---

[۱] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۳

دور پھیل گئے۔

خاندان و نسب خواجہ محمد عاقلؒ ایک معزز فاروقی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے اجداد شاہان مغلیہ اور امرار وقت کی نظروں میں خاص عزت رکھتے تھے ان کے ایک بزرگ حضرت محبوب اللہ الصمد مخدوم نور محمد تھے۔ ارادت خاں وزیر شاہ جہاں ان کا مرید تھا۔ شاہجہاں نے ان کو پانچ ہزار بیگہ اراضی اخراجات کے واسطے دی تھی اور اس مضمون کا ایک فرمان عطا کیا تھا[1]۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِنَّ اللہَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ الخ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللہَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ الخ

مورخہ بست و پنجم شہر ربیع الاول سنہ جلوس

مطابق سنہ ۱۰۴۲ھ

بدیں مضمون کہ

دریں زمان فرمان سعادت نشان فرخندہ عنوان

بعرض اینکہ موازی پنج ہزار بیگہ زمین قابل

زراعت از پرگنہ منگلوٹ سرکار صوبہ دار الامان

ملتان در وجہ مدد معاش بنام خادمان کرامت نشان

پیر و مرشد طریقت ہادی راہ حقیقت راہبر راہ شریعت

---

[1] مناقب فریدی۔ ص ۷۴ - ۷۶

ومعرفت، غوّاص بحر عرفان، زبدۂ خدا پرستان
حضرت قبلہ میاں صاحب مخدوم نور محمد کوریجہ
دام اللہ ظلہ وشرفہ معہ فرزندان از ابتدائے فصل
خریف بازگشت اری بہشت سنہ ۹۹۹ فصلی مقرر است
امر رفیع القدر شرف صدور یافت کہ زمین مذکورہ بہ میاں
صاحب معزالیہ عنایت فرمودیم کہ حاصلات آنہا
فصل بہ فصل سال بسال صرف مایحتاج خود نمودہ دعائے
خیر دولت ابد پیوند اشتغال می فرمودہ باشند، باید کہ
حکام وعمال وجاگیرداران وکر دریان حال واستقبال
داخل پرگنہ اراضی مذکور در محل پیمودہ حسب الحکم اشرف الاعلیٰ
این امر جلیل القدر را مستمر دانستہ در زمین مذکور را از مالیہ
سرکار یک صد وچہل چاہ چک بستہ ویک مسجد مبارک
وسرائے رنگین پختہ درس خواندن طالب علماں ساختہ
بتصرف میاں صاحب معزالیہ دہند وبوجہات و
سائر جہات اخراجات مثل مغلیہ وپیش کش وجرمانہ
وخالصانہ ومحصولانہ ودروغگانہ وپہرانہ ودہ نیمی ومقدمی
وصدودمی وقانونگوئی وضبط ہر سال وتکرار زراعت
وکل تکالیف دیوانی ومطالبات سلطانی مزاحمت
نرسانند ودر ہر سال وہر فصل سند مجدد نطلبند، واجب الارشاد

عمل نمودہ تخلف نوازند" تحریر تاریخ

مناقب فریدی میں عالمگیر اور شاہانِ مابعد کے فرامین بھی درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس جاگیر کو برقرار رکھا اور شاہ نور محمد کوریجہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

نور محمد کوریجہ کے تین فرزند تھے (۱) سلطان مخدوم (۲) مخدوم محمد یعقوب (۳) حاجی محمد اسحاق۔ اول الذکر نے لاولد وصال فرمایا۔ موخر الذکر کی اولاد دہرون ضلع ڈیرہ غازی خان میں آباد ہوگئی۔ محمد یعقوب کے دو بیٹے ہوئے۔

(۱) مخدوم غلام حیدر۔ ان کا مزار دریائے سندھ کے کنارے یارا والی میں ہے۔

(۲) مخدوم محمد شریف۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک قاضی نور محمد دوسرے قاضی محمد عاقل[۱]

محمد شریف صاحب، یارا والی میں مقیم ہوگئے تھے اور وہاں ان کے کثیر تعداد میں مرید ہوگئے تھے۔ وہ بڑے مرتاض بزرگ تھے۔ زہد و ورع، قناعت و توکل میں یگانۂ روزگار تھے۔ حاجی نجم الدین صاحبؒ نے لکھا ہے کہ وہ "عالم باعمل" اور "صاحب برکت" تھے[۲]۔ خواجہ گل محمد احمد پوری نے لکھا ہے کہ وہ زہد و ورع میں لاثانی تھے[۳]۔

کوٹ مٹھن

"مناقب فریدی" میں کوٹ مٹھن کے آباد ہونے کے متعلق لکھا ہے کہ جب مخدوم محمد شریف صاحب، یارا والی میں آکر آباد ہوئے تو مٹھن خان لنج

---

[۱] مناقب فریدی۔ ص ۸۴ [۲] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۱۹ [۳] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۳۸

رئیس یار والی آپ کا مرید و معتقد ہوگیا۔ ایک دن آپ کا گذر اس جگہ سے ہوا جہاں اب کوٹ مٹھن آباد ہے۔ دریا کے کنارہ پر یہ پُرفضا مقام دیکھ کر آپ نے خان موصوف سے کہا کہ اس جگہ ایک شہر آباد کیا جائے اور وہ اللہ والوں کا مسکن ہو۔ خان نے اس جگہ شہر بسانا قبول کرلیا۔ اور مخدوم سے گذارش کی کہ وہ خود اس مقام کو اپنا مستقر بنالیں۔ اس طرح کوٹ مٹھن وجود میں آیا[۱] اور حضرت مخدوم محمد شریف کی موجودگی کی وجہ سے دور دور سے علماء و مشایخ وہاں آکر جمع ہوگئے۔

کوریجہ لقب

شاہ محمد عاقل صاحبؒ کا خاندانی لقب کوریجہ تھا۔ تمام شاہی فرامین میں ان کے بزرگوں کے نام کے ساتھ کوریجہ لقب ملتا ہے۔ حاجی نجم الدین صاحب نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ خواجہ صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ ایک دن مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گئے اور پوچھا کہ کیا کسی نے اذان کہہ دی ہے؟ لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے مٹی کے ایک برتن کو جو قریب ہی رکھا تھا اٹھایا اور کہا کہ اے کوزہ تو اذان کہہ۔ اس وقت سے ان کو "کوریجہ" کہنے لگے۔ کوزہ کو سندھی زبان میں کوُرا کہتے ہیں اور کہنے کے لئے جو استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ کوراجو ہوگیا جس کے معنی ہوئے "کوزہ بگو" رفتہ رفتہ کوراجو سے کوریجہ ہوگیا[۲]

تعلیم

خواجہ محمد عاقلؒ نے بہت تھوڑی عمر میں کلام پاک حفظ کرلیا تھا[۳]۔ ان کے والد ماجد مخدوم محمد شریف صاحبؒ جو "یکتائے زماں" اور "محدث دوراں[۴]" تھے خود ان کو تعلیم دیتے تھے۔ فاضل باپ نے اپنے ہونہار بیٹے میں علم و ادب کا وہ ذوق و شوق

۱۳۹

[۱] مناقب فریدی ص۔ ۹۴ [۲] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۱۹-۱۱۸ [۳] مناقب فریدی۔ ص۔ ۵۰ [۴] تکملہ سیر الاولیاء ص

پیدا کر دیا جو آخر عمر تک ان کا طرۂ امتیاز رہا۔ اور جس سے ہزاروں شائقینِ علم وادب نے فائدہ اٹھایا۔

خواجہ صاحب نے اپنے والد کے علاوہ حضرت شاہ فخر صاحبؒ اور خواجہ مہاریؒ سے بھی تحصیل علوم کی تھی حضرت شاہ فخر صاحب نے ان کو شرح عبدالحق اور سواء السبیل کا درس دیا تھا[۵۱]۔ خواجہ مہارویؒ سے انھوں نے حدیث کی سند لی تھی[۵۲]۔

خواجہ صاحب کا حافظہ نہایت عمدہ تھا۔ جزوی مسائل تک صحت اور حوالوں کے ساتھ ان کو یاد رہتے تھے۔ ان کے تبحر علمی کے متعلق خواجہ گل محمد احمد پوری نے لکھا ہے۔

"در عصر خود شرقاً غرباً مماثل آنحضرت در علم ظاہری ہم کسے نبود"[۵۳] — مشرق و مغرب میں ان کی مثل اس زمانہ میں علم ظاہری میں کوئی نہ تھا۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں —

"خلوص علم از اصول و فروع بآں مشابہ بود کہ بدرجہ اجتہاد رسیدہ بود"[۵۴]

اجرائے مدارس و سلسلہ درس و تدریس

خواجہ محمد عاقل صاحبؒ کو ابتدا ہی سے درس و تدریس کا بڑا شوق تھا انھوں

---

۵۱ مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۱ ۵۲ تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۰۸-۱۰۹، سلسلہ حدیث اس طرح درج ہے۔ شیخ محمد عاقل شیخ نور محمدؒ، شیخ فخر الدین دہلویؒ، شیخ نظام الدین الفوری ثم اورنگ آبادیؒ، شیخ حافظ محمد اسعد الانصاری المکی ثم اورنگ آبادی، شیخ محمد طاہر بن شیخ محمد ابراہیم کردی شہرازوری شیخ محمد ابراہیم کردیؒ۔

۵۳ تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۰۹ ۵۴ ایضاً

نے کوٹ مٹھن میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پہ ایک مدرسہ قائم کیا۔ بڑے بڑے عالم اس مدرسہ میں ملازم تھے۔ درس و تدریس کا کام بہت باقاعدہ ہوتا تھا۔ خود خواجہ محمد عاقلؒ سو سے زیادہ طلباء کو درس دیتے تھے۔ مدرسہ کے ساتھ ہی ایک بڑا لنگر خانہ تھا۔ جب آپ کوٹ مٹھن سے شدانی تشریف لے گئے تو وہاں بھی مدارس قائم کئے اور طلباء و اساتذہ کے لئے لنگر کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔[۱]

خواجہ صاحبؒ کے مدارس میں جن کتابوں کا درس ہوتا تھا وہ یہ ہیں ——

مشکوٰۃ شریف۔ احیاء العلوم۔ صحیح بخاری۔ لوائح و شرح قصیدہ' سواء السبیل۔ تسنیم۔ فصوص الحکم

شرح وقایہ معہ حواشی۔ ہدایہ۔ شرح مواقف۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ میر ہاشم۔ شرح عقاید۔ خیالی۔ مطول وغیرہ[۲]

خواجہ نہاروی کی خدمت میں حاضری

تحصیلِ علم کے بعد خواجہ محمد عاقلؒ اور ان کے بڑے بھائی میاں نور محمدؒ کو اصلاحِ باطن اور تزکیہ نفس کے لئے مرشد کامل کی تلاش اور جستجو پیدا ہوئی۔ اگرچہ خود ان کے والد ماجد بڑے صاحب کمال بزرگ تھے لیکن بقول خواجہ گل محمدؒ۔

"داعیہ آنجناب شہباز بلند پرواز بود"[۳]

اسی اثنا میں حضرت خواجہ نور محمد نہارویؒ کی شہرت سنی۔ اتفاقاً ان کے بڑے بھائی کی موضع باران والی میں خواجہ نہاروی سے ملاقات بھی ہو گئی، پہلی ہی نظر میں ہم

---

[۱] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۰۴ [۲] ایضاً [۳] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۵

یہ عالم ہوا کہ ــــ

"۔۔۔ ہیبت ۔۔۔۔ آں بادشاہ گدا

لباس در گرفت" [۱]

اور بے اختیار زبان پر یہ اشعار آ گئے [۲]

بشبہائے سیہ کے بُد امیدم

کہ روزے گردد ایں روزِ سفیدم

شبم را صبح فیروزی بر آید!

غم و رنج شبا نروزی سر آید

کہ بودم گمر ہے در ظلمتِ شب

رسیدہ جان ز گمراہیم بر لب

بر آمد از افق رخشندہ ماہے

بکوئے دوستم بنمود راہے [۲]

اسی رات کو ایک قاصد خواجہ محمد عاقل کو بلانے کے لئے کوٹ مٹھن بھیجا گیا۔ خواجہ صاحب فوراً آ کر ملے اور اوچ میں خواجہ نور محمدؒ کے دستِ حق پرست پہ بیعت کر لی۔

دہلی کا سفر اور شاہ فخر صاحب کی خدمت میں حاضری

خواجہ محمد عاقلؒ کو کئی مرتبہ [۳] حضرت شاہ فخر صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ پہلی بار جب وہ خواجہ مہاروی کی

---

[۱] تکملہ سیر الاولیاء، ص ۵۴ [۲] ایضاً۔ ص ۴۶ [۳] مناقب فریدی میں ان کے تین مرتبہ دہلی تشریف لانے کا ذکر ہے۔ تکملہ میں لکھا ہے کہ دو مرتبہ دہلی گئے (ص ۴۶)، مناقب المحبوبین نے فیصلہ نہیں کیا ہے بلکہ لکھا ہے "دو سہ مرتبہ رفتہ اند۔ ص ۹۰، ۵۹"

ہمراہی میں مہار سے دہلی تشریف لائے تھے تو سارا سفر پیادہ پا کیا تھا۔ جب مرشد نے
اس کا سبب دریافت کیا تو عرض کیا "میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ حضرت شاہ فخر صاحبؒ
کی زیارت کو پاپیادہ جاؤں گا"[۵۱] دوسری مرتبہ وہ دہلی اس طرح آئے کہ اپنے وطن سے مہار
خواجہ مہارویؒ کی خدمت میں گئے تھے، وہاں معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب دہلی تشریف لے
گئے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فوراً دہلی کا رخ کیا۔ دہلی پہنچے تو شاہ فخر صاحب کی خدمت میں پیش
کرنے کے لئے کچھ پاس نہ تھا۔ صرف ایک لوٹا تھا اس کو فروخت کیا اور شاہ فخر صاحب کے
لئے مٹھائی خریدی۔ خواجہ مہاردی کو اس کا علم ہوا تو دو اشرفیاں دیں کہ یہ حضرت شاہ صاحب
کی خدمت میں پیش کر دو۔[۵۲]

مناقب فریدی میں لکھا ہے کہ دوسری بار جب وہ شاہ فخر صاحبؒ کی خدمت
بابرکت میں حاضر ہوئے تھے تو علاوہ فیضانِ باطنی کے کچھ مسائلِ تصوف بھی سمجھے تھے،[۵۳]
مناقب المحبوبین کا بیان ہے کہ انھوں نے شاہ فخر صاحب سے شرح عبدالحق اور سواءالسبیل
پڑھی تھی۔[۵۴] آخری بار جب وہ مولانا فخر صاحبؒ سے رخصت ہوئے تو انھوں نے چار
کتابیں عنایت فرمائی تھیں۔

(۱) مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہی

اس پر مولانا کے ہاتھ کا حاشیہ لکھا ہوا تھا۔ مناقب المحبوبین کے مصنف نے
اس نسخہ کی زیارت کی تھی۔

---

[۵۱] [۵۲] تکملہ ص ۱۴۷، مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ خواجہ مہاردی نے ۴ اشرفیاں پیش کرنے کے لئے دی تھیں۔
(ص ۱۲۲) [۵۳] مناقب فریدی۔ ص ۵۰ [۵۴] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۱

(۲) کتاب مطول

(۳) سواء السبیل

(۴) ایک مجموعہ جس میں لوائح جامی، شرح رباعیات جامی وغیرہ تھی[۱]

مجاھدات قاضی محمد عاقل صاحبؒ نے نہایت سخت مجاہدات کئے تھے۔ خواجہ حافظ محمد جمالؒ کہا کرتے تھے کہ قاضی صاحبؒ نے جتنے مجاہدے کئے ہیں مشکل سے کوئی دوسرا شخص کرسکتا ہے[۲]۔ ان کو ذکر جہر میں بڑی دلچسپی تھی۔ آخر زمانہ میں بھی جب ان کا بدن پیرانہ سالی کے باعث کمزور اور نحیف ہوگیا تھا، وہ نہایت پابندی سے ذکر جہر کرتے تھے۔ ان کے ذکر کی آواز میلوں تک جاتی تھی[۳]۔ نواب غازی الدین خان نے اسماء الابرار میں لکھا ہے کہ قاضی صاحبؒ کے ذکر کی آواز دہار سے شہر فرید تک (جو تین چار میل کے فاصلہ پر ہے) جاتی تھی[۴]

قاضی صاحبؒ "حبس دم" کی بھی مشق فرمایا کرتے تھے۔ خواجہ گل محمد نے لکھا ہے کہ انھوں نے مجاہدۂ حبس دم کو کمال تک پہنچا دیا تھا۔ ان کا ارشاد تھا۔

"شغل حبس مثل مار بر گنج است۔ | شغل حبس دم خزانے پر سانپ کی مانند ہے
ہر کہ از گزند او نترسد بگنج می رسد"[۵] | جو اس کے نقصان سے نہیں ڈرتا وہ خزانہ پاتا ہے

عبادت میں مشغولیت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ان لوگوں سے جو بلاناغہ حاضر خدمت ہوتے تھے، یہ دریافت فرمالیتے تھے کہ اتنے دنوں کہاں رہے۔ جب

---

[۱] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۱۔ مناقب فریدی۔ ص ۵۸ [۲] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۷ [۳] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۸ [۴] بحوالہ مناقب المحبوبین۔ ص ۱۱۹ [۵] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۸

کوئی جواب میں عرض کرتا کہ بندہ تو روزانہ حاضر ہوتا ہے تو فرماتے ۔ "من ندیدہ ام" [۵۱]

قید وبند کے مصائب قاضی محمد عاقل صاحبؒ کے بڑے بھائی قاضی نور محمد صاحبؒ ڈیرہ غازی خاں میں ٹھیکے لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ٹھیکہ کی رقم ادا نہ ہوئی تو ناظم ڈیرہ نے شاہ محمد عاقل صاحبؒ کو جو ضامن تھے قید کر لیا۔ ۹ مہینے تک شاہ صاحبؒ نے قید وبند کے مصائب برداشت کئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے اپنا سارا وقت عبادت وریاضت میں صرف کیا۔ رہائی کے بعد فرمایا کرتے تھے۔

"اگر آں نہ ماہ مرا بدست نمی آمد!
شاید از نتیجہ شغل بے نصیب می رفتم" [۵۲]

قید کے زمانہ میں پیر و مرشد کی جانب سے حضرت نارووالہ صاحب نے متعدد بار رہائی کے لئے اعمال ان کے پاس بھیجے۔ لیکن انھوں نے کوئی عمل نہیں پڑھا بعد کو جب لوگوں نے عمل نہ پڑھنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا۔

"برائے خلاص نفس خود عمل کردن حیا دامن گیر می شد" [۵۳]

مقبولیت خلافت ملنے کے بعد کچھ عرصہ تک خواجہ محمد عاقلؒ نے شیوع سلسلہ کی طرف توجہ نہیں کی۔ شیخ مہارویؒ کو علم ہوا تو نہایت سختی کے ساتھ لکھا کہ "تم فیض کو عام کیوں نہیں کرتے اور خلق اللہ کو داخلِ سلسلہ کیوں نہیں کرتے

---

۵۱ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۸

۵۲ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۹

۵۳ " " "۔ ص "

میں اس کی اطلاع شاہ فخر صاحبؒ کو کروں گا" یہ سن کر خواجہ صاحب لرز گئے اور نہایت ادب سے عرض کیا ـــــ

"کدام کس پیش من آمدہ است کہ
آں رد نمودم۔ اگر مرضی مبارک باشد
خود بہ خود بگویم" [۱]

اپنے مرید کا یہ انکسار اور عجز دیکھ کر خواجہ مہارویؒ کو جوش آگیا۔ فرمانے لگے ـــــ

"اے میاں صاحب! روزے باشد
کہ ملائک آسماں بنامِ شما منادی دہند
وخلائق از شرق وغرب بر آستانِ
شما جبہ سایند، سبحان اللہ! شما می
فرمائید کہ پیش من کسے نمی آید" [۲]

تھوڑے ہی دنوں بعد پیر کی پیشین گوئی صحیح ہوئی اور ہزاروں عقیدت مند ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

فتوح اور لنگر قاضی صاحب کا لنگر ابتدائی زمانہ سے ہی جاری تھا۔ طلباء اور فقراء کو اس لنگر سے کھانا ملتا تھا۔ لیکن ایک زمانہ شاہ صاحب پر ایسا بھی گذرا تھا کہ مسلسل فاقہ رہتا تھا اور لنگر کے سب متعلقین، فقراء اور طلباء کو یہ مصائب برداشت کرنے پڑتے تھے۔

---

[۱] و [۲] تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۵۰

خواجہ گل محمد احمد پوریؒ اس تنگی اور عسرت کے زمانہ میں قاضی صاحبؒ کی خانقاہ میں رہتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب فتوح نہ آتی تھی تو کچھ نہ پکتا تھا جب کچھ آجاتا تو پک جاتا۔ لیکن خواجہ صاحب کا یہ عالم تھا کہ جب تک تمام متعلقین، درویش اور طالبعلم کھانا نہ کھا لیتے،

"دست بہ طعام نمی بردند" [۵۱]

خواجہ گل محمد نے لکھا ہے کہ ان کے متعلقین وغیرہ کی تعداد پانچسو تھی[۵۲] اور یہ تعداد اس وقت تھی جب فقر و فاقہ کے مصائب بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ جب باب فتوح کھل گیا تو لنگر سے کھانے والوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ اندازہ لگانا مشکل ہوگیا۔ لکھا ہے ——

"دراں وقت نہ واردین را تعداد	اس وقت نہ آنے والوں کا شمار
بود، نہ طعام را انداز، یکے دربار	تھا نہ کھانے کا اندازہ۔ ایک شاہی
شاہنشہی بود" [۵۳]	دربار تھا (جو چلتا رہتا تھا)

اتباع سنت خواجہ محمد عاقلؒ اتباعِ سنت کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ احکامِ شریعت وسنتِ نبوی پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ وصال سے کچھ پہلے حضور سرور کائناتؐ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں ——

"تو مارا بسیار خوش کردی کہ ہمگیں سنتہائے مارا زندہ کردی" [۵۴]

---

[۵۱] [۵۲] [۵۳] تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۴۹

[۵۴] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۳

خواجہ جلال پوری فرمایا کرتے تھے کہ ان کو درجہ فنافی الرسول حاصل تھا۔[۵۱]

توزیع اوقات خواجہ محمد عاقل اپنے اوقات کے بہت پابند تھے۔ مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد وہ شغل و ذکر میں مصروف ہو جاتے تھے۔ پھر کھانا کھا کر عشاء کی نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ اس کے بعد مریدوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ آدھی رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ تہجد کی نماز پڑھ کر ذکر جہر کرتے تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے۔ طلباء کو درس شام کے وقت دیتے تھے۔ ڈیڑھ پہر دن باقی ہوتا تھا کہ اُن کا حلقۂ درس شروع ہو جاتا تھا۔[۵۲]

لباس و خوراک خواجہ صاحبؒ عمدہ اور لطیف لباس زیبِ تن فرماتے تھے۔ شاہ فخر صاحبؒ نے ہدایت کی تھی کہ لطیف لباس اور لطیف غذا استعمال کرنا۔ یہ نصیحت سن کر ان کو بہت تعجب ہوا تھا لیکن پھر جب انھوں نے رسالہ خواجہ عبیداللہ احرارؒ میں لکھا دیکھا کہ

"سالک را باید کہ غذا و لباس لطیف
استعمال کند کہ انوار لطیف وارد
می شود"[۵۳]

---

۵۱ ذکر حبیب۔ ص ۸۰ - ۷۹

۵۲ مناقب فریدی۔ ص ۵۵ - ۵۴
تکملہ سیرالاولیاءؒ ص ۱۴۲

۵۳ تکملہ سیرالاولیاءؒ ص ۱۴۴
مناقب فریدی۔ ص ۵۵

تو شاہ فخر صاحب کی نصیحت کی حکمت ان کے ذہن نشین ہو گئی۔

خواجہ صاحبؒ کا قمیص سینے پر سے چاک رہتا تھا۔ کلاہ قادری سر پر ہوتی تھی۔ جب باہر تشریف لے جاتے تو سر مبارک پر دستار یا سلاری (لنگی) باندھ لیتے تھے۔ تکملہ میں ان کے لباس کے متعلق لکھا ہے —

"پاجامہ از توسیلہ سیاہ و با نہ بند سیاہ مستعمل
می شد، و بر دوش لنگی یا الاچہ یا دوپٹہ یا سلاری
بہر کیف می رسد مستعمل می شد" ل۵

ریشمین کپڑا کبھی استعمال نہ کرتے تھے۔

خواجہ صاحبؒ بہت قلیل الطعام تھے۔ رات دن میں ۵۰ درم سے زیادہ خوراک نہ ہوتی تھی۔ تکملہ میں لکھا ہے —

"در اکل و شرب آں حضرت از شصت و ہشت
درم ارد ہفت نان تنک و نرم تیار کردہ می شد
بایں طریق کہ بر تابہ نیم پختہ نمودہ بعد ازاں بر اخگر ہا
تمام پختہ می شد بایں صورت نان تمام نرم می شود
———— ازاں نانہا دو نیم نان گہے
سہ بشوربہ چوزہ یا دال مونگ یا شلغم تناول می فرمودند
دہم چنیں وقت شب می کردند" ۵۲

ل۵ تکملہ سیر الاولیا - ص ۱۴۴ مناقب فریدی - ۵۵

۵۲ تکملہ ص ۱۴۳

اخلاق

شاہ صاحبؒ کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ امیر و غریب، بوڑھے اور جوان سب ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ سب سے یکساں شفقت اور انکساری سے ملتے تھے۔ جو ان سے ملتا یہ سمجھتا تھا کہ جس قدر التفات و اکرام مجھ پر ہے کسی پر نہیں۔ اکثر اوقات ایسا دیکھا گیا کہ بعض لوگوں نے بازو پکڑ پکڑ کر آپ کو اپنی طرف رجوع کیا۔ لیکن آپ نے نہایت خندہ پیشانی اور محبت سے ان کو جواب دیا۔ لوگ زور زور سے گفتگو کرتے لیکن آپ نہایت آہستگی اور خندہ روئی سے ان کو مطمئن کرتے۔ بعض مرتبہ خود ہنس کر ذکر کیا کرتے تھے کہ لوگ میرے بازو پکڑ کر اور زور زور سے چیخ کر مخاطب کرتے ہیں، گویا میں بہرا ہوں۔ [۵۱]

اصلاح مریدین

شاہ محمد عاقلؒ اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف خاص توجہ فرماتے تھے۔ وہ ان میں صحیح مذہبی جذبات، خدا پر بھروسہ اور اسی سے ہر مشکل میں مدد مانگنے کا صحیح جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ چیچک کے عمل کے متعلق ذکر ہو رہا تھا۔ فرمانے لگے ـــ

نسبت اثر بجز ذکر دن عین شرک است

موثر حقیقی حق تعالیٰ است " [۵۲]

شاہان مغلیہ کی عقیدت

اکبر شاہ ثانی نے شاہزادہ جہاں خسرو اور کاؤس شکوہ کو قاضی محمد عاقل صاحبؒ کا مرید کرایا تھا۔[۵۳] بہادر شاہ ظفر کو

۵۱ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۴

۵۲ تکملہ۔ ص ۱۹۵

۵۳ مناقب فریدی۔ ص ۳۶

ان سے بہت عقیدت تھی۔ ایک شعر میں کہتا ہے ؎

دل فدا کرتے ہیں نام فخرِ دیں پر اے ظفر
ہم ہیں عاقل ربط عاقل سے دلی رکھتے ہیں ہم

وصال قاضی صاحب تقریباً چار مہینے تک علیل رہے۔ ایک دن فرمانے لگے ؎

"امروز در تمام ہرج سفر کشیدیم خوب شد کہ
بہ منزل رسیدیم" ؎[۱]

حاضرین حیران ہو گئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ خواجہ گل محمد احمد پوری۔ یہ الفاظ سن کر رونے لگے۔ اسی دن شاہ صاحب نے وصال فرمایا۔ شدانی سے کوٹ مٹھن لا کر سپردِ خاک کیا گیا۔ ۸ رجب ۱۲۲۹ھ کو یہ واقعہ پیش آیا۔ تاریخ وصال ہے ؎

دل ز داغِ درد پُر سوز و لہب
جاں بلب شد چوں سخن گوید بلب
رفت از دارِ فنا سوئے بقا
رہبرِ دینِ ہدیٰ عالی نسب
مظہرِ نورِ محمدؐ، فخرِ دیں
شہ محمد عاقل، محبوبِ رب
ہادیٔ خلقِ خدا رفت از جہاں!
حسرتا دردا دریغا صد عجب
آہ وا ویلا و صد افسوس و درد
کز جہاں نورِ جہاں شد محتجب

---

[۱] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۵۱

خم تہی گشت و نماندہ صاف درد:
درد باقی بہر مست و مضطرب
چونکہ تاریخ وسیہ سال وصال
از دلِ پُر درد خود کردم طلب
سرز جیب بیخودی برکرد و گفت
روز ہشتم بود از ماہِ رجب[۵]
۱۲۲۹ھ

سجادہ نشین

قاضی محمد عاقل صاحبؒ کے بعد ان کے صاحبزادے میاں احمد علیؒ سجادۂ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ وہ بڑے پایہ کے عالم تھے طبیعت سادہ پائی تھی۔ فطرتاً خلیق تھے۔ ۹ شعبان ۱۲۳۱ھ کو وصال فرمایا۔ کوٹ مٹھن میں سپردِ خاک کیے گئے۔ میاں احمد علیؒ کے دو لڑکے تھے۔

(۱) میاں خدا بخش

(۲) خواجہ تاج محمود

میاں احمد علیؒ کے بعد میاں خدا بخش مسند نشین ہوئے۔ کچھ دنوں کوٹ مٹھن میں رہے پھر چاچڑاں کو اپنا مستقر بنالیا۔ مصنف تکملہ نے ان کی نسبت لکھا ہے۔

"انوارِ اسرار از ناصیۂ مبارک او ہویدا است
کہ مثل ایں وجود شریف کم کسے دیدہ باشد
در علم و حلم و جاہ و سخا، دریں زمانہ عدیل او کسے
نیست و قدم بر قدم جد خود حضرت سلطان
الاولیاءؒ می رود۔ و ترک یک مستحب ازاں ذات

---

۵۷ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۵۵

فائض البرکات زیادہ باشد" [1]

مرزا محمد وشاہ کے دو شعر ان کے متعلق بہت مشہور ہیں ۔۔۔ [5]

فقر گر خواہی برو در چاچڑاں   ہست محکم فیض حق سرکار ما

بن گیا کامل جو پہنچا چاچڑاں   میرے مرشد کا عجب دربار ہے

میاں خدا بخش مرجعِ خلائق بزرگ تھے ۔ لوگ بہت دور دور سے ان کی خدمت میں
ضر ہوتے تھے ۔ لنگر سے نفیس کھانے لوگوں کو ملتے تھے ۔ خود ان کی گذر اوقات سوکھی
ں پر تھی [2] ۔ بیماروں کی دیکھ بھال کے لئے ایک طبیب ملازم تھا ۔ دواخانہ کا پورا اہتمام تھا،
مریضوں کی دیکھ بھال اور عیادت فرمایا کرتے تھے ۔

لکھا ہے کہ ان کے یہاں آنے والوں کی اس قدر کثرت تھی اور اس قدر زمیندار اور
ں ان کی آستانہ بوسی کو حاضر ہوتے تھے کہ بارہ بارہ من غلہ روزانہ گھوڑوں کے خرچ
آتا تھا ۔ [3]

اتباعِ شریعت کا بڑا خیال رہتا تھا مصنف مناقب فریدی کا بیان ہے کہ "ذات بابرکات
بھی کوئی سنت ترک نہیں ہوئی" [4]

اس زمانہ میں سکھوں کے مظالم کی خبریں ڈیرہ غازی خاں سے ان تک پہنچیں ۔ مسلمانوں
خود ان کے مظالم بیان کئے اور کہا کہ وہ نماز پڑھنے ، اذان دینے اور تلاوت قرآن کرنے
ع کرتے ہیں ۔ اور عدول حکمی پر قتل کرتے ہیں ۔ مسلمانوں کی دردناک داستانیں سن کر
ا دل بھر آیا اور فرمانے لگے "مسلمان بھائیوں پر یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا" لکھا ہے کہ انھوں
ن مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کا ارادہ کر دیا تھا ۔ [5]

مناقب فریدی ۔ ص ۷۷ ، [2] مناقب فریدی ۔ ص ۸۱ [3] مناقب فریدی ۔ ص ۷۵
مناقب فریدی ص ۷۵ ، [5] مناقب فریدی ۔ ص ۷۶ ۔ ۷۵ ، ۷۶ ، ۷۸

میاں صاحب نے کبھی نواب راجاؤں سے جاگیریں قبول نہیں کیں۔ نواب بہاولپور نے چند موضع پیش کئے تو فرمایا — "میرے پیروں نے کبھی کسی کی ایسی چیز قبول نہیں کی دوسرے یہ کہ جب ریاست اور زمینداری ہوئی تو مال گزاری وغیرہ امور پیش آئیں گے اور کبھی نہ کبھی عدالت تک جانا ہوگا۔ جب ان کاموں میں مصروف ہوئے تو پھر فقیری کہاں اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے"۔[۱۵]

میاں صاحب درس کے معاملہ میں نہایت سختی اور پابندی سے کام لیتے تھے۔ ان کے زمانہ میں کئی مدرسے جاری رہے۔ وہ خود صبح کے وقت حدیث و فقہ و تصوف کا درس دیتے تھے[۲۵]

میاں خدا بخش صاحبؒ نے ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۶۹ھ کو وصال فرمایا۔ مزار کوٹ مٹھن میں ہے۔ خلفاء میں یہ بزرگ مشہور ہیں —

(۱) غلام فخرالدین (۶) مخدوم عنایت شاہ

(۲) صاحبزادہ نصیر بخش (۷) حیدر بخش

(۳) کریم حیدر (۸) قاضی فتح محمد ملتانی

(۴) مولوی غلام کبریا (۹) سید لال شاہ

(۵) مولوی محمد صالح ملتانی

میاں خدا بخش صاحب کے دو صاحبزادے تھے۔

(۱) مولانا غلام فخرالدین (۲) مولانا غلام فرید

میاں صاحب کے بعد مولانا غلام فخرالدین مسند نشین ہوئے۔ وہ نہایت درجہ شرع کے پابند تھے۔ بڑا قوی حافظہ تھا۔ احادیث نبوی نوک زبان پر رہتی تھیں[۳۵]

---

۱۵ مناقب فریدی۔ ص ۷۔ ۵، ۶، ۸۔ ۲۵ مناقب فریدی۔ ص ۶، ۵، ۶، ۸

۳۵ مناقب فریدی ص۔ ۸۹۔ ۹۲۔ ۹۴

اراضی جو والیان ریاست بہاول پور نے حضرت میاں خدابخش صاحب کو پیش کی تھی۔ وہ آپ نے اپنے زمانہ میں قبول فرمالی تھی۔[1] ۵ رجمادی الاول ۱۲۸۸ھ کو وصال فرمایا اور اپنے والد کے آغوش میں سپرد خاک کیے گئے۔[2]

ان کے بعد مولانا غلام فرید سجادہ پر جلوہ افروز ہوئے۔ خاتم سلیمانی میں لکھا ہے:۔

"خواجہ غلام فرید چشتی چاچڑاں شریف والے بڑے ولی کامل گذرے ہیں۔ ہمیشہ عشق الٰہی میں محو رہتے تھے۔"[3]

خلافت کے معاملہ میں وہ نہایت سخت گیر تھے۔ آپ نے صرف ان لوگوں کو خلافت دی جو عوارف کے اصولوں پر عامل تھے۔[4]

میاں تاج محمود میاں احمد علی صاحبؒ کے دوسرے صاحبزادے، میاں تاج محمود سے بھی نظامیہ سلسلہ چلا۔ ان کے پانچ صاحبزادے تھے۔

(۱) خواجہ محمد شریف
(۲) خواجہ گل محمد
(۳) خواجہ خیر محمد
(۴) خواجہ شیر محمد
(۵) خواجہ غوث بخش

ان پانچوں صاحبزادوں نے سلسلہ کو فروغ دیا۔ میاں غوث بخش کے ایک صاحبزادے میاں ہوت تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے میاں عبداللہ تھے۔ ان سے بھی سلسلہ کو خوب ترقی ہوئی۔

میاں تاج محمود کے مشہور خلفا یہ تھے ــــــ

(۱) میاں فضل علی خاں ۔ مزار سکھانی
(۲) میاں محمد مزار کوٹ مٹھن

---

[1] مناقب فریدی۔ ص ۸۹-۹۲ - [4] و [2] ایضاً۔ ص ۸۹-۹۲، ۹۴ و [3] خاتم سلیمانی ص ۱۶۳ [4] منا المحبوبین قب ص ۹۴

(۳) مولوی محمد حامد ساکن شدانی

(۴) مولوی چند ودہ مزار سیت پور

خلیفہ اکبر خواجہ محمد عاقل کے سب سے پہلے خلیفہ تھے۔ خواجہ صاحب ہر معاملہ میں ان سے مشورہ کرتے تھے اور ان ہی کی سفارش پر خلافت عطا فرمایا کرتے تھے[۵] قاضی صاحبؒ کے مریدوں کی اصلاح وتربیت بھی فرماتے تھے۔ خواجہ گل محمد احمد پوری کو انھوں نے کشکول پڑھایا تھا۔ آپ نے ۳ ربیع الآخر ۱۲۳۹ھ کو وصال فرمایا۔

مولوی عبداللہ خواجہ محمد عاقلؒ کے خلیفہ تھے۔ بے حد مجاہدہ کیا تھا۔ سیاحت بھی کافی کی تھی۔ جید عالم تھے۔ شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کی مشہور کتاب تسنیم کی شرح تنیسم کے نام سے لکھی تھی۔ ایسا غوجی پران کا حاشیہ بہت مشہور تھا۔ ان کا مزار احمد پور میں ہے۔

مولوی محمد اعظم قاضی صاحب کے عزیز ترین خلفاء میں تھے۔ سفر وحضر میں شیخ کے ساتھ رہتے تھے۔ خواجہ گل محمد اور ان میں بڑی محبت تھی۔ ایک پیالہ میں کھاتے اور ایک لحاف میں سوتے تھے۔ ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۴۰ھ کو وصال فرمایا۔

میاں شریف الدین قاضی صاحب کے خلیفہ تھے۔ انھوں نے سلسلہ کی اشاعت میں خاص حصہ لیا۔ تکملہ میں لکھا ہے ــــــ

"از آں حضرت خلافت یافتہ وبسیار خلق اللہ از دست مبارک ایشاں در سلسلہ سلطان الاولیاء داخل شدہ ومی شوند۔ اللہ تبارک وتعالیٰ بکرم وفضل خود روز افزوں دارد ودر سلوک مریداں روشِ غریب ونمطِ عجیب دارند"

---

[۵] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۵۸

داز مشاہدہ و مکاشفہ اوشاں بسیار معاملہ شہرہ آفاق است"

ان کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے میاں بشیر الدین نے پھر میاں محکم الدین اور میاں محمد غوث وغیرہ نے سلسلہ کو جاری رکھا۔

مولوی گل حسن قاضی محمد عاقل کے مرید تھے۔ شاعر خوش گو تھے۔ قاضی صاحب کو ان کا کلام بہت پسند تھا۔ وحدتِ وجودان کا خاص موضوع تھا۔

خواجہ گل محمد احمد پوری بڑے عالم تھے۔ قاضی صاحب کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ ۹ محرم ۱۲۴۳ھ کو احمد پور علاقہ بہاول پور میں وصال فرمایا تھا۔ بزرگان سلسلہ کے حالات میں ایک کتاب تکملہ سیر الاولیاء تصنیف کی تھی۔

باب ہفتم

حضرت حافظ محمد جمال ملتانیؒ

ملتان' اسلامی ہند کی ابتدا سے سہروردیہ سلسلہ کا مرکز رہا ہے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے یہاں سہروردیہ سلسلہ کی ایسی عظیم الشان خانقاہ قائم کی تھی کہ ملتان و منصورہ کا سارا علاقہ ان کا حلقہ بگوش ہوگیا تھا۔ صدیوں تک اس خطہ میں سہروردیہ سلسلہ کے علاوہ کسی دوسرے سلسلے کو اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ اٹھارویں صدی میں وہاں جس شخص نے چشتیہ کا کام سب سے پہلے شروع کیا وہ حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے ایک عظیم المرتبت خلیفہ حافظ محمد جمال تھے۔ وہ علم و عمل کی بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اگر ایک طرف روحانی اور علمی اعتبار سے ان کا پایہ بلند تھا' تو دوسری طرف شجاعت و تہور' مجاہدانہ جذبات اور سرفروشی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے حضرت مارہرویؒ نے انکو ملتان میں چشتیہ سلسلہ کی ترویج و تبلیغ کی غرض سے شاہ فخر صاحبؒ کے اشارہ پر متعین کیا تھا۔ لکھا ہے ــــــ

روزے در مجلس حضرت مولانا صاحب حضرت قبلہ عالم ہم نشستہ بودند و حافظ صاحب ہم درآں جا نشستہ بودند تذکرہ ایں افتاد کہ در ملتان تصرف

ایک دن حضرت شاہ فخر صاحب کی مجلس میں حضرت مہاروی بیٹھے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب بھی وہاں تھے۔ اس بات کا ذکر چھڑا کہ ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی عظمت کے سامنے کسی ولی کا تصرف

ہیچ ولی۔ بہ عظمت بہاؤالدین زکریا ملتانی پیش نمی رود۔ وہیچ شیخ درآنجا کسے را بیعت نمی کند۔ مولانا صاحب فرمودند میاں نور محمد صاحب! تا ہنوز بہ ملتان ولایت بہاؤالحق بود۔ لہذا تصرف ولی دیگر کارگر نمی شد اماں حالا ملتان حوالہ مایاں شدہ است، لازم است کہ مریدے از مریدان خود درآنجا فرستند وبگوبند کہ در عین خانقاہ بہاؤالدین زکریا خلق را مرید کند وتصرف خود کند" ¹	کام نہیں کرتا اور کوئی شیخ وہاں نہیں جاتا اور کسی کو بیعت نہیں کرتا۔ مولانا صاحب نے فرمایا' میاں نور محمد صاحب! اب تک ملتان بہاؤالحقؒ کی ولایت تھی۔ لہذا وہاں کسی دوسرے ولی کا تصرف کام نہیں کرتا تھا لیکن اب ملتان ہمارے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ لازم ہے کہ تم وہاں اپنا کوئی مرید بھیجو اور کہو کہ خانقاہ شیخ بہاؤالدین زکریاؒ میں خلق کو مرید کرے اور اپنا تصرف کرے۔

قبلۂ عالم نے دہلی سے واپسی پر حافظ صاحب کو ملتان بھیج دیا۔ انھوں نے مولوی خدا بخش کو خانقاہ بہاؤالحقؒ میں بیٹھ کر مرید کیا تھا ²

قبلۂ عالم کی خدمت میں حاضری

حافظ محمد جمال صاحبؒ کا ابتدائی زمانہ تھا کہ پیر کا شوق پیدا ہوا۔ اسی تلاش اور فکر میں حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ کے مزارِ اقدس پر حاضر ہوئے اور عبادت وریاضت میں مشغول ہوگئے۔ ہر شب کو ایک کلام پاک ختم کرتے تھے اور پیر کامل کے لئے دعا مانگ کر سو جاتے تھے۔ ایک رات کو خواب میں اشارہ پایا کہ حضرت شیخ نور محمد مہارویؒ کی خدمت میں حاضر ہو' چنانچہ فوراً مہار

¹ مناقب المحبوبین - ص ۱۲۶ - ۱۲۷

² ,, ,, ,,

کو روانہ ہوگئے اور قبلۂ عالم کی خدمت میں حاضر ہوکر مرید کرنے کی درخواست کی۔ قبلۂ عالم نے پوچھا "تم نے کچھ ظاہری علم بھی حاصل کیا ہے؟" کسرِ نفسی سے عرض کیا "قرآن پاک اور نماز روزہ سے متعلق کچھ مسائل پڑھے ہیں" قبلۂ عالم کا یہ اصول تھا کہ علماء کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ کھانے کے وقت جب مولوی محمد حسین نے (جو قبلۂ عالم کے عزیز مرید اور محرم راز تھے) حافظ صاحب کو دیکھا تو کھڑے ہوگئے، معانقہ کیا اور حالات دریافت کئے قبلۂ عالم نے یہ دیکھا تو فوراً دریافت کیا "کیا تم ان کو جانتے ہو؟" مولوی محمد حسین نے عرض کیا "ہم دونوں نے ایک ہی استاد سے پڑھا ہے۔ یہ بڑے جید عالم ہیں۔ ہم لوگ جوان کے ہم جماعت تھے ان کو طالب علمی کے زمانہ میں "علامۃ العصر" کہا کرتے تھے"۔ یہ سن کر قبلۂ عالم حافظ صاحب کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ آپ نے اپنا علم ہم سے کیوں چھپایا؟ عرض کیا ــــــ

"قبلۂ من، شنیدہ ام گروہ فقرا از فرقۂ علماء نفرت دارند لہذا علم خود را از حضور پنہاں داشتم"	قبلۂ من! میں نے سنا ہے کہ فقراء علماء سے نفرت رکھتے ہیں۔ لہذا میں نے اپنے علم کو حضور سے پوشیدہ رکھا۔

قبلۂ عالم نے جواب دیا ــــــ

"حافظ صاحب! ما یاں طالبان عالمانیم مارا علماء می شناسند، جاہل چہ خواہد شناخت، ما یاں از فرقۂ علماء بسیار خوشنیم" [۱]	حافظ صاحب! ہم تو علماء کے چاہنے والے ہیں ہمیں تو علماء ہی سمجھ سکتے ہیں جاہل بے چارا کیا سمجھے گا۔ ہم فرقۂ علماء سے بہت خوش ہیں۔

اسی دن سے حافظ صاحب، قبلہ عالم کی خدمت میں حاضر رہنے لگے ۔ پیرسے تعلق

[۱] مناقب المحبوبین ۔ ص ۱۲۵

رفتہ رفتہ عشق تک پہنچ گیا اور حافظ صاحب سفر و حضر میں اپنے شیخ کے ساتھ رہنے لگے[۵۱] عرصہ تک انھوں نے آفتابہ برداری اور وضو کرانے کی خدمت انجام دی[۵۲] قبلۂ عالم کی خانقاہ میں لنگر کا اہتمام ان ہی کے سپرد تھا[۵۳]

حافظ صاحب کا علمی تبحر اور درس و تدریس کا شغل

حافظ صاحب کے علمی تبحر علمی دلچسپیوں کا اندازہ ملفوظات سے ہوتا ہے۔ وہ قرآن پاک کی آیات، احادیث کے فقرات پڑھتے تھے، مریدوں سے معنی پوچھتے تھے اور خود سمجھاتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ باریک سے باریک اور دقیق سے دقیق مسائل ان سے پوچھے جاتے تھے اور وہ نہایت شافی اور مکمل جواب دیتے تھے۔ مسئلہ وحدت الوجود سے خاص دلچسپی تھی۔ امام اکبر اور مولانا جامیؒ کی تصانیف پر پورا عبور تھا جس وقت ان کے غوامض و رموز کو سمجھاتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ایک سمندر موجیں مار رہا ہے[۵۴]

حافظ صاحبؒ نے ملتان میں اپنا مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ علم و فضل کا اعلیٰ مرکز تھا خواجہ گل محمد احمد پوریؒ نے دو سال تک اس مدرسہ میں پڑھا تھا اور حافظ صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تھا[۵۵]

اخلاق

حافظ صاحبؒ نہایت بااخلاق بزرگ تھے۔ مناقب فخریہ میں ان کے متعلق لکھا ہے ـــــ

"وحافظ محمد جمال ملتانی .... کمال باطن و
تہذیب اخلاق وکمالات آراستہ" [۵۶]

---

۵۱ مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۶
۵۲ ؍؍ ؍؍ ص ۱۲۶
۵۳ تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۳۵
۵۴ مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۴
۵۵ ؍؍ ؍؍ ص ۱۳۵
۵۶ مناقب فخریہ۔ ص ۳۰

غریبوں کی دل جوئی کو وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ غریب اور امیر سب کے یہاں دعوتوں میں جاتے لیکن غریب کے یہاں اس طرح جاتے کہ خوشی کا اثر چہرہ پر ظاہر ہونے لگتا۔[۵۱] کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالتے تھے۔ بلکہ اگر کوئی ایسی حرکت کرتا تو اس کو ملامت کرتے تھے[۵۲] ان کا دستور تھا کہ جب تک سب مریدین اور متعلقین کھانے سے فارغ نہ ہو جاتے تھے کبھی کھانا تناول نہ فرماتے تھے[۵۳] بچوں سے بڑی خوشی سے باتیں کرتے تھے۔ اگر کوئی بات ناگوار ہوتی تو صراحتاً منع نہیں کرتے تھے بلکہ "تعریض و تمثیل" سے سمجھاتے تھے[۵۴] اپنے پیر بھائیوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ہر دکھ درد میں ان کی امداد کے لئے تیار رہتے تھے قاضی محمد عاقل صاحب جب قید میں تھے تو انھوں نے پریشان ہو کر حافظ صاحب کو خط لکھا تھا جس میں یہ شعر اور ایک مصرعہ لکھا تھا[۵۵]

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس از آنکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

ع بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

یہ خط پڑھتے ہی، حافظ صاحب ننگے پاؤں کھڑے ہو گئے اور قاضی صاحب سے جا کر ملے۔[۵۵]

سکھوں سے مقابلہ

جس زمانہ میں حافظ صاحب، ملتان میں جلوہ افروز تھے، پنجاب پر سکھوں کا تسلط تھا۔ اور مسلمانوں کو طرح طرح کے آلام و مصائب کا سامنا

---

۵۱ مناقب المحبوبین۔ ص ۱۳۵
۵۲ مناقب المحبوبین۔ ص ۱۳۵
۵۳ ؍؍ ؍؍۔ ص ۱۳۶
۵۴ ؍؍ ؍؍ ص ۱۳۷
۵۵ ؍؍ ؍؍ ص ۲۸ - ۱۲۷

کرنا پڑ رہا تھا۔ حافظ صاحب کے قیام کے زمانہ میں سکھوں نے کئی بار ملتان پر حملہ کیا لیکن حافظ صاحب کی زندگی میں وہ ملتان پر قابض نہ ہو سکے[1] حافظ صاحب اگر ایک طرف عبادت اور درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے تو دوسری طرف عملی جہاد سے بھی خوب واقف تھے۔ ان کی شجاعت، ہمت اور استقلال نے مسلمانوں کے مضمحل اعضاء میں نئی روح پھونک دی تھی۔ سکھوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ انھوں نے انتہائی مردانگی اور عالی ہمتی سے کیا۔ جب حالات بہت خراب ہو گئے تو خود میدانِ جنگ میں اتر آئے۔ سکھوں کے حملہ کی اطلاع ملی تو ——

"حضرت حافظ صاحب، در قلعہ تیر و کمان گرفتہ موجود می بودند"[2]	حضرت حافظ صاحب قلعہ میں تیر و کمان لئے ہوئے موجود تھے۔

پھر ایک دوسرے موقع پر ——

"می گویند کہ دراں وقت جنگ حافظ صاحب مرحوم در برج قلعہ ملتان تیر و کمان بدست خود گرفتہ تیر بر کافراں می انداختند"[3]	کہتے ہیں کہ جنگ کے وقت حافظ صاحب مرحوم قلعہ ملتان کے برج میں بیٹھے ہوئے کافروں پر تیر برسا رہے تھے۔

سنہ ۱۲۲۶ھ میں ایک مرتبہ پھر سکھوں نے ملتان پر حملہ کیا۔ حافظ صاحب اس وقت ملتان میں نہ تھے۔ جب اطلاع ملی تو چناب کو جلدی سے عبور کر کے، معرکہ میں حصہ لینے کے لئے ملتان پہنچ گئے[4]

ایک مرتبہ سکھوں نے انتہائی تیاریِ ساز و سامان اور قوت کے ساتھ ملتان پر حملہ کیا

---

[1] مناقب المحبوبین ص ۱۲۷
[2] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۷
[3] 〃 〃 ص ۱۲۷
[4] 〃 〃 ص ۱۳۱

لوگوں میں پریشانی پھیل گئی۔ بعض لوگوں نے گھبرا کر ہجرت کر جانے کا ارادہ کیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا ــــ

"آواز جنگ بکفار عام است واکنوں جنگ بایشان فرض عین کرد۔ پس الحال بیرون نمی رویم۔ کہ ما را دو درجہ است یکے درجہ غزا، دوم درجہ شہادت"[51]

یہ فرمانے کے بعد آپ نے مقابلہ میں خود سبقت فرمائی۔ خوف و ہراس سے وہ بالکل ناآشنا تھے۔ اللہ پر ان کو کامل اعتماد تھا[52] اور اسی تقویت پر وہ میدانِ جنگ میں کود جاتے تھے۔

حافظ صاحب تیر اندازی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اور اس کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ لکھا ہے ــــ

"آں حضرت در پیشۂ تیر اندازی یگانہ بودند حتیٰ کہ ایں پیشۂ تیر اندازی تعلیم می کردند" [53]	فن تیر اندازی میں جناب شیخ بے مثال تھے۔ یہاں تک کہ اس کی دوسروں کو تعلیم بھی دیتے تھے۔

اصلاح رسوم اور اتباع شریعت

حافظ صاحب غیر شرعی رسوم کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ زاہد شاہ سے پوچھا کہ تم کہیں شادی کرنا چاہتے ہو۔ انھوں نے عرض کیا۔ جی ہاں۔ مگر وہ لوگ سادات سے نہیں ہیں اور ہماری برادری کے لوگ کہتے ہیں کہ شادی سادات میں کرنی چاہیے۔ فرمایا۔

"نکاح سادات با غیر سادات در شرع جائز است تو گفتہ جاہلان	سادات کا نکاح غیر سادات سے شرع میں جائز ہے۔ تو جاہلوں

---

[51] مناقب المحبوبین ۔ ص ۱۳۷
[52] مناقب المحبوبین ۔ ص ۱۳۷
[53] " " ۔ ص ۱۳۷

را چہ اعتبار می کنی" ۵۱	کے کہنے پر کیوں اعتبار کرتا ہے

شریعت کا خاص احترام کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے ——

"احسن طریق وصول الی الحق طریقہ	معرفت حق کا بہترین طریقہ وہ ہے
مشایخ است کہ رسیدہ است باسناد	جو مشایخ کا ہے اور جو رسول اکرم صلی اللہ
صحیح برسول علیہ السلام و آں آرائنگی	علیہ وسلم سے معتبر ذریعہ سے پہنچا ہے اور وہ
ظاہر شریعت است۔ و مستقیم بودن	ظاہر کو شریعت سے آراستہ رکھنے کا ہے اور اس
برآں و پاک کردن باطن است	پر قائم رہنے کا اور باطن کو خراب عادتوں
از اوصاف ذمیمہ" ۵۲	سے صاف کرنے کا۔

لباس حافظ صاحبؒ اچھا لباس پہنتے تھے۔ تہ بند کم باندھتے تھے۔ اکثر پاجامہ پہنتے تھے۔ کلاہ قادری ۵۳ اوڑھتے تھے۔ کرتے کا گریبان چاک رہتا تھا لکھا ہے

"در اکثر اوقات وگاہے می پوشید قلندری
کہ نوعے است از انگرکھہ کشادہ بغیر چین برکمر
واندک می بود کہ دستار سپید می بندیدند بلکہ
بطریق عمامہ می بست، چادر معلم را کہ در ہندی
لنگی می نامند و در سفر موزہ یا جرموق می پوشیدند
و دوست می داشتند" ۵۴

ملفوظات حافظ محمد جمالؒ کے ملفوظات بہت کثرت سے مرتب کئے گئے تھے۔ مندرجہ ذیل ملفوظات خاص طور سے مشہور ہیں۔

---

۵۱ مناقب المحبوبین ۔ ص ۱۳۰
۵۲ مناقب المحبوبین ۔ ص ۱۴۰
۵۳ اس کو کلاہ چہار ترکی بھی کہتے ہیں۔
۵۴ مناقب المحبوبین ۔ ص ۱۳۶

(۱) فضائل رضیہ ۔ از مولوی عبدالعزیز سکنہ قصبہ بڑہیاران

(۲) انوار جمالیہ ۔ از منشی غلام حسن شہید ملتانی

(۳) اسرار الکمالیہ ۔ از زاہد شاہ مٹھٹی

وصال حافظ صاحبؒ نے ۵ رجمادی الاول ۱۲۲۶ھ کو وصال فرمایا۔ کسی نے تاریخ وصال کہی ہے ؎

خرد ز سالِ وصالش چو جست و جوئے کرد

ندائے داد سروشم کہ یافت خوب وصال

حافظ صاحبؒ نے دو شادیاں کی تھیں۔ لیکن کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

خلفاء حافظ صاحبؒ چاروں سلسلوں میں مرید کرتے تھے لیکن

"طریقہ خاص ایشاں چشتیہ بود" [1]

ان کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لکھا ہے ــــ

"مریدان ایشان نیز جماعتے کثیر اند" [2]

بعض خلفاء کے نام یہ ہیں ــــ

(۱) مولانا خدا بخش ملتانیؒ (۵) مولوی عبید اللہ ملتانی

(۲) زاہد شاہ (۶) مولوی حامد

(۳) مولوی غلام حسن (۷) صاحبزادہ غلام فرید

(۴) قاضی عیسیٰ خان پوری (۸) مولوی عبدالعزیز بڑہیاری

حافظ صاحبؒ کے وصال کے بعد مولوی خدا بخش صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے وہ بڑے عالم تھے۔ توحید پر ایک رسالہ "رسالہ توفیقیہ" لکھا تھا۔ تکملہ سیر الاولیا میں ان

---

[1] مناقب المحبوبین ۔ ص ۱۳۸ [2] مناقب فخریہ ۔ ص ۳۰

کے متعلق لکھا ہے ـــــ

"یک نسیمے است از گلزار معانی بیان او نشان
کردن قطرات امطار یا امواج بحار شمردن
است" [۵۱]

مناقب فخریہ میں ان کو مرد بے نظیر بتایا گیا ہے۔[۵۲] انھوں نے چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی توسیع و اشاعت میں بڑی جدوجہد کی۔ حاجی نجم الدین صاحب کا بیان ہے کہ ـــــ

"صدہا مردم را از ایشاں فیض شد" [۵۳]

---

۵۱ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۲۵
۵۲ مناقب فخریہ - ص ۳۰
۵۳ مناقب المحبوبین - ص ۱۳۳

حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ

پنجاب میں حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ کا فیض اور چشتیہ نظامیہ سلسلہ کا نام شاہ نور محمد صاحب مہارویؒ کے ذریعہ پہنچا اور شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے ذریعہ اس کی تکمیل ہوئی۔ شاہ محمد سلیمانؒ بڑے برگزیدہ بزرگ تھے۔ ان کے ارشاد و تلقین سے پنجاب اور افغانستان کے ہزاروں گمراہانِ بادیہ ضلالت نے ہدایت پائی ان کے خلفا ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے اور رشد و ہدایت کے وہ چراغ روشن کئے کہ ایک بار پھر صوفیۂ متقدمین کی خانقاہوں کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ وہ سلسلۂ نظامیہ کے آخری عظیم الشان بزرگ تھے۔ ان کا تبحر، تقدس، اسلامی سوسائٹی کی اصلاح کے لئے جد و جہد اپنی نظیر آپ تھی۔

شاہ محمد سلیمان صاحب نے جس وقت پنجاب میں مسندِ ارشاد بچھائی تھی اس وقت سارا صوبہ سکھوں کے تسلط میں تھا سلطنت مغلیہ کی تجہیز و تکفین کے آخری منازل طے ہو چکے تھے۔ انگریزوں کا اقتدار سرعت کے ساتھ بڑھ رہا تھا اور تمام ملک کو گھیر ہی لیا چاہتا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ عبوری دور تھا۔ ایک حکومت ختم ہو رہی تھی دوسری حکومت کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ مسلمانوں پر مغلوبیت اور افسردگی طاری تھی۔

قوائے عمل شل ہو رہے تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت شاہ سید احمد شہیدؒ اپنی عظیم الشان تحریک کو چلانے میں مصروف تھے۔ سکھوں کے مظالم اور چیرہ دستیوں سے تنگ آکر وہ جہاد پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور مسلمانوں کی عسکری اصلاح و تنظیم کی کوشش میں منہمک تھے۔ شاہ محمد سلیمانؒ بھی اسی ماحول میں سانس لے رہے تھے۔ انھوں نے گو عملی جہاد میں حصہ نہیں لیا لیکن شریعت و سنت کی تلقین میں برابر سرگرم رہے۔ وہ سلطنت کے واپس لے لینے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کی نظر میں "اسلامی شعار" کے احیاء کی ضرورت سب سے زیادہ مقدم تھی کہ اس کے بغیر حکومت اگر حاصل بھی کر لی جاتی تو اس کا قایم رکھنا ناممکن تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ

ع دین جڑ ہے یہ کٹی تو نخلِ دنیا پھل چکا

چنانچہ انھوں نے صاف صاف بتادیا کہ جب تک اتباعِ سنت و شریعت کا التزام نہ ہوگا حکومت کا خواب منت کشِ تعبیر نہ ہو سکے گا اور مسلمانوں کی پریشانیاں کم نہ ہوں گی۔ بار بار سمجھاتے ہیں ـــــ

"چوں مسلماناں اعمالِ حسنہ را ترک کردہ اند، حق تعالیٰ بر ایشاں کافراں را مسلط کردہ است" [۵۷]	مسلمانوں نے اچھے اعمال چھوڑ دئے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان پر مسلط کر دیا ہے۔

وہ مسلمانوں کے تمام آلام و مصائب، ابتلاء و پریشانی، دکھ اور درد کا علاج درستیٔ اعمال میں پاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی کوشش کا مرکز بھی اعمال کی درستی کو قرار دیا تھا وہ مسلمانوں کو صحیح طور پر اخلاقِ محمدی کا نمونہ دیکھنا چاہتے تھے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں عادات و کردار کی درستی کو وہ سب چیزوں سے مقدم تصور کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے

---

[۵۷] نافع السالکین ۔ ص ۱۰۹

اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس ہی کوشش اور جد وجہد میں صرف کیا۔ جب حکومت وسلطنت جاتی ہے تو قوموں کے اخلاق و اطوار اور کردار بگڑ جاتے ہیں۔ ان کا اجتماعی شیرازہ منتشر ہونے لگتا ہے اور انتشار وابتری کے ہولناک جراثیم زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کر جاتے ہیں۔ ذہن وفکر کی ابتری جسمانی انتشار سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے ان حالاتِ گردوپیش میں جس طرح سرمایۂ ملت کی حفاظت کی وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ انھوں نے حضرت شاہ سید احمد بریلویؒ کی تحریک کو ناکامیاب ہوتے ہوئے دیکھا تھا اس لئے اب انھوں نے اس تحریک سے قطع نظر، حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا نیا پروگرام بنایا۔ ان کی کوششوں کا محور مختلف تھا۔ انھوں نے کسی موقع پر بھی جنگ وجہاد کی صراحتاً تلقین نہیں کی کہ وقت کا تقاضہ وہ نہ تھا۔ لیکن انھوں نے مسلمانوں کی قومی زندگی میں ان صلاحیتوں کو ابھارنے اور بیدار کرنے کی کوشش کی جن میں مستقبل کے تشکیل وتجدید کا سامان موجود تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو شریعت وسنت پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت فرمائی کہ اسی میں ان کے درد کا درماں اور مصائب کا علاج تھا۔

شاہ صاحبؒ کی جلائی ہوئی اس شرع وسنت کی شمع کے گرد دور دور سے پروانے جمع ہوئے۔ ان کے خرمنِ کمال سے ہزاروں نے فیض حاصل کیا۔ سنگھڑ اور تونسہ کا غیر آباد اور غیر معروف علاقہ علم وعرفان کا مرکز بن گیا۔ جہاں سے ہزاروں عقیدت مند تربیت پاکر ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ سیال، گولڑہ، جلال پور، حیدرآباد، شیخاوائی، راجپوتانہ میں چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی خانقاہیں قائم ہوگئیں اور ایک بار پھر پرانی محفلوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ خاتم سلیمانی کا مصنف لکھتا ہے:۔ "اس نقارہ کی آواز پنجاب، ممالک متحدہ، راجپوتانہ سے گزر کر جزیرۂ سراندیپ اور عدن تک پہنچی اور افغانستان، بلوچستان، ترکستان سب اس نقارہ کی آواز سے چونک اٹھے اور ہزاروں طالبانِ حق سینکڑوں کوس طے کرکے تحصیلِ فیض کے واسطے تونسہ پہنچے۔ یہ نام ہی کچھ غیر موزوں تھا مگر ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد !
فی الفور بصورت طلا شد [۵۱]

پیدائش اور خاندان

حضرت شاہ محمد سلیمانؒ کی ولادت باسعادت ۱۱۷۸ھ میں بمقام گڑگوجی ہوئی [۵۲]۔ شاہ صاحبؒ کے والد کا اسم گرامی زکریا بن عبدالوہاب بن عمر خاں تھا۔ یہ خاندان افغان قوم کے جعفریہ قبیلہ سے متعلق تھا [۵۳]۔ آپ چونکہ افغان تھے اس لئے اس علاقہ میں روہیلہ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

شاہ صاحب کے والد کا وصال ان کے شیرخوارگی کے زمانہ میں ہو گیا تھا۔ والدہ نے بچے کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ ان کو اپنے بچے کی اقبال مندی کا یقین ایک خواب سے ہو گیا تھا۔ ولادت سے پہلے انھوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ آفتاب آسمان سے اتر کر ان کی گود میں آگیا ہے اور تمام گھر منور ہو گیا ہے اور سینکڑوں آدمی مبارک باد دے رہے ہیں [۵۴]۔

شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کے ایک بھائی خواجہ یوسف اور چار بہنیں تھیں۔ خواجہ یوسف جوانی میں انتقال کر گئے تھے۔ بہنوں کی شادیاں ہوئیں اور ان سے کثیر اولاد ہوئی [۵۵]

تعلیم و تربیت

جب آپ کی عمر چار سال کی ہوئی تو آپ کی والدہ نے ملا یوسف جعفر کے پاس قرآن پاک پڑھنے کے لئے بھیجا۔ ان سے ۱۵ پارے پڑھنے کے بعد وہ اپنے ایک ہم قوم حاجی صاحب سے پڑھنے لگے۔ حاجی صاحب کی بیوی بہت تیز مزاج اور بدخو تھی۔ وہاں زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے اور حاجی صاحب کے ارشاد کے مطابق وہ

۵۱؎ خاتم سلیمانی۔ ص ۹ ۵۲؎ "خانہ خود کہ در کوہ است واسم آں گڑگوجی است کہ مسافت از تونسہ سہ کردہ می شود" نافع السالکین۔ ص ۱۱

۵۳؎ خاتم سلیمانی۔ ص ۱۵ "جعفریہ قبیلہ' ہمدانی درحیم۔ دانی ، قبیلہ کی شاخ تھا۔

۵۴؎ خاتم سلیمانی۔ ص ۱۷ ۵۵؎ خاتم سلیمانی۔ ص ۱۵

تونسہ میں میاں حسن علی کے پاس چلے گئے۔ وہاں بگی مسجد میں (جو تونسہ بازار کے پاس تھی) پڑھنا شروع کیا[۵۱]۔ میاں حسن علی کا اصول تھا کہ مدرسہ کے طلبا کو گدائی یا مزدوری پر مجبور کرتے تھے۔ خواجہ محمد سلیمان صاحب کو گداگری کر کے پیٹ پالنے کا حکم ہوا۔ خواجہ صاحب اس حکم سے بہت گھبرائے لیکن بجز تعمیل چارہ نہ تھا۔ بھیک مانگنے کے لئے نکلے۔ ایک ہندو بقال کو روٹی پکاتے ہوئے دیکھا اور اسکے چوکے سے بغیر اجازت روٹی اٹھا لائے۔ بقال نے آ کر میاں حسن علی سے شکایت کی۔ میاں صاحب نے باز پرس کی اور بالآخر آپ کو گداگری کے قابل نہ پا کر مزدوری کا حکم دیا تاکہ کپڑوں، روٹی اور کتابوں کا خرچ چل جائے۔ دوسرے دن ۲ روپیہ پر ایک جگہ مزدوری پر لگ گئے۔ دن بھر آپ پتھر پر بیٹھے رہے۔ مزدوروں نے مالک سے شکایت کی لیکن مالک نے آپ کو پوری مزدوری دے دی۔ میاں حسن علی کو یہ حال معلوم ہوا تو کہا کہ اب تم میرے گھر سے کھا لیا کرو[۵۲]۔ شاہ صاحب، میاں حسن علی کے پاس رہنے لگے اور علم حاصل کرتے رہے۔ ایک دن وہ تونسہ شریف سے ۲ کوس جنوب کی طرف ایک موضع سوکڑ میں ایک کتاب خریدنے کے لئے گئے۔ وہاں مولوی نور محمد نارووالہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولوی صاحب نے ان کی بہت تعظیم کی اور باوجود پیرانہ سالی خود پیدل چلے اور شاہ صاحب کو گھوڑے پر سوار کرایا[۵۳]۔ میاں حسن علی سے خواجہ صاحبؒ نے قرآن پاک پورا کیا۔ خود ایک مجلس میں فرمانے لگے۔

"...... در تونسہ شریف پیش میاں حسن علی
قرآن مجید می خواندیم" [۵۴]

اس کے علاوہ پند نامہ حضرت خواجہ فرید الدین عطار، گلستان سعدی، بوستان

۵۱؎ یہ مسجد ۱۲۷۲ھ میں رود سنگھڑ سے منہدم ہو گئی۔ خاتم سلیمانی۔ ص ۲۰

۵۲؎ خاتم سلیمانی۔ ص ۲۲-۲۱ ۵۳؎ خاتم سلیمانی۔ ص ۲۶-۲۵ ۵۴؎ نافع السالکین۔ ص ۱۴۳

سعدی، وغیرہ کتابیں بھی ان ہی سے پڑھیں[1]

میاں حسن علی سے پڑھ چکنے کے بعد آپ لانگھ پہنچے[2]۔ یہاں ایک عمدہ گنبد دار مسجد تھی جس میں مولوی ولی محمد درس دیتے تھے[3]۔ خواجہ صاحب نے ان ہی سے فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کوٹ مٹھن تشریف لے گئے اور وہاں قاضی محمد عاقلؒ کے مدرسہ میں عربی کی تحصیل شروع کی۔ خواجہ الہ بخشؒ کے شجرہ میں جو سنہ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا ہے، خواجہ محمد سلیمان کے متعلق لکھا ہے ——

"در مبادی حال در کوٹ مٹھن بہ مدرسہ
قاضی محمد عاقل صاحب بہ تحصیل علم کتب
درسیہ توجہ می فرمودند"[4]

یہاں آپ نے منطق کی مشہور کتاب قطبی پڑھی اور فقہ پر پورا عبور حاصل کیا[5]۔ کوٹ مٹھن ہی میں قیام کے زمانہ میں آپ کو خواجہ نور محمد صاحب مہارویؒ کے اوچ تشریف لانے کی خبر ملی۔ اس زمانہ میں آپ کو امر معروف کی تلقین کا بڑا خیال تھا[6]۔ شاہ نور محمد صاحب سے سماع پر بحث کرنے اور اس پر تنبیہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن ان کی خدمت میں پہنچکر دنیا ہی بدل گئی۔ اس قدر مبہوت ہو گئے کہ فوراً ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی۔ اپنے پیر سے انھوں نے آداب الطالبین، فقرات، لوائح، عشرہ کاملہ، فصوص الحکم وغیرہ کا درس لیا[7]۔

---

[1] خاتم سلیمانی۔ ص ۱۱، ۲۶ [2] یہ مقام تونسہ سے پانچ کوس مشرق کی جانب دریائے سندھ کے کنارے واقع تھا۔ [3] یہ مسجد ۱۲۷۸ھ تک تھی، اس کے بعد دریا کی طغیانی سے برباد ہو گئی خاتم سلیمانی ص ۲۷
[4] شجرہ خواجہ الہ بخش ص ۱۹ [5] خاتم سلیمانی۔ ص ۲۹ [6] خود ایک مجلس میں فرمانے لگے جب میں کوٹ مٹھن میں تحصیلِ علم کرتا تھا تو اس وقت مجھے قدرتی طور پر دینیات کی طرف زیادہ خیال تھا اور امر معروف کے لئے گرد و نواح کے مواضعات میں چلا جایا کرتا تھا۔ مناقب سلیمانیہ۔ بحوالہ خاتم سلیمانی۔ ص ۱۲۰ [7] خاتم سلیمانی۔ ص ۲۸

بیعت

مشہور ہے کہ حضرت شاہ فخر صاحبؒ نے حضرت خواجہ نور محمد مہاروی ؒ کو ایک شہباز کے مقید کرنے کی بشارت دی تھی اور فرمایا تھا کہ اس سے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی تبلیغ و اشاعت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ چنانچہ شاہ نور محمد صاحب ہر سال اوچ اور کوٹ مٹھن اس باز کی تلاش میں آتے تھے[۱] آخری بار جب اوچ آئے تو اپنے ایک عزیز محمد حسین سے فرمانے لگے" اے محمد حسین آپ کو معلوم ہے کہ میں ہر سال اس ملک میں کیوں آتا ہوں ؟" عرض کیا" آپ خود ارشاد فرمائیں " اس پر خواجہ نور محمد نے فرمایا کہ میں ایک شہباز کے شکار کرنے کے لئے آتا ہوں اور یہ شاہ فخر صاحبؒ کا حکم ہے[۲]

جب شاہ محمد سلیمان صاحب شاہ نور محمد کی خدمت میں پہنچے تو ان کا عالم ہی بدل گیا۔ فوراً مرید ہونے کی درخواست کی۔ شاہ نور محمد صاحب نے ان کو حضرت سید جلال ؒ کے مزار کے سرہانے لے جاکر مرید کر لیا[۳]۔ یہ شاہ محمد سلیمانؒ کی نوعمری کا زمانہ تھا لیکن وہ اپنے پیر سے عقیدت اور ان کے احکام کی بجاآوری میں کہنہ سال مریدوں سے بازی لے گئے۔

دہلی کا سفر

شاہ نور محمد صاحبؒ نے اس نوعمر طالب علم کو مرید کرنے کے بعد شاہ فخر صاحبؒ کی خدمت بابرکت میں حاضری کا حکم دیا جس شہباز کو دام میں لانے کی بشارت انھوں نے دی تھی وہ مقید ہوچکا تھا۔ شاہ محمد سلیمان نے تعمیل حکم میں دہلی کا ارادہ کر دیا۔ دلاور، جودھ پور، اجمیر، جے پور، ریواڑی ہوتے ہوئے ۱۱۹۹ھ میں وہ دہلی پہنچے[۴] یہ گرمی کا زمانہ تھا آفتاب کی وہ تمازت کہ پرندوں نے درختوں میں پناہ لی۔ ریگستان کا یہ عالم کہ میلوں تک پانی ندارد، نہ کوئی سواری، نہ کوئی دوست لیکن

---

[۱] "تحقیق ہے کہ اس کے بعد شاہ نور محمد صاحبؒ پھر کبھی سنگھڑ میں نہیں گئے" خاتم سلیمانی۔ ص ۳۳

[۲] خاتم سلیمانی۔ ص ۳۰ [۳] [۴] [۵] خاتم سلیمانی۔ ص ۳۱۔ ۳۴۔ ۳۳

یہ محبوب سبحانی، سلیمان ثانی کمال ذوق وشوق سے قبلہ عالم کا حکم بجالا رہا تھا اور سفر کی صعوبتوں اور راستے کی تکلیفوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا تھا "عشق و محبت" کا یہ متوالا سفر کی صعوبتیں ذوق وشوق کے ساتھ طے کرتا ہوا دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ شاہ فخر صاحبؒ وصال فرما چکے ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

والدہ کی تشویش جب عرصہ تک شاہ محمد سلیمانؒ کی کچھ خبر نہ ملی تو والدہ کو فکر لاحق ہوئی بیٹے کی تلاش میں گڑھ گوجی سے سوکڑ تشریف لائیں۔ جب یہاں بھی بیٹے کا پتہ نہ ملا تو اپنے داماد کو تلاش کے لئے آگے بھیجا۔ وہ تلاش کرتے کرتے آخر شاہ صاحب سے جا ملے اور والدہ کے اضطراب اور بے چینی کی داستان سنائی۔ شاہ محمد سلیمان صاحبؒ پیر سے اجازت لے کر والدہ کے پاس گئے۔ پیر سے دور ہٹ کر عشق کی آگ اور بھڑک اٹھی اور وہ مفارقت کی تاب نہ لا سکے۔ ماں کا یہ عالم تھا کہ بیٹے کی جدائی کے خیال سے بھی ان کو تکلیف ہوتی تھی۔ محبت مادری اور عشق مرشد میں کشمکش شروع ہوئی۔ والدہ نے ان کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پہرے دار بٹھائے، کانٹوں کا حصار کیا، لیکن وہ عشق جو بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے کے لئے تیار ہو اس کی نظر میں یہ تدابیر سب بے معنی تھیں۔ جب عشق نے زور مارا تو یہ سب بندشیں چشم زدن میں ٹوٹ گئیں اور وہ دیوانہ وار پیر کی طرف دوڑ پڑے۔ ابتدائی زمانہ کا یہ واقعہ خود ایک مجلس میں انہوں نے اس طرح بیان فرمایا۔

"در اوائل والدہ شریفہ مارا ممانعت نمودے از رفتن
درخدمت قبلہ عالم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، یک شب
میاں یاراں کہ از قوم جعفر بود بر من پاسباں گماشتند

---

۵۱ مشاہیر اسلام - جلد اول - ص ۸۹

چوں دیدم کہ اورا خواب غلبہ کردہ است، از خوابگاہ برخاستم و بر دیوار حصار آمدہ از آنجا جستہ در خارِ بنی افتادم بگرد حصار بود۔ پاجامہ دریدہ شد و ہر دو پائے بہ زخم خار مجروح شد و خوں رواں شد

بخدمت حضرت قبلہ عالم مشرف شدم"[1]

اس کے بعد آپ کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ ایک مہینہ مہار شریف قیام کرتے تھے، پھر کچھ دنوں کے لیے گھر آجاتے تھے۔ والدہ کو ان کا یہ حال دیکھ کر بہت خیال ہوا۔ اس سلسلہ میں تعویذ وغیرہ بھی کرائے۔ ملفوظ میں ایک جگہ فرماتے ہیں ——

"ہرگاہ ایں فقیر در حضور حضرت قبلہ عالم بشرف بیعت مشرف شد، مرا در خانۂ خود ہرگز قرار نیامدے، چنانچہ یک ماہ در حضور می بودم و چند روز در خانہ، بریں نمط می گذشت تا وصالِ مبارک حضرت قبلہ عالم قدس سرہٗ والدہ صاحبہ مرحومہ گفتے کہ پسر مرا خیال بد شدہ است کہ در خانۂ خود آرام نمی گیرد۔ از علماء و فقرا چنداں تعویذ ہا گرفتہ کہ آوند پر ساختہ بودند، چونکہ فقیر از کمال جذبہ عشق مستولی شدہ بود، لاچار بے قراری حاصل بود۔ بیت

محبتے ست کہ دل را نمی دہد آرام
دگرنہ کیست کہ آسودگی نمی خواہد"[2]

مرشد سے عشق | حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کو اپنے پیر و مرشد خواجہ مہاروی رح

---

[1] نافع السالکین ص ۱۳۳

[2] نافع السالکین ص ۱۷

سے عشق تھا۔ ان سے جب جدا ہوتے پریشان اور بے چین رہتے۔ فرقت میں ذوق و شوق کا یہ عالم ہو جاتا تھا کہ اکثر پیدل ہی مہار شریف کو روانہ ہو جاتے تھے اور راستے کی تمام صعوبتیں نہایت خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میاں غلام حیدر اور میاں عیسیٰ جعفر کو ساتھ لے کر مہار شریف کو روانہ ہو گئے۔ راستہ میں پیروں سے خون جاری ہو گیا اور

"ہر دہ ناخن از ہر دو پائے من جدا شدند"[1] — پاؤں کے دسوں ناخن انگلیوں سے جدا ہو گئے۔

لیکن اسی استقلال اور ہمت کے ساتھ ۱۰۰ کوس کا سفر طے کیا۔ سفر میں دو دو تین تین دن کے فاقے بھی ہوئے، لیکن عقیدت و ارادت کا یہ متوالہ والہانہ انداز میں یہ سب مصیبتیں جھیلتا ہوا اپنے مرشد کے قدموں میں پہونچ گیا۔ غلام حیدر کا بیان ہے ——

"من بارہا معائنہ نمودم کہ کفش ایشاں بخون پا پُر شد۔ و قطرات ازاں برآمد و ایشاں از خود ہم چناں بے خبر و قدم مبارک مردانہ در سیر مثل معتادمی نہادند و ہرگز از جریانِ خون و زخمی شدنِ پا خبر نداشتند، من بخدمت عرض داشت نمودم کہ دریں جا بنشینیم ہرگز اختیار نکردند، چوں در بلدہ ملتان رسیدیم نظر اینکہ کفش تنگ است کفش دیگر فراخ خرید نمایم، چوں بغیر یک چادرِ نو قیمت دیگر موجود نبود، خواستم کہ آنرا فروختہ

---

[1] نافع السالکین - ص ۱۱

قیمت کفش ادا نمایم، ہر چند سعی نمودم جائز نہ داشتند، وبعد از گفتگوئے بسیار فرمودند کہ مارا از خود ہیچ خبر نیست، غم مدار کہ در قطع منزل تفاوت نخواہد شد" ؎۱

شاہ صاحبؒ اپنے پیر کی اطاعت اور تابعداری میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پیر مشاطہ کی مانند ہوتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ــــ

"شیخ مشاطۂ مرید است یعنی چنانچہ مشاطہ عروس را آراستہ سزاوار صحبت شوئے خود سازد، مانند این شیخ ظاہر و باطن را بہ شریعت پیراستہ مستحق صحبت محبوب حقیقی گرداند" ؎۲

ایک مرتبہ تہار شریف میں دیوان حافظ کا مطالعہ کر رہے تھے، اتفاقاً شیخ کا بھی ادہر سے گذر ہوا۔ پوچھا کیا پڑھتے ہو۔ عرض کیا خواجہ حافظ اور ساتھ ہی یہ شعر پڑھا ؎

کمال صنعت مشاطہ باید
کہ روئے زشت را زیبا نماید ؎۳

شاہ محمد سلیمان صاحب کا عقیدہ تھا کہ

"صحبت شیخ باعقیدہ باید کرد کہ بے عقیدہ از صحبت ہیچ فائدہ نیست" (شیخ کی صحبت میں عقیدہ کے ساتھ حاضر ہونا چاہئے بے عقیدہ صحبت سے ...)

جب بھی وہ اپنے مرشد کی صحبت میں رہے اسی عقیدہ سے رہے۔ اور اپنا سارا

؎۱ نافع السالکین ۔ ص ۱۸ ؎۲ نافع السالکین ۔ ص ۶۹
؎۳ نافع السالکین ۔ ص ۴۴ ؎۴ نافع السالکین ۔ ص ۵۰

وقت باطنی اصلاح میں صرف کیا۔ شیخ بھی ان پر دوسرے مریدوں کی نسبت زیادہ توجہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ سلیمانؒ مہار میں مقیم تھے۔ زیادہ وقت میاں خدا بخش ولد حافظ محمد مسعود کی مسجد میں گزارتے تھے اور ذکر و مجاہدہ میں مشغول رہتے تھے۔ مجلس کے وقت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر کتبِ تصوف کا درس لے لیا کرتے تھے۔ قبلۂ عالم کو ان کا اس قدر خیال تھا کہ خود مسجد میں جا کر ان سے ملتے تھے[۱]۔

خلافت ۱۵، ۱۶ برس کی عمر میں خواجہ محمد سلیمانؒ، خواجہ مہارویؒ سے بیعت ہوئے تھے[۲]۔ شیخ کی صحبت کا فیض کل ۶ سال تک اٹھایا۔ خود ایک جگہ فرماتے ہیں ــــ

"مارا صحبتِ ظاہری حضرت قبلۂ عالم	ہمیں حضرت قبلہ عالم کی ظاہری صحبت
شش سال یا کم بود"[۳]	چھ سال یا کچھ کم حاصل رہی ہے

۲۱، ۲۲ سال کی عمر میں پیر و مرشد نے خلافت عطا فرمائی اور تونسہ میں قیام کی ہدایت کی۔ ۷۰ سال تک بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ وہ تونسہ شریف میں تبلیغ و اشاعت اور اصلاح و تربیت میں مصروف رہے۔

تونسہ میں قیام خانقاہ تونسہ، ڈیرہ غازی خاں سے ۳۰ کوس کے فاصلہ پر ایک غیر معروف گاؤں تھا۔ پیر و مرشد نے حکم دیا کہ اپنا وطن چھوڑ کر وہاں آباد ہو جاؤ۔ شاہ محمد سلیمان نے فوراً گڑگوجی کو الوداع کہا اور تونسہ پہنچ گئے۔ وہاں بقول پیر حیدر علی شاہ صاحب جلال پوری، آپ سرکنڈوں کی ایک جھونپڑی بنا کر عبادت میں مشغول ہو گئے[۴]۔ جب اس علاقہ کا رئیس الف خاں حلقہ مریدین میں شامل

---

[۱] خاتم سلیمانی۔ ص ۴۲-۴۱

[۲] ۱۱۹۹ھ میں آپ بیعت ہوئے۔ ۱۲۰۵ھ میں شاہ نور محمد صاحب کا وصال ہوا

[۳] نافع السالکین ص ۱۴۱-۱۴۰

[۴] ملفوظات حضرت پیر صدر شاہ جلال پوری۔ (ذکر حبیب) ص ۲۸۲-۲۸۳

ہوا تو اس نے شاہ صاحبؒ کی اجازت سے ایک مکان بنوا دیا۔ جب آپ کی شہرت بڑھی اور لوگ دور دور سے شرفِ بیعت کے لئے حاضر ہونے لگے تو نواب بہاول خاں والیِ ریاست بہاولپور بھی سلسلہ خدام میں داخل ہو گئے اور تعمیر مسجد کے لئے چند ہزار روپے خدمتِ اقدس میں پیش کئے۔ حضرت نے وہ روپیہ حسب دستور لنگر کے درویشوں میں تقسیم کر دیا۔ جو بچا وہ مسکینوں اور درویشوں کو بانٹ دیا۔ نواب بہاولپور نے پھر روپے بھیجے۔ وہ بھی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دئے گئے آخرالامر نواب صاحب نے حضرت خواجہ اللہ بخشؒ کو روپے بھیجے اور ان سے درخواست کی کہ وہ مسجد تعمیر کرا دیں۔ صاحبزادہ صاحب نے جب سامان مہیا کیا تو خواجہ صاحبؒ کو معلوم ہوا۔ آپ نے فرمایا۔

"واہ او بھیڑیا جے میرے کول گھل دوں تے
کتیاں مسجداں تیار کرا دیندا" [1]

اس طرح رفتہ رفتہ، تونسہ بارونق اور پُر فضا مقام بن گیا اور دور دور سے لوگ وہاں آنے لگے۔ فاربس نے اپنے فیصلہ میں قیام تونسہ کے متعلق لکھا ہے ـــــ

"خواجہ محمد سلیمان صاحبؒ کے زمانہ میں جو حالات
تونسہ کے تھے، ان سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اور
ان کے خلفا ہی نے اس کو آباد کیا تھا" [2]

مدارس کا اجرا شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے تونسہ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد سب سے پہلا کام اجراء مدارس کا کیا۔ ان کے مدارس کے متعلق تفصیلی معلومات کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ ۱۹۱۱ء میں خواجہ حامد اور خواجہ محمود کے درمیان ایک مقدمہ ڈسٹرکٹ جج ملتان کی عدالت میں ہوا تھا اس میں بعض پرانے گواہوں کے بیانات

---

[1] ملفوظات حضرت پیر حیدر شاہ جلالپوری (ذکر حبیب) ص ۸۲ ـ ۲۰۳ [2] ترجمہ فیصلہ مقدمہ دیوانی منفصلہ ایچ ایف فاربس صاحب بہادر ڈسٹرکٹ جج ملتان مقدمہ نمبر ۱۰۹ سنہ ۱۹۱۱ء

اور عمارتوں کے معائنہ سے ان مدرسوں کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے۔ جج نے اپنے فیصلہ میں ان مدارس کی تفصیل دی تھی۔ مناسب ہے کہ یہاں اس فیصلہ کے اہم اقتباسات درج کئے جائیں ـــــ

"انھوں نے (یعنی خواجہ محمد سلیمان ؒ نے اغراضِ مذہبی کے لئے مدارس جاری کئے تھے اور وہ، جو لوگ زیارت کرنے کے لئے اور مرید بننے کے لئے آتے، ان کو مذہبی تعلیم دیتے تھے اور ان کے لئے سہولتیں مہیا کرتے تھے یہ تمام کارروائی زیرِ نگرانی شاہ محمد سلیمان صاحب ہوتی تھی امداد کنندگان ان کے خلفا تھے .... بڑے بڑے خلفا کے نام سے اب تک وہ مکانات جو مسجد کے اردگرد ہیں، موسوم ہیں۔ گو اصلی مکانات سب شہید ہو چکے ہیں۔ احمد یہ بیان کرتا ہے کہ خواجہ الہ بخش صاحبؒ کے مکانات بنانے سے پہلے یہ زمین خالی تھی اور وہاں فقیروں کی جھگیاں تھیں۔ کھڈی بنگلہ، محمد علی شاہ کا بنگلہ اور نیز اور بہت سے ناموں سے مکانات نامزد ہیں۔ مثلاً مدرسہ مولوی محمد عمر۔ مولوی احمد صاحب کا بنگلہ، مدرسہ مولوی الٰہی بخش، یہ تمام صاحب خواجہ سلیمان صاحب کے خلفا تھے۔ پھر ملاحظہ ہو بیان نور محمد کا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا دادا یہاں آیا اور پندرہ سال خواجہ محمد سلیمان صاحب اور ۱۵ سال خواجہ الہ بخش صاحب کی خدمت کرتا رہا۔ اس کو مولوی شیخ احمد کہتے تھے۔

اس کا ایک مدرسہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ خواجہ
محمد سلیمان صاحبؒ کے زمانہ میں پچاس استاد تھے۔
ان کے مکانات تھے۔ اور بعض مکانات میں کئی استاد
اکٹھے رہتے تھے۔ خواجہ محمد سلیمان صاحبؒ کے لنگر سے
ان کو کھانا ملتا تھا۔" [۱]

اس فیصلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے تونسہ کو دار العلوم بنا دیا تھا۔ ان کے دولت کدہ کے چاروں طرف متعدد مدرسے تھے، پچاس استاد وہاں رہتے تھے۔ تعلیم و تربیت کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر جاری تھا۔ علومِ دینیہ کی ترقی و ترویج میں بے حد کوشش کی جا رہی تھی۔ مدرسوں کا اجرا، شاہ صاحب کے مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ تھا۔ صرف اسی طرح سے اسلامی شعار کی ترویج ممکن تھی۔ تونسہ جیسی بستی میں پچاس مدرسین کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ تونسہ اس علاقہ کا تعلیمی مرکز بن گیا تھا اور دور دور سے شائقینِ علم وہاں جمع ہونے لگے تھے۔

درس و تدریس شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کو خود درس دینے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے خاص شاگردوں اور مریدوں کو سلوک و احسان کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ ان کے ملفوظات میں بعض جگہ ان کتابوں کا ذکر آ گیا ہے جن کو وہ اکثر پڑھایا کرتے تھے۔ ایک جگہ جامع ملفوظ لکھتا ہے ——

"حضرت قبلہ من قدس سرہ العزیز در اثنائے تعلیم کتاب
احیاء العلوم ایں عبارت را بر زبان در فشاں راندند" [۲]

پھر ایک موقع پر لکھتا ہے ——

---

[۱] ترجمہ فیصلہ مقدمہ دیوانی، ایچ ایف فاربس۔ ص ۱۲-۱۱ [۲] نافع السالکین ص ۱۶۰

"کاتب حروف پیش شیخ خود قاری کتاب
فتوحات مکی بود" [1]

احیاء العلوم اور فتوحات کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے کچھ مریدوں کو کنز اور کافیہ بھی پڑھایا تھا۔ چنانچہ حاجی چراغ الدین نے کنز اور کافیہ ان ہی سے پڑھا تھا [2]

شاہ صاحب کا علمی تبحر

شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر بہت گہری تھی۔ قرآن حدیث اور فقہ پر ان کو پورا عبور تھا۔ ملفوظات میں جگہ جگہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی نقل کرتے ہیں۔ تصوف کی اعلیٰ کتابوں کا مطالعہ نہایت بالغ نظری سے کیا تھا۔ عوارف المعارف اور فتوحات مکیہ نوکِ زبان پر تھیں اور شیخ سہروردیؒ اور امام اکبرؒ کے بنیادی خیالات پر کافی غور و فکر کیا تھا۔

حدیث و فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی مسئلہ آپ سے دریافت کیا جاتا تو برجستہ اسناد نقل کر دیتے۔ ایک مرتبہ قبلۂ عالم کے عرس میں تشریف فرما تھے۔ ایک عالم نے کچھ مسائل دریافت کئے۔ آپ نے برجستہ ان کا شافی و کافی جواب عنایت فرمایا اس مجلس میں مولوی خدا بخش صاحبؒ (خلیفہ حافظ محمد جمال ملتانیؒ) بھی موجود تھے۔ انھوں نے اپنے برادر زادہ اور شاگرد مولوی عبد الغفار سے فوراً کہا کہ ان ارشادات کو ایک رسالہ کی شکل میں لکھ لو۔ چنانچہ وہ سوالات اور جوابات جمع کر لئے گئے۔ مناقب سلیمانی میں اس رسالہ کا کچھ حصہ نقل کیا گیا ہے [3]۔ اس سے شاہ صاحب کی وقتِ نظر، وسعتِ معلومات، اور تبحرِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ صاحبؒ فقہ اسلامی کے مطالعہ پر خاص زور دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حدیث بغیر مجتہد کے نہیں سمجھی جا سکتی۔ فرماتے ہیں ـــ

---

[1] نافع السالکین۔ ص ۱۴۳ [2] مناقب سلیمانی۔ ص ۱۸۰ [3] مناقب سلیمانی۔ ص ۱۲۹ - ۱۳۲

"فہم حدیث بغیر مجتہد کسی را نیست مارا عمل بر
قول مجتہد است نہ بر حدیث" [۱]

وہ ائمہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ جامی کے یہ اشعار وردِ زبان رہتے تھے [۵]

آں امامانے کہ کردند اجتہاد
رحمتِ حق بر روانِ جملہ باد
بوحنیفہ بد امام با صفا!
آں سراجِ اُمتانِ مصطفےٰ [۲]

عسرت کی زندگی شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے اپنا ابتدائی زمانہ بڑی عسرت اور تنگی میں بسر کیا تھا۔ جب تونسہ میں وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے آئے تھے تو ان کے خورد ونوش کا کوئی بند وبست نہ تھا۔ ایک شخص رحم کھا کر ان کو کھانا دینے لگا تھا۔ اس میں بھی یہ مصیبت تھی کہ اس کے دروازہ پر ایک کتا رہتا تھا۔ خواجہ صاحب کھانا لینے جاتے تو اس انتظار میں کھڑے رہتے کہ کتا ہٹے تو اندر جائیں اگر کتا وہیں رہتا تو دن بھر بھوکے رہتے۔[۳] جب خواجہ نور محمد مہارویؒ کے خلیفہ کی حیثیت سے وہ تونسہ شریف پہنچے تو عسرت کا یہ عالم تھا کہ سرکنڈوں کی جھونپڑی میں اپنا سر چھپاتے تھے اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ گڑگوجی میں ان کی کچھ زمین تھی، لیکن خواجہ نور محمد صاحب کے ارشاد کے بموجب اسے ویسے ہی چھوڑ آئے تھے [۴] کچھ عرصہ بعد فتوح کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دنیا کی ہر نعمت ان کے قدموں میں آگئی۔ لیکن استغنا کا وہی عالم رہا اور انھوں نے کبھی فارغ البالی کی زندگی بسر نہیں کی۔ جو کچھ ان کی خانقاہ

---

[۱] نافع السالکین۔ ص ۱۱۳ — [۲] نافع السالکین ص ۱۶۹
[۳] نافع السالکین ص ۲۹ — [۴] نافع السالکین۔ ص ۱۷۵

میں پہنچا تھا فوراً تقسیم کر دیتے تھے۔ اپنے لئے کچھ نہ رکھتے تھے۔ لکھا ہے ـــــ

"حضرت قبلۂ من قدس سرہ العزیز سلطان التارکین
بود ہزاراں نقود و اسپاں و شتران و دیگر چیزہا از امتعہ
و اقمشہ کہ مریدان در نذر آوردندے ہماں لحظہ عطا
می نمودند۔ ہیچ چیز با خود نمی داشتند" ۵۱

ایک مرتبہ ایک شخص محمد واصل جس نے عرب و عجم کی سیر کی تھی حضرت کے اس عطا و کرم کی تعریف کی تو فرمانے لگے ـــــ: "میاں واصل! میں تو وہی ہوں جو تونسہ میں کتے والے مکان سے کھانا لے کر کھاتا تھا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے" ۵۲

شاہ صاحب کی طبیعت میں قناعت اور توکل کا جذبہ حد درجہ تھا۔ ہر قسم کی فتوح ان کے دروازے پر آتی تھی۔ لیکن وہ ایک ہاتھ سے لیتے تھے اور دوسرے سے تقسیم کر دیتے تھے۔ مناقب حافظیہ میں لکھا ہے: "ترک و تجرید میں حضرت شیخ اکبرؒ کا کوئی مثل نہ تھا ... بجز ایک لنگی کوئی چیز شیخ اکبر کے پاس نہ تھی خواہ سفر ہو یا حضر، گرمی ہو یا سردی، حجرۂ مبارک میں صرف ایک بوریا تھا۔ اسی پر نماز و نوافل پڑھتے تھے اور اسی کو سونے کے وقت تخت پر بچھا لیتے تھے۔ گرمیوں میں دھلی لنگی سرہانے رکھ کر استراحت فرماتے تھے۔ جاڑوں میں اسی لنگی کو استراحت کے وقت جسم مبارک پر ڈال لیتے تھے" ۵۳

شاہ صاحب اپنے مریدوں کو بھی یہ ہی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ وہ صابر و شاکر و قانع بنیں ۵۴

لنگر حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کا لنگر نہایت وسیع اور باقاعدہ تھا۔ کھانے کے علاوہ درویشوں اور طلباء کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ لنگر کے اہتمام کے لئے ایک

---

۵۱ نافع السالکین۔ ص ۱۷۵ ۵۲ نافع السالکین۔ ص ۲۹
۵۳ مناقب حافظیہ۔ ص ۱۵ - ۱۴ ۵۴ " " ۔ ص ۹۵

پورا محکمہ تھا۔ پیارا نامی بنیہ مودی مقرر کیا گیا تھا۔ میاں علی محمد ہوتانی، لانگری تھے۔ مستوفی حساب برخوردار خاں چاکی تھے۔ نور خاں گرمانی، وکیل اور صلاح کار کا کام انجام دیتے تھے۔ منشی گری کا عہدہ صدیق محمد کاسی کو ملا تھا۔[۱] یہ پورا محکمہ لنگر کا انتظام کرتا تھا۔

لنگر میں کھانے کے علاوہ، ضرورت کی ہر چیز موجود رہتی تھی۔ حجام، لوہار، موچی، دھوبی، آب کش، وغیرہ ماہانہ تنخواہ پاتے تھے اور وہاں موجود رہتے تھے اور بقول مصنف خاتم سلیمانی "درویشوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف اور احتیاج باقی نہ رہی تھی"[۲] بیمار ہوتے تو دوائیں لنگر سے مفت ملتی تھیں۔ مودی کو حکم تھا کہ جو شخص نسخہ لائے بغیر پوچھے اس کو دوا دے دی جائے۔ ایک مرتبہ خدا بخش لانگری نے عرض کیا "غریب نواز اس مہینہ میں مودی نے پانچ سو روپیہ درویشوں کی دواؤں کے سلسلہ میں درج کیا ہے" آپ کو یہ سن کر سخت غصہ آیا۔ فرمایا۔ اگر پانچ ہزار بھی دوا پر خرچ ہو تو مجھے اطلاع نہ کی جائے۔ کیا درویشوں کی جان کے مقابلہ میں روپیہ کی کچھ حقیقت ہے"[۳]

لنگر کا یہ قاعدہ تھا کہ ہر درویش کو تین پاؤ پختہ روٹی ملا کرتی تھی۔ چھ مہینے کے بعد کپڑے اور جوتیاں ملتی تھیں۔ علاوہ ازیں ایک سیر تیل اور کچھ گھی ملا کرتا تھا۔ ان مدرسین کے لئے جو رات دن درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، ان کو اس کے علاوہ بھی کچھ مراعات حاصل ہوتی تھیں ان کا کام چونکہ دماغی محنت کا تھا اس لئے ان کو ایک سیر پختہ روزینہ، سیر بھر گھی ماہانہ اور ایک سیر تیل ملا کرتا تھا لباس ان کو بھی چھ مہینے میں ہی ملتا تھا۔ لیکن ایک سفید لنگی اور ایک گوسفند بھی عطا ہوتا تھا۔[۴]

خواجہ صاحبؒ کے لنگر کی حیثیت بہت ہمہ گیر تھی یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس لنگر میں زیادہ تر علماء و مدرسین شامل تھے۔ خواجہ صاحبؒ نے ان کو تمام ضروریاتِ زندگی سے بے فکر کر کر پوری ذہنی مرکزیت کے ساتھ درس و تدریس کے کام کے لائق بنا دیا تھا۔ علماء کی ایک کثیر تعداد

---

[۱] خاتم سلیمانی۔ ص ۶۶ [۲] خاتم سلیمانی۔ ص ۶۷ [۳] خاتم سلیمانی ص ۶۶ [۴] خاتم سلیمانی۔ ص ۶۶

اس طرح دینی کام کے لئے تیار ہو جاتی تھی۔ آج ہم اس عظیم الشان لنگری نظام کے دور رس اثرات و نتائج پر معلومات کی کمی کی بنا پر تفصیلی بحث کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ویسے تو اس زمانہ میں ہندوستان کی کئی خانقاہوں میں بڑے بڑے لنگر قائم تھے اور سینکڑوں آدمیوں کا مجمع رہتا تھا۔ مثلاً دہلی میں شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ میں پانچ پانسو فقیر رہتے تھے اور ان کے خورد نوش کا انتظام ہوتا تھا[۵۱]۔ خواجہ محمد عاقلؒ کی خانقاہ میں بھی لنگر کا بڑا اہتمام تھا[۵۲]۔ لیکن جو باقاعدگی اور جو مقصد شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کے لنگری نظام میں ملتا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں تھا۔ شاہ محمد سلیمانؒ کا یہ کل نظام ایک مقصد کے ماتحت تھا۔ وہ اس طرح کی سہولتیں بہم پہنچا کر علماء کو درس و تدریس اور مشائخ کو تبلیغ و اصلاح کے لئے تیار کرتے تھے۔ شائقینِ علم و فضل جگہ جگہ سے تونسہ میں آ کر جمع ہوتے تھے اور شاہ صاحب ان کی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

شاہ صاحبؒ کی مقبولیت

حضرت شاہ محمد سلیمانؒ نہایت ہر دل عزیز بزرگ تھے۔ عقیدت مندوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ مکان کے شمالی اور جنوبی دروازے کھول دئے جاتے تھے۔ لوگ ایک ..... دروازے سے داخل ہوتے اور دوسرے سے نکلتے رہتے تھے[۵۳]۔ جب شاہ صاحب تونسہ سے باہر جاتے تو اسٹیشنوں پر معتقدین کے ہجوم لگ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ بھنڈے کے اسٹیشن پر اس قدر خلقت جمع ہو گئی کہ گاڑی کو بہت دیر تک رکنا پڑا[۵۴]۔

شاہ صاحبؒ کی خانقاہ میں جگہ جگہ سے لوگ آتے تھے۔ قریبی ریاستوں کے نواب اور جاگیرداران کے آستانہ پر اپنی حاضری کو باعثِ فخر و مباہات سمجھتے تھے۔ افغانستان

---

[۵۱] آثار الصنادید۔ سرسید احمد خاں | [۵۲] تکملہ سیر الاولیاء

[۵۳] خاتم سلیمانی۔ ص ۷۱ | [۵۴] خاتم سلیمانی ص ۱۳

سے شاہ شجاع ان کی خانقاہ میں عقیدت و ارادت کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ جاگیرداروں اور والیانِ ریاست کا تو یہ معمول تھا کہ گدی پر بیٹھتے وقت ان ہی کے دستِ مبارک سے پگڑی بندھواتے تھے اور ان کی دعاؤں کو اپنے لئے سعادتِ دارین تصور کرتے تھے۔ سرسید نے (جو ان کے ہم عصر تھے) لکھا ہے کہ ان کی شہرت قاف سے قاف تک ہے[۵۱]۔ دہلی سے جو اپنے انحطاط کے زمانہ میں بھی علم وفضل کا مرکز تھا، علماء اور صوفیہ فیض حاصل کرنے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مولوی حیات علی دہلوی[۵۲] اور صاحبزادہ نظام الدین پسر کالے صاحب[۵۳] کو اپنی روحانی پیاس بجھانے کا سامان تونسہ ہی میں ملا تھا۔

شاہ صاحب کا نظام اوقات

شاہ محمد سلیمان صاحبؒ اپنے اوقات اور معمولات کے بہت پابند تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد ایک پہر ذکرِ جہر میں مشغول رہتے تھے۔ ذکر سے فراغت کے بعد ہر شخص کو حاضری کی اجازت ہوتی تھی۔ جب اس سے فرصت ملتی تو رات کا کھانا نوش فرماتے۔ پھر عشاء کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد حجرہ میں چلے جاتے تھے۔ تہجد کے بعد ذکرِ جہر کرتے تھے۔ اس وقت ایک مخصوص محفلِ سماع[۵۴] ہوتی تھی، جس میں کسی شخص کو حاضری کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ میاں احمد قوال[۵۵] کچھ سناتا تھا۔ نماز فجر سے قبل اپنے تخت پر آرام فرماتے تھے۔ جب اذان ہوتی، مسجد میں تشریف لاتے۔ نماز کے بعد پھر حجرہ میں چلے جاتے ایک پہر دن گزرنے پر پھر عام مجلس شروع ہو جاتی۔ اس کے بعد کھانا کھاتے، اور کسی قدر قیلولہ کے بعد نماز ظہر ادا کرتے۔ پھر عصر تک کلام پاک کی تلاوت میں مشغول رہتے۔ عصر سے مغرب تک مسجد

---

۵۱ ۵۲ آثار الصنادید ۵۳ خاتم سلیمانی۔ ص ۱۴۸ ۵۴ نافع السالکین میں لکھا ہے۔ "سماع را بعد از نماز تہجد بسیار عزیز داشتندے" ص ۱۴۷ ۵۵ خاتم سلیمانی میں لکھا ہے: "میاں احمد قوال حضرت کا خاص غلام تھا۔ بچپن سے لے کر آخیر عمر تک حضور پرنور کی صحبت میں رہا" ص ۸۶ آپ کا ایک اور قوال پیر بخش تھا۔ نافع السالکین ص ۱۲۵

میں قیام فرماتے۔ مناقب حافظیہ میں لکھا ہے کہ شیخ کے ان معمولات میں خواہ حضر ہو یا سفر فرق نہیں ہوتا تھا۔[۵۱]

تعلیم اخلاق

جب کسی قوم کا سیاسی زوال شروع ہوتا ہے تو اس کے افکار و اعمال، عادات و اطوار بھی انحطاط پذیر ہونے لگتے ہیں۔ یہ قومی زوال کی آخری منزل ہوتی ہے۔ اخلاقی زوال کے اثرات سیاسی زوال سے کہیں زیادہ مہلک ہوتے ہیں اس کے بعد کچھ عرصہ کے لئے تجدید و احیاء کی سب راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ شاہ محمد سلیمان نے جس وقت ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا کیا تھا اس وقت مسلمانوں پر سیاسی ادبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ اس زوال کو سب دیکھ رہے تھے لیکن بہت کم لوگ ایسے تھے جن کی حقیقت بین نگاہیں سیاسی زوال کے پیچھے ایک خطرناک اخلاقی زوال کے اثرات کو بھی دیکھتی ہوں ایسے لوگوں نے سلطنت کا ماتم کرنے میں اپنا وقت صرف نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی اخلاق و شعائر کی نگہبانی کی۔ شاہ محمد سلیمان صاحبؒ بھی ان ہی چند بزرگوں میں تھے جن کی کوششوں کا محور اخلاق و عادات کی درستی تھا۔

حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ چاہتے تھے کہ مسلمان، رسول عربی کے آئینہ میں اپنے اخلاق و عادات کو سنواریں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اچھے فضائل اور عادات صرف متابعت رسول سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں ــــ

"خوب خصائل و حمیدہ افعال بغیر متابعت
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاصل نہ شود"[۵۲]

متابعت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں ــــ

---

[۵۱] مناقب حافظیہ ۔ ص ۱۶ - ۱۵

[۵۲] نافع السالکین ۔ ص ۹۷

"متابعت عبارت از دو چیز است	متابعت سے مراد دو چیزیں ہیں۔ جو
آنچہ خدا و رسول خدا او امر کردہ اند	کچھ خدا اور رسول خدا نے حکم دیا ہے اسے کرنا
بباید کرد، و آنچہ منع فرمودہ اند نباید کرد"[۱]	اور جس چیز سے منع کیا ہے اس سے بچنا۔

شاہ صاحبؒ کی اخلاقی کوششوں کا مرکزی نکتہ یہی تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اسی جدو جہد میں وقت گزارا کہ عوام کے اعمال درست کیے جائیں فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں آدمی بہت ہیں لیکن آدمیت نہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ـــــ

"آدمی کم موجود شوند کہ اکثر صورت آدمی دارند
وخصال آدمی ندارند، آدمیت عبارت از خوب
خصال وحمیدہ افعال است" [۲]

فرمایا کرتے تھے کہ آدمی ہونا بہت مشکل ہے۔ "آدمی شدن بسیار مشکل است"[۳] انتہا یہ تھی کہ کہا کرتے تھے کہ سلک السلوک[۴] میں آدمی کی جو صفات لکھی ہیں وہ خود میرے اندر بھی نہیں ہیں[۵]

ملفوظات میں جگہ جگہ بری صحبت، غیبت، غرور، عیب جوئی، شراب خواری، عشق بازی اور رشوت خوری سے بچنے کی ہدایت ہے۔ اور بار بار ادب، مہمان نوازی، نیکی، عجز و انکسار اور ایمان داری کا درس دیا گیا ہے۔ نافع السالکین میں شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جہاں اصلاح اخلاق پر زور دیا گیا ہو۔ ان سب اصلاحی مشوروں کا خلاصہ یہ ہے ـــــ

---

[۱] قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا شاہ صاحبؒ کی یہ تلقین بالکل اسی آیت کا ترجمہ ہے [۲] نافع السالکین۔ ص ۱۰۹۔ ۹۷ [۳] نافع السالکین ص ۱۶۱

[۴] ضیاء نخشبی کی مشہور کتاب ہے۔

[۵] نافع السالکین۔ ص ۱۶۱

(۱) بری صحبت سے بچو۔ اس کے اثرات بہت خطرناک ہوتے ہیں اور جلدی اثر کرتے ہیں۔ جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند[۱]

صحبت کے اثرات بتانے کے سلسلہ میں وہ نہایت نصیحت آموز حکایتیں اور قصے بیان کرتے ہیں۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ بار بار یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

نار خنداں باغ را خنداں کند
صحبت مرداں ترا مرداں کند

یک زمانہ صحبتِ با اولیا!
بہتر از صد سال طاعت بے ریا[۲]

بری صحبت کے اثرات بیان کرتے ہوئے 'عوارف المعارف' کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ ایک سانپ ایسا ہوتا ہے کہ جس پر اس کی نظر پڑ جاتی ہے وہ سوختہ ہو جاتا ہے جب حیوان کے یہ اثرات ہیں تو انسان کے اثرات کا کیا کہنا[۳] ؎

(۲) غرور و تکبر سے بچو[۴] کسی کو حقارت سے نہ دیکھو[۵] عجز سے رہو۔ اپنے آپ کو سب سے بدتر اور کم تر سمجھو[۶] فرماتے ہیں ——

"ہر کہ خود را از ہمہ کس کم داند او
مقبول و محبوب حق تعالیٰ باشد"[۷]

۱؎ نافع السالکین ص ، ۲؎ نافع السالکین ص ، ۳؎ نافع السالکین۔ ص ۵۲ ۴؎ نافع السالکین ص ۲۵ ۵؎ نافع السالکین۔ ص ۲۵ ۶؎ نافع السالکین۔ ص ۱۶۶، ۶۵
۷؎ نافع السالکین ص ۱۱۰

شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کی سی انکساری پیدا کرنی چاہیئے ایک مرتبہ بارش کی کمی ہوئی۔ نماز استسقاء کے باوجود جب بارانِ رحمت نازل نہیں ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ برے لوگوں کی شامتِ اعمال سے یہ ہوا ہے۔ حضرت بایزید بسطامی نے جب یہ سنا تو فوراً شہر سے نکل کھڑے ہوئے کہ سب سے برا تو میں ہی ہوں[۵۱]"

شاہ صاحبؒ چاہتے تھے کہ ان کے مریدوں میں عجز و انکسار کا مادہ پیدا ہو اور وہ شفقت و مہربانی کے ساتھ خلقت سے پیش آئیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"سالک را باید کہ ہمہ خلق را چہ شریف و چہ
خسیس بہ شفقت و رحمت ناظر باشد تا حق تعالیٰ
بر وے رحمت کند"[۵۲]

غرور و نخوت سے نہ صرف دینی کام میں رکاوٹ پڑتی ہے بلکہ خود انسان کے اندر روحانی ترقی کی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں۔

(۳) حسد و کبر سے بچو۔ فرماتے ہیں ـــ

"گل توحید نہ روید بہ زمینے کہ درو	توحید کا پھول اس زمین میں نہیں اگتا
خارِ شرک و حسد و کبر و ریا است"[۵۳]	جہاں شرک، حسد اور ریا کے کانٹے موجود ہوں

(۴) عیب جوئی سے بچو[۵۴] فرماتے تھے کہ اپنے عیوب کی تلاش مقدم ہے ـــ

"سالک را باید کہ بہ سبب عیب بینیِ خویش از عیب
خلق چشم بہ بندد کہ عین سعادت و رضامندی حق سبحانہ
دریں مندرج است، چنانچہ در حدیث وارد است طوبیٰ

---

۵۱ نافع السالکین ۔ ص ۱۱۰ ‏ ۵۲ نافع السالکین ۔ ص ۲۲
۵۳ " " ۔ ص ۲۹ ‏ ۵۴ " " ۔ ص ۲۹

لن تشغل علیہ من عیوب الناس" [۱]

(۵) غیبت سے بچو۔ قرآن پاک کا حکم ہے۔

وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ۔

یاد رکھو ـــــ

"غیبت از سرقت بد است زیرا کہ در سرقت سارق چیزے

دزدے می خورد و در غیبت ہیچ سود نیست بلکہ اعمال

غیبت کنندہ خاکستر شود" [۲]

پھر یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

آں کس کہ بسوئے غیبت افراختہ است

او از تنِ مردگاں غذا ساختہ است

وآنکس کہ بعیبِ خلق پرداختہ است

زانست کہ عیب خویشِ نشناختہ است [۳]

وہ اپنی نصیحت کو پُر زور اور زود اثر بنانے کے لئے آیاتِ قرآنی، احادیث اور اشعار برمحل استعمال کرتے تھے۔ جب اخلاقی درس دیتے ہیں تو ان کے لہجے میں اصولی سختی اور تبلیغی نرمی کا نہایت ہی حیرت انگیز امتزاج ہوتا ہے۔ نصیحت کرنے کا جو موقع ملتا ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس قسم کے لوگ آتے جس قسم کا مسئلہ زیر بحث ہوتا وہ اخلاقی درس کو نہ بھولتے۔ وہ چاہتے تھے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاقی اصول کارفرما ہوں کسی قسم کی گفتگو ہوتی وہ اس کا اخلاقی پہلو ضرور نمایاں کر دیتے تھے۔ ایک دن تجارت کے

---

[۱] نافع السالکین۔ ص ۳۴ [۲] نافع السالکین ص ۸۴۔۸۳ [۳] نافع السالکین ص ۸۴، ۸۳

متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو ارشاد فرمایا۔

"اگر کسے سوداگری دانہ گندم کند بریں	اگر کوئی اس نیت سے گیہوں کی تجارت
نیت کہ غلہ را بہ قیمت گراں خواہم	کرے کہ اسکو گراں بیچوں گا تو یہ امر شریعت
فروخت ایں امر در شریعت ممنوع	میں ممنوع ہے بلکہ جو کوئی ایسی نیت کرتا
است بلکہ ہر کہ ایں نیت کند عاقبت	ہے اس کی عاقبت خراب ہوتی ہے۔
الامر خوار شدہ بمیرد" [۱]	

جانوروں کے پالنے کے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو فوراً ہدایت فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص جانوروں کو پالتا ہے لیکن ان کی خبر گیری نہیں رکھتا اس سے قیامت کے دن پرسش کی جائے گی۔ [۲]

یہ معمولی معمولی باتیں ہیں لیکن اپنے اخلاقی درس کو وہ یہاں بھی نہیں بھولتے۔
مریدوں کے لئے ان کی اخلاقی تعلیم کے مرکزی نکتے یہ تھے :۔

(۱) عمل صالح۔

" سالک را باید کہ در اعمالِ صالحہ مداومت نماید" [۳]

(۲) نیکی۔

" کار ما بہ بداں ہم نیکی کردن است " [۴]

(۳) ادب۔

از خدا خواہم توفیق ادب!
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب [۵]

---

[۱] نافع السالکین ۔ ص ۱۵۸ [۲] نافع السالکین ۔ ص ۱۰۷
[۳] " " ۔ ص ۶۲ [۴] نافع السالکین ۔ ص ۱۱۹ [۵] نافع السالکین۔ ص ۱۱۴

مریدوں کی اخلاقی تعلیم میں وہ ان ہی تین چیزوں پر زور دیتے تھے۔ ملفوظات میں متعدد جگہ ان ہی کو مختلف انداز سے بیان کر کے دل نشین کرایا گیا ہے۔

ارکان اسلام کا تحفظ

حضرت شاہ محمد سلیمانؒ کو ارکانِ اسلام کے تحفظ کا بڑا خیال تھا۔ جس وقت انھوں نے اصلاح و تربیت کا کام شروع کیا تھا اُس وقت لوگوں میں فسق و فجور بہت بڑھ گیا تھا۔ خود شکایت کرتے ہیں۔

"دریں زمانہ مرداں فسق و فجور می کنند"[۱] — اس زمانہ میں لوگ فسق و فجور کرتے ہیں۔

دین سے بے اعتنائی عام تھی۔ بدعت کے کاموں میں سیکڑوں جمع ہو جاتے تھے لیکن کارِ خیر میں حصہ لینے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا تھا۔ فرماتے ہیں ــــ

"ہر جا کہ بدعت و بازی باشد خلق بسیار جمع شود، و ہر جا کہ کار نیک باشد خلق کم رود"[۲] — جہاں کہیں بدعت یا کھیل ہوتے ہیں بے شمار لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ جہاں نیک کام ہوتا ہے وہاں کم آتے ہیں۔

ایک شخص جس نے بڑی سیاحت کی تھی، شاہ صاحب سے عرض کیا ــــ

"من ملک خراساں و ہندوستان را دیدہ ام کہ ہیچ جا دین داری نیست مثل بخارا و دیگر در تونسہ مبارک کہ از سبب برکت آں صاحب بسیار دیں داری ہست"[۳] — میں نے خراسان اور ہندوستان میں گشت کیا ہے، کہیں ایسی دین داری نہیں ہے جیسے بخارا اور تونسہ میں۔ تونسہ میں آں صاحب کی وجہ سے بڑی دین داری ہے۔

تونسہ کی یہ حالت تو شاہ صاحب کی مسلسل کوشش اور تلقینِ پیہم کے بعد ہوئی تھی ورنہ اور جگہ حالت یہ تھی کہ عوام ارکانِ اسلام سے نابلد تھے اور طرح طرح کے حیلے بہانے

---

[۱] نافع السالکین۔ ص ۱۷۰ [۲] نافع السالکین۔ ص ۱۱۲ [۳] نافع السالکین۔ ص ۱۷۰

بنا کر فرائض سے بچتے تھے۔ نماز اور روزہ لوگوں نے ترک کر دیا تھا۔ اسلام کے یہ ستون غفلت اور بے توجہی کے باعث کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ شاہ صاحب کو ارکانِ اسلام سے یہ غفلت دیکھ کر حد درجہ رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ ملفوظات میں جگہ جگہ عوام کی اس بے اعتنائی پر غم و غصہ کا اظہار کیا گیا ہے[۱]۔ ایسے زمانہ میں صرف نماز ہی جو لوگ پڑھ لیتے ہیں وہ بہت کافی عبادت کر لیتے ہیں۔ ایک شخص نے عرض کی کہ میں علاوہ پانچ وقت نماز کے کوئی کارِ خیر نہیں کرتا۔ ارشاد ہوا۔

"ہر کہ دریں زمانہ نماز پنج وقت با جماعت بخواند او ولی است کہ دریں زمانہ بے دینی تمام است" [۲]

جو شخص اس زمانہ میں پنج وقتہ نماز با جماعت پڑھ لیتا ہے وہ ولی ہے۔ کہ اس زمانہ میں بے دینی بہت ہے۔

روزہ سے لوگ بچتے تھے[۳] اور طرح طرح کے عذر پیش کرتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ روزہ رکھنے سے خشکی ہوتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے مسلسل ان خیالات کے خلاف جہاد کیا۔ اور بتایا کہ ایسا خیال کرنا گمراہیِ نفس پر مبنی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"دنیا داراں درماہ رمضان شریف روزہ ندارند و گویند کہ مارا خشکی می شود ایں سخن از گمراہیِ نفس و شیطان است" [۴]

دنیا دار رمضان المبارک کے روزے نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں خشکی ہوتی ہے یہ بات نفس کی گمراہی اور شیطان کے غلبہ کی ہے۔

صوفیہ کی اصلاح

اس زمانہ کے صوفیہ مختلف قسم کی بد اعتقادیوں کا شکار تھے۔ روحانی ترقی اس لئے چاہتے تھے کہ دنیاوی دشواریاں حل ہو سکیں اور —

مقصودِ من خستہ ز کونین توئی
از بہرِ تو میرم ز برائے تو زیم!

---

[۱] نافع السالکین ص ۱۶۶ [۲] نافع السالکین۔ ص ۱۴۸ [۳] نافع السالکین۔ ص ۱۰۹، ۱۵۴، ۱۶۶ وغیرہ [۴] نافع السالکین ص ۱۰۹

کی صدا اب کسی حجرہ سے سنائی نہ دیتی تھی[1]۔ اعمال و وظائف میں حد سے زیادہ اعتقاد تھا۔ اور سارا وقت اسی میں صرف ہوتا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے اس گمراہی کو محسوس کرلیا اور فرمایا

"سالک را باید کہ در عملیات تضیعِ وقت نہ کند کہ ایں رہزن و مانع راہ فقر است و مقصودِ اصلی کہ یادکردن حق است" [2]	سالک کو چاہیئے کہ عملیات میں وقت کو ضائع نہ کرے ایسے مشغلے راہ فقر کے ڈاکو اور رکاوٹیں ہیں۔ اصلی مقصود خدا کا یاد کرنا ہے۔

ان وظائف کی جگہ جن کا مقصد کسی دنیاوی مشکل کا حل کرنا ہوتا تھا، شاہ صاحبؒ نے ذکرِ جہر پر زور دیا۔ اور فرمایا ـــــ

"ذکرِ جہر بہ کلمہ لاالٰہ الا اللہ از ہمہ اوراد و وظائف بہتر است چنانچہ در حدیث شریف وارد است افضل الذکر لاالٰہ الا اللہ" [3]	ذکرِ جہر بہ کلمہ لاالٰہ الا اللہ سب اوراد و وظائف سے بہتر ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے سب سے افضل ذکر لاالٰہ الا اللہ ہے

شاہ صاحبؒ کی کوشش تھی کہ صوفیہ میں اطاعتِ حق کا صحیح جذبہ اور دین کا غم پیدا ہو۔ وہ اس دینی طبقہ کو مادّی الجھنوں میں پھنسا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بار بار ہدایت ہوتی ہے کہ صوفیہ کو غمِ دین چاہیئے۔ فرماتے ہیں ـــــ

"سالک را باید کہ غمِ دین خورد کہ مقصودِ دارین است ــہ	سالک کو چاہیئے کہ غم دین کھائے کہ مقصودِ دارین یہی ہے ــہ

غمِ دنیا مخور کہ بے ہودہ است
ہیچ کس در جہاں نیا سود است

---

[1] حضرت بابا فرید گنج شکر اکثر اپنے حجرہ میں بسجود خلوت میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے [2] نافع السالکین ص ۲۵ [3] ایضاً ص ۱۳۱

غمِ دیں خور کہ غم غمِ دین است
ہمہ غمہا فروتر ازیں است"[۱]

وہ صوفیہ کو دنیا داری سے دین داری کی طرف بلاتے تھے اور ان کو بتاتے تھے کہ کل تم کیا تھے، آج کیا ہو گئے؟ تمہاری کوششوں اور عبادتوں کے مرکز کیوں تبدیل ہو گئے؟ تم نے دین کے بجائے دنیا سے کیوں دل لگا لیا۔ تم نے اپنے اعتقادات میں کیوں فساد پیدا کر لیے، صحیح مذہبی جذبہ پیدا کرو کہ وہی سعادتِ دارین کا باعث ہوگا۔

شاہ صاحب کی بالغ نظر ہر گمراہ روش کو دیکھ لیتی تھی اور وہ اس کے خطرناک اثرات سے فوراً آگاہ ہو جاتے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ لوگ اپنے شیخ پر بے جا اعتقاد اور اس کی روحانی امداد پر بے جا اعتماد رکھتے ہیں، چنانچہ انھوں نے صاف طور سے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ تم اپنے پیر سے جس قدر امداد چاہتے ہو اور کائنات کے کاموں میں اس کا جس قدر دخل خیال کرتے ہو، یہ سب باتیں اس کے احاطۂ اختیار سے باہر ہیں۔ اللہ پر صحیح بھروسہ رکھو، سوائے اس کے کسی سے التجا نہ کرو، اسی سے عرضِ مدعا کرو اور اسی پر اعتماد رکھو۔

"التجا و تکیہ بہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ
باید کرد نہ بغیر او"[۲]

لوگوں کا اعتقاد تھا کہ "چونکہ ایں چنیں شیخ کامل و مکمل می داریم ہر کار و عمل کہ می کنم مرا غم نیست"[۳] شاہ صاحب نے ایسے غلط اعتقادات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور فرمایا کہ کارخانۂ قدرت میں کسی چیز کو دخل نہیں۔ وہاں انسانی اعمال سے نتائج مرتب ہوتے ہیں[۴] حق تعالیٰ کا ہر کام حکمت سے ہوتا ہے۔ انسان کو اس سے واقفیت نہیں۔

" ہمگی کار حق تعالیٰ بغیر حکمت نیست — اللہ تعالیٰ کا کوئی کام بغیر حکمت نہیں ہوتا

---

[۱] نافع السالکین۔ ص ۳۰ [۲] نافع السالکین ص ۴۰، [۳] ایضاً۔ ص ۵۸ [۴] ایضاً ص ۴۷

ہیچ کس نداند"	لیکن وہ حکمت کسی کو معلوم نہیں ہوتی۔

ایک جگہ ان ہی گمراہیوں کے سلسلہ میں فرماتے ہیں ——

" سالک را باید کہ ہر فعل ایزد تعالیٰ	سالک کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل عین
را عین حکمت پندارد۔ اگر چہ بر آں	حکمت سمجھے۔ اگر چہ اس (حکمت) سے واقف
اطلاع نداشتہ باشد و بروے	نہ ہو۔ اس پر اعتراض نہ کرے جس نے
اعتراض نکند و ہر کہ اعتراض کند فہو	اعتراض کیا وہ دارین میں مردود ہوگیا۔
مردود فی الدارین۔	

علماء کو تنبیہ

حضرت شاہ محمد سلیمان صاحب قدس سرہ العزیز نے اسلامی سوسائٹی کے جس طبقہ کو بھی غلط راستے پر پایا اس کی طرف فوراً توجہ کی۔ علماء کی بے راہ روی دیکھی تو وہ کانپ اٹھے اور فرمایا ——

" فساد العالم فساد العالم " [۱]

وہ علماء کی گمراہی کو ساری قوم کی گمراہی کے مترادف سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ علماء کی گمراہی خود ان ہی تک محدود نہیں رہتی۔ عوام بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک عامی کی گمراہی خود اسی تک رہتی ہے۔ لیکن عالم کی بے راہ روی سے عوام بھی متاثر ہو جاتے ہیں

" نہ در جنت تنہا می روند و نہ در دوزخ	وہ نہ تو جنت میں تنہا جاتے ہیں نہ دوزخ
بلکہ ہر دو طرف با جماعت کثیر روانہ	میں دونوں جگہ کثیر جماعت ان کے
می شوند " [۲]	ساتھ ہوتی ہے۔

چنانچہ علماء کو ہدایت فرماتے ہیں ——

" عالم را باید بر علم عمل کردن۔

---

[۱] [۲] نافع السالکین۔ ص ۲۰

والا کمثل الحمار یحمل اسفاراً [۱]

علم کا مقصد شاہ صاحب کی نظر میں یہ تھا ——

"مقصود از علم عمل و ہدایت و محبت باری تعالیٰ حاصل کردن است" [۲]

علم سے مقصود عمل، ہدایت اور حق تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا ہے۔

اگر یہ مقصد پورا نہ ہو تو سب علم گمراہی ہے اور اس کا حاصل کرنا عبث۔

شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کے نصابِ تعلیم کے خلاف بھی آواز بلند کی فرمایا کہ علماء کو فقہ اور تفسیر پر زور دینا چاہیئے۔ ان ہی کے مطالعہ سے مذہبی زندگی سنورتی ہے، فرماتے ہیں ——

"علم فقہ و تفسیر ضروریہ است کہ دانستن فرض و واجب و سنت و مستحب و مکروہ موقوف بر علم فقہ است و باقی ہمہ علوم سر دردی است" [۳]

علم فقہ اور تفسیر لازمی ہیں۔ فرض، واجب سنت، مستحب اور مکروہ کا علم علم فقہ پر ہے۔ باقی سب علوم سر دردی ہیں۔

ایک جگہ فرماتے ہیں ——

علم بغیر عمل، و عمل بغیر عقیدہ صاف کہ اہل سنت و جماعت است فائدہ ندہد" [۴]

علم بغیر عمل اور عمل بغیر عقیدہ اہل سنت و جماعت فائدہ نہیں پہونچاتا۔

---

[۱] نافع السالکین۔ ص ۲۲ [۲] نافع السالکین۔ ص ۱۲۲

"علامہ اقبالؒ کا خیال ہے" مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے۔ بولہب را حیدرِ کرّار کن۔ اگر یہ بولہب حیدرِ کرّار بن جائے یا یوں کہیئے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسان کے لئے سراسر رحمت ہے"

[۳] نافع السالکین۔ ص ۱۳۵ [۴] ایضاً ص ۵۰ IQBAL'S EDUCATIONAL PHILOSOPHY P. 116

اگر ایسا نہیں ہے تو سب فضول ہے ؎

علم چندانکہ بیشتر خوانی

چوں عمل در تو نیست نادانی [۵۱]

سماج

زوال و انحطاط کے زمانہ میں سیکڑوں سماجی اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان کی ابتدا گھر کی چار دیواری سے ہوتی ہے رفتہ رفتہ ساری قوم مجموعی حیثیت سے ان میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ملفوظات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں سوسائٹی کی وہ حالت نہ رہی تھی جو مہذب اور تربیت یافتہ سوسائٹی کے افراد کی ہونی چاہیئے۔ گھر کی چہار دیواری مدنی زندگی کا گہوارہ ہے۔ جب گھر میں اخلاقی خرابیاں رونما ہونے لگتی ہیں تو مدنی زندگی کے سارے سرچشمے مسموم ہو جاتے ہیں۔ نافع السالکین میں ایسے متعدد واقعات درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کا ادب و احترام بالکل جاتا رہا تھا۔ ایک شخص نے آکر خدمتِ اقدس میں عرض کیا "حضرت میرے عیال و اطفال مجھے گالیاں دیتے ہیں اور میری خدمت نہیں کرتے" شاہ صاحب کو یہ سن کر بے حد رنج ہوا لیکن وہ انسانی نفسیات سے واقف تھے۔ اس شخص کو تو یہ کہہ کر تسلی دے دی ـــــ

"تکیہ حق بکار آید و تکیہ غیر بکار نیاید	اللہ پر اعتماد و بھروسہ تو کام آتا ہے ورنہ غیر پر بھروسہ
و اگر کسے تکیہ بر عیال و اطفال کند کہ مرا	کب کام آسکتا ہے اگر کوئی اپنے بال بچوں پر بھروسہ
خدمت کنند، ہیچ فائدہ نمی دہد" [۵۲]	کرتا ہے کہ وہ میری خدمت کریں گے تو اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا

لیکن پھر ایک موقع پر نہایت افسوس کے ساتھ فرمایا ـــــ

"از علامات قیامت است کہ پسر با پدر	قیامت کی علامتوں میں سے ہے کہ بیٹا
در جنگ و نزاع باشد" [۵۳]	باپ سے جھگڑا کرے گا۔

---

[۵۱] نافع السالکین۔ ص ۸۵ [۵۲] نافع السالکین ص ۱۱۲ [۵۳] نافع السالکین۔ ص ۱۱۲

اور پھر یہ شعر پڑھا ؎

دختـــرانرا ہمہ جنگ است وجدل با مادر

پســرانرا ہمہ بدخواہِ پدرمی بینم[۵۱]

جب کوئی اخلاقی یا سماجی کمزوری شاہ صاحبؒ کے علم میں آجاتی تھی تو وہ اس کے دور کرنے کی بے حد کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے یہ حالات دیکھے تو مختلف طریقوں سے والدین اور اولاد کے تعلقات میں شگفتگی، اطاعت اور معقولیت پیدا کرنے کی سعی فرمائی ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے ——

"خدمت و فرماں برداری والدین از دل و جان باید کرد کہ در حدیث آمدہ کہ والدین مثل کعبۃ اللہ اند اگر کسے والدین را رد کند ہرگز مقبول نہ شود"[۵۲]

والدین کی خدمت اور فرمانبرداری دل اور جان سے کرنی چاہیئے، حدیث میں آیا ہے کہ والدین کعبۃ اللہ کی مانند ہیں جو والدین کو رد کرتا ہے وہ خود بھی مقبول نہیں ہوگا۔

اس طرح ڈرانے کے بعد ایک جگہ نہایت خوشی کے ساتھ فرماتے ہیں ——

اگر پســر با پدر خوشدل شدہ تکلم

نماید، آنرا مبارک بادی نمایند"[۵۳]

شاہ صاحبؒ نے سوسائٹی کی اور بہت سی خرابیوں کی مذمت کی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں، پہلے زمانہ میں قاضی صاحب نسبت ہوتے تھے، اب رشوت خور ہوتے ہیں[۵۴] رشوت خوری کی مذمت اس طرح کرتے ہیں ——

"ہر کہ حرام خورد، رزق او تنگ شود، وعاجز باشد چنانچہ دزداں ہمیشہ خوار باشند"[۵۵]

جو کوئی حرام کھاتا ہے اس کا رزق تنگ ہوجاتا ہے اور وہ عاجز ہوجاتا ہے چنانچہ چور ہمیشہ خوار ہوتے ہیں۔

---

[۵۱] نافع السالکین۔ ص ۱۱۷ [۵۲] نافع السالکین۔ ص ۱۵۲

[۵۳] نافع السالکین۔ ص ۶۰ [۵۴] نافع السالکین۔ ص ۱۰۴، ایضاً

اہل کاروں کی مذمت ایک سلسلہ میں اس طرح کرتے ہیں ـــــ

"ہر اہل کار دریں زماں کہ می آید از	اس زمانہ میں ہر اہل کار جو آتا ہے پہلے
سابق بدتر باشد" ۵۱	سے بدتر ہوتا ہے۔

ایک جگہ شراب خواری کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے نفس پر شیطان کو غالب کرتا ہے تو وہ شراب خواری وغیرہ کا ارتکاب کرنے لگتا ہے[۵۱]
ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشق بازی سے بچنا چاہیئے۔

"عشق ورزیدن با کودکان وزنان	عورتوں اور لڑکوں سے عشق کرنا ایک بلا ہے
بلائیست ازیں دور باید بود" ۵۲	اس سے دور رہنا چاہیئے۔

اتباع شریعت کی تلقین

شاہ محمد سلیمان صاحبؒ شریعت کے معاملہ میں نہایت سخت گیر تھے۔ فرمایا کرتے تھے ـــــ

"ہر کہ خواہد مقبول و محبوب حق سبحانہ	جو شخص چاہتا ہو کہ حق تعالیٰ کا محبوب ہو جائے
تعالیٰ گردد باید کہ در متابعتِ شریعت	اسے چاہیئے کہ ظاہر اور باطن میں شریعت کی متابعت
ظاہراً و باطناً کوشش نماید چنانچہ نص دریں باب وارد	کرے چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا
است۔ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّ	گیا ہے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی
تَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ" ۵۳	یحببکم اللہ

بار بار ارشاد ہوتا ہے ـــــ

"از امر غیر مشروع دور باشید" ۵۴	غیر شرعی چیزوں سے دور رہو۔

ان کو سوائے قرآن و حدیث کے کوئی گفتگو پسند نہ تھی۔ فرمایا کرتے تھے ۔

---

۵۱ نافع السالکین ۔ ص ۶۱ — ۵۲ نافع السالکین ۔ ص ۱۶۵
۵۳ " " ۔ ص ۴۵ — ۵۴ " " ۔ ص ۱۵۵

"بغیر ذکر خدا و رسول ہمہ سر دردی است" [1]

شاہ صاحبؒ کا خیال تھا کہ انسانیت کا کمال بغیر متابعتِ شریعت دشوار ہے ـــــ

"وحصولِ کمال انسانی بغیر متابعت شریعت
ظاہری و باطنی از قبیل محالات است" [2]

فرمایا کرتے تھے کہ صفائی قلب جو روحانی ترقی کے لئے ازبس ضروری ہے، بغیر اتباعِ شریعت کے حاصل نہیں ہوتی [3]۔ اگر کوئی ولی بھی خلافِ شرع عمل کرتا ہے تو اس کی ولایت اور روحانیت کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

"یک فعل غیر مشروع بندہ را از مرتبۂ ولایت بیفگند" [4]

ایک غیر شرعی فعل بندے کو مرتبۂ ولایت سے نیچے پھینک دیتا ہے۔

شاہ صاحبؒ تصوف و سلوک کی مستند کتابوں کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کرتے تھے کہ صراطِ مستقیم سے مقصود راہِ شریعت ہے۔ حضرت ابن عربیؒ نے فتوحات مکیہ میں اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے عوارف المعارف میں یہی بتایا ہے کہ شریعت کی مدد کے بغیر روحانیت کی دشوار گذار راہیں طے نہیں کی جا سکتیں [5]۔

شاہ صاحبؒ جب لوگوں کو شریعت سے بے اعتنائی برتتے ہوئے پاتے تھے تو ان کو سخت صدمہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ اگر اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالفرض اس وقت موجود ہوتے تو اس زمانہ کے لوگوں کو کافر کہتے، اس لئے کہ انھوں نے شریعت کا اتباع چھوڑ دیا ہے اور مخلوق ان کو دیوانہ کہتی اس لئے کہ ان کے افعال و اخلاق شریعت کے مطابق ہوتے [6]

---

[1] نافع السالکین۔ ص ۱۰۹ [2] نافع السالکین ص ۴۹، نیز ص ۱۲۸
[3] نافع السالکین۔ ص ۱۲۸ [4] نافع السالکین۔ ص ۱۲۸ [5] ایضاً [6] نافع السالکین ص ۱۹

متابعت رسول کی ھدایت

شاہ صاحبؒ متابعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بے حد زور دیتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے تمام مصائب اور مشکلات کا سبب اتباعِ رسولؐ نہ کرنے میں پاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت بھی اس لئے نکلی ہے کہ انھوں نے متابعتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"دریں زماں چوں مسلمانان متابعت نبی صاحب
صلی اللہ علیہ وسلم گذاشتہ اند حق سبحانہ وتعالیٰ کفار
را برایشاں مسلط کردہ است" [۱]

وہ اکثر ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ جب سکھوں نے ملتان کا محاصرہ کیا تو ایک بزرگ حضور رسول مقبول صلعم کی خدمت میں امداد کے طالب ہوئے۔ خواب میں رسولِ خدا نے ارشاد فرمایا۔

"امت من متابعت من گذاشتہ اند" [۲]

فرمایا کرتے تھے کہ دین اور دنیا دونوں میں کامیابی کا انحصار رسول اللہ کے اتباع پر ہے، بے متابعت حصولِ مقصد ناممکن ہے[۳]۔ حکومت بھی اسی وقت مل سکتی ہے جب زندگی کے ہر شعبہ میں اس "اکمل ترین انسان" کا اتباع ہو اور روح کی کمالیت بھی اس وقت ممکن ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پہ گامزن ہو[۴]۔ سلوک و معرفت کی راہیں بغیر اتباعِ رسول کے طے نہیں کی جا سکتیں۔

دریں رہ بجز مرد راعی نرفت
گم آں شد کہ دنبالِ داعی نرفت

---

[۱] نافع السالکین۔ ص ۵ [۲] نافع السالکین۔ ص ۴۰ - ۱۰۶ - ۱۵۸ [۳] کمال روح موقوف است بر متابعت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم" نافع السالکین ص ۱۲۸

محال است سعدی که راہِ صفا
توان رفت جز در پے مصطفیٰ[۱]

مذہبی و روحانی تعلیم

شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں میں صحیح مذہبی جذبات پیدا کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو صحیح راستہ پر لگانے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ ان کی نظر میں پیر کا کام، مشاطہ کی طرح، اپنے مرید کے روحانی خط و خال سنوارنا تھا۔ جس وقت حضرت خواجہ مہارویؒ نے ان کو خلیفہ بنانا چاہا تھا تو انھوں نے یہ عذر کیا تھا "قبلہ! زمانہ کی حالت دگرگوں ہے۔ لوگ بہت گمراہ ہو گئے ہیں۔ یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ مجھ میں استطاعت نہیں کہ اس کام کی ذمہ داری قبول کروں[۲]"، لیکن جب پیرومرشد نے اصرار کیا تو انھوں نے یہ ذمہ داری قبول فرمائی۔ اور ساٹھ سال اس ذمہ داری کو اس طرح پورا کیا کہ ان کی دوررس نگاہ زندگی کے ہر شعبہ تک پہونچی اور ان کے اصلاحی ہاتھ کا اثر دور دور محسوس کیا گیا۔ ان کے آخری زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ ملفوظات میں درج ہے۔ ایک عورت نے سوال کیا "غریب نواز لکھوکھا آدمی، کیا مرد کیا عورتیں، آپ کے دست پر بیعت ہوتی ہیں اور یہ حال ہے کہ آپ کسی کو زیادہ دیر بیٹھنے نہیں دیتے اور کیا دن ہو کیا رات بیعت کرتے رہتے ہیں اور ہر ایک کا بھروسہ ہے کہ قیامت کے دن آپ کام آئیں گے اور امداد کریں گے۔ مگر حیرانی ہے کہ کروڑوں مخلوق میں سے آپ اپنے مرید کس طرح پہچان سکیں گے" جواب میں ارشاد فرمایا "رات کا وقت ہوتا ہے اور چھ سات چرواہے اپنی اپنی بھیڑیں ملا دیتے ہیں اور پھر جب چاہتے ہیں ہر ایک اپنے ریوڑ کو جدا کر لیتا ہے۔ حالانکہ سب بھیڑیں ہم رنگ ہوتی ہیں اور حالانکہ سب چرواہوں کو احمق اور بے وقوف کہا کرتے ہیں تو کیا میں اپنے مریدوں کو شناخت نہ کر سکوں گا"[۳]

---

[۱] نافع السالکین۔ ص ۱۵ [۲] خاتم سلیمانی۔ ص ۶۸ [۳] خاتم سلیمانی۔ ص ۷۷

شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کی مذہبی و روحانی تعلیم کے بعض اہم پہلو یہ ہیں۔

عبادت شاہ صاحب اپنے مریدوں اور معتقدوں کو سمجھایا کرتے تھے کہ انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت ہے۔ قرآن پاک کی یہ آیت اکثر پڑھتے تھے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ[۱]

کبھی یہ شعر پڑھتے تھے ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی[۲]

شاہ صاحبؒ کی حیثیت ایک روحانی طبیب کی سی تھی۔ وہ ہر شخص کو اس کی طاقت، استعداد اور صلاحیت کے مطابق عبادت کا حکم دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ریاضت بقدرِ استطاعت کرنی چاہیئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شروع میں انتہا سے زیادہ ریاضت کی جاتی ہے بعد کو ناتوانی اور ضعف کے باعث فرائض کی ادائگی میں بھی کوتاہی ہونے لگتی ہے[۳]

اللہ پر صحیح اعتقاد و اعتماد شاہ صاحب اپنے مریدوں کو اللہ پر صحیح اعتماد اور کامل بھروسہ کا درس دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی تعلیمات اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

(۱) "اتحاد تکیہ بہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ باید کرد نہ بغیر او"[۴]

(۲) "سالک را باید کہ سوائے جناب حق عز وجل تکیہ گاہِ خود نہ بیند"[۵]

---

[۱] نافع السالکین۔ ص ۱۴ [۲] نافع السالکین۔ ص ۱۴ [۳] نافع السالکین۔ ص ۵۰
[۴] نافع السالکین۔ ص ۱۷ [۵] نافع السالکین۔ ص ۵۹

غیر اللہ پر تکیہ کرنا حادث ہے[۵۱]۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے خدا پر بھروسہ کیا اور آگ گلزار بن گئی[۵۲] حضرت یوسف علیہ السلام نے غیر پر بھروسہ کیا اور زندان میں رہے[۵۳]۔

حُبِ دنیا سے پرہیز — شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے اپنے ملفوظات میں جگہ جگہ "دنیا کی محبت[۵۴]" اور دنیاداروں کی صحبت[۵۵]" سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ اس سے ان کا مقصد گوشہ نشینی یا رہبانیت نہ تھی۔ خود اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

"سالک را چند چیز در دنیا چارہ نیست	سالک کو دنیا کی چند چیزوں کے بغیر چارہ
وآں را صوفیۂ کرام از دنیا نمی شمارند	نہیں۔ اوران کو صوفیۂ کرام دنیا میں شمار
بلکہ از امورِ دینیہ انگارند۔ چنانچہ	نہیں کرتے۔ بلکہ ان کو امورِ دینیہ میں گنتے
قوتِ ضروری برائے عبادت وجامۂ	ہیں۔ چنانچہ غذا جو عبادت کے لئے ضروری
ضروری بنا بر سترِ عورت، وآبِ ضروری	ہو اور کپڑا جو ستر کے چھپانے کیلئے درکار ہو اور پانی
بہ جہت بقارِ حیات ومسکنِ ضروری	جو بقائے حیات کیلئے ہو اور مسکن ضروری برائے عبادت
برائے عبادت وعلمِ ضروری برائے عمل"[۵۶]	اور علم برائے عمل وہ چیزیں ہیں جو دنیا میں شمار نہیں

حکومت کے متعلق شاہ صاحبؒ کا نظریہ شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے جب مسلمانوں کے سیاسی زوال کے اسباب کا تجزیہ کیا تو ان کو مسلمانوں کے سب آلام ومصائب کا صرف ایک سبب نظر آیا اور وہ مذہب سے بے گانگی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ظالموں کے ظلم سے تنگ آگئے ہیں۔ جواب میں فرمانے لگے ——

---

۵۱ نافع السالکین۔ ص ۷۵ ۔ ۵۲ نافع السالکین۔ ص ۱۱۹

۵۳ " " ۔ ص ۱۲۹ ۔ ۵۴ " " ۔ ص ۱۱۱

۵۵ " " ۔ ص ۲۸ ۔ ۵۶ " " ۔ ص ۳۱۵

"اگر کسے بدی کند بر خود کردہ باشد" [1]

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی طرح ان کا خیال یہ تھا کہ حکومت کفر کے ساتھ چل سکتی ہے لیکن ظلم و ناانصافی کے ساتھ نہیں [2]

شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ظالم حکمراں کا مسلط ہونا، لوگوں کی بد اعمالی کی دلیل ہے "اعمالکم عمالکم" پر ان کا اعتقاد تھا [3] اور اپنی مجلسوں میں اسی پر اصرار کیا کرتے تھے کہا کرتے تھے کہ جب خدائے تعالیٰ کسی ملک کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو ظالم حاکموں کے قبضہ میں دے دیتا ہے یہ شعر ان کے وردِ زبان رہتے تھے ؎

چو خواہد کہ ویراں کند عالمے
نہد ملک در پنجۂ ظالمے
بقومے کہ نیکی پسند و خدائے
دہد خسرو عادل و نیک رائے [4]

جب لاہور پر سکھوں کا قبضہ ہوا تو شاہ صاحبؒ نے کہا ——

ان اللہ یتجلی علی استعداد متجلی لہ
یعنی کار مسلماناں در ناشائستگی از
حد گذشتہ کہ ایشاں در ملک غلبہ کردہ اند [5]

پھر یہ شعر پڑھا ؎

چشم عبرت بر کشا و قدرت حق را ببیں
شامت اعمال ما ایں صورت نادر گرفت

---

[1] نافع السالکین - ص ۱۴۶-۱۴۵ [2] ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ
[3] نافع السالکین - ص ۷ [4] نافع السالکین - ص ۷ [5] نافع السالکین - ص ۱۴

وہ حاکم کو برا کہنے اور غیر ضروری طور پر بدامنی اور ہنگامہ آرائی کے بجائے درستیٔ اعمال کا مشورہ دیتے تھے کہ اسی میں فتح و کامرانی کا راز تھا۔ فرماتے ہیں۔

"سالک را باید کہ درحق حاکم وقت دعائے بد نہ کند، خواہ مسلمان باشد خواہ مشرک خواہ ظالم باشد خواہ عادل، بلکہ برائے او دعا کند تا در حکم آں سستی نباشد زیراکہ در سستیٔ حکم نقصان خلق اللہ است و در قوت آں عین مصلحت[1]	سالک کو چاہیے کہ حاکم وقت کے حق میں بددعا نہ کرے خواہ وہ مسلمان ہو یا مشرک ظالم ہو یا عادل۔ اس کے لیے دعا کرے تاکہ اس کے حکم میں سستی نہ ہو۔ اس لیے کہ سستی میں خلق اللہ کا نقصان ہوتا ہے اور قوت میں عین مصلحت ہے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت دعا فرمائیے کہ مسلمان کی حکومت ہو، ہم کفار کی حکومت سے تنگ آگئے ہیں۔ جواب میں ارشاد فرمایا۔

" حاکم حق تعالیٰ است ....

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ"[2]

شاہ صاحبؒ کی مستقل رائے یہ تھی کہ حکومت سے پہلے درستیٔ اعمال ازبس ضروری ہے فرماتے ہیں۔

"ہر بلا و مصیبت کہ بر مرداں منزل شود از جہت صدور اعمال ناشائستہ باشد۔ چنانچہ در حدیث شریف وارد است اعمالکم عمالکم یعنی کردارہائے شما حاکمان شما اند۔ اگر اعمال شما نیک باشند	ہر بلا اور مصیبت جو انسانوں پر نازل ہوتی ہے ان کے اعمالِ ناشائستہ کا نتیجہ ہوتی ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ اعمالکم عمالکم یعنی تمہارے کردار تمہارے حاکم ہیں اگر تمہارے اعمال نیک ہوں گے تو

ا۔ ۲۔ ۳۔ نافع السالکین۔ ص ۲۳ - ۳۲ - ۴۰

پس حاکم شما اہل اسلام وعادل باشند، واگر بالعکس باشند پس حاکم شما نیز کافر وجابر باشند"	تمہارے حاکم بھی اہل اسلام میں سے اور عادل ہوں گے اگر اس کے برعکس ہوں گے تو حاکم بھی کافر اور جابر ہوں گے۔

غیر مسلموں سے تعلقات

حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ نہایت وسیع المشرب وسیع الخیال اور وسیع النظر بزرگ تھے چشتیہ سلسلہ کے دیگر اکابر کی طرح ان کا عقیدہ بھی یہ تھا کہ ہندوؤں سے شگفتہ تعلقات رکھے جائیں۔ وہ اپنے مریدوں کو ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ کہ اپنے مذہب، اپنے تمدن، اپنی شریعت پر قائم رہو لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذاہب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اپنے تعلقات میں کبھی بدمزگی پیدا نہ ہونے دو۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ـــــ

"سالک را باید کہ ہیچ کس رنج ندہد بلکہ ہمہ مخلوق صلح کند" [۱]	سالک کو چاہیئے کہ کسی کو رنج نہ پہنچائے بلکہ ساری مخلوق سے صلح رکھے۔

شاہ صاحبؒ ہمیشہ محبت، امن اور صلح کا درس دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے سلسلہ کے بزرگوں کی ہدایت ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں صلح رکھی جائے جامع ملفوظات نے لکھا ہے ـــــ

"حضرت قبلہ من قدس سرہ فرمودند کہ در طریق ماہست کہ با مسلمان وہنود صلح باید داشت، وایں بیت شاہد آورند ؎	حضرت قبلہ من قدس سرہ نے فرمایا کہ ہمارے طریقہ میں ہے ہندو اور مسلمان سے صلح رکھی جائے اور اس بیت کو شہادت کے طور پر پیش کرتے تھے۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص وعام
با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام" [۲]

---

[۱] نافع السالکین، ص ۱۵۵ [۲] نافع السالکین۔ ص ۱۷۶

یہ واضح رہے کہ شاہ صاحبؒ کا یہ برتاؤ اور یہ سلوک صرف غیر مسلموں کے ساتھ تھا۔ بد مذہبوں کے معاملہ میں وہ نہایت سخت گیر تھے۔ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو ہمیشہ بدمذہبوں سے بچنے کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

سالک را باید کہ از صحبت بدمذہبان خود را دور دارد، اگرچہ در صحبت ایشاں نعیم دنیاوی موجود شود ہرگز اختیار نکند، بلکہ بہ گرسنگی و برہنگی گذران بہتر است[۵۱]	سالک کو چاہیئے کہ بدمذہبوں کی صحبت سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ چاہے ان کی صحبت میں دنیاوی فوائد ہی موجود ہوں ہرگز ان سے میل جول نہ رکھے۔ بلکہ بھوکا اور ننگا رہنا ان کی صحبت سے بہتر ہے

وہ بدمذہبوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے مطالعہ کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ حضرت مخدوم بہاءالدین زکریا ملتانیؒ نے تو اپنے بیٹے کو ایک ایسی کتاب بھی نہ پڑھنے دی تھی جس کا مصنف ایک معتزلی تھا[۵۲]

عیسائی اور شاہ صاحب

حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کے زمانہ میں برطانوی اقتدار نہایت سرعت کے ساتھ قائم ہو رہا تھا۔ مختلف مقامات پر عیسائی مبلغ اپنے مذہب کی تبلیغ و تلقین کرتے پھر رہے تھے۔ بعض لوگوں کو وہ ملازمتوں کا لالچ دیتے تھے۔ بعض کو خاموش تبلیغ کے ذریعہ اپنا ہم خیال بنا لیتے تھے ایک طرف یہ کوششیں جاری تھیں کہ دوسری طرف لارڈ میکالے نے اس طریقۂ تعلیم کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ جس کے ذریعہ مغربی اثرات کا پھیلنا یقینی امر تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس جب عیسائی مشنریوں کے ہنگاموں کی خبریں پہنچتی تھیں تو ان کو سخت تکلیف ہوتی تھی اور وہ اپنی بساط اور اپنے مقدور کے مطابق مسلمانوں کو ان

---

۵۱ نافع السالکین ۔ ص ۱۶ ۵۲ نافع السالکین ۔ ص ۱۹۲، ۵۳ ایضاً

مغربی اثرات سے بچانے کی جدوجہد فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مولوی محمد حیات صاحب[۱] دہلوی نے عرض کیا کہ ——

"بسیار مسلماناں را فرنگیاں از دین	بہت سے مسلمانوں کو فرنگیوں نے دین
محمدی گمراہ نمودہ از ایمان خارج کردہ	محمدی سے گمراہ کر دیا ہے اور ایمان سے
اند کہ ایشاں دین مسیحا از جہت	خارج کر دیا ہے اور انھوں نے دین مسیحی
صحبت اختیار کردہ اند" [۲]	صحبت کی غرض سے اختیار کر لیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کو یہ خبر سن کر صدمہ ہوا اور فرمایا کہ ایسی نوکری سے جس میں ایمان کا خطرہ ہو بھوکا مرجانا بہتر ہے۔ جب ملتان پر انگریزوں کا قبضہ ہوا اور شاہ صاحبؒ کو معلوم ہوا کہ انھوں نے وہاں کے مقابر کی بے حرمتی کی ہے تو سخت پریشانی میں یہ شعر پڑھا ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں برد[۳]

ایک مرتبہ ایک شخص سے فرمانے لگے۔

"فرنگیاں را تیر نمی زنی" [۴]

اس نے عرض کی "قدرت نہیں رکھتا" "آپ مدد فرمائیے"۔ آپ نے شعر پڑھا اور خاموش ہو گئے ؎

کماں نرم باید کماندار چست
بوقتِ کشیدن در آید درست[۵]

---

[۱] مولوی محمد حیات صاحب دہلویؒ بڑے جید عالم تھے وہ دہلی سے شاہ صاحب کی صحبت کا فیض حاصل کرنے کے لئے تونسہ شریف گئے تھے ان کے مختصر حال کیلئے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی" (زبان جولائی ۱۹۷۲ء)

[۲] نافع السالکین ص ۱۱، [۳] نافع السالکین ص ۱۰۲، [۴] نافع السالکین ص ۱۰۲، [۵] نافع السالکین ص ۵

سرکاری ملازمت اور شاہ صاحب

متقدمین صوفیہ سلسلہ چشت اپنے خلفا اور مریدین کو شغل[1] سے اجتناب کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سرکاری ملازم ہونے کے بعد انسان میں دینی کام انجام دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ شغل کو روحانی ترقی میں ایک رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ ایک شخص نے اطلاع دی مولوی علی الدین بہاولپوری احمد پور کے قاضی ہو گئے ہیں۔ فرمانے لگے۔

"مولوی مذکور پیشیں ازیں خوش بود	مولوی مذکور اس سے پہلے خوش تھے۔ اب
اکنوں در بلا افتاد کہ معاملہ قضا اختیار	بلا میں گرفتار ہو گئے کہ قضا کا جھگڑا اپنے
کردہ کہ معاملہ قضا نزد پیران ما ممنوع	ذمہ لے لیا۔ قضا کا معاملہ ہمارے پیروں
است کہ بسیار مریدانرا ازیں معاملہ	کے نزدیک ممنوع ہے اور انھوں نے
منع کردہ اند" [2]	بہت سے مریدوں کو اس سے منع کیا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے حضرت شیخ نظام الدین اولیا کا واقعہ سنایا کہ ابتدائی زمانہ میں انھوں نے قاضی ہونا چاہا تھا لیکن شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے منع کر دیا تھا[3]

ایک مرتبہ آپ کے ایک مرید مولوی علی محمد جراح نے عرض کیا کہ غریب نواز! مجھے ڈیرہ غازی خاں کی قضا مل رہی ہے لیکن میں بہت ڈرتا ہوں۔" فرمایا۔ مرا بدی لا تخف اللّٰہ ادبی۔ اور خاموش ہو گئے۔[4]

شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کی نوکری کرنی چاہیے۔[5] سرکاری معاملہ سے دور رہنا بہتر ہے۔ اس میں پڑ کر فرشتہ بھی شیطان ہو جاتا ہے۔

---

[1] شغل سے مراد سرکاری ملازمت تھی [2] نافع السالکین۔ ص ۵ [3] نافع السالکین۔ ص ۱۰۳

[4] نافع السالکین۔ ص ۸۳ [5] نافع السالکین۔ ص ۸۳

"اگر فرشتہ باشد چوں در معاملۂ سرکار افتد دیو شود"[۵۱]

ملفوظات میں متعدد جگہ انھوں نے اپنے اعلیٰ مریدوں کو سرکاری ملازمت سے منع کیا ہے اس ضمن میں ایک جگہ تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں۔

"نوکری و ملازمت نمودن بہ اہل دنیا بد است، و داخل
شدن در معاملۂ اہل دنیا ازاں بدتر، کسیکہ حاکم شود از
جانب اہل دنیا بر مخلوقات چوں بر مخلوقات حکم کند
و پاس خاطر اہل دنیا نماید و رعایت امر اللہ و رسول
خدا صلی اللہ علیہ وسلم فراموش کردہ بر خلق اللہ ظلم و تعدی
کند و حال خلق اللہ را بہ ظلم و جبر بگیرد" [۵۲]

امراء سے بے تعلقی حضرت شاہ محمد سلیمان صاحب قدس سرہ امراء اور دنیا دار لوگوں سے بہت اجتناب فرماتے تھے۔ ایسے لوگوں کے پاس آنا جانا روحانی ترقی میں ایک رکاوٹ تصور فرماتے تھے۔ مریدوں کو بھی ہدایت تھی کہ ایسے لوگوں سے بچا جائے۔ ان کی صحبت سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

(۱) "سالک را باید کہ از صحبتِ اہل دنیا
دور باشد" [۵۳]

(۲) "قرب ایشاں ہلاکت جان است
.. قرب سلطاں آتش سوزاں بود" [۵۴]

(۳) "صحبت الاغنیاء ممیت القلب ولو کانت ساعۃ" [۵۵]

---

۵۱ نافع السالکین ۔ ص ۶ — ۵۲ نافع السالکین ۔ ص ۸۳

۵۳ " " ۔ ص ۲۸ — ۵۴ " " ۔ ص ۱۰۶ | ۵۵ الیفاً۔

شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اہلِ دنیا "سفید چشم" اور "بے وفا" ہوتے ہیں[1]۔
جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ درِ فقیر کی تلاش میں پھرتے ہیں اور آہ و زاری کرتے ہیں، لیکن ویسے بلا مطلب وہ کبھی فقرا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے[2]

امرا سے علیحدہ رہنے کے سلسلہ میں وہ ایک بہت دل چسپ حکایت سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ سعدیؒ حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ سے ملاقات کے لئے گئے شیخ عطارؒ نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا۔

"تو با تونگراں دوستی داری با تو ملاقات نکنم" — تو امیروں سے دوستی رکھتا ہے۔ میں تجھ سے نہیں ملتا۔

شیخ سعدیؒ کو سخت صدمہ ہوا۔ ۶ ماہ تک وہاں رہے۔ پھر حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے ان کو بلایا اور "آستین خود را دراز کرد تا حضرت سعدیؒ بر آں بوسہ داد و رفت"[3]
شاہ صاحبؒ نے جاگیر کے معاملہ میں بھی اپنے بزرگوں کے مسلک پر عمل کیا۔ ایک مرتبہ عبدالجبار خاں نواب ڈیرہ غازی خاں نے درویشوں کے خرچ کے لئے جاگیر پیش کی جواب میں فرمایا۔

"ما ایں جاگیر نہ گیریم کہ خلاف سنت پیران
و شیخان ما ہرگز نہ خواہیم بود کہ ایشاں قبول
نہ کردہ اند"[4]

کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ صاحبزادہ گل محمد کے لئے جاگیر قبول فرمالیجئے۔ جواب دیا۔
گل محمد را نیز حاجت جاگیر نیست اگر نعلین

---

[1] نافع السالکین۔ ص ۸۲ [2] نافع السالکین۔ ص ۸۲
[3] نافع السالکین۔ ص ۸ [4] " " ۔ ص ۱۶۱

درویشان راست کنند، برائے خدمت او
معتبران خدمت گار شوند"[۱]

شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا مہمان ہو کر زندگی بسر کرنی چاہیئے تاکہ دینی کام پوری ذہنی مرکزیت کے ساتھ انجام پاسکیں۔

نواب بہاول خاں اول اور شاہ صاحب

نواب بہاول خاں اول، خواجہ مہاروی کا مرید اور معتقد تھا۔ خواجہ محمد سلیمان صاحبؒ سے بھی اس کو بڑی عقیدت تھی۔ خواجہ صاحب کا یہ مسلک تھا کہ امراء ورؤسا سے علیحدہ رہتے تھے لیکن اگر کبھی ملنا پڑ جاتا تو نہایت خودداری اور استغنا سے ملتے تھے۔ اگر کوئی بات خلاف قاعدہ دیکھتے تو سختی کے ساتھ زجر و تنبیہ فرماتے اور اپنی ناراضگی کا اظہار صاف طور پر کر دیتے۔

خواجہ مہارویؒ کے وصال کے بعد نواب بہاول خاں نے صاحبزادگانِ مہار اور متعلقین کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ خواجہ مہارویؒ کے عرس کے موقع پر شاہ محمد سلیمان صاحبؒ وہاں تشریف لے گئے تو قاضی عاقل محمد صاحب اور حافظ محمد جمال صاحبؒ نے اس کا ذکر کیا اور تمام واقعات شاہ صاحب کو بتا کر نواب صاحب کے پاس جا کر سفارش کرنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا "دیکھئے صاحبان! ہم تو پہاڑی آدمی ہیں۔ منت اور خوشامد کرنی تو ہم جانتے ہی نہیں سب مجھے نواب صاحب کے پاس جانے سے گریز نہیں ہے۔ کیونکہ اپنے مرشدزادوں کا کام ہے۔ مگر طریقہ لجاجت کی امید نہ رکھئے۔

ٹھلہ الاونٹر اینن ٹھلہ کہا ونٹر

یعنی موٹا کھانا، موٹا پہننا اور سخت کلام کرنا ہمارا کام ہے۔ جانے کو تو میں جاتا ہوں مگر پھر مجھ سے یہ شکایت نہ کرنا کہ کام خراب کر آیا یا مٹی دا گھبکاریا کھلیں واچٹکار۔ ادہر یا ادھر[۲] غرض خواجہ صاحب

---

۱ نافع السالکین۔ ص ۱۶۱   ۲ نافع السالکین۔ ص ۷۶، ۷۸، خاتم سلیمانی۔ ص ۷۸-۷۷

مرشد زادوں کے احترام کے باعث منع نہ کرسکے اور نواب صاحب کے پاس پہنچے۔ نواب نہایت عجز و انکسار سے ملا۔ خواجہ صاحب نے اس کو انتہائی غصہ میں ڈانٹا اور کامیاب واپس ہوئے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ نواب محمد صادق خاں پسر بہاول خاں نے خواجہ مہاروی کے صاحبزادوں سے کچھ جرمانہ وصول کیا۔ شاہ محمد سلیمانؒ کو اس کا علم ہوا تو سخت ناگواری ہوئی۔ نواب صادق خاں سے خط و کتابت کا سلسلہ بند کر دیا۔ نواب نے عذر و تقصیر کے لیے سید غلام شاہ اور دیگر اشخاص کو خدمتِ عالی میں بھیجا۔ اتفاق سے ان دنوں صاحبزادہ نور احمد صاحب بھی احمد پور مقیم تھے۔ نواب نے ان سے بھی شاہ صاحب کی خدمت میں جانے کی درخواست کی۔ صاحبزادہ نور احمد صاحب مع سید غلام شاہ وغیرہ، خواجہ تونسویؒ کی خدمت میں پہونچے اور ان سے ہمراہ چلنے کی درخواست کی۔ خواجہ صاحبؒ نے اول تو ٹالا۔ لیکن جب صاحبزادے صاحب نے اصرار کیا تو فرمانے لگے "صاحبزادے صاحب آپ کو اس کام کے لیے یہاں تشریف لانا ہرگز ہرگز مناسب نہ تھا۔ آپ کی خاطر تو میں نواب صاحب سے ناراض ہوا تھا ..... اب آپ ہی خود تشریف لائے ہیں" صاحبزادہ صاحب نے جواب دیا "قبلہ! کیا کریں۔ مجبوراً و لاچار ہو کر آئے ہیں ہماری گذران اس ملک میں ہے"۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "نہیں۔ نہیں۔ وہ تمہارے ملک میں ہے اور اس کی گذران تمہارے ملک میں ہے۔ خداوند کریم کا بھی لحاظ چاہیئے۔ آپ کے والد صاحب قطب الاقطاب تھے۔ آپ خدا کا دروازہ چھوڑ کر اہلِ دنیا کے پاس التجا لے جاتے ہیں" مجبوراً خواجہ تونسویؒ سلطان پور تشریف لے گئے۔ نواب صاحب حاضر ہوئے تو خواجہ صاحبؒ نے نہایت سخت سست کہا اس نے نذر پیش کی۔ خواجہ صاحبؒ نے فرمایا۔ اس کو دیوار کے باہر پھینک دو کہ اس بلا کے واسطے ہم ساری رات پہرہ چوکی کیوں دیں [1]۔

---

[1] خاتم سلیمانی۔ ص ۸۳-۸۰ و نافع السالکین۔ ص ۱۵۶

بہاول خاں ثانی جب تخت نشین ہوا تو اس نے شاہ صاحبؒ کے ساتھ انتہائی عقیدت وارادت کا سلوک کیا۔ تخت نشینی کے موقع پر شاہ صاحب کی خدمت میں ۸ ہزار روپیہ نذر کے بھیجے۔ خواجہ صاحبؒ نے یہ روپے مساکین و یتامی پر تقسیم کر دیے[1] اس کے بعد آپ کے لئے ایک مسجد بنوائی[2] فارس نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے: "۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں نواب بہاول خاں والی ریاست بہاولپور نے خواجہ سلیمان صاحب کی یادگار میں ایک مسجد اور ایک روضہ تیار کرا دیا"[3] فارس نے اسی فیصلے میں لکھا ہے "بہاولپور کا ہر نواب ثانی پیر تونسہ کا مرید ہوتا ہے"[4]

ریاستیں اور شاہ صاحبؒ

پنجاب اور سرحد کی چھوٹی بڑی ریاستیں شاہ صاحبؒ سے عقیدت وارادت کو اپنے لئے باعثِ فخر و مباہات تصور کرتی تھیں۔ اکثر اوقات پگڑی باندھنے کی درخواست شاہ صاحب ہی سے کی جاتی تھی۔ جب نواب صادق محمد خاں کا انتقال ہوا اور نواب رحیم یار خاں، نواب بہاول خاں ثالث کے نام سے گدی پر بیٹھے تو شاہ صاحب، احمد پور تشریف لے گئے اور اپنے دستِ مبارک سے دستار باندھی[5]۔ جب لعل خان تنکانی حاکم سنگھڑ کا دورِ حکومت ختم ہوا تو شاہ صاحب نے نوابی کی دستار اسد خاں کے سر پہ باندھی[6]۔

جب شاہ صاحبؒ ان والیانِ ریاست کو کسی گمراہی میں مبتلا پاتے تھے تو نہایت سختی سے تنبیہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ لعل خان تنکانی حاکم سنگھڑ نے ایک بلوچ لڑکی سے جبراً نکاح کر لیا۔ مسلمانانِ سنگھڑ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ قاضی سنگھڑ اور دیگر ذمہ دار اشخاص نے شاہ صاحب سے پورا واقعہ بیان کیا۔ شاہ صاحب نے لعل خاں کے

---

[1] نافع السالکین۔ ص ۶۲ [2] نافع السالکین۔ ص ۶۸ [3] فیصلہ فارس۔ ص ۷-۶
[4] فیصلہ فارس۔ ص ۴۲ [5] خاتم سلیمانی۔ ص ۹۴ [6] خاتم سلیمانی۔ ص ۹۷

پاس کہلا بھیجا "مسلمانوں پر اس قدر ظلم نہ کرو اور کچھ خدا سے ڈرو" لعل خاں نے جواب لکھا شاہ صاحب نے وہ عریضہ پڑھ کر غصہ سے دور پھینک دیا۔[1]

لعل خاں کے بعد اس کا ایک عزیز اسد خاں حاکم ہوا۔ اس نے عدل و انصاف سے کام نہیں لیا تو شاہ صاحب نے اس کو تنبیہ کی — "اسد خاں ظلم ترک کر دے۔ تیری حکومت میں اگر کہیں فائدہ ہے تو یہ کہ اذان سننے میں آتی ہے۔ ورنہ میں دیکھتا ہوں کہ تھوڑے دنوں میں ہی اس نشانی (یعنی اذان) کو وہ (رنجیت) یا سکھوں کی فوج آنے والی ہے"[2]

ایک مرتبہ نواب عبدالصمد خاں والیِ ڈیرہ غازی خاں نے قلعہ اختیار خاں کا محاصرہ کیا۔ اہالیانِ شہر گردھی کے خالی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نواب قلعہ نے اپنے چھوٹے بھائی کو شاہ محمد سلیمانؒ کی خدمت میں بھیجا کہ امداد کی درخواست کرے۔ شاہ صاحب نواب عبدالصمد خاں کے پاس جانے کے لئے خود تیار ہوئے۔ میاں محمد صالح نے عرض کیا "قبلہ آپ کا تشریف لے جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ نواب متکبر آدمی ہے" شاہ صاحب نے جو ہر کام خالصاً للہ کیا کرتے تھے۔ فرمایا "میں بندۂ خدا ہوں نہ کہ بندۂ نفس۔ اگر وہ کہنا نہ مانے گا تو آخر میرا کیا بگڑے گا"[3]۔

یہ الفاظ شاہ صاحب کی بلند حوصلگی، عالی ہمتی، اور بے نفسی کے بہترین شاہد ہیں۔ وہ اصلاحی کام میں ذاتی عزت و افتخار کا جذبہ بالکل شامل نہ ہونے دیتے تھے۔

شاہ شجاع اور خواجہ تونسوی

جس زمانہ میں شاہ محمد سلیمان صاحب تونسہ میں رونق افروز تھے، اس وقت مشرق وسطیٰ کی سیاست بہت خطرناک صورت اختیار کر رہی تھی۔ نپولین کی جنگوں کے بعد سے روس مسلسل مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ۱۸۲۶ء میں روسیوں نے ایرانیوں کو شکست دے کر اس ملک پر بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ برطانیہ کو روس کے اس بڑھتے ہوئے اقتدار سے سخت خطرات پیدا

---

[1] خاتم سلیمانی۔ ص ۹۷ [2] خاتم سلیمانی۔ ص ۹۹ [3] خاتم سلیمانی۔ ص ۱۰۱

ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس نے افغانستان میں اپنی طاقت کا استحکام کرنا چاہا تاکہ برطانوی ہند اور روس کے درمیان ایک طاقتور ریاست مقابلہ کے لئے موجود رہے۔ لیکن افغانستان میں اس وقت اندرونی گڑبڑ ہو رہی تھی۔ دُرّانی خاندان کو دوست محمد نے کابل اور غزنی سے نکال دیا تھا۔ دُرّانی خاندان کے امیدوارِ تخت و تاج، شاہ شجاع نے بالآخر ہندوستان میں پناہ لی تھی اور انگریز شاہ شجاع کی حمایت میں تھے۔

شاہ سلیمان تونسوی کی روحانی شہرت کو سن کر شاہ شجاع ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خاتم سلیمانی میں کئی واقعات ایسے درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کو حضور خواجہ صاحب سے بڑی عقیدت اور ارادت پیدا ہو گئی تھی۔

جب شاہ شجاع دوسری بار انگریزی امداد لے کر افغانستان جا رہا تھا تو تونسہ شریف سے اس کا گذر ہوا۔ رات کو وہیں قیام کیا۔ صبح کو خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب نے اپنے مصلے پر اس کو بٹھالیا اور ساری سرگذشت سنی۔ اس کے بعد پوچھا "افغانستان کی تسخیر کا ارادہ ہے لیکن یہ بتاؤ کہ کس کی پناہ میں جا رہے ہو" فوراً جواب دیا "کہن دل خاں اور پردل خاں کی حمایت میں جا رہا ہوں"۔ اس کے بعد شاہ شجاع چلا گیا۔ شاہ صاحب اپنی مجلس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ اس کا بخت برگشتہ معلوم ہوتا ہے وہ اللہ کے بجائے کہن دل خاں اور پردل خاں پر اعتماد رکھتا ہے"۔ لیکن شاہ صاحب بڑے مردم شناس بزرگ تھے۔ اگر ایک طرف شاہ شجاع کی اس بات پر ان کو اعتراض تھا، تو دوسری طرف وہ اس کی ہمت و مردانگی کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب شاہ شجاع کے قتل کی خبر سنی تو فرمانے لگے: "شاہ شجاع بڑی ہمت والا جوان تھا۔ حصولِ مطلب کی خاطر اپنی جان تک نذر کر دی" [۵]

[۵] خاتم سلیمانی۔ ص ۹۴

امیر دوست محمد خاں اور شاہ صاحبؒ

حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کی شہرت ہندوستان اور افغانستان میں دور دور تک پھیل گئی تھی۔ جس زمانہ میں شاہ شجاع اور دوست محمد خاں میں افغانستان کی حکومت کے لئے کشمکش ہو رہی تھی اور سکھوں اور انگریزوں نے شاہ شجاع کو امداد دینی شروع کر دی تھی، اس وقت دوست محمد خاں نے شاہ صاحب سے روحانی امداد کی درخواست کی۔ اور لکھا کہ میں نے خالصاً للہ جہاد پر کمر باندھی ہے تاکہ یہ اسلامی علاقہ کفار کے صدمات اور تصرفات سے محفوظ رہے۔ دعا فرمائیے کہ خدا مجھے فتح و نصرت عطا فرمائے" شاہ صاحبؒ نے یہ خط سن کر منشی محمد واصل سے کہا کہ جواب میں یہ شعر لکھ دو ؎

ہر آں کہ استعانت بدرویش برد
اگر بر فریدوں زد پیش برد[1]

وصال

ماہ صفر ۱۲۶۷ھ کا چاند دیکھ کر خواجہ صاحبؒ نے فرمایا۔ ہمارے "سفر" کا مہینہ ہے۔ خدا خیر کرے۔" کچھ دن بعد زکام کی شکایت ہوئی اور ۷ صفر کو جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ نواب بہاولپور نے ۷۰ ہزار روپیہ کے صرفہ سے سنگ مرمر کا عالی شان روضہ تیار کرایا۔ مولوی حسین علی فتح پوری نے تاریخ وصال کہی ؎

سلیمانِ زماں رحلت چو فرمود
یکایک در جہاں ظلمت بیفزود
پئے سالِ وفاتش ہاتفِ غیب
بگفت او آفتابِ چشتیاں بود[2]
۱۲۶۷

حاجی نجم الدین صاحبؒ نے ایک نظم میں شاہ صاحبؒ کی زندگی کے کل اہم واقعات

---

[1] خاتم سلیمانی۔ ص ۹۷ [2] شجرہ خواجہ الٰہ بخش۔ ص ۲۰ خاتم سلیمانی۔ ص ۱۵۰

کی تاریخیں دی ہیں۔

دردا کہ غوث الاعظم راہی سوئے جناں شد
از ہجر او دو عالم پُرشور و پُر فغاں شد
از سالِ انتقالش ہاتف مرا بگفتہ
محبوب ذات حق بود اندر زمیں نہاں شد
سالِ ولادت آنرا از من اگر بپرسی
گرہائے دورسازی خورشید دوجہاں شد
لفظ حبیب اللہ بے ہائے عمر او داں
من کردہ ام شماری ہشتاد و چار آں شد
تاریخ بیعت او ہم رفتنش بدھلے
خورشید دوجہانی می خواں درین عیاں شد
وقتِ وصال مرشد نسبت دو دو سالہ بودہ
از نجم دین عاصی در نظم این بیاں شد[1]

اولاد | خواجہ محمد سلیمانؒ کے دو فرزند تھے۔

(۱) خواجہ گل محمد

(۲) خواجہ درویش محمد

دونوں شاہ صاحب کی حیات ہی میں وصال فرما گئے تھے۔ اس لئے شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے پوتے خواجہ اللہ بخش مسند نشین ہوئے۔

خلفاء | شاہ محمد سلیمانؒ ۲۲ سال کی عمر میں سجادہ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے تھے

---

[1] تافع السالکین۔ ص ۱۱۹ ان کی مہر کا سجع تھا ؏ سلیمان سرافراز نور محمد است

اور ۸۴ سال کی عمر تک وہ تلقین وارشاد میں مصروف رہے۔ اس مدت میں ہزاروں تشنگانِ معرفت ہندوستان اور دیگر بلادِ اسلامیہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے جہاں جوہر قابل پایا اس کی قدر کی اور خلافت سے سرفراز کیا۔ خواجہ گل محمد احمد پوری نے لکھا ہے:۔

"خلفاء ایشاں در ہندوستان وولایت

خراساں صاحبِ ارشاد اند" [۱]

مناقب حافظیہ میں لکھا ہے کہ آپ نے کم وبیش ۷۰ بزرگوں کو خرقۂ خلافت عنایت فرمایا تھا [۲]۔ بعض خلفاء کے نام یہ ہیں ــــ

(۱) مولوی محمد باراں کلاچوی
(۲) مولوی محمد علی مکھڈی
(۳) مولوی محمد علی خیر آبادی
(۴) مولانا احمد تونسوی
(۵) صاحبزادہ نور بخش نبیرۂ قبلۂ عالم
(۶) قطب الدین برادر حقیقی صاحبزادہ نور بخش
(۷) مولوی نور جہانیاں صاحب بہاول پوری
(۸) مولوی شہسوار صاحب سکنہ نواحی تھا
(۹) حاجی بختاور
(۱۰) حاجی برخوردار
(۱۱) مولوی سرفراز چشتی فریدی ڈیرہ اسمٰعیل خاں
(۱۲) میاں عبدالشکور خیر آبادی
(۱۳) سردار خاں ولایتی
(۱۴) حسن شاہ قندہاری
(۱۵) ولی اللہ خراسانی
(۱۶) ولی اللہ المشہور بہ منبر والہ
(۱۷) مولوی محمد حیات دہلوی
(۱۸) میاں حسن عسکری دہلوی
(۱۹) میر فضل علی جھجری
(۲۰) مولوی قیام الدین دہلوی
(۲۱) مولوی شرف الدین سونری
(۲۲) شیخ احمد مدنی

---

[۱] تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۳۵ [۲] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۴

(۲۳) مولوی صالح محمد تونسوی "

(۲۴) علی محمد امام

(۲۵) میاں عبداللطیف چینا پٹنی

(۲۶) صاحبزادہ غلام نصیرالدین عرف کالے صاحب

(۲۷) مولوی نور محمد ملتانی امام مسجد حمام

(۲۸) حافظ نورالدین ڈھنڈھی سکنہ نواحی مہار

(۲۹) مولوی امام الدین ڈہڈی۔ لاہور

(۳۰) نور احمد سندھی

(۳۱) غلام محمد شیرانی

(۳۲) نور عالم سکنہ مکھنہد

(۳۳) فاضل شاہ کشمیری

(۳۴) امیرالدین بن فضل شاہ کشمیری

(۳۵) سید شیر شاہ پاک پٹنی
نبیرہ مولانا بدرالدین۔

(۳۶) مستان شاہ خراسانی

(۳۷) ابوالحسن لانگھوی سکنہ سنگھڑ

(۳۸) تقی محمد لانگوی

(۳۹) مولوی قادر بخش

(۴۰) حافظ عظمت علی طیفروی نواحی مہار

(۴۱) مولوی غلام رسول طیفروی

(۴۲) فیض اللہ شاہ ہجوی

(۴۳) مولوی نظام الدین

(۴۴) حافظ گوہرا وچا

(۴۵) میاں دبل خاں پوری

(۴۶) مولوی محمد حسین چوہان

(۴۷) مولوی محمد یار جہیناوی

(۴۸) غلام محمد اوجینی

(۴۹) حافظ غلام رسول

(۵۰) مولوی نور محمد نارووالہ

(۵۱) سجل خاں سکنہ پھنڈی

(۵۲) غلام محمد ملفانی

(۵۳) غلام رسول خاں، کو افغان

(۵۴) محمد اکرم

(۵۵) مولوی شمس الدین سکنہ مساہیول

(۵۶) مولوی عبدالرحمٰن مودی

(۵۷) مولوی امام الدین مصنف نافع السالکین

(۵۸) مولوی محبوب عالم

(۵۹) میاں نظام الدین بمبئی

(۶۰) شرف دین گرہ دستانی

(۶۱) غلام محمد رسول پوری

(۶۲) غلام محمد پٹنی

(۶۳) حاجی نجم الدین مصنف مناقب المحبوبین

ان خلفاء میں حاجی نجم الدین صاحبؒ، حافظ محمد علی خیر آبادیؒ، مولوی شمس الدین سیالویؒ نے سلسلہ کی ترویج و تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کی خانقاہیں آج تک عقیدت و ارادت کا مرکز ہیں۔

حافظ سید محمد علی صاحب خیرآبادیؒ خواجہ تونسویؒ کے اولین خلفاء میں سے تھے خیرآباد میں ان کی خانقاہ علم و فضل کا مرکز اور فیوض و برکات کا منبع تھی۔ اودھ اور دکن میں چشتیہ سلسلہ کی اشاعت کا کام اسی خانقاہ میں بیٹھ کر کیا گیا تھا۔ وہ بے پناہ عزم و استقلال کے مالک تھے۔ نامساعد حالات سے بالکل متاثر نہ ہوتے تھے۔

ولادت اور نسب حافظ صاحبؒ کی ولادت باسعادت ۱۱۹۲ھ کو ہوئی تھی[1] ان کے والد ماجد مولوی شمس الدین ایک علمی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے اجداد میں ایک بزرگ حضرت شیخ سعد خیرآبادیؒ حضرت شاہ مینا لکھنوی کے خلیفہ تھے اور ان کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی۔ حافظ صاحب کا خاندان بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علم و فضل میں اس گھرانے کو ایک امتیازی رتبہ حاصل تھا۔

ایام طفلی بچپن ہی سے حافظ صاحب کی طبیعت عبادت کی طرف راغب تھی۔ رات کے آخری حصہ میں اٹھ کر وہ یادِ حق میں مشغول ہو جاتے تھے[2]۔ شریعت کی پابندی

---

[1] تذکرہ اولیائے دکن جلد اول۔ ص ۳۰۸ [2] مناقب حافظیہ۔ ص ۹۳، ۹۴

کا یہ عالم تھا کہ ایک دن وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی جگہ جا رہے تھے۔ راستہ میں بیر کے درخت ملے۔ سب لڑکوں نے ان درختوں سے پھل توڑ کر کھائے حافظ صاحب سے کھانے کے لئے کہا گیا تو فرمایا: "یہ درخت غیر کی ملک ہیں بغیر مالک کی اجازت کے کیونکر کھاؤں" [۱]

تعلیم

سب سے پہلے سید محمد علی صاحب نے قرآن پاک حفظ کیا۔ اس کے بعد خیرآباد میں مولانا عبدالوالی صاحب سے جو اپنے زمانہ کے مشہور عالم تھے شرح وقایہ تک علم حاصل کیا۔ پھر شاہ جہاں پور تشریف لے گئے اور وہاں کچھ عرصہ تک تحصیل علوم میں مشغول رہے۔ یہاں شہر کے باہر ایک مسجد میں ان کا قیام رہا۔ شاہ جہاں پور کی علمی دنیا جب ان کی تشنگی علم کو نہ بجھا سکی تو دہلی کا رخ کیا۔ کہ وہی ہندوستان میں علم و ادب احسان و سلوک کا آخری مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت شاہ ولی اللہ صاحب کے گھرانے نے علم کی وہ شمع روشن کر رکھی تھی جس کے گرد دور دور سے علمی پروانے جمع ہو رہے تھے۔ دہلی میں مشکوٰۃ کا سبق انھوں نے حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے لیا۔ [۲] پھر حرمین شریفین میں صحیح بخاری کی سماعت فرمائی۔ جب شاہ سلیمان تونسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو صحیح مسلم کی سماعت [۳] کی دہلی میں شاہ عبدالقادرؒ کی خدمت میں فصوص الحکم کا کچھ حصہ پڑھا [۴]

مجاہدات

حافظ صاحبؒ نے ابتدائی زمانہ میں سخت مجاہدات کئے تھے۔ سب سے پہلے وہ حضرت سید محمد مشتاق عرف چھیدا میاںؒ [۵] کے مزار پر چلہ کش ہوئے۔ پھر حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار متبرکہ پر ریاضات شاقہ میں مشغول ہو گئے۔ نمازیوں کے لئے پانی بھر بھر کر لاتے۔ باقی وقت میں عبادت کرتے۔ اسی طرح کافی عرصہ گذر گیا۔ پھر حضرت قطب صاحبؒ کے مزار پر دہلی میں حاضر ہوئے اور حسب معمول مجاہدوں میں مشغول ہو گئے

۱؎ ۲؎ ۳؎ ۴؎ مناقب حافظیہ۔ ص ۹۳، ۹۴

۵؎ مناقب حافظیہ۔ ص ۹۶

چند مکانوں میں اجرت پر پانی بھر کر اپنی گذر اوقات کرتے تھے اور اکثر روزہ رکھتے تمام رات قرآن پاک کی تلاوت میں گزرتا تھا۔ دہلی سے وہ اجمیر شریف پہونچے اور وہاں بارہ سال تک ایک مسجد میں مقیم رہے۔[1] یہاں سے پاک پٹن کا ارادہ کر دیا۔ پاک پٹن میں خواجہ محمد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و بزرگی کی شہرت سن کر دل اس طرف متوجہ ہوگیا۔ یہاں ان کو عقیدت و ارادت کا ایسا مرکز مل گیا جس نے ان کے مجاہدوں اور ریاضتوں کو صحیح راستے پر لگا دیا۔ شاہ محمد سلیمانؒ کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ فطرت کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتیں ابھر آئیں اور ان کو چمکنے کا موقع مل گیا۔

بیعت

حافظ صاحبؒ انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ پاک پٹن سے تونسہ روانہ ہوئے شاہ محمد سلیمانؒ کی خدمت میں پہونچ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی خواہش کا بھی اظہار نہ کر سکے۔ اسی طرح ایک سال گذر گیا۔ ایک دن حافظ صاحبؒ کے دل میں خیال آیا کہ افسوس حضرت شاہ صاحبؒ میرے حال کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔ شاہ صاحب کو معلوم ہوا تو فرمایا "جس شخص سے مجھے تعلق ہوتا ہے بظاہر میں اس کی طرف توجہ نہیں کرتا ہوں"۔ یہ سن کر حافظ صاحب کے بے چین قلب کو اطمینان ہوا۔ شاہ صاحب نے پہاڑ پر پاؤں رسی میں باندھ کر عبادت کرنے کی ہدایت کی۔ عرصہ تک حافظ صاحب اس طرح کے مجاہدے کرتے رہے۔ اس کے بعد شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے اپنے سلسلہ میں داخل کر لیا اور خلافت سے سرفراز فرمایا۔ حافظ صاحب نے کچھ عرصہ تک کسی شخص کو مرید نہیں کیا شیخ کو علم ہوا تو وجہ پوچھی۔ عرض کیا "اہل ہند نہایت درجہ معاصی میں مبتلا ہیں۔ اسی وجہ سے سلسلہ میں داخل نہیں کیا"۔ شاہ صاحب نے فرمایا "تم کو اس سے کیا کام۔ میں نے اجازت دی ہے۔ نیک خواہ بد جو کچھ ہوں گے مجھ سے ہوں گے"۔[2] شیخ کا یہ حکم سننے کے بعد

---

[1] مناقب حافظیہ ص ٩٠ [2] مناقب حافظیہ ص ٩٩

حافظ صاحب نے بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اودھ، پنجاب اور حیدر آباد کے ہزاروں باشندوں نے ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ پھر حافظ صاحب حرمین شریفین تشریف لے گئے وہاں دس سال تک مقیم رہے اور کچھ لوگوں کو مرید بھی کیا۔[۱]

پیر و مرشد سے عقیدت

حافظ صاحب کو اپنے پیر و مرشد سے بڑی عقیدت تھی شیخ کے نوکروں تک کی عزت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ صاحب کا سائیس لکھنؤ میں مل گیا۔ اس کی بے حد تعظیم کی۔[۲] حافظ صاحب حب اپنے شیخ کی خدمت میں جاتے تھے تو کئی کوس پہلے سے پیادہ پا چلنے لگتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مرید نے سوار ہونے کی درخواست کی تو فرمایا ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد[۳]

شاہ صاحبؒ ان کی صحبت اور خلوص کی بے حد قدر کرتے تھے اور انتہائے تعلق میں ان کو شاہ ہوری کہتے تھے۔[۴]

بری رسموں کو دور کرنے کی کوشش

حافظ صاحبؒ کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کی سوسائٹی کا نشو ونما اسلامی اصول پر ہو۔ وہ ہمیشہ اسلامی رسم و رواج اور طرزِ زندگی پر زور دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ بری رسموں کو دور کرنے کی جد وجہد کرنا سب سے زیادہ اہم کام ہے خود ان کے متعلق مناقب کے مصنف کا بیان ہے: "ہمیشہ سنتِ نبویہ کے زندہ رکھنے اور اہل ہند کی باطل رسومات کو مٹانے کے واسطے مستعد اور آمادہ رہتے تھے"۔[۵]

---

[۱] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۰۰ [۲] مناقب حافظیہ ص ۱۱۷ [۳] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۲۱
[۴] ″ ″ ۔ ص ۱۰۶ [۵] ″ ″ ۱۰۶

حافظ صاحب کی اصلاحی کوششوں کی ابتدا خود ان کے گھر سے ہوئی۔ انھوں نے اپنے گھر میں ان تمام رسومات اور توہمات کو ختم کیا جن کو وہ غیر شرعی سمجھتے تھے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ان کو قصبہ موہان کا سفر پیش آیا۔ حاضرین نے کہا۔ کیا حضرت بی بی صاحبہ کی رسومات نہیں کریں گے؟ فرمایا "جہاں ہوں گا وہاں فاتحہ کر دوں گا۔ کیونکہ اس سے غرض ایصالِ ثواب ہے اور وہ ہر جگہ ممکن ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اسی جگہ سیوم کی فاتحہ کروں"[1]

شادی کے معاملہ میں وہ غیر ضروری رسومات کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک دن اچانک صاحبزادے حافظ جمال الدین کو دلہن کے مکان پر لے گئے۔ اور نکاح کے لئے کہا۔ دلہن کے گھر والوں نے بے سروسامانی کا عذر کیا تو فرمایا جو کچھ اللہ اور رسولؐ کا حکم ہے اس کے مطابق عمل کرنا چاہیئے"۔ چنانچہ قواعدِ شرعیہ کے مطابق نکاح ہو گیا اور کوئی غیر شرعی رسم ادا نہیں کی گئی۔

حافظ صاحب کے برادر زادے حافظ تراب علی صاحب کی شادی میں کاغذ کے پھول تیار کئے گئے تھے۔ حافظ صاحب کی نظر پڑی تو سخت رنج ہوا۔ فرمایا "یہ بزرگ زادے ہیں اور ایسے مراسمِ قبیحہ کرتے ہیں" یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے[2]۔ وہ ایسی شادیوں میں جن میں اسلامی شعار کی پابندی نہیں ہوتی تھی شرکت نہ کرتے تھے۔ ایک شخص واجد علی خاں نے شادی میں شرکت کی درخواست کی۔ فرمایا "اس زمانہ میں اس قدر مہر قرار دیا جاتا ہے کہ اس کا ادا کرنا ناممکن ہوتا ہے یہ امر ناروا ہے۔ پس ایسی تقریب نکاح میں میں شریک نہیں ہوا کرتا"[3]۔ خاں صاحب کے اس یقین دلانے پر کہ جو مہر قرار پائے گا وہ اسی وقت ادا کیا جائے گا آپ شادی میں تشریف لے گئے۔

---

[1] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۰۶

[2] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۰۷

[3] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۰۷

تقاریب میں رنڈیوں کے ناچ سے سخت نفرت تھی۔[۱]
اگر کہیں رنڈیوں کا ناچ ہوتا تو ہرگز شریک نہ ہوتے۔[۲] ایک مرتبہ حیدرآباد میں حضرت شاہ یوسف کے مزار پر حاضری کا اتفاق ہوا۔ تو دیکھا کہ وہاں طوائفوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ آپ کو اس قدر غصہ آیا کہ محفل میں پہونچ کر مشائخ کو للکارا۔

"یہ بال تمہاری داڑھی کے نہیں ہیں۔ بلکہ زنار کے
تار ہیں۔ اولیاء اللہ کے مزاروں پر ایسا فسق و فجور
ہوتا ہے اور تم دیکھتے ہو"[۳]

حافظ صاحب مشرکانہ تہواروں میں شرکت کو پسند نہ فرماتے تھے۔ کہتے تھے۔

"جس مسلمان نے رسم کفر کو رغبت دل سے مشاہدہ
کیا اس کے ایمان میں خلل پڑا"[۴]

جب کسی قوم کے قوائے عمل مضمحل ہوتے ہیں تو ان علوم اور شعبدوں میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بغیر ہاتھ پاؤں کو جنبش دئے آسائش کی زندگی کا دل کش خواب دکھلاتے ہوں۔ چنانچہ اس زمانہ میں عام لوگوں کو کیمیا بنانے کی فکر رہتی تھی۔ ہر شخص اسی دھن میں وقت گزارتا تھا۔ حافظ صاحب نے اپنے ملفوظات میں جگہ جگہ ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے۔[۵]

اخلاق

حافظ محمد علی صاحب اخلاق محمدی کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ انسانی مساوات واخوت پر ان کا ایمان تھا۔ اپنے عمل سے اس کی تائید کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک موچی میاں اسلم کے جوتے سی رہا ہے فرمایا

---

[۱] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۵۳ [۲] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۰۸ [۳] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۳۱
[۴] " " ص ۱۷۷ [۵] " " ص ۲۸۴

اپنے ہاتھ دھوکر آ اور کھانا کھا۔ اور اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا[1]۔ جاڑے کے موسم میں ایک جولاہا ان کے پاس آکر بیٹھا۔ اس کے پاس جاڑے کا لباس نہ تھا۔ حافظ صاحب نے اس کو اپنے بستر میں اپنے پاس سلایا[2]۔

حافظ صاحب جب محفل میں مدعو کیے جاتے تو کبھی ممتاز جگہ پر نہ بیٹھتے[3]۔ سفر وحضر میں خادموں کے ساتھ کام میں شریک رہتے تھے۔ بعض اوقات روٹیاں اپنے ہاتھ سے پکا لیتے تھے[4]۔ اظہارِ شیخت سے نفرت تھی۔ بلکہ اس قسم کا تواضع جس سے ترک تجرید کا اظہار ہو پسند نہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ترک کو بھی ترک کرنا چاہیے[5]۔

اتباعِ سُنّت

حافظ صاحب اتباعِ سنت پر بہت زور دیتے تھے۔ مناقب حافظیہ میں لکھا ہے:۔

"حضرت شیخ الاسلام کو چونکہ اتباع نبوی میں بہت کدوکوشش تھی، ہمیشہ سنت نبویہ کے زندہ رکھنے اور اہل ہند کی باطل رسومات کو مٹانے کے واسطے مستعد اور آمادہ رہتے تھے"[6]

ان کی مجلسوں میں مسائلِ شریعت اور سنت کے علاوہ کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔[7] اپنے مریدوں کو سنتِ نبوی پر عمل کرنے کی برابر تاکید کرتے تھے۔ ایک شخص ہر روز صبح کو آکر قدم بوسی کرتا تھا ایک روز فرمایا "آیا یہ ڈنڈوت ہے۔ کہ فجر کو اٹھ کر ہندوؤں کی طرح ایسا کرتا ہے۔ السلام علیکم کہہ کر بیٹھ جانا چاہیے"[8]۔ حافظ صاحب اپنے مریدوں کو بتایا کرتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۰۹ — [2] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۲

[3] ″ ″۔ ص ۱۱۰ — [4] ″ ″۔ ص ۱۱۲

[5] ″ ″۔ ص ۱۱۵ — [6] ″ ″۔ ص ۱۰۶

[7] ″ ″۔ ص ۱۳۶ — [8] ″ ″۔ ص ۱۴۸

کے اتباع کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی اور محبتِ الٰہی کا دعویٰ بغیر اتباعِ نبوی جھوٹا دعویٰ ہے۔[۵۱]

حافظ صاحب اپنے مریدوں کو احسان وسلوک کی صرف ان کتابوں کے مطالعہ کی ہدایت فرماتے تھے جن میں شریعت پر خاص زور دیا گیا ہو۔ عوارف المعارف ان کو بہت پسند تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں ہر مسئلہ حدیث شریف سے لکھا گیا ہے۔"[۵۲]

مریدوں کی تربیت

حافظ صاحب اپنے مریدوں کی اصلاح وتربیت میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "مرشدوں کو مریدوں کا اس طرح خیال رہتا ہے جس طرح ماں کو اپنے لڑکوں کا خیال رہتا ہے۔"[۵۳]

حافظ صاحب اظہارِ مشیخت سے ناراض ہوتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ ہر چیز کا اخفا کیا جائے ایک دن ان کے ایک مرید میر محمد علی ان لکڑیوں پر جن سے کپڑا بنا جاتا ہے۔ بیٹھے ہوئے تھے اتفاقاً حافظ صاحب کی نظر ان پر پڑ گئی۔ فرمایا۔ ایسا فعل نہیں کرنا چاہیئے جس سے لوگ یہ سمجھیں کہ یہ شخص نہایت متواضع اور منکسر ہے۔" ایک مرید نے اپنی رضائی ایک مسکین کو دیدی تو سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا اس فعل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص ایسا باخدا ہے کہ ایک رضائی اس کے پاس تھی وہ بھی خدا کی راہ میں دیدی۔[۵۴] فرمایا کرتے تھے کہ ترک کو بھی ترک کرنا چاہیئے۔ مریدوں کے بال رکھنے کو اس وجہ سے ناپسند کرتے تھے کہ اس سے اظہارِ مشیخت ہوتا ہے۔[۵۵]

حافظ صاحب اپنے مریدوں کی ظاہری وباطنی زندگی کی اصلاح میں بڑے جد وجہد کرتے تھے۔ مرید کرتے وقت یہ ہدایتیں فرماتے تھے۔

---

۵۱ مناقب حافظیہ۔ ص ۱۷۷
۵۲ مناقب حافظیہ۔ ص ۲۱۲
۵۳ " "۔ ص ۱۸۶
۵۴ " "۔ ص ۱۱۵
۵۵ " "۔ ص ۱۱۵
۵۶ " "۔ ص ۱۶۳

(۱) شریعت پر قائم رہو۔

(۲) اللہ کی محبت میں دل کو ثابت رکھو۔

(۳) جب تک تحصیلِ علم سے فارغ نہ ہو ذکر نہ کرو۔

(۴) دنیا کی محبت میں مت بیٹھو۔ اس سے محبتِ الٰہی کی لذت سلب ہوتی ہے۔ ؎

تعویذ و عملیات سے اجتناب

جب مذہبی ذہن پریشان ہوتا ہے تو عملیات میں غیر معمولی اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے قوائے عمل شل ہو جاتے ہیں اور اوہام کا تار و پود' زندگی کے سرچشموں کو خشک کر دیتا ہے۔ حافظ صاحبؒ کے زمانہ میں اسلامی سوسائٹی انحطاط پذیر تھی۔ عملیات' تعویذ اور گنڈوں میں انتہا سے زیادہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔ حافظ صاحب کو یہ چیز سخت ناپسند تھی۔ مناقب میں لکھا ہے۔

"شیخ الاسلام عملیات سے نفرت رکھتے ہیں
اور دوسروں کو بھی اس سے منع فرماتے ہیں" ؎۲

آپ نے کبھی کسی کو تعویذ نہیں دیا۔ ایک شخص بے حد مصر ہوا تو مولانا روم کا یہ شعر کاغذ پر لکھ دیا ؎

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو
ایمنے از تو مہابت ہم ز تو

مثنوی مولانا روم

حافظ صاحبؒ کو مثنوی مولانا روم پر بڑا عبور تھا۔ انھوں نے عارف روم کے معارف ربانیہ کا مطالعہ نہایت بالغ نظری سے کیا تھا اور ان کو نہایت ہی بلیغ اور دل نشین انداز میں بیان کرتے تھے۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے

"گویند مثنوی را مثل ایشاں کسے نمی خوانند" ؎۴

؎۱ مناقب حافظیہ۔ ص ۲۱۹ ؎۲ مناقب حافظیہ۔ ص ؎۳ مناقب حافظیہ۔ ص ؎۴ مناقب المحبوبین ص ۳۵۷

اشراق کی نماز کے بعد وہ مثنوی کا درس دیتے تھے[۵۱] مرتب مناقب حافظیہ کا بیان ہے

"اس کتاب شریف کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام کو کمال
تعلق محبت تھا اور اس کے معانی اور مطالب اس
زمانہ میں آں حضرت کی مانند کوئی نہیں بیان کرتا تھا"[۵۲]

حافظ صاحب اپنے اعلیٰ مریدوں کو مثنوی کے مطالعہ کی ہدایت فرمایا کرتے تھے[۵۳]

وہ مثنوی کو حقائق و معارف اسرار و رموز کا ناپیدا کنار سمندر سمجھتے تھے، اس لیے اس کی شرح لکھنے کو کبھی اچھا نہ سمجھا۔ ایک روز مجلس میں فرمانے لگے کہ مولانا جامی نے مثنوی کی شرح لکھنی شروع کی۔ اس کے دو تین اشعار کی شرح لکھنے پائے تھے۔ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ کو خواب میں دیکھا۔ کہ فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب تمہارے شرح لکھنے سے ناخوش ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اسرار کو درپردہ کہا ہے اور تم اس کو ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ یہ سنکر مولانا جامی نے شرح لکھنی بند کر دی[۵۴]

حافظ صاحب کے درسِ مثنوی میں ہندو بھی شریک ہوتے تھے[۵۵]

درس و تدریس حافظ صاحبؒ کی خانقاہ میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ مولانا رومؒ حضرت ابن عربیؒ اور مولانا جامیؒ کی تصانیف کا درس وہ خود دیتے تھے اور اس انداز میں دیتے تھے کہ بڑے بڑے عالم ان سے استفادہ کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو خود بڑے جید عالم تھے، فصوص کا درس لینے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے[۵۶]

---

۵۱ مناقب حافظیہ - ص ۱۱۵ ۵۲ مناقب حافظیہ - ص ۱۱۶
۵۳ " - ص ۲۱۴ ۵۴ " - ص ۲۱۵
۵۵ " - ص ۲۵۶ ۵۶ " - ص ۱۱۶

حافظ صاحب معاصرین کی نظر میں

حافظ صاحبؒ ان مخصوص بزرگوں میں تھے جن کی روحانی عظمت اور علمی تبحر کی تعریف کرنے پر خود ان کے معاصر علماء و مشایخ مجبور ہو گئے تھے۔ مولانا انوار الحق صاحب قدس سرہ لکھنؤ کے اکابر اولیاء میں سے تھے۔ حافظ صاحب کو وہ ہمیشہ "شبلی وقت" کہا کرتے تھے[1] ایک مرتبہ حافظ صاحب ان کی مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص نے آکر مولانا سے مصافحہ کیا۔ مولانا نے حافظ صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "ان کے ہاتھ پر بوسہ دو۔ یہ شیر حق ہیں"[2] ایک مرتبہ مولانا انوار الحق صاحب نے اپنی مجلس میں فرمایا "حافظ صاحب دولہا ہیں اور ہم سب براتی"[3]

لکھنؤ کے ایک دوسرے عظیم المرتبت بزرگ مولانا عبد الرحمن صاحب ان کے بیحد مداح تھے اور ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے — "حافظ صاحب اپنے عہد کے سلطان المشایخ ہیں"[4] حافظ صاحب جب تشریف لائے تھے تو شاہ غلام علی صاحبؒ اور شاہ عبد القادر صاحبؒ نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی تھی۔[5]

حاجی نجم الدین صاحبؒ ان کے متعلق بیوملانی میں لکھتے ہیں ؎

اور محمد علی شاہ ساکن خیر آباد
کری جوانی خرچ جن بیچ خدا کی یاد
یہ ہیں صاحب سلسلہ صدہا لوگ مرید
دن دن شہرا جگ اندر ان کا ہوا مزید[6]

---

[1] مناقب حافظیہ - ص ۱۰۲ [2] مناقب حافظیہ - ص ۱۰۲
[3] " " - ص ۱۰۳ [4] " " - ص ۱۰۳
[5] " " - ص ۱۶۷ [6] بیوملانی - ص ۵

امراء سے اجتناب

حافظ صاحب کا "صحبت الاغنیاء للفقراء سم قاتل" پر راسخ اعتقاد تھا۔ وہ کسی امیر کے پاس جانا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کی صحبت سے اجتناب کرتے تھے۔ لیکن اگر کوئی آ جاتا تو سنتِ نبوی کے مطابق اخلاق سے پیش آتے۔ حیدر آباد قیام کے زمانہ میں ایک مرتبہ محی الدولہ احمد یار خاں نے عرض کیا کہ حضور یہاں کے رئیس کو آپ سے ملنے کا بے حد شوق ہے۔ فرمایا۔ تم اور وہ دونوں جھوٹے ہو۔ اگر اس کو ملاقات کا اشتیاق ہوتا تو وہ میرے پاس کیوں نہ آتا۔ اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ میرے دروازے پر نہ بواب ہیں نہ حجاب ہیں" [1]

بہادر شاہ ظفر اور حافظ صاحب

بہادر شاہ ظفر نے چند مرتبہ حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی اور ملاقات کا شوق ظاہر کیا، لیکن حافظ صاحب نے یہی یہ فرمایا کہ ملاقات کی حاجت نہیں ہے شوق کا دل ہی میں رہنا اچھا ہے۔ بہادر شاہ نے اصرار کیا لیکن حافظ صاحب راضی نہ ہوئے بالآخر بہادر شاہ نے کالے صاحب کی وساطت سے ملنے کی کوشش کی۔ کالے صاحب وقت کے منتظر رہے۔ قطب صاحب کے عرس کے دنوں میں حافظ صاحب آستانہ شریف کی مسجد میں رونق افروز تھے کالے صاحب نے فرمایا۔ حافظ صاحب ایک ضرورت سے جاتا ہوں جب تک میں حاضر نہ ہوں آپ یہیں تشریف رکھیں۔ یہ کہہ کر بادشاہ کے پاس گئے اور اس کو لے کر آئے۔ حاضرین نے شور کیا کہ بادشاہ مسجد کی طرف آتے ہیں۔ جب یہ آواز حافظ صاحب کے کانوں میں پہونچی فوراً دیوار پھاند کر چلے گئے [2]

وہ کلمہ حق کے کہنے میں بے باک تھے اور کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قطب صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ مزار شریف کے قریب چھتوں پر قنادیل لگی ہوئی ہیں۔

---

[1] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۳۵ [2] مناقب حافظیہ۔ ص ۱۳۵

اور ان کی رسیاں مزار مبارک کی طرف ہیں۔ پوچھا کہ یہ قناتیں کس کی ہیں۔ کہا گیا کہ بادشاہ دہلی کے محلات کے واسطے ہیں۔ حافظ صاحب نے غصہ ہو کر فرمایا۔ یہ انتہائی بے ادبی ہے۔ ان رسیوں کو کاٹ دو تاکہ یہ قناتیں گر پڑیں۔[۵۱]

نواب بہاول خاں اور حافظ صاحبؒ

نواب بہاول خاں ثانی خواجہ تونسویؒ کا مرید تھا۔ حافظ صاحب سے ملاقات کی تمنا رکھتا تھا۔ مگر کبھی اس کا موقع نہ ملتا تھا۔ ایک دن شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کی خدمت میں اپنی اس تمنا کا اظہار کیا۔ شیخ نے حافظ صاحب کو طلب کیا۔ حافظ صاحب حاضر ہوئے تو سلام عرض کرنے کے بعد شیخ کے روبرو بیٹھ گئے۔ خاں موصوف کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ تھوڑی دیر کے بعد پیر و مرشد کی اجازت سے اپنے مقام پر واپس آ گئے۔[۵۲]

مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ حافظ صاحب ایک مرتبہ احمد پور تشریف لے گئے تھے نواب بہاول خاں کو جب تشریف آوری کا علم ہوا تو ملاقات کا ارادہ کیا۔ آپ کو خبر ہوئی تو فوراً تونسہ شریف کے لئے روانہ ہو گئے۔[۵۳]

انگریزوں سے تنفر

حافظ صاحب کے زمانہ میں انگریزوں کا اقتدار ہندوستان میں پوری طرح سے قائم ہو گیا تھا۔ انگریزی معاشرت کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ حافظ صاحب کو انگریزی طور طریقہ اور طرزِ معاشرت سے سخت نفرت تھی۔ اگر کوئی انگریزی وضع اختیار کرتا تھا تو طبیعت پر گراں گزرتا تھا۔ بوٹ پہن کر کوئی شخص آتا تو ناخوش ہوتے اور فرماتے "یہ نصاریٰ کی وضع ہے"[۵۴] مصنف مناقب حافظیہ کے چچا واحد علی خاں نے ایک کوٹھی بنائی اور حافظ صاحب کو برکت کے لئے مکان میں لائے۔ حافظ صاحب نے معائنہ کے بعد فرمایا کہ واحد علی خاں نے خوب مکان بنایا ہے

---

۵۱ مناقب حافظیہ ۔ ص ۱۲۸ ۵۲ مناقب حافظیہ ۔ ص ۱۳۵

۵۳ " " ۔ ص ۵۵-۵۴-۳۵ ۵۴ " " ۔ ص ۱۳۷

مگر مجھ کو پسند نہیں آیا۔ کیونکہ اس میں دروازے انگریزی وضع کے ہیں۔[۱] ایک مرتبہ ایک صاحب کے نام کے ساتھ انگریزی لفظ سن کر اس قدر ناراض ہوئے کہ اس کا خط تک نہ پڑھا۔[۲]

وحدتِ وجود وحدتِ وجود پر وہ عوام میں گفتگو کرنے کو برا سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے پوچھا کہ عوام جو وحدتِ وجود پر گفتگو کرتے ہیں اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ فرمایا "یہ الحاد و زندقہ ہے"[۳]

سماع سماع کے معاملہ میں بہت احتیاط فرمایا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ زمان[۱]، مکان[۲]، اخوان[۳] کی شرطیں جب تک پوری نہ ہوں مجلس منعقد نہیں کرنی چاہیئے قوال ہمیشہ باشرع ہونا چاہیے۔[۴]

ہندوؤں کو عقیدت ہندوؤں کو بھی حضرت حافظ صاحب سے بڑی عقیدت تھی مثنوی رومیؒ کے درس میں ہندو بھی شریک ہوتے تھے۔ حیدرآباد کے راجہ چنڈولال کو آپ سے بے حد عقیدت تھی۔[۵] اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ دہلی کا ایک کایستھ ہندو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس قدر متاثر ہوا تھا۔ کہ معہ اہل و عیال مسلمان ہو گیا۔[۶] شاہ صاحب کا اخلاق بے حد اچھا تھا۔ ہر ملنے والا ان سے مل کر خوش ہوتا تھا اور ان کی محبت کا نہ مٹنے والا نقش لے کر ان کی مجلس سے جاتا تھا۔

واجد علی شاہ اور حافظ صاحب واجد علی شاہ کے ہنگامہ ہائے ناؤ و نوش اور حکومت کے کاموں سے بے تعلقی کو دیکھ کر حافظ صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ انھوں نے متعدد بار واجد علی شاہ سے شکایت کی اور اس کے فرائض

[۱] مناقب حافظیہ ۔ ص ۱۳۷
[۲] مناقب حافظیہ ۔ ص ۱۳۷
[۳] " " ۔ ص ۱۵۵
[۴] " " ۔ ص ۱۵۷
[۵] مناقب المحبوبین ۔ ص ۲۵۷
[۶] مناقب المحبوبین ۔ ص ۲۵۸

سے آگاہ کیا۔ جب تمام نصیحتیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں تو حافظ صاحبؒ لکھنؤ تشریف لائے
اور واجد علی شاہ سے کہلا بھیجا کہ ہم جنگ کے واسطے آئے ہیں۔ اگر تجھ کو زور اور بہادری
کا دعویٰ ہو تو مقابلہ کرے" اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ تلواریں ہمراہ لاؤ۔ ہم جنگ کریں گے مصنف
مناقب حافظیہ کو بھی تلوار لانے کا حکم ہوا۔ متفکر ہو کر کئی بار فرمایا۔

"میرے دل میں آتا ہے کہ اس رئیس
سے تخت خالی کرادوں" لہ

ایک رات شاہ مینا صاحبؒ کی درگاہ میں بیٹھے تھے۔ فرمانے لگے "یہ تختہ کا تختہ
الٹے" ایک پیر مردان کے قریب بیٹھے تھے بار بار عرض کرتے تھے ایسا نہ فرمایئے آخر
مسلمان ہے۔ حافظ صاحب اور زیادہ جوش میں آجاتے اور فرماتے۔

"اگر نصاریٰ کی عمل داری ہو تو اس حکومت
سے بہتر ہے" ؎

حافظ صاحب بہ حیثیت شاعر

حضرت حافظ صاحب کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ غزلیں اور رباعیاں بہت اچھی کہتے تھے۔
مشتاق تخلص تھا۔ ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

دلم بربود جانانے کہ آنی دلستاں دارد
شکر لب خندہ نمکینی خمار میکشاں دارد
چو گل رخ نرگسیں چشمے بروئش سنبلی زلفے
لب نازک تنِ لالۂ قدِ سرو رواں دارد
کہ از تمکین نمی پرسد زحالِ زارِ من دلبر
خدایا مہرباں سازشش کہ دل سنگیں چناں دارد

لہ مناقب حافظیہ - ص ۲۶۰ ؎ ایضاً

ازیں نامہرباں شوخی چہ آسائش دہد وستم
کہ باکم التفاتی یا زمن خاطر گراں دارد
بکیشِ دلبری شاید روا دارد دل آزاری
کہ از مژگاں زند پیکاں، از ابرو کماں دارد
متاعِ صبر از دلہا کند غارت بیک لمحہ
مگر در گوشۂ چشمے چنیں ہا مرداں دارد!
بیا مشتاق زیں بگذر تو خاکپائے سلیماں شو
کہ ہر کس از جمالِ او کمالِ بیکراں دارد

وصال حافظ صاحبؒ کو آخر عمر میں فالج کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ رفتہ رفتہ مرض اس قدر بڑھ گیا کہ ہاتھ پاؤں بیکار ہوگئے۔ عبادت میں بھی جب دقت ہونے لگی تو فرمایا "جسم جاتے کا تو تھا آخر ساتھ نہ دیا"[۵۷] ماہ ذی قعدہ ۱۲۶۶ھ کو وصال فرمایا۔ کیمری میں سپرد خاک کیے گئے۔

خلفاء حضرت حافظ صاحبؒ کے تین خلیفہ صاحبِ سلسلہ اور صاحبِ ارشاد ہوئے

(۱) مرزا سردار بیگؒ

(۲) شاہ حبیب علی شاہؒ

(۳) مولانا احسن الزماںؒ

یہ تینوں بزرگ حیدرآباد میں رہے اور وہیں سلسلہ کی اشاعت اور توسیع کا کام کیا۔ مولانا احسن الزماں صاحب جید عالم اور بڑے پایہ کے محدث تھے۔ انھوں نے حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ کی مشہور کتاب فخرالحسن کی ضخیم شرح عربی زبان میں "القول المستحسن فی شرح

---

۵۷ مناقب۔ ص ۲۹۱

فخر الحسن" کے نام سے لکھی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے علوم اہل بیت کے نام سے ایک کتاب چوبیس جلدوں میں تصنیف فرمائی تھی۔ اس میں انھوں نے تمام مسائل محققہ اہل سنت کا اثبات روایات اہل بیت سے کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا بندوبست نواب محبوب علی خاں نے کیا تھا۔ لیکن صرف ایک جلد طبع ہونے پائی تھی کہ نظام کا انتقال ہو گیا اور وہ کام نامکمل رہ گیا۔[۱]

مولانا احسن الزماں صاحب کے صاحبزادے شاہ لطیف الزماں صاحب عرف بادشا میاں آج کل حیدر آباد میں سجادہ نشین ہیں۔ اور بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔

سجادہ نشین

حضرت حافظ صاحبؒ کے بعد مولانا حافظ محمد اسلم صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے۔ وہ حافظ صاحب کے حقیقی برادرزادے تھے۔ انھوں نے ۴۵ سال تک حافظ صاحبؒ کے سجادہ کو رونق بخشی۔

حافظ محمد اسلم صاحبؒ نہایت سادہ مزاج بزرگ تھے۔ آستانہ حافظ صاحب پر صفائی تک کی خدمات انجام دیتے تھے۔[۲] رؤسا اور امرا سے بے تعلق رہتے تھے۔[۳] حافظ محمد عبدالصمد صاحب مودودیؒ نے اپنے روزنامچہ میں ان کے متعلق لکھا ہے۔ عبادت و ریاضت میں وہ مشایخ متقدمین کا نمونہ ہیں۔ شریعت و طریقت کے جامع ہیں۔ ساٹھ سال کی عمر ہو چکی ہے لیکن انھوں نے نکاح نہیں کیا۔[۴]

---

[۱] مکتوبات مولانا مصباح الحسن صاحبؒ بنام مصنف [۲] احترام الاصفیاء ص ۴۰
[۳] احترام الاصفیاء ص ۴۷ [۴] روزنامچہ حافظ سید عبدالصمد صاحبؒ بحوالہ احترام الاصفیاء ص ۲۲۷

حافظ محمد اسلم صاحبؒ نے ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۲۰ھ کو وصال فرمایا۔ آپ کے بعد میاں خادم حسین صاحب برادر زادہ حافظ صاحب سجادہ نشین ہوئے۔ ان کا وصال جلد ہوگیا۔ ان کے بعد حضرت حافظ صاحب کے سجادہ پر میاں خادم حسین صاحب کے صاحبزادے میاں امتیاز حسین صاحب بیٹھے اور خواجہ محمد اسلمؒ کے سجادہ نشین میاں محمد حسین صاحب ہوئے[۵۱]۔ میاں امتیاز حسین صاحب کی وفات کے بعد میاں سید ماجد حسین صاحب سجادہ نشین ہوئے۔

حافظ محمد اسلم صاحبؒ کے خلفاء میں حافظ عبدالصمد صاحب مودودی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہ بڑے عالم تھے۔ حیوٰۃ العلماء میں لکھا ہے کہ ان کو صحیح بخاری کے کئی پارے از بریاد تھے[۵۲]۔ ۷ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ کو وصال فرمایا ان کے سجادہ نشین مولانا مصباح الحسن صاحب ہیں۔ وہ مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری اور مولانا وصی احمد صاحب محدث پانی پتی کے شاگرد ہیں۔ علم و فضل، اخلاق و مروت میں بے مثل ہیں۔

---

۵۱ مکتوب مولوی مصباح الحسن صاحب بنام مصنف

۵۲ حیوٰۃ العلماء ۔ ص ۱۰۶

شیخاواٹی

آفتاب تونسہ کی کرنیں ملک کے گوشہ گوشہ پر پڑیں۔ ہزاروں سنگ ریزے لعل ناب بن کر چمکے۔ علم وعرفان کے وہ چشمے جاری ہوئے کہ ہزاروں تشنگانِ معرفت کی سیرابی کا سامان بہم پہونچ گیا۔ پنجاب اور راجپوتانہ میں سلسلۂ نظامیہ کی متعدد خانقاہیں قائم ہوئیں۔ عقیدت وارادت کے ان مرکزوں نے مسلمانوں کی اصلاح وتربیت میں حیرت انگیز حصہ لیا۔ اور یہ خانقاہیں مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا سرچشمہ بن گئیں۔

شیخاواٹی[1] میں حاجی نجم الدین صاحبؒ کی خانقاہ علم وفضل سلوک ومعرفت کا منبع تھی۔ ہزاروں عقیدت مند وہاں جمع ہوتے تھے۔

ولادت — حضرت حاجی صاحبؒ کی ولادت ۴ رمضان ۱۲۳۴ھ کو بمقام جھونجھوں[2] ہوئی تھی۔ آپ کے والد ماجد شیخ احمد بخش صاحب حمیدیؒ بڑے مرتاض

---

[1] جغرافیائی حالات وتاریخی واقعات کے لئے ملاحظہ ہو۔ "وقائع راجپوتانہ" جلد اول ص ۶۶۰، ۸۸۴

[2] مضافات جے پور سے ہے۔ ہشتاد کروہ از دہلی سمت مغرب سی کروہ از نارنول بطرف مذکور" مناقب المحبوبین۔ ص

بزرگ تھے ۔ زہد و تقا کا دور دور شہرہ تھا ۔ شاہ ارادت اللہ صاحب نقشبندیؒ کے مرید تھے[۱] ۔ اور حضرت خواجہ حمید الدین ناگوریؒ کی اولاد پاک نہاد سے تھے اس لئے اطراف و جوانب کے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے ۔

تعلیم حضرت حاجی صاحبؒ کی بسم اللہ، سال کی عمر میں اس زمانہ کے مشہور بزرگ مولانا محمد رمضان صاحب قادری مہمی نے پڑھائی ۔ حضرت مہمی صاحب حافظ محمد علی صاحب خیر آبادی سے مستفیض تھے ۔ جس زمانہ میں حافظ صاحب مکہ معظمہ میں تھے، وہ اکثر ان کی صحبت میں حاضر رہتے تھے ۔ لکھا ہے ـــــ

"اکثر بخدمت ایشاں می آمدند وفیض
می گرفتند" [۲]

حاجی صاحب نے قرآن پاک ان ہی بزرگ سے پڑھا ۔ اس کے بعد علوم ظاہری کی طرف متوجہ ہوئے ۔ طبیعت ابتدا ہی سے ریاضت کی طرف مائل تھی علوم ظاہری کی تحصیل نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ۔ اور تصوف و احسان کا رنگ غالب آگیا

بیعت حاجی نجم الدین صاحبؒ ایک دن شیخ حبیب اللہ قادری کی کتاب ... انیس العارفین کا مطالعہ فرما رہے تھے ۔ جب اس جملہ پر نظر پڑی ۔

من لا شیخ لہٗ فشیخہٗ الشیطان

تو مرشد کی تلاش کا جذبہ پیدا ہو گیا اور یہ سمجھنے لگے کہ مرشد کامل کے بغیر سب محنت و مجاہدہ، ریاضت و طاعت بیکار و بے سود ہے ۔ اس کے بغیر منزل مقصود کا نشان نہیں مل سکتا ۔ چنانچہ مرشد کی تلاش میں دہلی کا ارادہ کیا ۔ والدین نے اجازت نہ دی ۔ تو خفیہ طور پر پیادہ پا دہلی کو روانہ ہو گئے ۔ جھنجھوں سے ابھی چند کوس

---

[۱] مناقب المحبوبین ۔ ص ۳۶۹ [۲] مناقب المحبوبین ۔ ص ۳۵۵

ہی نکلے تھے کہ آپ کے بھائی شہاب الدین صاحب نے تعاقب کیا اور واپس لے آئے اس وقت حاجی نجم الدین صاحب کی عمر ۱۷، ۱۸ سال تھی۔ خواجہ اجمیری کے عرس کے زمانہ میں ان کو پھر موقع مل گیا۔ اور تونسہ شریف کی شہرت سن کر وہاں روانہ ہو گئے۔ ۱۰ شعبان ۱۲۵۳ھ کو خواجہ تونسویؒ کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے، خواجہ صاحب عبادت میں مشغول تھے۔ شوقِ ملاقات میں آپ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور حجرہ کے اندر چلے گئے۔ خواجہ تونسویؒ کے جمالِ جہاں آرا کو دیکھ کر بے خودی سی طاری ہو گئی اور بے ساختہ زبان پر یہ دوہرہ آگیا ؎

مکھ دیکھت ہی من موہن کو میری نینں میں چھپ چھاگئی
جب دور کیا مکھ کا انچر جب جوت میں جوت سمائیگی

خواجہ صاحب نے فرمایا ــــ

"آاے مرد ہندی تو تو ہندوستانی ہے"

پھر یہ شعر پڑھا ؎

ہندو ہے بت پرست مسلمان خدا پرست
ہم بندے ہیں اسی کے جو ہے آشنا پرست

اس کے بعد حضرت خواجہ محمد سلیمانؒ نے ان کو حلقہ مریدین میں شامل کر لیا۔ حاجی صاحب ۶ ماہ تک شیخ کی خدمت میں رہے۔ اس زمانہ میں انھوں نے خواجہ تونسویؒ کے خلیفہ اعظم مولوی محمد باراں کلوچوی سے رشحات، لمعات، فصوص الحکم، فتوحات مکیہ وغیرہ کا درس لیا۔ اس کے بعد پیر کے ہمراہ مہار شریف اور پاک پٹن تشریف لے گئے، ۱۰ محرم ۱۲۵۴ھ کو پاک پٹن میں خواجہ تونسوی نے ایک بڑے مجمع کے سامنے جس میں دیوان شرف الدین صاحب اور دیگر مشایخ اور علما شامل تھے۔ حاجی صاحب کو خلافت عطا فرمائی اور شیخاواٹی میں قیام کا حکم دیا۔ خواجہ تونسویؒ کے بہت سی

ایسے مرید جو عرصے سے خدمت کر رہے تھے لیکن خلافت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے اس پر متعجب ہوئے اور کہا کہ خواجہ صاحب نے کیوں ایک نو وارد کو اس قدر جلد خلافت عطا فرما دی۔ خواجہ صاحب کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ہم نے کیا دیدیا۔ نجم الدین خود اپنی روشنی کا سامان اپنے ہمراہ لائے تھے۔ ان کے چراغ میں صفائی، تیل اور بتی سب کچھ موجود تھا۔ ہم کو تو صرف لو لگانی تھی وہ لگا دی۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

گوہر پاک بباید کہ شود قابل فیض
ورنہ ہر سنگ و کلوخے دُر و مرجاں نشود

خلافت حاصل کرنے کے بعد دوسری مرتبہ جب آپ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کشکول اور لوائح کا درس لیا۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں عشرہ کاملہ، دیوان حافظ وغیرہ کتابیں شیخ سے پڑھیں۔[۱]

شیخاواٹی قیام حاجی صاحبؒ نے اپنے پیر و مرشد خواجہ محمد سلیمانؒ کی ہدایت کے ماتحت شیخاواٹی میں قیام فرمایا۔ جس جگہ آپ نے اپنا مسکن بنایا تھا وہ بالکل غیر آباد جگہ تھی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں وہاں عقیدت مندوں کا ہجوم ہونے لگا۔ آپ نے اس "بیٹر" (جنگل) میں ایک مسجد تعمیر کرائی اور اپنے سلسلہ کا کام نہایت انہماک سے شروع کر دیا۔ خواجہ محمد سلیمانؒ نے جب ان کے اس انہماک کا حال سنا تو فرمایا ـــــ

"ہندوستان کے بہت سے آدمی ہمارے مرید
ہوئے اور بہت سے لوگ وہاں سے آئیں گے
مگر جو نفع اور درجہ حاجی نجم الدین اور سید

---

[۱] مناقب المحبوبین ۔ ص ۳۷۵

محمد علی خیرآبادی نے حاصل کیا وہ ان ہی کا حصہ تھا"۔ [1]

اتباعِ سنت و احترامِ شریعت

حاجی نجم الدین صاحبؒ شریعت کے معاملہ میں نہایت سخت گیر تھے۔ وہ خود شریعت و سنت کے اتباع میں بے حد کوشش کرتے تھے۔ مریدوں کو بھی ہدایت تھی کہ شریعت کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہیں۔ "نجم الاخرہ" اور "فضیلت النکاح" میں انھوں نے بعض اہم شرعی مسائل کی تشریح کی ہے اور مسلمانوں کو بتایا ہے کہ ان کی کامیابی کا راز صرف اتباعِ سنت نبوی میں ہے۔ حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ پیر و مرشد کو شریعت پر ثابت قدم ہونا چاہیئے۔ پیو ملانی غیر پہلانی میں لکھتے ہیں۔

شریعت پر مضبوط ہو دوجے جو درویش
عشق خدا سے رات دن رکھتا ہو دلریش
عالم عامل وہ ہووے تابع نبیؐ ضرور
کوئی سنت مستحب اندر نہ ہو قصور
پڑھے نماز جماعت سے پانچوں وقت سدا ہار
رہے خدا کی یاد میں شاغل لیل و نہار
جا کر نبی رسول سے ملے ہاتھ سے ہاتھ
عقائد بیچ درست ہو سنت اور جماعت

اظہارِ کرامت کی مذمت اس طرح کرتے ہیں ؎

پران لگا کر جو اوڑے مردود ہے جبلائے
شریعت بیچ قصور ہو وہ گمراہ کہلائے [2]

---

[1] خاتم سلیمانی
[2] پیو ملانی ۔ ص ۸

عشق حقیقی اور وحدت وجود

حاجی صاحب عشق حقیقی کے نشہ میں چور رہتے تھے حضرت موسیٰ کے گڈریے کی طرح وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دل کی دنیا میں لاتے تھے، بناتے تھے، سنوارتے تھے اور پہروں خلوت کدہ میں لطف اٹھاتے تھے۔ بعض جگہ تو وہ اس طرح تصویر کھینچتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا معشوق اسی دنیائے آب وگل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تصور تخیل اور احساس کا انتہائی اعجاز ہے۔ ایک خواب بیان کرتے ہیں——

سکھی ایک خواب مجھ کو آج آیا
گویا دونوں جہاں کا راج آیا!
کہ جانی پیو میرے مجھ پاس آئے
میرے کارن عجب کچھ بھیس لائے
ہر یک نوع کی عجب زیور طلائی
کہ جن میں لعل اور چونی جڑائی
سرغ شالو عجب برہان پور کی
لڑی موتی دہجی اصل دُر کی!
سکھی میں سیج پھولوں کی بچھائی
دوڑ کر جوڑ پی کے پاس آئی
لگے پیو پوچھنے احوال میرا
کہ کیا ہے اے سجن یہ حال تیرا
عجب لاغر ہوا ہے تن یہ تیرا
بتا کس غم نے آکر تجھ کو گھیرا

بگفتم از فراق تو چنینم
کنم قربان برت ایمان و دینم
ترے غم نے کیا یہ حال میرا
بھیا دو جگ میرے اوپر اندھیرا
بدیساں جا کے وہاں تم چت لگایا
مجھے بالکل نہ دل اپنے سے لگایا!
نہ بھیجا خط نکو قاصد سندیسا
نہ میرے حال کا کچھ تھا اندیشا
کہ اس برہن کوں میں گھر چھوڑ آیا
حوالہ کس کے میں گھر چھوڑ آیا
عجب تم سنگ دل ہو اے دلارام
نہیں کچھ رحم ہے تجھ دل میں یکدام
لگی ہنسنے کہ اے برہن ہماری
نہیں دل سے تجھے ہم نے بساری
اگرچہ ظاہرا پردیس تھا میں
ولے باطن میں تیرے دیس تھا میں
دیوانی تجھ ستی میں دور تھا کب
کہ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ نَحْنُ اَقْرَبْ
اگرچہ سات دریا پار تھے ہم
دل و جان سے تمہارے یار تھے ہم
جو توں ہر دم رکھے تھی دھیان میرا

طرف تیرے ہی تھا بس گیان میرا
ارے ہر دم ہم اس کے پاس ہیں گے
کہ جس کو یاد ہم ہر سانس ہیں گے
مگر تو گھر کو اپنے صاف کر لے
نصیحت یہ مری دل بیچ دھر لے
کہ ہم اس گھر اندر آکر بسیں ہیں
کہ جو گھر اپنا صافی رکھیں ہیں[۵۱]

وحدتِ وجود پر حاجی صاحب کا ایمان تھا۔ اپنی نظموں میں جگہ جگہ اسی پر گفتگو کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ــــ

تیرے بحرِ وحدت بیکراں کی طرح طرح کی یہ موج ہیں
سو اسی نے جوش یہ کھایا ہے یہ تو میں نہیں ہوں تو ہی ہے
بوجود ایں ہمہ گفتگو کہ تو ہی تو ہے پھر آپ کو
تو نے کیسی جائے چھپایا ہے یہ تو میں نہیں ہوں تو ہی ہے
قربان ہوں میں اے نجم الدین مرے خواجہ شاہ سلیماں پیر
مجھے جن یہ بھید بتایا ہے یہ تو میں نہیں ہوں یہ تو ہی ہے[۵۲]

جب "اسرار وحدت" کہتے کہتے حد سے گذر جاتے ہیں تو گھبرا کر بے اختیار کہتے ہیں ــ

چپ رہ بجا باورے چھپا، کھول مت بھید
دیکھ پیا کو ہر جگہ گر ہے تجھ کو دید[۵۳]

---

۵۱ ایہ ماہیہ نجم ۔ ص ۲۰ ۔ ۲۱   ۵۲ غزلیات حاجی نجم الدین صاحب (قلمی نسخہ)
۵۳ بیو ملانی ۔ ص ۱

تصانیف حاجی نجم الدین صاحبؒ نے اردو اور فارسی میں تصانیف کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ان کی اردو تصانیف تاریخ اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ راجپوتانہ میں اردو زبان کی ترویج میں حاجی صاحب کا خاص حصہ تھا۔ مولانا غلام سرور صاحب لکھتے ہیں ——

"ہمارے ملک میں اردو زبان کے سب سے پہلے مصنف اور حامی آپ ہی ہیں اردو زبان کی بزم ادب یعنی شاعری کا سہرا بارھویں صدی کے وسط سے آپ ہی کے سر اقدس پر بندھا ہوا نظر آتا ہے۔"[1]

حاجی صاحب کی اردو تصانیف یہ ہیں :-

(۱) گلزار وحدت
(۲) ماحی الغیریت (علم توحید میں)
(۳) بیو ملانی غیر بھلانی (ذکر و اشغال میں)
(۴) بارہ ماہیہ نجم (عشق و محبت الٰہی میں)
(۵) افضل الطاعت (نظم علم تجوید میں)
(۶) پریم گنج (ہندی دوہرے)
(۷) حیات العاشقین فی لقائے رب العالمین
(۸) نجم الآخرہ
(۹) فضیلت نکاح
(۱۰) بیان الاولیاء

[1] مکتوب مولانا غلام سرور صاحب بنام مصنف

(۱۱) سماع السامعین فی رد المنکرین

(۱۲) دیوان نجم اردو

(۱۳) تذکرۃ الواصلین دفتر اول

(۱۴) تذکرۃ الواصلین دفتر دوم

ان کتابوں میں شاہ صاحب نے اخلاق و تصوف کی تعلیم نہایت دل کش انداز میں دی ہے ان کتابوں کا مقصد عوام میں اسلامی تعلیم کا پھیلانا تھا۔ مولانا غلام سرور صاحب لکھتے ہیں

"یہ تصانیف اس ملک کے بے علم اور کم علم اشخاص
کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ بیش بہا جواہر جو عربی
فارسی سمندروں کی تہ میں پنہاں تھے وہ آپ نے
ریگستان کے جنگلوں میں بکھیر دئے ہیں" لـہ

عوام کو مشاہیر صوفیہ کے اقوال اس سادگی اور خوبی سے سمجھائے ہیں کہ بے اختیار حاجی صاحب کے تبحر اور فنی مہارت کی داد دینی پڑتی ہے۔ نظم میں بزرگوں کے اقوال اس طرح نقل کرتے ہیں کہ گراں نہیں معلوم ہوتے اور نفس مضمون میں حل ہو جاتے ہیں ۔۔۔ مثلاً

ے کہا نظام الدین نے جو محبوب الہ
بیچ فوائد یہ لکھا ہے گا حسن گواہ

ے یحییٰ شرف الدین نے مشکل کری آسان
ایسا لکھا کتاب میں تجھ بن کروں بیان

ے شیخ محی الدین جو تھا در جیلان
شیخ من کے واسطے ایسا لکھا

لـہ مکتوب مولانا غلام سرور صاحب بنام مصنف

۵ اور فوائد اس طرح خوب طرح سے کھول
شیخ کلیم اللہ نے لکھے پیچ کشکول !

حاجی صاحب کی فارسی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں —

(۱) شجرۃ العارفین (حالات خواجگانِ چشت و دیگر مشایخ)
(۲) شجرۃ المسلمین (تاریخ نوابان فتح پور)
(۳) شجرۃ الابرار (حضرت خواجہ ناگوری ؒ کے حالات)
(۴) مناقب الحبیب (احوالِ خواجہ اجمیری ؒ)
(۵) مناقب التارکین (حالات خواجہ صوفی حمید الدین)
(۶) مناقب المحبوبین (حالات مشایخ سلسلہ نظامیہ معہ ملفوظات خواجہ تونسوی ؒ)
(۷) تذکرۃ السلاطین (احوال بادشاہان ہند)
(۸) راحت العاشقین
(۹) مقصود العارفین
(۱۰) احسن العقائد
(۱۱) احسن القصص
(۱۲) نجم الواعظین
(۱۳) نجم الہدایت
(۱۴) مقصود العارفین فی شرح اوراد شیخ نصیر الدین
(۱۵) ہدایت نامہ
(۱۶) قبالات نجمی
(۱۷) دیوان نجم فارسی

وصال

۱۲۸۷ھ میں حسب معمول آپ اجمیر شریف عرس میں شریک ہوئے وہاں کچھ طبیعت ناساز ہوئی۔ علالت کی حالت میں جھنجون پہونچے۔ ۱۹ رمضان ۱۲۸۷ھ کو وصال فرمایا۔ جنازہ فتح پور لایا گیا اور یہاں سپرد خاک کیا گیا۔ شاہ صاحب کے فرزند سوم مولانا نور احمد نے تاریخ وصال کہی ؎

شہباز اوج وحدت فارغ شدہ زکثرت
برداشت سوئے حق سر از زانوئے تعبد
از قفس عنصری چون پرواز کرد روحش
شاداں بشاخ طوبیٰ باشوق جاگزیں شد
باصد دریغ و حسرت تاریخ گفت ہاتف
شاہنشہ ولایت نجم ھدیٰ و دین بُد

۱۲۸۷ھ

اولاد

حاجی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک شاہ ضیاء الدین صاحب جے پوری کے خلیفہ لطف خاں صاحب کی لڑکی سے، دوسری شیخ عبدالکریم صاحب کی لڑکی سے۔ پہلی بیوی سے تین لڑکے اور ۲ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

(۱) مولانا نصیر الدین شاہ
(۲) عبداللطیف شاہ
(۳) نور احمد شاہ
(۴) فضیلت النساء
(۵) لطیف النساء

شاہ صاحب کے تینوں فرزند عالم اور صاحب ارشاد تھے۔ مولانا نصیر الدین صاحب حاجی صاحب کے بعد سجادۂ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ عبداللطیف شاہ صاحب نے جودھ پور میں اپنی خانقاہ قائم کی۔ وہیں ان کا مزار ہے۔ شاہ نور احمد صاحب

فتح پور میں رہے۔ ان کی دو تصانیف مشہور ہیں۔

(۱) دیوان نور

(۲) مجموعہ رویائے صادقہ

دیوان مطبع کریمی بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ کلام میں فصاحت اور لطافت دونوں ہیں

خلفاء حاجی نجم الدین صاحب کے خلفار کی تعداد بہت کثیر تھی۔ انھوں نے راجپوتانہ کے اکثر مقامات پر اپنے خلفار کو بھیج کر خانقاہیں قائم کرائی تھیں۔ جے پور۔ جودھ پور، بیکانیر، اودے پور، اجمیر، وغیرہ میں ان کے خلفاء نے اپنے سلسلہ کا کام نہایت تندھی اور محنت سے انجام دیا۔ بعض خلفار کے نام یہ ہیں

(۱) مولانا حکیم سید محمد حسن صاحب امروہوی

(۲) مولانا قمرالدین شاہ صاحب

(۳) مولوی صدرالدین صاحب عباسی

(۴) مولانا یار محمد صاحب پشاوری مدفون جودھپور

(۵) مولوی امام الدین صاحب پنجاب

(۶) قاضی امام الدین صاحب ساکن سرسہ

(۷) حکیم سید اشرف علی صاحب کشن گڈھ

(۸) مولانا سیف الدین صاحب شہید

(۹) سید ریاض الدین صاحب

(۱۰) نواب حاجی محمد خاں۔ جودھپور

(۱۱) صاحبزادہ منیر خاں

(۱۲) خان جی الٰہی بخش سیکر

(۱۳) رسالدار بیجہ خاں جی قائم خانی بیکانیر

(۱۴) شیخ محمود

(۱۵) میاں لعل شاہ

(۱۶) شیخ لعل محمد قصاب سولنکھی فتحپوری

(۱۷) شیخ خدا بخش جاہل سفید باف فتحپور

(۱۸) شیخ سلطان شاہپور۔ میواڑ

(۱۹) شیخ خدا بخش چوڑی گر۔ ساکن شاہ پور

(۲۰) شیخ امام الدین ساکن ڈ بڈوانہ

(۲۱) شیخ محمود شاہ درویش

(۲۲) شیخ پیر بخش قصاب

(۲۳) شیخ مولا بخش سنگتراش

(۲۴) شیخ رمضان معمار

(۲۵) شیخ میران بخش معمار

(۲۶) ملا نور محمد پانی پت

مولانا حکیم سید محمد حسن صاحب امروہوی

حضرت مولانا سید محمد حسن صاحبؒ (۱۲۴۹ھ - ۱۳۲۳ھ) جید عالم اور زاہد و عابد بزرگ تھے۔ فلسفۂ مشائیہ اور علوم عقلیہ میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے، علوم نقلیہ، حدیث و تفسیر و فقہ میں مفتی صدر الدین دہلوی کے شاگرد تھے۔ علم طب حکیم امام الدین دہلوی سے حاصل کیا تھا۔ عرصہ تک گورنمنٹ کالج اجمیر میں عربی و فارسی کے پروفیسر رہے آخر زمانہ میں ملازمت کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اجمیر میں مطب کرنے لگے تھے اپنے وطن امروہہ میں وصال فرمایا۔

حکیم صاحبؒ نے کتبِ سماوی کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا۔ انجیل و زبور

پر کامل عبور تھا علم تصوف سے خاص دلچسپی تھی۔ وحدت وجود کے قائل تھے
اور حضرت امام اکبرؒ کے خیالات کی وضاحت اپنی تصانیف میں کی ہے۔
مدت العمر تصنیف و تالیف کا مشغلہ رہا۔ ان کی مہتم بالشان تصنیف تفسیر القرآن
ہے۔ جو ۱۲۹۵ھ میں مطبع میر حسن دہلوی سے "تفسیر حضرت شاہی معاملات الاسرار
فی مکاشفات الاخیار" کے نام سے فارسی زبان میں شائع ہوئی تھی پھر دوبارہ اردو زبان
میں "غایت البرہان فی تاویل القرآن" کے نام سے چھپی۔ ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں

(۱) کواکب دریہ (سید المطابع امروہہ)
(۲) معراج رسول (مطبع دبدبہ محبوبی)
(۳) اتمام حجت اسلام در شرح کتاب دانیال علیہ السلام
(پرنٹنگ کمپنی اجمیر شریف)
(۴) حقانیت اسلام (مطبع رضوی دہلی)
(۵) تلخیص التواریخ ملقب بہ مفرح دلکشا
(مطبع مطلع العلوم اخبار۔ نیر اعظم مراد آباد)
(۶) رسالہ آگہی نامہ (مطبع چراغ راجستان)
(۷) درنایاب (مطبع چراغ راجستان اجمیر)
(۸) گنجینہ اسرار انبیاء (مطبع نامی پرنٹنگ کمپنی اجمیر)
(۹) کشف الاسرار (مطبع دار العلوم میرٹھ)
(۱۰) نگینۂ حکمت در شرح فصوص الحکم حضرت شیخ اکبرؒ (نولکشور لکھنؤ)
(۱۱) آفتاب عالم تاب (مطبع عالم تاب مطبع میر حسن رضوی دہلی)

حکیم صاحبؒ نہایت منکسر المزاج اور سادہ لوح بزرگ تھے۔ مباحثہ کبھی نہ کرتے
تھے۔ مریدین میں ان کے داماد مولوی فضل احمد صاحب فریدی مرحوم بڑی خوبیوں کے

انسان تھے۔ غریب و بے کس لوگوں کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ متقدمین کی تصانیف سے گہری دلچسپی تھی۔

حکیم صاحبؒ نے دو لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑیں تھیں۔ صاحبزادوں کے نام حکیم سید عبدالملک صاحب مرحوم اور حکیم سید عبدالرب صاحب ہیں۔ حکیم سید عبدالرب صاحب نظامی قدیم روایات کے حامل اور بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔

حضرت مولانا محمد نصیرالدین صاحبؒ

مولانا محمد نصیرالدین صاحبؒ (۱۲۹۷-۱۲۵۲ھ) حاجی صاحبؒ کے خلفِ اکبر اور خلیفۂ اعظم تھے دہلی میں مرزا لعل بیگ کے مدرسہ میں درسِ نظامی کی تکمیل کی تھی۔ ۱۲۸۷ھ میں حاجی صاحبؒ کے سجادہ پر جلوہ افروز ہوئے۔ ہندو اور مسلمان سب ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ ان کا بیشتر وقت وعظ و تلقین اور درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا۔

راجہ بھوپال سنگھ نے اپنی جاگیر میں ایک چھوٹا سا قصبہ حضرت پوران کے نام پر آباد کیا تھا۔ راؤ مادھو سنگھ کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی اور ایک سو دو بیگہ زمین حضرت کی خدمت میں پیش کی تھی۔

حضرت مولانا محمد نصیرالدین صاحب نے اپنے پیر کے ملفوظات نجم الارشاد کے نام سے جمع کئے تھے۔ علاوہ ازیں ایک کتاب مجمع الفرائض بھی تصنیف فرمائی تھی ان کے خلفاء میں مندرجہ ذیل بزرگ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(۱) غلام محمد نجم الدین صاحبؒ

(۲) مولانا گل محمد صاحب مفتی فتحپور

(۳) مولانا عبداللہ شاہ صاحب پشاوری

(۴) قاضی محمد اشرف صاحب قاضی لچھمن گڑھ

(۵) محمد سعداللہ صاحب

(۶) حاجی علی محمد صاحب امام جامع مسجد مارواڑ

(۷) محمد عبداللہ ساکن لاڈلون

مولانا نصیرالدین صاحبؒ کے وصال کے بعد ان کے فرزند اکبر حاجی غلام محمد نجم الدین صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے۔ اندور، اجین، رتلام وغیرہ کے لوگ کثیر تعداد میں ان سے بیعت تھے۔ ۲۱ جمادی الآخر ۱۳۷۴ھ کو وصال فرمایا ان کے خلف اکبر جناب مولانا غلام سرور صاحب مدظلہ سجادۂ مشیخت پر بیٹھے۔ ان میں مشایخِ سلسلہ کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ بہت منکسرالمزاج، متواضع اور بااخلاق بزرگ ہیں۔

باب یازدہم

حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ

حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ خواجہ تونسویؒ کے محبوب ترین خلفا میں تھے انھوں نے چشتیہ سلسلہ کی نشر و اشاعت میں جو مسلسل اور پُر خلوص جد و جہد کی، اسی کے نتیجہ کے طور پر جلال پور اور گولڑہ کی خانقاہیں وجود میں آئیں۔

خواجہ صاحب ۱۲۱۴ھ کو سیال میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت پنجاب پر سکھوں کا تسلط تھا اور ان کا اقتدار تیزی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ ان حالات میں ان کو طرح طرح کی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ ان کے والد ماجد میاں محمد یار کو سکھوں نے گرفتار کر لیا تھا اور ان کے خاندان کو ہوش رُبا تکالیف برداشت کرنی پڑی تھیں۔

خواجہ سیالویؒ کے والد ماجد نے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی۔ ۷ سال کی عمر میں انھوں نے قرآن پاک ختم کر لیا۔ اس کے بعد اپنے ماموں میاں احمد الدین کے ساتھ موضع بیکی ڈھوک علاقہ پنڈی گھیب تشریف لے گئے اور وہاں کے مدرسہ میں چند ماہ رہ کر نام حق اور کریما پڑھا۔ پھر مکھڈ چلے گئے اور وہاں تیرہ سال رہ کر تحصیل علم کی۔

مکھڈ میں مولوی محمد علی صاحب علمی دنیا کے صدر نشین تھے ان کی شہرت دور دور

پسیلی ہوئی تھی۔ خواجہ سیالوی عقیدت مندانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے علم حاصل کرنے لگے۔ مولوی صاحب ان کے انہماک اور خلوص سے متاثر ہوئے اور ان پر خاص التفات وکرم فرمانے لگے۔ اکثر اپنے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلاتے اور علمی مسائل پر ان سے گفتگو کرتے۔ مولوی صاحب کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ خواجہ سیالوی کی وہ صلاحیتیں جو شاید ناسازگار حالات میں کملا کر رہ جاتیں، بیدار ہوگئیں اور انھوں نے علوم ظاہری میں مولوی صاحب سے وہ فیض حاصل کیا جس کا اعتراف وہ آخر عمر تک کرتے رہے۔

اسی زمانہ میں شیخ سیالوی کو کابل جانے کا موقع مل گیا۔ میاں محمد امین ایک نامور تاجر تھے۔ درویشوں سے عقیدت وارادت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ تجارت کے سلسلہ میں افغانستان جانے کا ارادہ کیا، تو برکت کے لئے مولوی علی محمد صاحب کی اجازت سے شیخ شمس الدین کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ خواجہ صاحب نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور کابل کے ایک متبحر عالم حافظ دراز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث وفقہ کا درس لیا۔ پہلے ہدایہ مکمل پڑھی۔ پھر حدیث کی سند لی۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد مکھڈ واپس آگئے اور مولوی علی محمد صاحب کی صحبت میں رہنے لگے۔

مولوی علی محمد صاحب ان دنوں حقیقت ومعرفت کی منزلیں طے کر رہے تھے باطناً درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے لیکن محبت الٰہی کے جوش سے رات دن اشکباری میں گزارتے تھے اور ایک ایسے رہبر کامل کی تلاش میں سرگرداں تھے جو ان کے مضطرب قلب کے لئے سکون کا سامان مہیا کرسکے۔ ایک دن انھوں نے خواجہ محمد سلیمان تونسوی کی ایک شخص سے تعریف سنی اور ان سے ملنے کا اشتیاق دل میں پیدا ہوگیا۔ چنانچہ مولوی صاحب خواجہ سیالوی کو اپنے ساتھ لے کر خواجہ تونسوی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت خواجہ شمس الدین اٹھارہ سال کے تھے علم حدیث وفقہ حاصل کرچکے تھے اور باطنی تعلیم کا ذوق بھی دل میں تھا۔ جب خواجہ تونسوی کی خدمت میں پہنچے تو ان

کے قدموں میں ایسی کشش محسوس کی کہ پھر وہاں سے سر نہ اٹھایا۔ خواجہ صاحبؒ نے دونوں کو مرید کر لیا۔ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد شاگرد اور استاد دونوں مکھڈ واپس آ گئے۔

مولوی علی محمد صاحب کے اولاد نہ تھی۔ خواجہ سیالویؒ کو وہ بیٹے کی طرح رکھتے تھے اور ان کی علمی ترقی کے لیے دل وجان سے کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا سارا مال ومتاع خواجہ صاحب کے سپرد کر دیا۔ اور مدرسہ میں ان کو اپنا قائم مقام بنا دیا۔ خواجہ صاحبؒ کے والدین ان کی شادی کے لئے مصر ہوئے۔ لیکن وہ مکھڈ چھوڑنے اور ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً ان کے والد صاحب نے خواجہ تونسویؒ سے امداد کی درخواست کی۔ خواجہ تونسویؒ نے مولوی صاحب کو لکھا "مولوی ابو نے اس فقیر کو کیوں اسیر کر رکھا ہے۔ اس کو باپ کے پاس بھیج دیئے۔ اور ساتھ ہی خواجہ شمس الدین کو ہدایت کی کہ وہ والدین کے پاس جائیں اور نکاح سے فراغت حاصل کریں۔

۲۴ سال کی عمر میں خواجہ شمس الدینؒ کا نکاح ان کے چچا میاں احمد یار کی دختر کے ساتھ ہو گیا۔ اس زمانہ میں خواجہ صاحب کے والد نہایت عسرت اور تنگی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اکثر فاقے ہوتے تھے اور بیشتر تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان حالات میں خواجہ شمس الدین نے وطن میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا۔ اور درس وتدریس کے کام میں مشغول ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ عبادت وریاضت کی طرف بھی توجہ تھی۔ سال میں کئی کئی بار تونسہ شریف جاتے تھے اور فیوض باطنی سے مالا مال ہو کر واپس آتے تھے۔ خواجہ سیالویؒ کو اپنے مرشد سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کے ہمراہ ۱۴ مرتبہ مہار شریف کا سفر کیا تھا اور ان کا سامان اپنے کاندھوں پر رکھ کر ان کی سواری کے آگے آگے چلتے تھے۔ تقریباً ۲۶ سال کی عمر میں خواجہ تونسویؒ نے ان کو خلافت سے نوازا اور ہدایت کی کہ بیعت کا کام بڑے اہتمام سے کرنا۔ اپنے اشتغال میں مصروف ہو کر اس کو نظر انداز نہ کر دینا۔ خواجہ صاحبؒ نے سب سے پہلے اپنے والدین اور پھر ان چار بزرگوں کو مرید کیا

(۱) میاں چھٹہ کسب دار

(۲) شیخ عبدالجلیل قریشی

(۳) عبداللہ دین دار

(۴) میاں فضل احمد قریشی

ان بزرگوں کا مختصر حال انوار شمسیہ میں درج ہے۔

شیخ شمس الدینؒ نے سیال شریف میں اپنا خانقہی نظام اعلیٰ پیمانے پر قائم کیا تھا۔ ان کے یہاں لنگر کا خاص اہتمام تھا۔ تمام زائرین اور مسافروں کو کھانا لنگر خانہ سے ملتا تھا۔ شہر کے مفلسوں اور مسکینوں کو بھی کھانا دیا جاتا تھا۔ قیام کا انتظام بہت اچھا تھا۔ چار پائی اور بستر ہر آنے والے کے لئے مہیا کئے جاتے تھے۔ جو لوگ مستقلاً خانقاہ میں رہتے تھے ان کو کپڑا بھی دیا جاتا تھا۔

شیخ سیالویؒ کا اخلاق بہت اعلیٰ تھا۔ اجنبی اور ملاقاتی سے ایک طرح ملتے تھے۔ ہر آنے والے سے خلوص اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔ ہمدردی سے ہر ایک کے دکھ درد کی داستان سنتے تھے اور مناسب حال علاج کرتے تھے۔ شریعت کے معاملہ میں بہت سخت گیر تھے اور اس سلسلہ میں مریدین پر سختی کو ضروری سمجھتے تھے۔ نماز باجماعت پڑھاتے تھے۔ سماع بالمزامیر سے اجتناب کلی کرتے تھے۔

۱۴ صفر ۱۳۰۰ھ کو شیخ سیالویؒ واصل بحق ہوئے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے تاریخ وفات کہی ؎

دریغا صد دریغا صد دریغا	کہ شمس الدین امام العارفین رفت
ہزاراں فسوس کیں مہر جہاں تاب	بہ اوج عرش از فرش زمین رفت
چو سر در جست تاریخش ز ہاتف	بگفتا شمس اوج علم دیں رفت
	۱۳۰۰ھ

خواجہ سیالویؒ کے تین فرزند تھے۔

(۱) خواجہ محمد الدینؒ

(۲) خواجہ فضل الدینؒ

(۳) خواجہ شجاع الدینؒ

وصال کے بعد خواجہ محمد الدین سجادہ پر بیٹھے۔ خواجہ اللہ بخش تونسویؒ نے خرقہ پہنایا۔ انھوں نے اپنے باپ کی روایات کو جاری رکھا۔ ان کے چار فرزند تھے۔

(۱) محمد امینؒ

(۲) محمد ضیاء الدینؒ

(۳) محمد عبداللہ

(۴) محمد سعد اللہؒ

خواجہ محمد الدین نے ۲ رجب ۱۳۲۷ھ کو وصال فرمایا۔ خواجہ محمد امین ان کی حیات ہی میں وصال فرما گئے تھے۔ اس لئے صاحبزادہ محمد ضیاء الدین صاحبؒ سجادہ پر بیٹھے

خلفاء | خواجہ شمس الدین سیالوی کے خلفاء میں مندرجہ ذیل ۳۵ بزرگ خاص طور سے قابل ذکر ہیں :-

(۱) خواجہ محمد الدینؒ

(۲) صاحبزادہ فضل الدینؒ

(۳) صاحبزادہ شجاع الدینؒ

(۴) پیر غلام حیدر شاہ صاحبؒ جلال پور

(۵) پیر مہر علی شاہ صاحبؒ گولڑہ

(۶) مولوی فضل الدین ساکن جاجہ تحصیل شاہ پور

(۷) مولوی معظم الدین ساکن مرولہ والہ تحصیل بھیرہ

(۸) مولوی محمد امین ساکن چکوڑی ضلع گجرات

(۹) شیخ عبدالجلیل ساکن تحصیل شاہ پور

(۱۰) مولوی حفیظ ماہی صاحب

(۱۱) سید محمد شاہ صاحب غزنوی ساکن کٹا واڑہ علاقہ بوبک خیل خراسان

(۱۲) سید اکرام شاہ ساکن سلہوکے علاقہ رسول نگر

(۱۳) سید نوبہار شاہ ساکن سنجر ضلع ڈیرہ غازی خان

(۱۴) سید حسن شاہ ساکن سنجر ڈیرہ غازی خان

(۱۵) سید صالح شاہ صاحب ساکن سلطان پور ضلع جھنگ

(۱۶) میاں پیر بخش قریشی ساکن خواجہ آباد۔ میاں والی

(۱۷) سید جند وڈا شاہ صاحب ساکن عیسیٰ خیل میاں والی

(۱۸) میاں علی حیدر صاحب ساکن خاص میاں والی

(۱۹) مولوی سلطان محمود صاحب ناڑیوالہ ساکن جھیہ حسیں خوشاب

(۲۰) مولوی احمد الدین صاحب صوفی ساکن کدر ضلع میاں والی

(۲۱) ملا خوشنود صاحب یوسف زئی۔ ساکن کابل

(۲۲) سید حیات شاہ صاحب نارگ، دالم

(۲۳) مولوی غلام محمد صاحب ساکن لاہتی تحصیل خوشاب

(۲۴) سید رستم علی شاہ ساکن علاقہ پچھ کشمیر

(۲۵) سید محمد سعید شاہ صاحب ساکن بہتہہ متصل شہر لاہور مصنف مرز...

(۲۶) سید مبارک شاہ چھانا آبادی علاقہ راولپنڈی

(۲۷) سید گلاب شاہ صاحب اورنگ آبادی ضلع کیمل پور

(۲۸) سید غلام شاہ ساکن ہرن پور ضلع جہلم

(۲۹) سید شاہ بخش ساکن حاجی پور ضلع ڈیرہ غازی خان

(۳۰) سید شاہ خدا بخش صاحب ساکن سنجر ضلع ڈیرہ غازی خان

(۳۱) مولوی علی محمد صاحب ساکن کوٹ کالا ضلع شاہ پور

(۳۲) مولوی شیخ محمد صاحب ساکن سلہیانہ ضلع جھنگ

(۳۳) حافظ صاحب سمکے والہ ضلع کیمل پور

(۳۴) سید فیض شاہ ساکن جہانب علاقہ جھنگ

(۳۵) میاں محمد طیب ساکن بلبل پڑی معروف بہ جالندہری

پیر سید غلام حیدر علی شاہ جلال پوری

دریائے جہلم سے پار ہونے کے بعد ایک کوہستانی سلسلہ شروع ہوتا ہے یہیں پہاڑوں کے دامن میں جلال پور واقع ہے۔ ایک طرف دریائے جہلم موجیں مار رہا ہے دوسری طرف سبزہ زار کیف افزائے نظر بنا ہوا ہے۔ تیسری طرف وادیوں کا مستحکم سلسلہ حجازی وادیوں کی یاد دلاتا ہے۔ جلال پور کے اس جنت نظیر خطہ میں خواجہ سیالوی کے ایک عزیز خلیفہ سید غلام حیدر علی شاہؒ نے ایسی عظیم الشان خانقاہ قایم کی کہ تمام فضا ئیں روح پرور نغمات سے گونج اٹھیں۔

پیر سید حیدر شاہ صاحبؒ کی ولادت باسعادت ۳ صفر ۱۲۵۴ھ مطابق ۲۷ اپریل ۱۸۳۸ء کو ہوئی تھی۔ دسویں پشت میں ان کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم جہانیاںؒ سے جا ملتا ہے۔ پیر سید حیدر شاہ صاحب کے والد ماجد سید جمعہ شاہ نہایت عابد، منکسر المزاج اور متوکل بزرگ تھے والدہ ماجدہ سجادہ بیگم موضع کھیوہ ضلع گجرات (پنجاب) کے ایک مشہور بزرگ سید غلام شاہ کی صاحبزادی تھیں۔ پیر حیدر شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت میں ان کا خاص حصہ تھا۔ وہ بڑی عبادت گزار اور صالحہ خاتون تھیں۔ گو افلاس کی زندگی بسر کرتی تھیں لیکن توکل کی دولت سے مالا مال تھیں کبھی کسی کا سوال رد نہ کرتی تھیں ماں کے زہد و تقدس نے بیٹے کے ہر ہر رگ و ریشہ کو متاثر کیا۔ شاہ صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ ہماری والدہ بابا فرید گنج شکرؒ کی والدہ کی مانند تھیں جنھوں نے ابتدا ہی

سے اپنے لختِ جگر کو نماز روزہ کا پابند بنا دیا تھا۔ وہ شاہ صاحب کو رات کے وقت سوتے سے جگا دیتی تھیں۔ ۵، ۶ سال کی عمر میں شاہ صاحب میں ارکانِ دین کی پابندی اس قدر تھی کہ جیٹھ اور اساڑھ کی گرمی میں انھوں نے روزے رکھے۔

جب شاہ صاحبؒ نے ہوش سنبھالا تو ان کو میاں خان محمد اعظم پوری کے زیرِ تعلیم کیا گیا۔ انھوں نے کلام پاک پڑھنا شروع کیا جس کی تکمیل آپ کے چچا سید امام شاہؒ نے فرمائی۔ اس کے بعد میاں عبداللہ چکڑوی سے فارسی اور اردو کی درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر جلال پور سے پانچ کوس کے فاصلہ پر بمقام نین وال تشریف لے گئے اور وہاں قاضی محمد کامل سے کتبِ فقہ کا درس لیا۔ مفتی غلام محی الدین صاحب سے جو علمی اعتبار سے گرد و نواح میں جواب نہ رکھتے تھے، استفادہ کیا اور کنز الدقائق ان سے پڑھی۔ اس سے زیادہ ظاہری علم شاہ صاحبؒ نے باقاعدہ حاصل نہیں کیا۔ لیکن طبیعت کی افتاد اور ماحول کے اثر نے ان میں وہ عالمانہ انداز پیدا کر دیا تھا جس سے بہت سے عالم بھی محروم تھے۔

خواجہ سیالویؒ کی خدمت میں انھوں نے مرقع اور کشکول کا درس لیا۔

پیر حیدر شاہ صاحبؒ کی عمر ۱۰ سال کی تھی کہ ان کے والد ماجد نے وصال فرمایا رحلت کے وقت وصیت فرمائی کہ کسی کو خالی ہاتھ نہ جانے دینا۔ بڑوں کا ادب ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھنا، چھوٹوں سے محبت سے پیش آنا اور اقربا کے ساتھ صلہ رحمی کا اصول زریں یاد رکھنا۔

شاہ صاحبؒ مرشد کی تلاش میں ہرن پور پہونچے اور وہاں سید غلام شاہ صاحبؒ سے بیعت کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے سیال شریف جانے کا مشورہ دیا۔ بلکہ ساتھ لے گئے۔ خواجہ سیالویؒ نے جب ان کو دیکھا تو کھڑے ہو گئے، مزاج پوچھا

ؔ۵۱ جلال پور سے دس کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اور بیٹھنے کا حکم دیا۔

رجب ۱۲۷۱ھ کو ان کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے۔ بیعت کے بعد آپ کا یہ دستور تھا کہ ہر سویں دن پیر کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ جب چھٹی مرتبہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے خرقۂ خلافت اور اجازتِ بیعت سے سرفراز فرمایا۔

پیر حیدر شاہ صاحب کو اپنے شیخ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کا اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کے سامنے بولنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ خط لکھا اور اس میں صرف [illegible] لکھی لیکن پاسِ ادب سے شیخ کی خدمت میں پیش نہ کر سکے ؎

میں یار عزیز مخدوم میرا　　تو ساں کو حال سب معلوم میرا

کر دھنا دم اتے انعام سائیں　　جو ہر جا فیض ترا عام سائیں

کیتا دل درد تیرے بارہ بارہ　　جو دارو درد میرے کا نظارہ

نظارہ ہے کر دے جد جیندیاں ہیں　　وگرنہ جام زہروں پیندیاں ہیں

نظر کر دیکھ چہرے زار میرے　　جو میں بیمار کیتے درد تیرے

دوا کر مہربان بیماریاں دا　　وفا کر دلبرا دلداریاں دا

میں تیرے دیکھنے کی باوری ہوں　　دکھا مکھ کھول کے باوری ہوں

مرشد ان کا اس قدر خیال کرتے تھے کہ جب وہ سیال آتے تو خود تھوڑی دور تک استقبال کے لیے جاتے تھے۔ ایک دن شیخ عبدالجلیل خادمِ شیخ کی وساطت سے عرض کیا کہ حضور میں اس قدر تعظیم و تکریم سے بہت نادم اور محجوب ہوتا ہوں اور میرے قلب پر ایک قسم کی اضطراری کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ سوئے ادبی ہے۔ خواجہ سیالویؒ نے جواب دیا۔ شاہ صاحب ہم اپنی خوشی کے خود مختار ہیں۔ آپ اس معاملہ میں خاموش رہیں۔

ایک مرتبہ پیر سید حیدر شاہ علیل ہوئے۔ پیر و مرشد کو حال معلوم ہوا تو بولے

فرار ہوگئے۔ روتے جاتے تھے اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کرتے جاتے تھے

"یا ارحم الراحمین! میری ساری عمر دی اچھا
کھٹی پوٹھی ہے۔ اسے برباد نہ کرنا"
(یعنی میری عمر بھر کی کمائی یہی ہے)

پیر حیدر شاہ صاحب کا اخلاق نہایت اعلیٰ اور وسیع تھا منکسر المزاجی تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی۔ ایک مرتبہ چند آدمیوں کے ساتھ سیال شریف کو روانہ ہوئے راستہ میں ایک جگہ پانی پینے کے لئے رکے ایک شخص جو نہائی بد شکل اور کریہ المنظر تھا پانی پی رہا تھا اس نے بچا ہوا پانی پھینکنا چاہا۔ شاہ صاحب نے ہاتھ روک کر وہ پانی خود پی لیا۔

خود پسندی ان کو چھو کر بھی نہ گذری تھی۔ فطرتاً نہایت نرم دل تھے کسی شخص سے بہت زیادہ ناراض ہوتے تو صرف اتنا فرماتے۔ "نیک بختا تو نے یہ کیا کیا" یہ کہنے کے بعد اس کو آزردہ نہ ہونے دیتے۔ اور جس طرح ہوتا اسے خوش کر دیتے۔ فرمایا کرتے تھے ؎

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

غریبوں کی دل جوئی کی طرف خاص توجہ کرتے تھے کبھی کسی کیلئے بد دعا نہ کرتے تھے۔ ایک شخص مرزا خاں بے حد مخالفت کیا کرتا تھا۔ جب اس کے فتنہ و فساد کی حد نہ رہی اور لوگوں نے اس طرف رجوع کیا تو صرف اتنا فرمایا۔ دعا کرو خداوند کریم اس پر رحم کرے اور کسی اچھے شغل میں لگا دے تاکہ اسے ہماری مخالفت کرنے کی فرصت ہی نہ ملے۔

شاہ صاحب شرع کے بہت پابند تھے۔ ان کے سوانح نگار کا بیان ہے "آپ فقہا کی طرح محتاط اور عامل بالشرع رہتے تھے" [1]

[1] ذکر حبیب۔ حصہ اول۔ ص ۱۷

ایک دن فرمانے لگے۔

"مناقب المحبوبین میں بہت سی سندوں کے ساتھ
استاذ، والدین، بادشاہ اسلام اور پیر کے لئے سجدۂ
تعظیم کرنا جائز ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن طریقۂ شریعت
کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے" ؎۵۱

شاہ صاحب نہایت حسین و جمیل انسان تھے۔ لمبا قد، خوب صورت آنکھیں شانوں پر زلفیں، کلاہ چہار ترکی سر پر، موسم سرما میں بانات کا کوٹ گرمیوں میں ململ کا کرتا، پاؤں میں جبلی طرز کا سادہ جوتا پہنے ہوئے وہ حسن مجسم معلوم ہوتے تھے۔

۷ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ کو شاہ صاحبؒ نے وصال فرمایا۔ علامہ اقبال نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

ہر کہ بر خاکِ مزارِ پیر حیدر شاہ رفت
تربتِ او را امینِ جلوہ ہائے طور گفت
ہاتف از گردوں رسید و خاک او را بوسہ داد
گفتمش سالِ وفاتِ او بگو مغفور گفت
۱۳۲۶ھ

خواجہ صاحبؒ کے چار صاحبزادے تھے۔ سید بدیع الزماں شاہ، سید مظفر علی شاہ، محمد رسول شاہ، قائم الدین شاہ۔ سید بدیع الزماں خواجہ سیالوی سے بیعت تھے ۲۱ سال کی عمر میں، ۲ شعبان ۱۲۹۵ھ کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ قائم الدین شاہ، خواجہ اللہ بخش تونسویؒ سے بیعت تھے۔ ۲۱ رجب ۱۳۱۶ھ کو ۲۱ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ رسول شاہ کا انتقال ایامِ شیر خوارگی میں ہو گیا تھا۔ وصال کے بعد سید محمد مظفر علی شاہؒ

؎۵۱ ذکر حبیب۔ ملفوظات۔ ص ۳۶۵

سجادہ نشین ہوئے۔ وہ بھی خواجہ سیالوی سے بیعت تھے۔ صرف مسندِ خلافت والد سے ملی تھی۔ ۱۹ ربیع الآخر ۱۳۳۵ھ کو انھوں نے وصال فرمایا۔ ان کے صاحبزادے ابوالبرکات مولانا سید محمد فضل شاہ صاحب آج کل صاحب سجادہ ہیں۔ بلند اخلاق پاک سیرت عالم و فاضل اور وسیع النظر بزرگ ہیں۔

اسلامی ممالک مثلاً بیروت، دمشق، اسکندریہ، مصر، بیت المقدس کی سیاحت نے نگاہ میں وسعت اور اسلامی مسائل سے واقفیت پیدا کر دی ہے۔

پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی

خواجہ سیالوی کے خلفاء میں پیر سید مہر علی شاہ صاحبؒ ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ انھوں نے موجودہ دور میں نہ صرف احیاء تصوف کی کوشش کی، بلکہ بہت سے عقائدِ باطلہ کی تردید میں بھی سرگرم رہے۔

خواجہ صاحبؒ کا سلسلۂ نسب ۲۴ ویں پشت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جا ملتا ہے۔ ان کی نانی حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی اولاد سے تھیں۔ خواجہ صاحب کے والد ماجد سید نظیر الدین شاہؒ نے اپنے بیٹے کی ابتدائی تعلیم و تربیت نہایت ہی جگر سوزی کے ساتھ کی تھی۔ خواجہ صاحب خود بہت ذہین اور باشوق تھے۔ تھوڑی ہی عمر میں علومِ ظاہری سے فارغ ہو گئے اور درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ پھر حجاز چلے گئے۔ وہاں ایک عرصہ تک رہنے کے بعد وطن واپس آئے اور اصلاح و تربیت کا ہنگامہ برپا کر دیا۔

مکہ معظمہ میں ایک دن وہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حاجی صاحبؒ نے نہایت اصرار اور تاکید سے ہندوستان واپس جانے کا مشورہ دیا۔ اور فرمایا۔

"در ہندوستان عنقریب یک فتنہ — ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ

ظہور کنند شاہ صاحب در ملک خود واپس بردید۔ واگر بالفرض شما در ہند خاموش نشستہ باشید تاہم آں فتنہ ترقی نکند و در ملک آرام ظاہر شود۔[۵۱]

نمودار ہوگا تم ضرور اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔ اگر بالفرض تم ہندوستان میں خاموش بھی بیٹھے رہو تو وہ فتنہ ترقی نہ کرے گا اور ملک میں سکون رہے گا۔

خواجہ صاحبؒ حاجی صاحبؒ کے اس کشف کو فتنہ قادیانی سے تعبیر فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ان کو اس فتنہ کی مخالفت کا حکم دیا تھا چنانچہ خواجہ صاحبؒ نے اپنی زبان اور اپنے قلم دونوں سے قادیانیوں کے عقائد باطلہ کی پر زور تردید کی۔

خواجہ صاحبؒ بڑے متبحر عالم تھے ان کے ملفوظات ان کی بلندیٔ فکر اور وسعت معلومات کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے۔

"کمالات شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مرحوم بحد غایت کمال رسیدہ اند، در علم ظاہر و باطن نظیر خود خود گذشتہ اند"[۵۲]

شیخ اکبرؒ کے نظریۂ وحدت وجود پر جو عبور ان کو حاصل تھا اس کی اس صدی میں نظیر نہیں ملتی۔ فصوص الحکم کا باقاعدہ درس دیتے تھے اور اس کے اسرار و رموز کو خوب سمجھتے تھے علامہ اقبالؒ نے ایک مرتبہ شیخ اکبرؒ کے فلسفہ کے متعلق ان کو ایک خط لکھا تھا جس میں ان سے عقیدت و ارادت کا اظہار اس طرح کیا تھا ——

---

۵۱ ملفوظات طیبہ - ص ۱۲۶ ۵۲ ملفوظات ص ۱۲۷ - ۱۲۶

۵۳ - ملفوظات - ص ۱۴۲

لاہور - ۵ر اگست ۱۹۳۳ء

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ - السلام علیکم

اگرچہ زیارت اور استفادہ کا شوق ایک مدت سے ہے - تاہم اس سے پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا - اب اس محرومی کی تلافی اس عریضہ سے کرتا ہوں گو مجھے اندیشہ ہے کہ اس خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے میں جناب کو زحمت ہوگی. بہرحال جناب کی وسعتِ اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیشِ نظر مقصد کے لئے کھٹکھٹایا جائے۔

میں نے گذشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پر ایک تقریر کی تھی جو وہاں کے اداشناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی اب پھر ادھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے نظر بایں حال چند امور دریافت طلب ہیں - جناب کے اخلاقِ کریمانہ سے بعید نہ ہوگا اگر ان سوالات کا جوابِ شافی مرحمت فرمایا جائے

(۱) اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زمان کے متعلق کیا کہا ہے اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے۔

(۲) یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں. اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں۔

(۳) حضرات صوفیہ میں اگر کسی بزرگ نے بھی حقیقتِ زمان پر بحث کی ہو تو ان بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں. مولوی سید انور شاہ مرحوم و مغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا

اس کا نام تعاد دابتہ الزمان۔ جناب کو ضرور اس کا علم ہوگا۔ میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے۔ مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اس لئے مزید روشنی کی ضرورت ہے۔

میں نے سنا ہے کہ جناب نے درس و تدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا ہے اس لئے مجھے یہ عریضہ لکھنے میں تامل تھا۔ لیکن چونکہ مقصود خدمتِ اسلام ہے مجھے یقین ہے کہ اس تصدیعہ کے لئے جناب معاف فرمائیں گے اور جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے۔ باقی التماس دعا۔

مخلص۔

محمد اقبال" [1]

غیر شرعی رسومات سے خواجہ صاحبؒ کو بڑی نفرت تھی۔ ان کے ملفوظات میں جگہ جگہ اتباعِ سنتِ نبوی کی تلقین ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے شریعتِ نبوی کے اتباع سے بڑھ کر کوئی فخر نہیں ہو سکتا۔ [2]

خواجہ صاحبؒ کو شعر و سخن سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی شعر خوب کہہ لیتے تھے۔ اُن کی ایک فارسی غزل ملاحظہ ہو ——

صبا ز طرۂ شبرنگ مہوشِ طناز — کشود نافۂ مشکیں بروئے اہلِ نیاز
کیم گدائے دژ مفلسی کوتاہ دست — کجا ایں غالیہ عطری و قصہ ہائے دراز
تو ئی کہ ذرہ صفت را با آسماں بردی — چگونہ شکر تو گوید کمینہ بندہ نواز
عرض ادائے نیاز است ورنہ حاجت جست — کمال حشمت محمود را بعجز ایاز !

---

[1] اقبال نامہ۔ جلد اول ص ۴۴۴۔۲۴۴ [2] ملفوظات۔ ص ۱۴۴

رہین ساقی چشم کہ جرعہ بچشاند زجام چہرہ ترکاں مہوشان حجاز
بہ بزم بادہ فروشاں بہ نیم جو نہ خرند متاع زاہد طماع چہ حج وصوم ونماز
مرا ز پیر مغاں رازہائے سربستہ است فغاں ز واعظ خودبیں کجا است محرم راز

اگرچہ حسن تو از مہر غیر مستغنی است
من آں نیم کہ از ایمان خویش آیم باز

بابِ دوازدہم

حضرت خواجہ اللہ بخش تونسویؒ

نصف صدی کی اصلاحی اور تبلیغی جد و جہد کے بعد جب آفتابِ تونسہ غروب ہونے لگا تو خواجہ اللہ بخش نبیرۂ شیخ نے قدموں میں سر رکھ کر عرض کیا۔

"بابو! من از تو ہیچ چیز دیگر نمی خواہم
پس ہمیں می خواہم کہ نعلین فقیران ترا
راست کنم"

یہ جملہ سن کر شیخ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی فرمایا: "ونفخت فیہ من روحی" اور جان، جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ شاہ غلام نظام الدین صاحبؒ فرزند کلاں صاحبؒ نے خواجہ اللہ بخشؒ کے سر پر دستار باندھ کر ان کو سجادۂ مشیخت پر بٹھا دیا۔ خواجہ اللہ بخش مدت العمر اپنے دادا کی طرح روحانی اصلاح و تربیت کے کام میں سرگرم رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں چشتیہ سلسلہ کی رونق ان ہی کے دم سے تھی۔ وہ علم و عمل، لطف و کرم، زہد و اتقا کا مجسمہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دل و دماغ کی بڑی خوبیوں سے نوازا تھا اور انھوں نے ان صلاحیتوں کو دمِ واپسیں تک سلسلہ کی نشر و اشاعت میں استعمال کیا۔ غلام حسین نے ان کے متعلق سچ کہا ہے ؂

روشن از مہر جمالش برج دین !!
آفتاب آسماں فخر زمیں

خواجہ اللہ بخش، ماہ ذالحجہ ۱۲۴۱ھ کو تونسہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مولوی محمد صالح نے تاریخ کہی ہے "زہے بیدار بخت" جب تعلیم حاصل کرنے کی عمر ہوئی تو خواجہ تونسوی نے مولوی محمد امین کے سپرد کر دیا۔ مولوی صاحب صاحب کمال عالم تھے۔ انھوں نے قرآن پاک کے علاوہ، فارسی نظم اور عربی صرف و نحو کی بھی تعلیم دی۔ پھر حدیث کا درس دیا۔ جب اس سے فارغ ہو گئے تو دادا نے سلوک و معرفت کی تعلیم کے لیے خود اپنے پاس بلا لیا۔

ابتدائی زمانہ میں خواجہ اللہ بخش نہایت شان و شوکت کی زندگی بسر کرتے تھے، اچھے لباس کا شوق تھا۔ اچھی اچھی گھوڑیاں سواری میں رکھتے تھے۔ جب بڑے ہوئے تو ان سب چیزوں سے منہ پھیر لیا اور نہایت سادہ زندگی بسر کرنے لگے۔

خواجہ تونسوی نے نماز روزے کا پابند تو بچپن ہی سے بنا دیا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت کی طرف بھی دلچسپی بڑھتی گئی۔ مناقب المحبوبین میں حاجی نجم الدین صاحب لکھتے ہیں۔ کہ صاحبزادہ صاحب اکثر ہماری کوٹھری میں آکر کہا کرتے تھے: حاجی صاحب ہمارے لئے دعا کرو۔ خواجہ تونسوی ان کے دینی جذبے سے بے حد خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں دلائل الخیرات عطا فرما کر کہا۔ اب مجھ سے یہ نہیں پڑھی جاتی اب تم پڑھا کرو اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ شجروں پر میری طرف سے تم ہی دستخط کر دیا کرو۔ خواجہ اللہ بخش نے اس ہدایت پر یہاں تک عمل کیا کہ خواجہ تونسوی کے وصال کے بعد بھی ان ہی کا نام شجروں میں لکھتے رہے۔ خاکسار کے جد امجد مولوی فرید احمد صاحب مرحوم کے شجرہ پر تحریر فرماتے ہیں:-

الٰہی بکربت دغربت خاکراہ دردمنداں
سلیماں عاقبت شیخ فرید بخش بجز گرداں"

ہندوستان کا سفر

خواجہ تونسویؒ کے سجادہ پر بیٹھنے کے بعد خواجہ اللہ بخش نے ہندوستان کا سفر کیا اور مشائخ سلسلہ کے مزارات پر حاضر ہوئے۔ بیکانیر کی ایک مسجد میں تین چار دن تک قیام کیا اور کثیر تعداد میں لوگوں کو داخلِ سلسلہ کیا۔ نئے مریدوں کو ہدایت کی کہ نماز روزے کی پابندی کریں۔ راجہ سردار سنگھ والیِ بیکانیر نے حاضر خدمت ہونا چاہا۔ فرمایا۔

"ما فقیریم از ملاقات مایاں ترا چہ
سود است دریں جا بنیائی"

جب خواجہ صاحب دہلی پہنچے تو بہادر شاہ ظفر نے خدمت میں حاضر ہونا چاہا۔ خواجہ صاحب حضرت چراغ دہلویؒ کی درگاہ میں مقیم تھے۔ بہادر شاہ ملاقات کے لیے آئے تو وہ دوسرے دروازے سے نکل کر جنگل کی طرف چلے گئے۔ بہت منت سماجت کے بعد واپس آئے۔ بہادر شاہ نے شرفِ قدم بوسی حاصل کیا۔ اگلے دن خواجہ صاحبؒ شاہ جہاں آباد تشریف لائے۔ وہاں امرا اور درباریوں نے کثیر تعداد میں اظہارِ عقیدت کیا۔ محلات کی بیگمیں مرید ہوئیں۔ بہادر شاہ نے بھی نذر پیش کی۔

تعمیر کا شوق

خواجہ اللہ بخشؒ کو تعمیر مکانات کا بڑا شوق تھا۔ خاتم سلیمانی کے مصنف کا اندازہ ہے کہ ان کی بنوائی ہوئی عمارات تقریباً نصف حصہ شہر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فاربس نے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے۔

"ان میں (خواجہ اللہ بخش) میں انتظام و تعمیر کے کام کی بڑی لیاقت تھی۔ انھوں نے لنگر خانے، دوسرے و مکانات وغیرہ وغیرہ بنائے۔ جب کہ ان کے دادا کے پرانے خلفاء کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے کچے مکانات کو گرا دیا اور فراخ آستانہ درگاہ و مسجد میں بنائے

اوران کے ارد گرد پختہ اینٹوں کے مدرسے اور درویشوں
اور مولویوں کی رہائش کے لیے مکانات بنائے“ [1]

ان عمارات میں زیادہ تر مساجد، مدرسے، کنوئیں اور سرائیں تھیں اوران کی تعمیر سے خواجہ صاحب کا مقصد منسلکینِ خانوادہ اور دیگر زائرین کی سہولت کا سامان مہیا کرنا تھا

اخلاق خواجہ اللہ بخش کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ انوارالعارفین کے معاصر مصنف نے لکھا ہے:

”دریں زماں نبیرۂ ایشاں (خواجہ محمد سلیمان) میاں
اللہ بخش بر مسندِ ارشاد نشستہ اند۔ طالبان
را ارشاد می کنند و از آئندگان و روندگانِ آنجا
معلوم گردید کہ کریم النفس و خوش اخلاق اند“ [2]

خواہ دشمن ہو یا دوست، جو اُن سے ملتا ان کے اخلاق کا گہرا نقش دل پر لے کر اٹھتا ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ غریبوں اور بے کسوں کی طرف خصوصیت سے توجہ فرماتے پیر مہر علی شاہ صاحبؒ نے ایک مرتبہ اپنی مجلس میں فرمایا:

”در نظر خواجہ اللہ بخش صاحب اہل دنیا را مقدار یک ذرہ ہم وقعت و قدر نبود و بسیار غریب نواز بودہ اند۔ دنیا داراں را بسیار حقیر و بے مقدار دانستہ ہمچوں خواجہ اللہ بخش صاحب ہیچ فقیر دیدہ و شنیدہ نشد“ [3]	خواجہ اللہ بخش صاحب کی نظر میں اہل دنیا کی ذرہ برابر بھی وقعت اور قدر نہ تھی وہ بے حد غریب نواز تھے دنیا داروں کو بہت حقیر اور بے مقدار سمجھتے تھے اور اس معاملہ میں خواجہ اللہ بخش صاحب کے برابر کوئی فقیر دیکھا یا سنا نہیں گیا۔

---

[1] ص ۱۲ [2] انوارالعارفین۔ ص ۵۷۰ [3] ملفوظات طیبہ ص ۱۴۲

ہندو کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کے اخلاق سے متاثر ہوتے تھے۔ ایک ہندو آپ کی صحبت سے اس قدر متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا اور آپ کی خدمت کرنے لگا۔ آپ نے اس کا نام غلام رسول رکھا۔ اس کے متعلق مصنف خاتم سلیمانی کا بیان ہے کہ وہ زہد و اتقا میں صوفیۂ وقت سے سبقت لے گیا تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد خواجہ صاحبؒ نے اس کو اسلامی تعلیم دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے تفسیر حدیث اور فقہ میں مہارت پیدا کر لی۔ حج بیت اللہ کے لئے گیا۔ واپسی پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور خواجہ صاحب کی خانقاہ میں بیٹھ کر دیگر اعلیٰ مریدین و خلفاء کی طرح درس میں مشغول رہنے لگا۔[۱]

اصلاحی کوششیں

خواجہ صاحبؒ نے مسلمانوں کے ہر طبقہ کی اصلاح و تربیت کی طرف توجہ کی۔ ان کے ملفوظات و حالات میں متعدد واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبقۂ علماء کی اصلاح پر خاص زور دیتے تھے ان کا خیال تھا کہ علماء کی اصلاح سے مسلم سوسائٹی کا بڑا طبقہ خود بخود صحیح راہ پر آجائے گا۔ ایک مرتبہ ایک مسئلہ پر مختلف علماء نے مختلف فتوے دئے اور گروہ بندی کے زیر اثر شریعت کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ خواجہ صاحب کو علم ہوا تو بھری مجلس میں ان علماء کی مذمت کی۔[۲]

مرزا غلام احمد قادیانی نے اس وقت اپنے عقائد کی ترویج شروع کی اور اکثر علماء کو مباحثہ کی دعوت دی۔ خواجہ صاحب نے اپنی جگہ بیٹھ کر نہایت سختی کے ساتھ ان فتنوں کی تردید کی اور کوشش کی کہ مسلمانوں کا مذہبی احساس اور وجدان ان گمراہ تحریکوں سے متاثر نہ ہو۔

---

[۱] خاتم سلیمانی۔ ص ۱۹۲ [۲] خاتم سلیمانی ص ۲۱۸ - ۲۱۷

حضرت خواجہ اللہ بخش رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳ ستمبر ۱۹۰۱ء (۲۹ جمادی الاول ۱۳۱۹ھ)
کو وصال فرمایا۔ تاریخ ہے ــــ

چراغ جہاں بجھ گیا ہے
۱۳۱۹

خواجہ صاحب کے تین فرزند تھے۔ حافظ موسیٰ۔ حافظ احمد۔ حافظ محمود۔ حافظ موسیٰ صاحب مسند نشین ہوئے۔ وہ نہایت کم گو، منکسر مزاج بزرگ تھے ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۶ء کو وصال فرمایا اور خواجہ محمود سجادہ نشین ہوئے۔ وہ بڑے عالم فاضل بزرگ تھے۔ عربی، فارسی، اردو، پشتو، بلوچی وغیرہ زبانوں پر مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ حج کے موقع پر اس طرح عربی بولی کہ سننے والے حیران رہ گئے، مثنوی کا درس اس انداز میں دیتے تھے کہ حاضرین مسحور ہو جاتے تھے۔

حافظ صاحب کے بعد ان کے صاحبزادے محمد حامد صاحب مسند آرا ہوئے۔
آج کل مولانا حافظ سدید الدین صاحب سجادہ نشین ہیں بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ حالاتِ حاضرہ سے کافی واقفیت رکھتے ہیں اور اصلاحی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ حافظ محمود صاحب کے سجادہ نشین خواجہ حافظ نظام الدین صاحب ہیں ان سے سلسلۂ نظامیہ کا فیض پھیل رہا ہے۔ زہد و تقویٰ میں مشہور ہیں۔

خواجہ اللہ بخش تونسوی کے مریدین میں مولانا غلام احمد بریاں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کو تصوف سے بے حد دلچسپی تھی۔ بزرگوں کے حالات اور ملفوظات کی اشاعت میں جو کوشش انھوں نے کی اس کی مثال ملنی مشکل ہے "ملفوظات خواجگان چشت" فوائد الفواد، خیر المجالس، کشکول، اخبار الاخیار، اصول السماع وغیرہ کتابوں کو انھوں نے ترجمہ کرا کر اپنے مطبع مسلم پریس دہلی سے شایع کیا۔ اور اس طرح بہت سی ایسی کتابوں کو محفوظ کر دیا جو اگر اس وقت طبع نہ ہوتیں، تو ضائع ہو جاتیں۔

مولوی ارشاد علی صاحب فریدی اور مولوی فرید احمد صاحب | خاکسار راقم الحروف کے

دادا جناب مولوی فرید احمد صاحب مرحوم اور پردادا مولوی ارشاد علی صاحب امروہی مرحوم حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی کے مریدِ خاص میں سے تھے۔ اور انھوں نے اپنے مخصوص اور محدود دائرے میں رہ کر سلسلہ کی روایات کی نشر و اشاعت کے لئے پُر خلوص جد و جہد کی تھی۔

مولوی ارشاد علی صاحبؒ یکم اگست ۱۸۲۵ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہویں پشت میں سلسلۂ نسب حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے جا ملتا ہے۔ مولانا حاجی محمد مہدی صاحبؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ حاجی صاحب موئی (ضلع بریلی) کے رہنے والے تھے اپنے عہد کے جید عالم تھے۔ دربارِ مغلیہ میں ان کی بڑی قدر تھی۔ اکبر شاہ ثانی نے فصیح الشعرا اور ملک العلما کے خطابات عنایت فرمائے تھے۔ حاجی صاحبؒ نے بریلی سے امروہہ کا سفر خاص طور پر مولوی ارشاد علی صاحب کی تعلیم کے لئے کیا اور بہت جلد ان کو علم کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

مولوی ارشاد علی صاحب کے والد مولوی ابدال محمد صاحب مرحوم نے ان کے بچپن ہی میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور مولوی ارشاد علی صاحب کو عسرت و تنگی میں دن گزارنے پڑے لیکن انھوں نے اس زمانہ میں بڑی محنت سے پڑھا اور تحصیلِ علم سے فارغ ہونے کے بعد پنجاب چلے گئے جہاں عرصہ تک سرکاری ملازمتوں کے سلسلہ میں رہنا ہوا۔ اس زمانہ کے مشہور انگریز حکام، سرجان لارنس، کرنل ہملٹن، کرنل فیرنگ ٹن وغیرہ کے ساتھ کام کیا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں وہ کرنل جی۔ ڈبو۔ ہملٹن کمشنر ملتان کے سر رشتہ دار تھے۔ ہملٹن نے حکم دیا کہ پاک پٹن کی خانقاہ سے متعلق سب جاگیریں ضبط کرلی جائیں۔ مولوی ارشاد علی صاحب نے اس حکم سے اختلاف کیا اور ہملٹن کو سمجھایا کہ پاک پٹن وہ مقام ہے جہاں پہنچکر تیمور نے بھی اپنی خون آشام تلوار نیام میں رکھ لی تھی۔ ہملٹن نے ان کے اصرار پر اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ مولوی ارشاد علی صاحب جب اپنی سرکاری ملازمت کا ذکر فرماتے تو کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لئے اس طرف بھیجا تھا کہ میں بابا صاحبؒ کی درگاہ کی جاگیروں کی حفاظت کروں۔ صرف یہی ایک کام میرا زندگی کا حاصل ہے۔ دیوان اللہ جوایا صاحب سجادہ درگاہ بابا فریدؒ سے بڑے گہرے تعلقات

تھے مشائخ سلسلہ چشت کی بعض اہم کتابیں جو مولوی ارشاد علی صاحب نے نقل کرائی تھیں انکے مقابلہ و تصحیح کا کام حضرت دیوان صاحبؒ نے خود انجام دیا تھا۔ مولوی ارشاد علی صاحب کے بہت عرصہ تک اولاد نہ ہوئی۔ کافی عرصہ بعد جب لڑکا پیدا ہوا تو حضرت اللہ جوایا صاحب نے فرید بخش نام تجویز کیا۔ ارشاد علی صاحب نے فرید بخش کی جگہ فرید احمد نام رکھا اور اس تبدیلی کی وجہ یہ بتائی کہ بخش سے شرک کی بو آتی ہے۔

مولوی ارشاد علی صاحب کو دینی لٹریچر بالخصوص تصوف کی کتابوں سے خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے زر کثیر صرف کر کے اپنا قلمی کتب خانہ جمع کیا تھا۔ آج اس کا ایک عشر عشیر خاکسار کے پاس ہے بیشتر حصہ ضایع ہو چکا۔ اگر یہ کتب خانہ باقی رہتا تو ہندوستان میں مشرقی علوم کے چند مخصوص کتب خانوں میں اس کا شمار ہوتا۔ مولوی ارشاد علی صاحب کے علمی ذوق کی شاہد چند تصانیف بھی ہیں جن میں تین شایع ہو چکی ہیں۔ باقی غیر مطبوعہ ہیں۔ حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ کی چند مثنویاں انھوں نے شائع کیں۔ پھر ۱۳۰۴ھ میں دو کتابیں بشیر المدایح اور بشیر النصائح لاہور سے شایع ہوئیں۔ انشاء ارشاد، فرہنگ ارشاد کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

دسمبر ۱۹۰۰ء میں مولوی ارشاد علی صاحب نے اپنے وطن امروہہ میں وصال فرمایا اور پیر شاہ ابن صاحبؒ کے مزار کے احاطہ میں سپرد خاک کئے گئے۔ سر شیخ عبدالقادر نے جوان دنوں .... انگریزی اخبار (observer) نکالتے تھے ان کے انتقال پر اپنے رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خدمات کا ذکر کیا ہے [۱]

مولوی ارشاد علی صاحب کے تین فرزند تھے۔ مولوی فرید احمد مرحوم مولوی فضل احمد مرحوم اور مولوی شریف احمد مرحوم۔ اول الذکر حضرت خواجہ اللہ بخش تونسویؒ سے بیعت تھے۔

جناب مولوی فرید احمد صاحب مرحوم ۱۸۷۱ء میں بمقام امروہہ پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم وطن میں حاصل کرنے کے بعد لاہور چلے گئے اور وہاں گورنمنٹ کالج میں بی اے

---

[۱] The Punjab observer
Wednesday, December 26, 1900.

تک پڑھا تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو اپنے بڑے لڑکے جناب قبلہ مولوی عزیز احمد صاحب نظامی مدظلہ وکیل (خاکسار کے ماجد الدہا) کے پاس میرٹھ میں قیام کر لیا اور وہیں دسمبر ۱۹۴۲ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور قبرستان شاہ ولایتؒ میں سپردِ خاک کئے گئے۔

یہ مختصر سا خاکہ ہے ایک ایسے شخص کی زندگی کا جسے اللہ نے علم و عمل کی بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا اور جس کے احسانات کی گرانباری آج بھی دل محسوس کر رہا ہے۔

مولوی فرید احمد صاحب نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی اور حضرت اللہ جوایا صاحبؒ کی گود میں پایا۔ جوان ہوئے تو دیکھا کہ امروہہ کے گلشنِ علم میں بہار آ رہی ہے۔ ایک طرف حضرت مولانا احمد حسن صاحبؒ کا ہنگامۂ درس و تدریس برپا ہے۔ تو دوسری طرف حضرت مولانا محمد حسن صاحبؒ کے علمی فیوض جاری ہیں۔ تیسری طرف نواب وقار الملکؒ قومی تعلیم و ترقی کے لیے بے چین اور سرگرداں نظر آ رہے ہیں۔ اس پورے ماحول نے ان کی ذہنی نشو و نما پر گہرا اثر ڈالا۔ خواجہ اللہ بخشؒ اور حضرت اللہ جوایاؒ سے ان کو تصوف کا شوق ملا، مولانا احمد حسنؒ سے قرآن و حدیث کے مطالعہ کا ذوق حاصل ہوا، مولانا محمد حسنؒ سے مذاہبِ عالم کے مطالعہ کی لگن اور وقار الملک کی صحبت سے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کا احساس۔

---

۵۰ نواب وقار الملک ان کے علمی ذوق اور قومی جذبہ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اہم مسائل پر ان سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۰۲ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "جناب مخدومی مولوی فرید احمد صاحب سلامت سلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ یونیورسٹی کمیشن میں میں بھی گواہی ادا کرنا چاہتا ہوں اور لکھنا شروع بھی کر دیا ہے ترجمہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ کیا مہربانی سے آپ اس کام میں کچھ مدد فرما سکیں گے۔ اگر کچھ فرصت ہے تو مہربانی سے آج چار بجے تکلیف فرمائیے اور مشکور کیجیے۔ والسلام۔ خاکسار۔ مشتاق حسین۔"

علمی اعتبار سے مولوی فرید احمد صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے اپنا قصرِ علم مشرق و مغرب کے سنگم پر تعمیر کیا تھا۔ اگر ایک طرف دینی لٹریچر پر گہری نظر رکھتے تھے تو دوسری طرف مغرب کے علمی اور تحقیقی رجحانات سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ انگلستان اور امریکہ کے بعض اعلیٰ علمی رسائل ۴۰-۵۰ سال تک متواتر مطالعہ کرتے رہے تھے[1]۔ ان کے کتب خانہ میں ایک طرف عربی و فارسی کی قلمی کتابیں نظر آتی تھیں تو دوسری طرف انگلستان کی جدید ترین مطبوعات۔ مسلمانوں کی ابتدائی دینی تعلیم پر بڑا زور دیتے تھے۔ ملازمت کے دوران میں مرزا پور، جھانسی وغیرہ میں متعدد مدارس جاری کیے[2]۔ قرآن مجید کے مطالعہ پر بے حد زور دیتے تھے۔ گھر کے بچوں کو ترجمہ سے پڑھاتے اور سمجھاتے تھے۔ کہتے تھے کہ جس نے قرآن سمجھ کر نہ پڑھا وہ ایک نعمت سے محروم رہا۔

مولوی فرید احمد صاحب خلوص اور سچائی کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ قومی معاملات میں ان کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ تنخواہ کا بیشتر حصہ مدرسوں، انجمنوں، اخبارات اور غریب طلبا کو دے دیتے تھے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے ظاہری وضع سے علمی تبحر کا اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جب کسی علمی مسئلہ پر گفتگو کرتے تو ایسا محسوس ہوتا گویا ایک سمندر میں تموج پیدا ہو رہا ہے۔

خاکسار راقم الحروف نے اپنی ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی تھی، ان کے احسانات کے اظہار کا یہ موقع نہیں۔ اس کتاب میں اگر کچھ خوبیاں ہیں تو ان کے فیضِ صحبت کا اثر ہیں جو برائیاں ہیں وہ میری کوتاہی کا نتیجہ ہیں۔

---

[1] انگلستان کے ایک مشہور رسالے LITERARY GUIDE AND RATIONALIST REVIEW. نے ان کی وفات پر رنج کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تیس سال سے زیادہ تک اس رسالہ کا وہ شوق سے مطالعہ کرتے رہے تھے۔

[2] ملاحظہ ہو اخبار "البشیر" (خان بہادر مولوی بشیر الدین اٹاوہ) ۲۲ دسمبر ۳۲ء مقالات مدیریہ

مآخذ

آثار الصنادید: سر سید احمد خاں (مطبوعہ دہلی، پہلا ایڈیشن)

احسن الشمائل: ملفوظات وحالات شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ از خواجہ کامگار خاں (قلمی نسخہ، شیفتہ کلکشن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

احسن الاقوال: ملفوظات شیخ برہان الدین غریبؒ از خواجہ عماد بن حماد کاشانی (قلمی نسخہ، مملوکہ پروفیسر محمد حبیب)

احترام الاصفیا: حالات خواجہ محمد اسلم خیرآبادی از مولانا دین محمد (مطبوعہ ۱۳۴۵ھ)

احیاء علوم الدین: امام غزالیؒ (مطبوعہ مصر ۱۳۱۱ھ)

اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فارسی نسخہ (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ) اردو ترجمہ (مسلم پریس دہلی ۱۳۲۸ھ)

اردوئے معلیٰ: خطوطِ غالب۔ (مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۱۴ء)

السنۃ الجلیہ فی الچشتیۃ العلیہ: مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ (کتب خانہ اشرفیہ دہلی ۱۳۵۱ھ)

اصول السماع: مولانا فخر الدین زرادیؒ (دہلی ۱۳۱۱ھ)

انفاس العارفین۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (مطبع مجتبائی ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء)

انوار العیون: حالات وملفوظات شیخ احمد عبدالحق از شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ (قلمی نسخہ)

انوار شمسیہ المسمیٰ بہ خطبہ چشتیہ: مولانا امیر بخش (مفید عام پریس لاہور ۱۳۲۵ھ)

انوار العارفین۔ حافظ محمد حسین مرادآبادی (مطبع صدیقی بریلی ۱۲۹۰ھ)

انوار الرحمان: حالات وملفوظات مولوی عبدالرحمان صاحب لکھنویؒ از مولوی نوراللہ صاحب (لکھنؤ ۱۲۸۷ھ)

اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان: مولانا ابوالکلام آزاد (مطبوعہ لاہور ۱۹۳۹ء)

الغزالی۔ مولانا شبلی (نامی پریس کانپور ۱۹۰۲ء)

الفوز الکبیر۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (مطبوعہ دہلی)

اقبال نامہ: مکتوبات ڈاکٹر محمد اقبال (لاہور)

القول المستحسن فی شرح فخر الحسن: مولانا احسن الزماں حیدرآبادی (مطبوعہ)

المامون: مولانا شبلی (مطبوعہ آگرہ)

آئین اکبری: ابوالفضل مرتبہ سرسید احمد خاں

بارہ ماہیہ نجم: حاجی نجم الدین صاحبؒ (مطبوعہ)

بحر المعانی : سید محمد بن جعفر مکی الحسینی خلیفہ حضرت چراغ دہلوی
(قلمی نسخہ)

برکات الاولیا : مولوی سید امام الدین بن مفتی سید عبدالفتاح
(افضل المطابع دہلی ۱۳۲۲ھ)

بزم آخر : منشی فیاض الدین
(رحمانی پریس دہلی ۱۹۲۰ء)

بہجۃ الاسرار : شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات و ملفوظات از شیخ نورالدین ابوالحسن علی بن یوسف (مطبوعہ)

تاریخ جہاں کشا : عطا ملک جوینی
(گب میموریل سیریز)

تاریخ فیروز شاہی : مولانا ضیاء الدین برنی (مرتبہ سر سید احمد خاں)
(ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

تاریخ فیروز شاہی : شمس سراج عفیف
(ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

تاریخ فرشتہ : ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ
(نول کشور)

تاریخ ہند : مولانا ذکا اللہ دہلوی
(مطبع علی گڑھ انسٹیٹوٹ ۱۹۱۷ء)

تحفۃ النصائح : شیخ یوسف گدا مرید شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ
(مطبع نور لاہور)

تذکرہ : مولانا ابوالکلام آزاد (کلکتہ ۱۹۱۹ء نیز لاہور)

تذکرۃ الاولیا : خواجہ فریدالدین عطار
(لاہور)

تذکرہ علمار ہند : مولوی رحمان علی
(نول کشور سنہ ۱۹۱۴ء)

تذکرہ بسمل : حالات مولانا انوارالرحمان بسمل مرتبہ مصباح الرحمان صاحب
(راجستان بک ڈپو۔ جے پور)

تذکرہ گلشن بے خار : نواب مصطفٰے خاں شیفتہ
(نول کشور سنہ ۱۸۷۴ء)

تذکرہ کاملان رامپور : حافظ احمد علی خاں شوق
(ہمدرد پریس سنہ ۱۹۲۹ء)

ترجمان القرآن : مولانا ابوالکلام آزاد

ترجمہ فیصلہ مقدمہ دیوانی منفصلہ ایچ ایف فاربس۔ ڈسٹرکٹ جج ملتان
مقدمہ نمبر ۱۰۹ سنہ ۱۹۱۱ء (خواجہ حامد ومحمود) یونین پرنٹنگ ورکس لودھیانہ سنہ ۱۹۱۳ء

ترجمہ فیصلہ عدالت چیف کورٹ بمقدمہ تونسہ شریف
(گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور)

تزک جہانگیری : مرتبہ سر سید احمد خاں
(مطبوعہ علی گڑھ)

تفسیر عزیزیہ - شاہ عبدالعزیز دہلوی
(قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

تفہیمات الٰہیہ : شاہ ولی اللہ دہلوی
(مطبوعہ)

تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار : نواب صدیق حسن خاں
(مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۸ھ)

تکملۂ سیر الاولیاء : خواجہ گل محمد احمد پوری
(مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۲ھ)

تنبیہ الضالین و ہدایۃ الصالحین : (فتویٰ جو علماء مکہ اور شاہ محمد اسحاق صاحب نے بعض غلط نظریات کی تردید میں دیے تھے) (مطبع سید الاخبار ۔ دہلی ۱۲۶۲ھ)

تلبیس ابلیس : علامہ ابن جوزی
(مطبوعہ مصر ۱۹۲۸ء)

تلخیص التواریخ ملقب بہ مفرح دلکشا : حکیم محمد حسن صاحب امروہوی
(مطبوعہ)

جمہرۃ اللغت : ابن درید
(مطبوعہ حیدرآباد)

جواہر فریدی : علی اصغر چشتی
(قلمی نسخہ)

جوامع الکلم : ملفوظات حضرت سید محمد گیسو دراز مرتبہ سید محمد اکبر حسینی فرزند شیخ
(مطبوعہ انتظامی پریس عثمان گنج، حیدرآباد)

حجۃ اللہ البالغہ : شاہ ولی اللہ دہلوی
(معہ اردو ترجمہ امرتسر)

حدائق الحنفیہ : حالات علماء و فقہاء حنفیہ ۔ از مولوی فقیر محمد جہلمی
(مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، جون ۱۸۸۶ء)

حضرت مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
(مطبوعہ جید پریس ۔ دہلی)

حیات ولی : سوانح شاہ ولی اللہ دہلوی از مولوی محمد رحیم بخش
(افضل المطابع دہلی)

حیات خسرو : مولانا سعید احمد مارہروی
(نول کشور اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۹ء)

حیوٰۃ العلماء : حالات علماء سہسوان۔ از سید محمد عبد الباقی
(نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۲ء)

حیات مالک : مولانا سید سلیمان ندوی
(دار المصنفین اعظم گڈھ)

حیات جاوید : مولانا الطاف حسین حالی
(مطبع رعد کانپور ۱۹۰۱ء)

حقانیت اسلام : مولانا محمد حسن امروہوی
(مطبوعہ)

خاتم سلیمانی : حالات و ملفوظات خواجہ سلیمان تونسوی از مولوی الہ بخش بلوچی
(خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور ۱۳۲۵ھ)

خاتمہ مراۃ احمدی : مرزا محمد حسن
(کلکتہ ۱۹۳۰ء)

خیر المجالس : ملفوظات حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی
(قلمی نسخہ)

خزینۃ الاصفیاء : مولانا غلام سرور
(مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۸۷۲ء)

خلاصۃ الفوائد : ملفوظات خواجہ نور محمد (قلمی)

دول رانی خضر خاں : امیر خسروؒ
(مطبوعہ علی گڑھ)

دیوان بے نیاز : دیوان شاہ نیاز احمد بریلوی
(مطبع آگرہ اخبار آگرہ ۱۳۴۸ھ)

دیوان حسن دہلوی : دیوان امیر حسن علامۂ سنجریؒ مرتبہ مسعود علی محوی
(ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد دکن ۱۳۵۲ھ)

دیوان بہادر شاہ ظفر :

ذکر حبیب ۔ حالات و ملفوظات پیر سید حیدر شاہ جلال پوری مرتبہ ملک محمد الدین
(پنڈی بہاء الدین ۱۳۴۲ھ)

ذکر میر : میر تقی میر : مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق
(انجمن ترقی اردو ہند دہلی)

رسالہ احوال پیران چشت : (قلمی)

رسالہ قشیریہ : امام قشیری (مطبوعہ مصر)

رسالہ تحقیق آراضیِ ہند : شیخ جلال الدین تھانیسری
(قلمی نسخہ)

رسالہ مطلوب فی عشق المحبوب ۔ محمد امیر بہرائچی
(قلمی نسخہ)

رشحات : واعظ الکاشفی
(مطبوعہ نول کشور)

رشد نامہ : شیخ عبدالقدوس گنگوہی
(قلمی نسخہ)

روضتہ الاولیاء : میر سید غلام علی آزاد بلگرامی
(قلمی نسخہ)

روضتہ الاقطاب : محمد بلاق چشتی
(مطبع محب ہند دہلی)

ریاض الفصحائ : غلام ہمدانی مصحفی
(انجمن ترقی اردو۔ دہلی ۱۹۳۴ء)

زمزمۂ صابری۔ تسلیم احمد امروہوی
(مطبع حقانی امروہہ ۱۹۰۷ء)

سبع سنابل ۔ میر عبدالواحد بلگرامی
(مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۹ھ)

سفینتہ الاولیاء ۔ داراشکوہ
(قلمی نسخہ، نیز مطبوعہ)

سرور الصدور، ملفوظات حضرت شیخ حمید الدین سوالی ناگوریؒ خلیفہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ (قلمی نسخہ)

سوانح مولانا روم : امام غزالی۔
(نامی پریس کان پور)

سوانح احمدی : محمد جعفر تھانیسری
(بلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ۔ ضلع انبالہ)

سلسلۃ الذہب : شجرہ خواجہ علی محمد شاہ از محمد احتشام الدین
(گیلانی پریس لاہور)

سیر محمدی : مولانا شاہ محمد علی (یونانی دواخانہ پریس الہ آباد)

سیرۃ فریدیہ : حالات فریدالدین خاں وزیر اکبر شاہ ثانی از سر سید احمد خاں
(مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۹۶ء)

سیر الاقطاب : شیخ اللہ دیا چشتی
(نول کشور)

سیر العارفین : از درویش جمالی
(مطبوعہ دہلی)

سیرۃ النعمان : مولانا شبلی
(مطبع مفید آگرہ ۱۸۹۲ء)

سیرت النبی : مولانا شبلی و مولانا سید سلیمان ندوی
(دار المصنفین اعظم گڈھ)

سیر الاولیاء : امیر خورد
(چرنجی لال ایڈیشن دہلی)

سواء السبیل : شاہ کلیم اللہ دہلوی
(قلمی)

شجرۃ الانوار : مولانا رحیم بخش فخری مرید و خلیفہ شاہ فخر الدین دہلوی
(قلمی، کتابت ۱۲۸۱ھ، مملوکہ مصنف)

شجرہ چشتیہ سلیمانیہ فخریہ ۔ مولانا غلام فرید چشتی
(مطبع الٰہی آگرہ)

شرح القانون ۔ شاہ کلیم اللہ دہلوی
(قلمی)

شعر العجم : مولانا شبلی (دار المصنفین اعظم گڈھ)

صبح صادق : حالات فرماں روایان بہاول پور۔ از عزیز الرحمن عزیز
(عزیز المطابع بہاول پور ۱۹۴۳ء)

طبقات الشافعیہ : امام سبکی
(مطبوعہ)

طبقات ناصری : منہاج السراج جوزجانی
(ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

عجائب الاسفار : سفرنامہ ابن بطوطہ ترجمہ مولانا محمد حسین جج
(مطبوعہ، دہلی)

عشرہ کاملہ : شاہ کلیم اللہ دہلوی
(قلمی)

علمائے سلف۔ نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی صدر یار جنگ
(مطبوعہ علی گڑھ)

فتح الرحمن : شاہ ولی اللہ دہلویؒ
(مطبوعہ)

فتوح السلاطین۔ عصامی
(مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسن و سید محمد شفیع آگرہ و مدراس)

فتوحات مکیہ : شیخ محی الدین ابن عربیؒ
(مطبوعہ بولاق)

فخر الطالبین : ملفوظات و حالات حضرت شاہ فخر الدین دہلوی از سید نور الدین حسینی فخری (قلمی نسخہ ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۰۰ھ)

فخر الحسن : از شاہ فخر الدین دہلویؒ (قلمی)

فوائد الفواد : ملفوظات حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ از خواجہ میر حسن علا سجزیؒ
(مطبوعہ نول کشور)

قران القران : حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ
(مطبوعہ)

قول الجمیل : حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ
(مطبوعہ دہلی)

کتاب الہند : البیرونی مرتبہ ای سی زخاؤ
(لندن ۱۸۸۷ء)

کتاب اللمع ۔ شیخ ابونصر سراج
(گب میموریل سیریز ۱۹۱۴ء)

کشکول کلیمی ۔ شاہ کلیم اللہ دہلوی
(قلمی، نیز مطبوعہ دہلی)

کشف المحجوب ۔ شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش
(مطبوعہ لاہور)

کلمات طیبات : مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی، مرزا مظہر جان جاناں وغیرہ
(مطبع نامی گرامی، مفید عام آگرہ ۱۹۱۴ء)

کواکب دریہ : مولانا محمد حسن امروہوی
(مطبوعہ)

گلزار ابرار : محمد غوثی شطاری (قلمی)

لطائف اشرفی : مرتبہ مولانا نظام الدین یمینی المعروف بہ نظام حاجی غریب یمینی
(نصرت المطابع دہلی ۱۲۹۵ھ)

لطائف قدوسی : ملفوظات و حالات شیخ عبدالقدوس گنگوہی از شیخ رکن الدین
(مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ)

مامقیمان : مولانا سید علاء الدین اودہی
(مطبع مصطفائی واقع بیت السلطنت لکھنؤ ۱۲۵۶ھ)

ماثر الکرام . غلام علی آزاد بلگرامی
(مفید عام پریس آگرہ ۱۹۱۰ء)

مجنوں لیلیٰ : امیر خسرو
(مطبوعہ علی گڑھ)

مرقع دہلی . (دہلی بارہویں صدی ہجری میں) نواب ذوالقدر درگاہ علی خاں
مقدمہ از حکیم سید مظفر حسین (تاج پریس حیدر آباد)

مخزن الاخلاق : درگا داس
(مطبوعہ)

مخزن الشعراء : تذکرہ شعرائے گجرات مؤلفہ قاضی نورالدین فائق
مرتبہ مولوی عبدالحق (جامع پریس دہلی ۱۹۳۳ء)

مصباح الہدایۃ : شیخ محمود بن علی کاشانی
(مطبع نول کشور نیز ایران)

مطلوب الطالبین : محمد بولاق چشتی
(قلمی)

مصارع العشاق : ابو محمد جعفر بن احمد بن حسین السراج القاری
(مطبوعہ الجوائب قسطنطنیہ)

ملفوظات طیبہ : ملفوظات پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی (مطبوعہ)

مناقب فریدی: از احمد اختر مرزا
(مطبع احمدی دہلی ۱۳۱۴ھ)

ملفوظات شاہ عبد العزیز: مرتبہ قاضی بشیر الدین میرٹھی
(مطبع مجتبائی، میرٹھ ۱۳۱۴ھ)

ملہمات: شیخ جمال الدین ہانسوی
(مطبوعہ الور، نیز دہلی)

مکتوبات قدوسی: مکتوبات شیخ عبد القدوس گنگوہی
(مطبوعہ)

مکتوبات مجددی: مکتوبات مجدد الف ثانی
(مطبوعہ)

مکتوبات کلیمی: مکتوبات شاہ کلیم اللہ دہلوی، مرتبہ مولوی محمد قاسم کلیمی
(مطبع یوسفی دہلی ۱۳۰۱ھ)

مکتوبات سید اشرف جہانگیر:
(قلمی نسخہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

منتخب اللباب: خافی خاں
(مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

منتخب التواریخ: ملا عبد القادر بدایونی
(مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

مناقب حافظیہ: اردو ترجمہ موسوم بہ مشاہدہ حافظی، از محمد ہادی علی خاں، مترجمہ منشی نذر محمد
(نظامی پریس لکھنؤ ۱۳۵۴ھ)

مکاتبات امام غزالی ۔ مرتبہ سر سید احمد خاں
(علی گڑھ)

مناقب المحبوبین : حاجی نجم الدین صاحب
(مطبع محمد حسن رامپور ۱۲۸۹ھ)

مقدمہ ابن خلدون : اردو ترجمہ (مطبوعہ)

مسئلہ خلافت اور جزیرہ عرب : مولانا ابو الکلام آزاد

مراۃ الاسرار : عبد الرحمن چشتی
(قلمی نسخہ)

معارج الولایت : غلام معین الدین
(قلمی نسخہ)

مناقب فخریہ : از نظام الملک، مشتمل بر حالات شاہ فخر الدین دہلویؒ
(قلمی نسخہ کتابت ۱۳۰۰ھ، مملوکہ مصنف)

نافع السالکین : ملفوظات خواجہ محمد سلیمان تونسوی از مولانا امام الدین
(مطبوعہ لاہور ۱۲۸۵ھ)

نظام القلوب : شاہ نظام الدین اورنگ آبادی
(مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ)

نفحات الانس : مولانا عبد الرحمن جامی
(مطبوعہ بمبئی ۱۲۸۴ھ)

واقعات دار الحکومت دہلی : از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی
(آگرہ ۱۹۱۹ء) تین جلد

وجد و سماع : اردو ترجمہ رسالہ "السماع والرقص" ابن تیمیہؒ از مولانا عبد الرزاق

ملیح آبادی
(مطبوعہ الہلال بک ایجنسی لاہور)
وصیت نامہ : شاہ ولی اللہ دہلوی
(مطبع الرحمن سید حیات علی شاہ جہاں آباد ۱۲۶۸ھ)
وفیات لابن خلکان : جلد اول
(مطبوعہ)
وقائع عالم شاہی : مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی (روزنامچہ پریم کشور فراقی)
(رامپور ۱۹۴۹ء)
وقائع راجپوتانہ : مصنفہ بابو جوالا سہائے بھرت پور
(مفید عام پریس آگرہ ۱۸۷۸ء)
یادِ پیر ۔ (منظوم) سوانح حضرت محمد شاہ ہوشیارپوریؒ از محمد عمر خاں
(دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۳۰ء)
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں : مولوی ابوالحسنات ندوی
(وکیل بک ڈپو امرتسر ۱۳۴۱ھ)

رسائل :-

البشیر ، اٹاوہ
برہان ، دہلی
معارف ، اعظم گڑھ
وکیل ، امرتسر
الفرقان ، بریلی

Arberry, A. J.	The doctrines of the Sufis.
Afifi,	Mohiuddin Ibn-i-Arabi
Browne, E G.	A Literary History of Persia 4 vols. (Cambridge 1928).
Forster, G.	A Journey from Bengal to England. (London 1793).
Habib Mohd.	Hazrat Amir Khusrau of Delhi (Bombay 1930)
Habib, Mohd	Indian Culture and Social life at the time of the Turkish Invasions (Aligarh Historical Research Journal 1941).
Hitti, P. K	History of the Arabs
Iqbal, Sir Mohd.	Reconstruction of Religious Thought in Islam
Irvine, W.	Later Mughals
Lokkegaard, Frede	Islamic Taxation in the Classic Period
Massignon, Louis	Essai sur les origines De Lexique Technique De La Mystique Musulmane (Paris 1922)
Mez, Adam	Renaissance of Islam
Mirza, Wahid	Life & works of Amir Khusrau, (Calcutta 1935)
Omar-ud-din.	Ethical Philosophy of Al Ghazzali (Aligarh).
Polier, A H	Shah Alam and his Court.
Prasad, Beni	History of Jahangir
Sarkar, J N.	History of Aurangzeb
	Fall of the Mughal Empire.
	Chaitanya's life and teachings (Calcutta 1912)
	Chaitanya's pilgrimages and teachings
Saksena, Banarsi Prasad,	History of Shah Jahan.
Sinha, N K.	Ranjit Singh
Sinha, H. N.	Rise of the Peshwas.
Williams, R.	An Empire builder of the 16th Century
Yusuf Husain Khan	Nizam-ul-Mulk Asaf Jah I (Manglore 1936)

اشاریہ[1]

الف

[1] میں اپنے عزیز دوست ظہیر الدین ملک صاحب شعبۂ تاریخ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس اشاریہ کی تیاری میں میرا ہاتھ بٹایا۔

۴م